ساختیات
تاریخ، نظریہ اور تنقید
احمد سہیل

ساختیات

تاریخ، نظریہ اور تنقید

احمد سہیل

ساختیات

تاریخ، نظریہ اور تنقید

احمد سہیل

تخلیق کار پبلشرز
104/B۔یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید
مصنف : احمد سہیل
پتہ : 321, Old Elkhart Road # 37, Palestine, Texas-75801
ترتیب و تزئین : شیخ سلیم احمد

زیر اهتمام : انیس امروہوی
تخلیق کار پبلشرز
104/B،یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سرورق : نسیم آرٹسٹ
کمپوزنگ : نعت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
مطبع : بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، ترا ہا بہرام خان، دریا گنج، نئی دہلی۔۲

- مو‌ڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
- اہلووالیہ بکڈپو، ۴۹ / ۹۹۸۸، نیورو ہتک روڈ، نئی دہلی ۔۱۱۰۰۰۵
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

T.P. : 096 ISBN: 81-87231-20-3

SAKHTIYAT: Tareekh, Nazaria Aur Tanqeed 1999
By Ahmad Sohail Rs. 200.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
104/B, Yawar Manzil, I-Block, Laxmi Nagar, Delhi-110092

انتساب

امّی جان کے نام

جنھوں نے مجھے لکھنا سکھایا

فہرست

اپنی زمین کی مٹی کی بو باس ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کا نعم البدل نہیں۔ اپنی مٹی سے جس تہذیب و تمدن کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ان کی تر و تازگی و خنکی انسان کی شخصیت میں کچھ اس طرح رچ بس جاتی ہے کہ وہ کیسے ہی گھنے جنگلوں، سبزہ زاروں اور رواں دواں شفاف چشموں کے حسن و تازگی میں پناہ لے لے۔ دھول و گرمی کی تمازت اور افلاس کی تاریکی میں ڈوبے اس کے گاؤں کی مٹی کی بو باس آخری دم تک اس کے حواس پر طاری رہتی ہے۔ اپنی جڑوں سے کٹنے کا ذہنی کرب اسے ہمیشہ ناآسودہ رکھتا ہے۔

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات — سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کر دیکھتے ہیں

تیسری دنیا کے لیے امریکہ اس زمین پر ہی جنت سہی، مگر تارکین وطن کے لیے یہ بڑی سنگلاخ زمین ہے۔ اکثر لوگ اسے ایک پلاسٹک سوسائٹی کا نام بھی دیتے ہیں۔ لیکن تیسری دنیا کی وہ نسل جو امریکی فضا میں ہی پروان چڑھی ہے۔ ناسٹلجیا کے ذہنی کرب سے آزاد ہے۔ احمد سہیل ہندوستانی امریکیوں کی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی امریکہ میں گذری۔ تمام تعلیمی مراحل بھی یہیں طے کیے اور امریکہ ان کا وطن ثانی بن گیا۔

احمد سہیل سے میں کبھی ملا نہیں۔ فون سوشلائزیشن کا امریکہ میں سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اسی ذریعہ سے ان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوا۔ بے ریا، تصنع سے پاک، سادگی و معصومیت سے مملو ان کی ذات میں ایک مقناطیسیت پوشیدہ ہے۔ میرے قیام امریکہ کے دوران برصغیر میں زبان و ادب کے مسائل پر ان سے کھل کر باتیں ہوتی تھیں۔

احمد سہیل ایک Self-Effacing انسان ہیں۔ امریکہ کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں بیٹھ کر خاموشی سے علم و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں انکساری و عاجزی کا نمونہ، شہرت و پبلسٹی سے دور بھاگتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف ادب میں تخلیقی جوہر دکھائے ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ برصغیر کے ادبی و معیاری رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ اور اب ساختیات میں ان کی یہ کتاب اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔ مگر احمد سہیل کی زبان سے تعلی و خود ستائی کا کبھی ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ بے نیازی و قلندری ان کی ذات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ موجودہ کتاب چھپوانے سے بھی گریز کر رہے تھے۔ جب اس موضوع پر بات ہوتی وہ یہی کہتے کہ مجھے اردو تک لکھنی نہیں آتی۔ مسودہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کا مسودہ خود انہی کی طرح سادہ و سلیس ہے۔ اس میں شعبدہ بازی ہے اور نہ پیچ و خم جو پیشہ ور محققین کے یہاں نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ انھوں نے سیدھے سادے ڈھنگ سے اپنی بات قاری تک پہنچا دی۔

میں نے محسوس کیا کہ معلومات کا یہ خزانہ اردو قاری تک پہنچنا چاہیے۔ مسودہ کی ترتیب و تہذیب اور زبان کی نوک پلک درست کرنے میں ان کی مدد ضروری ہے مگر باقی سب انہی کا ہے۔ اب کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے جس کے بارے میں صحیح رائے اس سمندر کے شناور ہی دے سکیں گے۔ یہ بات بھی محل نظر ہے کہ اردو سماج سے دور دراز علاقہ میں ایک شخص بیٹھا اردو زبان و ادب کی خدمت میں منہمک ہے۔ اس لیے بھی ان کی اس سعی کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ کتاب دلچسپ اور معلومات کا خزانہ ہے۔ امید ہے علمی حلقوں میں اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

شیخ سلیم احمد، نئی دہلی

پیش لفظ

یہ سطریں تحریر کرتے ہوئے مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ اردو تنقید نے گذشتہ دس برسوں میں جو پونجی اکٹھی کی ہے وہ اس سرمائے سے کہیں زیادہ ہے جو اس سے پیشتر نصف صدی نے ترکے کے طور پر اسے دیا تھا۔ ساختیاتی نظریہ اوّل اوّل تدریسی حصاروں میں مقید رہا۔ کچھ بیدار مغز نقادوں اور جامعات کے اردو اساتذہ نے جب اس پر بات کرنا شروع کی، تو بھی اس نظریے کی تفسیر سے آگے بڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ وہ اس بات میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ یہ نظریہ اور اس سے متعلقہ دیگر مفروضات اردو کے اہل قلم اور جامعات سے تعلق نہ رکھنے والے نقادوں کی سائیکی میں حلول کر جائیں۔ اس لیے نصف درجن سے کم جن اصحاب نے اس پر بات کرنا شروع کی تھی، آج دس برسوں کے بعد بھی وہی نام اس سے متعلق دکھائی دیتے ہیں۔ ہندو پاک کے جامعات کے نصابوں میں جہاں تنقید کی تاریخ مختلف نظریات کو Chronological Order میں رکھ کر پڑھائی جاتی ہے، ساختیات اور پس ساختیات کے مفروضات کو اپنی جگہ بنانے کا جوکھم ابھی اٹھانا ہے۔ جن اہل قلم نے اس میدان میں کام کیا ہے وہ یا تو خود کو دہرانے لگ گئے ہیں یا فروعی قسم کے مباحث میں الجھ گئے ہیں۔

احمد سہیل نے امریکہ میں میری رہنمائی میں اپنی ڈاکٹریٹ پر کام کرتے ہوئے گذشتہ پانچ چھ برسوں میں جو مواد اکٹھا کیا (اور اس میں انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کی کتب کے علاوہ زیر دکس کیے گئے مقالوں اور مضامین کی تعداد کئی سو تک پہنچتی

ہے) یہ کتاب اسی مواد سے اخذ کی گئی ہے۔ بنیادی طور پر احمد سہیل کی "ساختیات: تاریخ، نظریہ اور تنقید" تنقید کی کتاب نہیں ہے، بلکہ ساختیاتی نظریے کی اساسی تفہیم کی ایک دستاویز ہے۔ چونکہ تفہیم کے بغیر نقد اور نظریے کی آگہی ممکن نہیں، اس لیے اس کتاب میں مغرب کے ساختیاتی نظریے اور مناجیات کی پیروی نہیں، بلکہ صرف اس کی اساسی تفہیم ہے۔ یہ امر قابلِ تعریف ہے کہ مصنف نے مغرب کے ساختیاتی انتقاری نظریے کی تہذیب کو اردو تنقید اور نظریے کے سیاق و سباق میں رکھ کر پرکھنے کی سعی کی ہے۔ دو ابواب، یعنی "صنوبر بہ گل چہ کرد" اور "ترجمے کا ساختیاتی نظریہ" میں اردو کی تہذیب کے حوالے سے ساختیاتی فکر کو صرف خوش آمدید کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ اس بات کا عندیہ بھی دیا گیا ہے کہ اردو نقد کا نظریاتی پس منظر مختصر ضرور ہے، لیکن بنجر نہیں ہے۔ کوئی بھی تصویر مکمل ہونے میں وقت لگتا ہے اور نقد اور نظریے کی آگہی کے پروسس میں اگر کچھ برس اور بھی لگ جائیں تو چنداں مبالغہ نہیں ہے۔ اب جبکہ اردو تنقیدی نظریہ ایک عبوری دور سے گذر رہا ہے۔ تو اس تیزی سے بدلتے ہوئے سیناریو میں ساختیاتی نظریے کی بھی تفہیم اس قدر ضروری ہے، جتنی کچھ عرصہ پہلے سماجی یا نفسیاتی نظریے کی تھی۔ یہ طے شدہ امر ہے کہ کسی بھی نئے نظریے کے تحت پیش کیے گئے سبھی مفروضات سے اتفاق ممکن نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے نظریے اپنے وقتوں میں مضبوط اور مغرور میناروں کی طرح ایستادہ رہنے کے بعد شکست و ریخت کے مرحلوں سے گذرے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن مصنف نے ساختیات کی تاریخ کا مختلف النوع حالتوں میں جائزہ لیتے ہوئے اس کی ان امید افزا جہات کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، جو اردو کے حوالے سے کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

ایک اہم بات جس کی طرف میں قارئین کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ مصنف نے کہیں بھی اپنی نظریاتی و تنقیدی سوچ کو قاری پر لادنے کی کوشش نہیں کی۔ مصنف نے صرف قاری کو اپنے ادراک کی مدد سے ساختیات کے نظری مسائل کی تفہیم کر سکنے کے وسائل مہیا کیے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قاری کو مصنف سے اور مصنف کو قاری سے سو فیصد اتفاق ہو۔ ذہنی و فکری تربیت، معاشرتی اور مکتبی

پس منظر کی تفاوت کے سبب کتاب کے بکھرے ہوئے متن کی تشریح و قرآت تشکیلی نوعیت کی ہے۔ جہاں نظریاتی سوچ کو قاری پر لادنے سے انکار ایک مثبت رویہ ہے، وہاں خطرہ اس بات کا بھی ہے کہ غیر آگاہ قاری کتاب کے متن کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر دے، کیونکہ مصنف نے اس صورت حال میں اطلاقی سطح پر کوئی صوری تصور نہیں دیا ہے۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ اردو کے مجموعی تناظر میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اور مصنف اگر اسے کسی صوری تصور کے تحت ایک محدود دائرے میں محصور کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔ ساختیات کی ابجد سمجھنے کے لیے تو کچھ کتابیں پہلے شائع ہو چکی ہیں لیکن ساختیات کی تاریخ، تنقید اور نظریے کو اردو کے سیاق و سباق میں دیکھنے اور پرکھنے کے لیے یہ ایک بالکل مختلف قسم کی کتاب ہے۔

کتاب میں مبادلیاتی نظریے کی خوشبو بھی جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ اور مصنف نے یہ کوشش کی ہے کہ تعلقات کے مباحث سے گذرتے ہوئے ثقافتی حصار سے باہر نکل کر فکری مکالمے کو کتاب کے صفحات میں جگہ دے۔ کیونکہ فکری سطح پر تہذیبی اور ثقافتی صورتحال کی طرح متن کے سوالات بھی روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ موجودہ دور میں ترسیلی برقیاتی مزاج کمپیوٹر اور ڈیٹا بنک Data Bank کی برقیاتی و حابی قوتوں کے سبب "قرات" کے عمل پر بُری طرح اثر انداز ہوا ہے۔ یہی امر ہے جو نئی ساختیاتی تھیوری میں "جوہر" کی صورت میں اُبھرا ہے۔ ساختیات کے متعلق عموماً یہ تاثر لیا جاتا ہے کہ یہ صرف متن پر زور دیتی ہے اور تاریخ کو اپنے مطالعے کی حدود سے خارج کر دیتی ہے۔ یہ رویہ ساختیات کے بارے میں روایت پرستانہ ہے۔ تاریخی آگہی کے بغیر جدید ساختیات میں متن کا مطالعہ اور تجزیہ غیر ممکن ہے۔ متن بذات خود تاریخ کو متعارف کرواتا ہے۔ جب بھی سابقہ نو آبادیاتی نو کلیسائی تخاطبہ (ڈسکورس) خاص طور پر امریکی تناظر میں ایبانک تنقید (Ebonic Criticism) یا تیسری دنیا کے حوالے سے رد نو آبادیاتی ڈسکورس کی بات ہوتی ہے تو ساختیاتی نظریے کی وساطت سے ذہن کی فکری ساخت فوراً ہی تاریخ متعلقات کی طرف مرجع ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے مصنف نے ساختیات کے اس روایتی تصور سے انحراف کیا

ہے، جس میں تاریخی آگہی کا شعور شامل نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ مصنف نے ساختیات کی روایتی میکانیت سے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ساختیاتی نظریہ کے کثیر الجہات مزاج کو اُبھارا ہے۔

مجھے کتاب کے مسودے کو پڑھتے ہوئے کئی بار یہ احساس ہوا کہ مصنف نے متن کو زبان کی طرح ہی "مصنوعی" قرار دیا ہے، کیونکہ متن کی بذات خود کوئی نظری اور فکری شناخت نہیں ہوتی۔ معروضی خدوخال کے روایتی کلیے میں برسوں سے ہر وہ چیز جو تحریر میں آرہی ہے، اس لسانی ڈھانچے (فقروں کی ساخت) کو متن کا لقب دے کر تاریخ کے عنصر کو قرأت اور مطالعہ سے خارج سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن روایت پرست جمودی اور غافل لسانی اور حتی ساختیات دانوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ متن میں پوشیدہ فکری سیاق اور پس منظر دراصل تاریخ کا وہ قلب ماہیت ہے، جو نہاں ہوتے ہوئے بھی ظاہر ہے۔ تاریخ کی جدلیات ہی متن میں مواد اور معطیات کی جمالیات کو جنم دے کر متن کو متن بناتی ہے اور یہی متن جو آج یعنی عہد حاضر میں قاری یا نقاد کی نظروں کے سامنے ہے، کل یعنی مستقبل میں تاریخ کا حصہ بن کر ادب اور نقد کو سیراب کرے گا۔

میں نے شروع میں ساختیاتی تنقیدی نظریے کو جامعات کے اساتذہ کی سعی نارسا کے حصار میں محدود ہونے کا ذکر کیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر احمد سہیل نے کمال احتیاط سے اس نظریے کو تدریس اور نصابی حصار سے باہر نکال کر عملی اور سائنٹفک تنقید سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں اس وقت ادبی تنقید جامعات سے باہر بہتر طور پر لکھی جارہی ہے۔ اور یہ کتاب اس بات کا اعلیٰ ثبوت فراہم کرتی ہے۔ ہندوپاک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اردو اساتذہ اور نقاد اہل قلم کے علاوہ یہ کتاب عام قاری سے بھی اپنا رابطہ مضبوطی سے قائم کرنے میں کامیاب ہوگی، اس کا مجھے اس لیے یقین ہے کہ اس میں قاری کی حس عمومی (Common Sense) کو بیدار کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ عام قاری کی حس عمومی کو بھی اس بات کا علم ہے کہ زبان معاشرے کا مصنوعی وظیفہ ہے۔ ساختیات کی موشگافیوں کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساسر کے نظریے میں زبان کے کردار کی وضاحت کلیتاً صاف نہیں ہے۔ لہٰذا قاری

اس کے توسط سے جو نتائج مرتب کرتا ہے وہ لسانیاتی تانے بانے میں الجھ کر متن کی اصل ماہیت کو خود اپنی ہی نظروں سے معدوم کر دیتا ہے۔ اس المیہ کی طرف کتاب میں اشارے موجود ہیں۔ یہ باور رہے کہ زبان خود نہیں بولتی بلکہ فرد اپنے ادراک اور قوت تخلیق کی کارکردگی سے زبان کو معروض میں لاکر اسے جیتا جاگتا بنادیتا ہے۔

اس اعتراف کے باوجود کہ ڈاکٹر احمد سہیل کی یہ کتاب ساختیات پر اردو میں تنقیدی ادب کے زمرے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، مجھے یہ لکھنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ اس بات کے باوجود کہ یہ کتاب اپنا دامن بہت کشادہ رکھتی ہے، شاید فاضل مصنف کو آنے والے برسوں میں ایک نئی کتاب لکھنے کی ضرورت بھی محسوس ہو۔ معروضی اور عقلی سطح پر کتاب کی نظری مناجیات کی رسائی کا خلاصہ کچھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

- مائیکرو ساختیات کے زیر سرخط۔ نفسیاتی مطالعے، جدیدیت (موضوعی مطالعے)
- میکرو ساختیات کے زیر سرخط۔ ترقی پسندی، ثقافتی مطالعے، مابعد جدیدیت (معروضی مطالعے)
- فطری ساختیاتی رسائی کے زیر سرخط۔ تاثراتی اور تبصراتی مطالعے
- تربیت وار ساختیاتی رسائی کے زیر سرخط۔ تجربی، تجرباتی اور عملیاتی مطالعے

بہرحال جن امور پر اس کتاب میں کچھ کم دھیان دیا گیا ہے، ان کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ تخلیقی قوت کی کارکردگی کی ساخت تاریخی، دیومالائی اور حیاتاتی منظر و پس منظر کے چوکھٹے میں رکھ کر بھی کی جاتی رہی ہے۔ اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں بقول ڈیوڈ ووڈ ساختیات کو اپنا رشتہ بہت پہلے جوڑ لینا چاہیے تھا۔ Chaos سے Cosmos تک پہنچنے کے عمل میں یعنی ذہنی انتشار یا بے ہیئتی سے تخلیقی ذہن کیسے ایک کوزہ گر کی طرح ایک شبیہ کے نقش ابھارتا ہے، وہ مرحلہ درپیش آتا ہے جسے تسلسل کے ٹوٹنے کا مرحلہ کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے عمل میں کربلا کا منظر، اساطیر کے چوکھٹے میں ہرناکشن کا قتل نرسنگھ کے ہاتھوں سے اور حیاتاتی منظر و پس منظر میں روزانہ زندگی کے مظاہر تخلیقی عمل کے ساخت کا پتہ دیتے ہیں۔ ڈیوڈ ووڈ نے کہا ہے کہ قاری ایک فعال Participant کے طور پر متن

کے ریزوں کو دوبارہ جوڑ کر جو نیا پیالہ تخلیق کرتا ہے، اس میں رنگ بھرنے کا کام بھی تاریخی، دیومالائی اور حیاتیاتی عنصر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ عنصر اس کی تربیت کا حصہ ہیں۔

جہاں فاضل مصنف نے فطری ساختیاتی رسائی کے زمرے میں تاثراتی اور مبعدی مطالعوں کا ذکر کیا ہے، وہاں شاید یہ بھی ضروری تھا کہ لکھاریوں کو دو گروپوں میں تقسیم کرنے کی جوہات رولاں بارتھ نے کی تھی اس پر بھی کچھ کہا جاتا۔ رولاں بارتھ نے جو دو لفظ استعمال کیے ہیں وہ Ecrivain 'ایکرویں' اور Ecrivant 'ایکری واں' ہیں۔ ایک طبقہ ان لکھاریوں کا ہے، جو کسی مقصد کے حصول کے لیے لکھتے ہیں۔ اجتماعی طور پر ترقی پسند تحریک سے منسلک سب شاعر اور ادیب اس زمرے میں آتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو کسی مقصد سے اپنا انسلاک نہیں رکھتے اور خود کار یعنی Automatic تحریر کو ہی اپنا منتہائے مقصود سمجھتے ہیں۔ اردو ادب کے منظر نامے میں ان دو اصطلاحات کی مدد سے ترقی پسند تحریک سے منسلک اور جدیدیت کے پیروکار لکھاریوں پر ایک خوبصورت بحث کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ساختیاتی تنقید کے ادب میں اس کتاب کا اضافہ اہم ثابت ہوگا۔

(ڈاکٹر) ستیہ پال آنند

واشنگٹن ڈی۔ سی۔ امریکہ
یکم جنوری ۱۹۹۹ء

ساختیاتی تاریخ کے سنگ میل

۱۷۱۶ء: گاٹیرڈ لیبنز (Gotterid Leibnitz) کا انتقال ہوا۔ جنھوں نے آفاقی ساختیے کا تصور دیا۔

۱۷۵۹ء: والٹیر نے طنزیاتی طور پر Monadology کی رجائیت پر Candide لکھی۔

۱۸۶۰-۶ء: ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) نے حیاتیاتی ساختیے کی نامیات کا سب سے پہلے معاشرتی علوم پر اطلاق کیا

۱۹۰۷ء: سوئیسر (Saussure) نے لسانیات پر اپنے پہلے تین خطبات دیے جن کا موضوع Cours De Linguistique Generale تھا۔

۱۹۱۲ء: سوئیسر کے شاگردوں نے ان خطبات کو ترتیب دیا۔

۱۹۱۳ء: سوئیسر کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۵ء: ماسکو کے لسانی سرکل کی بنیاد پڑی۔

۱۹۱۶ء: سوئیسر کی "کورس آف جنرل لنگوسٹکس" شائع ہوئی۔

۱۹۱۷ء: فرانز برینٹانوں (Franz Brentano) کا انتقال ہوا۔

۱۹۱۷ء: شکلووسکی (Shklovsky) کی کتاب "آرٹ از تکنیک" (Art as Technique) چھپی۔

۱۹۲۵ء: مارسل ماوس کی کتاب "Essaur Ledon" منظر عام پر آئی۔

۱۹۲۶ء: پراگ کے لسانی سرکل کی بنیاد پڑی۔

۱۹۲۶ء: ای خی بام (Eichnbaum) کی کتاب "The Thecry of the Formal Method" شائع ہوئی۔

۱۹۲۶ء: رومن جیکب سن (Jakobson) اور ان کے ہم نواؤں نے پراگ سرکل کی بنیاد رکھی۔

۱۹۲۷ء: مارٹن ہیڈیگر (Heidegger) کی کتاب "Being and Time" شائع ہوئی۔

۱۹۲۸ء: جین بوڈین ڈی کورٹینی (Jan Boudouin De Courtenay) فوت ہوئے۔

۱۹۲۹ء: مارس لاخ اور لوسین فیبر نے تاریخ کے "Annales" دبستان کی بنیاد رکھی۔

۱۹۲۹ء: پراگ سرکل میں باختن کی تصنیف "Problems of Dostovesky's Poetics" پیش کی گئی۔

۱۹۳۳ء: لیا (Lea) اور کرسٹائن پاپن (Christine Papin) کی "Kithchen Moids Murder Their Mistressess" شائع ہوئی۔

۱۹۳۳ء: بلوم فیلڈ (Bloom Filed) نے "Language" لکھی۔

۱۹۳۳ء: الفریڈ کوزبسکی (Korzybaski) کی کتاب "An Introduction to Non-Aristotelian system and General Semantics" چھپی۔

۱۹۳۶ء: ژاک لاکان (Lacan) نے میرین باد (Marienbad) میں منعقد عالمی کانگریس میں "Le State Du Miroir" کا تعارف پیش کیا۔

۱۹۳۷ء: لاکان کی تحریر "The Mirror-Stage as Formative of the Function of the I" شائع ہوئی۔

۱۹۳۸ء: ٹروبٹ ٹاسکی (Trubetzkoy) کا انتقال ہوا۔

۱۹۳۸ء: بیچی لارڈ (Bachelard) نے "La Formation De Lesprit Scientifique" لکھی۔

۱۹۳۹ء: ٹروبٹ ٹاسکی کی کتاب "Principles of Phonology" شائع ہوئی۔

۱۹۳۹ء: ایملی بنوینسٹ (Benveniste) کی کتاب "Nature Due Signe Lingustique" چھپی۔

۱۹۴۰ء: بیچی لارڈ (Bachelard) کی کتاب "Philosophy of No" شائع ہوئی۔

۱۹۴۱ء: ڈیموزل (Dumezil) کی "Jupiter Mars Quirinus" منظر عام پر آئی۔

۱۹۴۱ء: رومن جیکب سن اور لیوی اسٹروس کی نیویارک اسکول آف سوشل ریسرچ میں

ملاقات ہوئی۔

۱۹۴۳ء: میکس ورتھ ائمر (Max Werteimer) فوت ہوئے۔

۱۹۴۳ء: ہیم سیلو (Hjemslev) کی کتاب "Prolegomena to a Theory of Language" شائع ہوئی جس میں Glossematics کو متعارف کروایا گیا۔

۱۹۴۵ء: لیوی اسٹروس (Levi Strauss) کی تحریر "Structural Analysis in the Linguistics and Anthropology" چھپی۔

۱۹۴۸ء: لوئی آلتھیوز (Althusser) نے تیس سال کی عمر میں کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔

۱۹۴۸ء: رابرٹ گریوز (Robert Graves) کی کتاب "The White Goddess-A Historical Grammer of Poetic Myth" شائع ہوئی۔

۱۹۴۹ء: لیوی اسٹروس کی کتاب "Elementary Structures of Kinship" شائع ہوئی۔

۱۹۴۹ء: بتائی (Bataille) کی "La Part Maudite" چھپی۔

۱۹۴۹ء: بلینچوٹ (Blanchot) کی کتاب "La Part Du Feu" شائع ہوئی۔

۱۹۵۰ء: الفریڈ کوروبسکی (Korzybski) کا انتقال ہوا۔

۱۹۵۰ء: لیوی اسٹروس نے ماؤس کو متعارف کرایا۔

۱۹۵۳ء: بارتھ (Barthes) کی کتاب Writing Below Zero منظر عام پر آئی۔

۱۹۵۳ء: لاکان کی کتاب "The Function of Field of Speech and Language in Psycho Analysis" شائع ہوئی۔

۱۹۵۳ء: لاکان کا مقالہ "Discours De Rome" فرانس اور عالمی نفسیاتی ایسوسی ایشن کے درمیان وجہ نزاع بنا۔

۱۹۵۵ء: لیوی اسٹروس کی کتاب "Tristes Tropiques" شائع ہوئی۔

۱۹۵۵ء: کینگ گلولیم (Conguilhem) کی "La Formation Du Concept De Re Flexe" چھپی۔

۱۹۵۵ء: لوسین گولڈ مین (Goldmann) کی کتاب "Hidden God" شائع ہوئی۔

۱۹۵۶ء: جیکب سن اور ہلی (Halle) کی کتاب "Fundamentals of Language" شائع ہوئی۔

۱۹۵۶ء: لاکان نے سیمناروں کا سلسلہ جاری کیا۔

۱۹۵۷ء: رونالڈ بارتھ کے مضامین کو "Mythologies" کے نام سے شائع کیا گیا۔

۱۹۵۷ء: لاکان کی "The Age NCY of the Letter in the Unconscious" شائع ہوئی۔

۱۹۵۷ء: نوم چامسکی (Chomsky) کی "Syntactic Structure" چھپی۔

۱۹۵۸ء: لیوی اسٹروس کی "Tristeb Tropiques" اور "اسٹرکچرل انتھروپولوجی" کی پہلی جلد شائع ہوئی۔

۱۹۵۹ء: مارٹن ہیڈیگر کی "On the Way to Language" شائع ہوئی جس نے لسانی مباحث کو فلسفے کی طرف موڑ دیا۔

۱۹۵۹ء: کلوریل لیوی اسٹروس نے کالج ڈی فرانس میں شمولیت اختیار کی۔

۱۹۵۹ء: لاکان کو عالمی نفسیاتی کانگریس سے خارج کیا گیا (کچھ کتابوں میں ۱۹۶۵ء درج ہے)

۱۹۶۰ء: آلتھیوزر کی تحریر "Lepensee", Surlejeune Marx" میں شائع ہوئی۔

۱۹۶۰ء: لیوی اسٹروس نے کالج ڈی فرانس میں افتتاحی خطبہ دیا۔

۱۹۶۰ء: اندرے میرتیت (Martinet) کی کتاب "Elements De Lingustique Generals" شائع ہوئی۔

۱۹۶۰ء: فلپ سولرس (Sollers) نے لسانیات پر مشہور جریدہ "Telquel" نکالا۔

۱۹۶۰ء: جیکب سن کی کتاب "Linguistics and Poetics" چھپی۔

۱۹۶۱ء: مشل فوکو (Foucault) کی کتاب "Madness and Civilisation" منظر عام پر آئی۔

۱۹۶۲ء: جیکب سن اور لیوی اسٹروس نے مل کر بودلیر کی نظم "بلی" (The Cats) کا تحلیلی مطالعہ کیا جو "L'Homme" میں چھپا۔

۱۹۶۲ء: لیوی اسٹروس کی "وحشی ذہن" (The Savage Mind) شائع ہوئی۔

۱۹۶۳ء: بارتھ کی کتاب "Onracine" شائع ہوئی۔

۱۹۶۳ء: فوکو کی "Birth of the Clinic" منظر عام پر آئی۔

۱۹۶۳ء: کولوزووسکی (Klossowski) کی "With a Lecture on Nietzsche" چھپی۔

۱۹۶۴ء: لاکان نے "Ecole Freudienne De Paris" کی بنیاد رکھی۔

۱۹۶۴ء: لیوی اسٹروس کی "Mythologiques" حصہ اول شائع ہوئی۔

۱۹۶۴ء: بارتھ کے مضامین کا مجموعہ "Critical Essays" چھپا۔

۱۹۶۵ء: بارتھ کی "Elements of Semiology" چھپی۔

۱۹۶۵ء: تورودوف (Todorov) نے "ادب کے نظریے" نامی کتاب لکھی۔

۱۹۶۶ء: بارتھ کی "Critique of Verite" شائع ہوئی۔

۱۹۶۶ء: لاکان کی "Ecrits" چھپی۔

۱۹۶۶ء: آلتھیوزر کی کتاب "On Marx" چھپی۔

۱۹۶۶ء: فوکو کی "Order of Things" شائع ہوئی۔

۱۹۶۶ء: گریماز (Greimas) کی "S'Emantique Structurale" منظر عام پر آئی۔

۱۹۶۶ء: بینوانسٹ (Benvenist) کی "Problems of General Linguistics" شائع ہوئی۔

۱۹۶۶ء: پئر ماشرے (Macherey) کی کتاب "Theory of Literary Production" چھپی۔

۱۹۶۶ء: جان ہاپکنز یونیورسٹی (بالٹی موڑ، امریکہ) کے تحت لسانی تنقید اور انسان کی سائنس کے موضوع پر کانفرنس منعقد ہوئی (جو رد تشکیل کی حرف اول بھی ثابت ہوئی)۔

۱۹۶۷ء: ایڈمن لیچ (Leach) نے "The Structural Study of Myth and totemism" کو کتاب کی صورت میں مرتب کیا۔

۱۹۶۷ء: بارتھ کی Systeme De La Mode چھپی۔

۱۹۶۷ء: ڈومنٹ (Dumont) کی "Momo Hierarchicus" شائع ہوئی۔

۱۹۶۷ء: گرینجر (Granger) کی "Pensee Formelle Et Science" شائع ہوئی۔

۱۹۶۷ء: دریدا کی "Writing and Defferenece" اور "Of Grammatology" شائع ہوئی۔

۱۹۶۷ء: ولف گینگ کوہلر (Wolfgang Kohlar) کا انتقال ہوا۔

۱۹۶۸ء: چامسکی کی "Language and Mind" شائع ہوئی۔

۱۹۶۸ء: البرٹو ایکو (Eco) کی کتاب "La Struttura Assente" چھپی۔

۱۹۶۸ء: پولنزاس (Poulanztzas) کی کتاب "Political Power and Social Classes" چھپی۔

۱۹۶۸ء: ژیل ڈیلوز (Deleuze) کی "Difference Et Repetition" چھپی۔

۱۹۶۸ء: ژاں پی ژے (Piaget) کی "Structurilsm" شائع ہوئی (انگریزی ترجمہ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا)

۱۹۶۸ء: ژاں پرفے (Faye) نے اپنے جریدے "Chang" میں لاکان کے مقالے "Lechamp Freudien" کو شائع کیا۔

۱۹۶۹ء: التھیوزرازم کا خاتمہ۔

۱۹۶۹ء: ژیل ڈیلوز کی کتاب "Logique Dusenss" شائع ہوئی۔

۱۹۶۹ء: فوکو نے کالج ڈی فرانس میں شمولیت اختیار کی (کچھ کتابوں میں ۱۹۷۰ء لکھا ہے)

۱۹۶۹ء: فوکو کی "The Archeilogy of Knowledge" شائع ہوئی۔

۱۹۶۹ء: سرس (Serres) کی ''ابلاغ'' (Hermes) چھپی۔

۱۹۶۹ء: جولیا کرسٹیوا (Kristeva) کی "Semiotike" شائع ہوئی۔

۱۹۷۰ء: ولف گینگ ایزر (Iser) نے "The Affective Structure of Text" لکھی، اس کا جرمن سے انگریزی ترجمہ ایزر نے خود ہی کیا۔

۱۹۷۰ء: بارتھ کی S/Z شائع ہوئی۔

۱۹۷۰ء: فوکو کی L'Orde Dudisseoors چھپی۔

۱۹۷۰ء: پولش نقاد رومان انگرڈن کا انتقال ہوا۔

۱۹۷۰ء: لوسین گولڈمین فوت ہوئے۔

۱۹۷۰ء: جیفری ہارمین (Harman) کی کتاب "Beyond Formalism" شائع ہوئی۔

۱۹۷۱ء: لیوی اسٹروس کی "Mythologiques (IV)" شائع ہوئی۔

۱۹۷۱ء: ڈی مین (Deman) کی کتاب "Blindness And in Sight" چھپی۔

۱۹۷۲ء: ژیل ڈیلوز اور گتاری (Guttari) نے مشترکہ طور پر "L'Anti-Oepipe" لکھی۔

۱۹۷۲ء: دریدا کی "Dissemination" اور "Marges Dela Philosophie" شائع ہوئی۔

۱۹۷۲ء: جیراڈ (Girard) کی "La Violencetle Sacres" شائع ہوئی۔

۱۹۷۲ء: ڈیٹنے (Detienne) کی کتاب "The Gardens of Adonis" شائع ہوئی۔

۱۹۷۲ء: جان لوئی (John Louis) نے آلتھیوزر پر "The Case of Althusser" نامی مقالہ لکھا۔

۱۹۷۳ء: جان لوئی (John Louis) کے اس مقالے کا جواب آلتھیوزر نے دیا۔

۱۹۷۳ء: لاکان کی "Leseminaaire Boox, XI" شائع ہوئی۔

۱۹۷۳ء: بارتھ کی "The Pleasure of Text" شائع ہوئی۔

۱۹۷۳ء: بودریلاڈ (Baudrillard) کی "The Mirror of Production" چھپی۔

۱۹۷۴ء: لیوتارڈ (Lyotard) کی "Economie Libidinale" منظر عام پر آئی۔

۱۹۷۴ء: دریدا نے "Glas" لکھی۔

۱۹۷۴ء: اسپیربر (Sperber) کی "Rethinking Symbolism" چھپی۔

۱۹۷۴ء: آلتھیوزر کی "Elements D' Auto Critiuqe" شائع ہوئی۔

۱۹۷۵ء: میخائل باختن کا انتقال ہوا۔

۱۹۷۵ء: جے ایل آسٹن (Austine) کی کتاب "How to do Hinghs with Words" چھپی۔

۱۹۷۵ء: فوکو کی "Discipline and Punish" شائع ہوئی۔

۱۹۷۵-۸۱ء: لاکان "Omicar" نامی پرچے کے ناظم رہے۔ یہ پرچہ یونیورسٹی آف پیرس (سوربون) کے شعبہ نفسیات سے شائع ہوتا تھا۔

۱۹۷۵ء: برلوم فیلڈ نے "Map of Misreading" لکھی۔

۱۹۷۵ء: ای ڈی ہرچ جونیئر (Hirsch Jr.) کی کتاب "The Aims of Interpretation" شائع ہوئی۔

۱۹۷۶ء: لارڈرے یو (Lardreaue) اور جمبٹ (Jambet) نے "L'ange" لکھی۔

۱۹۷۶ء: بارتھ کالج ڈی فرانس کے تدریسی وتحقیقی عملے میں شامل ہوئے۔

۱۹۷۶ء: فوکو نے "History of Sexuality" لکھی۔

۱۹۷۶ء: لاکان نے "Culture and Communication" تحریر کی۔

۱۹۷۶ء: البرٹو ایکو نے "Theory of Semiotics" مکمل کی۔

۱۹۷۶ء: پال رکئیوع (Recoeur) نے "Interpretion Theory: Discourse and the Surplus of Meaning" لکھی۔

۱۹۷۶ء: ایملی بنیاوسٹ (Benveinst) کا انتقال ہوا۔

۱۹۷۷ء: ترودوف کی کتاب "تھیوری آف سمبلز" شائع ہوئی۔

۱۹۷۷ء: گلوشمین (Glucksman) نے "The Master Tinkers" لکھی۔

۱۹۷۸ء: جین ماری بنواسٹ (Benoist) کی کتاب "The Structural Revolation" منظر عام پر آئی۔

۱۹۷۹ء: جین اسٹار بنسکی (Starobinsky) نے سوسیئر پر "Words upon words" لکھی۔

۱۹۷۹ء: لیوتارڈ کی کتاب "La Condition Postmoderne" شائع ہوئی۔

۱۹۸۰ء: ژان پی ژے (Piaget) کا انتقال ہوا۔

۱۹۸۰ء: لاکان ایکولے فرائڈین ڈی پیرس سے الگ ہوئے۔

۱۹۸۰ء: بارتھ فوت ہوئے۔

۱۹۸۱ء: تورودوف کی کتاب "مائیکل باختن" شائع ہوئی۔

۱۹۸۱ء: بورڈیو (Bourdieu) نے "La Distinetion" لکھی۔

۱۹۸۱ء: ڈیلیوز کی کتاب "Mille Plateaox" شائع ہوئی۔

۱۹۸۱ء: رابرٹ ینگ (Young) نے "Untying the Text" مرتب کی۔

۱۹۸۲ء: اینٹ لیورز (Annette Lavers) کی کتاب "Roland Barthes: Structuralism and After" شائع ہوئی۔

۱۹۸۲ء: لاکان کا انتقال ہوا۔ (بعض کتابوں میں ان کا سن وفات ۱۹۸۱ء درج ہے)

۱۹۸۲ء: رومن جیکب سن کا انتقال ہوا۔

۱۹۸۲ء: ہلس جے مِلر کی کتاب "Fiction and Repetion" چھپی۔

۱۹۸۲ء: مشل پیچو (Pecheux) کی کتاب "Language, Semantics and Ideology" کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔

۱۹۸۳ء: لیوی اسٹروس کی "The View from Atter" شائع ہوئی۔

۱۹۸۳ء: پال ڈی مین کا انتقال ہوا۔

۱۹۸۳ء: ایڈورڈ سعید (Edward Said) کی کتاب "The World, the text and the Critic" منظر عام پر آئی۔

۱۹۸۴ء: کلارک (clark) اور ہول کوسٹ (Holquist) نے "میخائل باختن" نامی کتاب لکھی۔

۱۹۸۴ء: تورودوف کی "Critique De La Critique" شائع ہوئی۔

۱۹۸۴ء: فوکو فوت ہوئے۔

۱۹۸۵ء: رابرٹ گریوز (Robert Graves) کا انتقال ہوا۔

۱۹۸۵ء: جے ہلس مِلر نے "The Ligistic Moment" لکھی۔

۱۹۸۵ء: مائیکل مرسٹل (Mristol) کی کتاب "Carnival and Theater" چھپی۔

۱۹۸۶ء: میک کینل (Mac Cannell) کی کتاب "Figuring Lacan: Criticism and the Cultural Conscious" شائع ہوئی۔

۱۹۸۷ء: ٹی۔ میکارتھی (McCarthy) کی کتاب "The Critical Theory of Jurgen Haberma" چھپی۔

۱۹۸۷ء: رئے ہیرس (Rayharis) نے "Reading Saussure" لکھی۔

۱۹۸۷ء: پال ڈی مین کی "The Resistance Theory" شائع ہوئی۔

۱۹۸۹ء: جان ایم ایلس (John M. Ellis) نے "Against Deconstruction"

لکھی۔

۱۹۹۰ء: سیٹون کالینن (Stefan Collinini) نے "Interpertation and over Renterpertation" مرتب کی۔

۱۹۹۰ء: ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton) کی کتاب "آئیڈیالوجی اینڈ ایستھٹک" شائع ہوئی

۱۹۹۱ء: ایسٹ ہوپ (Esthope) کی کتاب "British Post Structuralism Since 1968" چھپی۔

۱۹۹۱ء: جے سی ایونس (J.C. Evans) کی کتاب "Strategies of Deconstruction" شائع ہوئی۔

۱۹۹۱ء: ڈی لےمین (Leman) کی کتاب "Signs of the Time" چھپی۔

۱۹۹۱ء: ڈی ہولڈ کرافٹ (Holdcroft) کی کتاب سوسیئر (Saussure) شائع ہوئی۔

۱۹۹۲ء: پیٹر بیکاڈرنگ کی کتاب "Practising Post Modernism / Reading Moderinsm" شائع ہوئی۔

۱۹۹۲ء: مدن سروپ (Madan Sarup) کی "Jacques Lacan" شائع ہوئی۔

۱۹۹۳ء: ایڈورڈ سعید کی کتاب "کلچر اور امپیریلزم" شائع ہوئی۔

۱۹۹۳ء: رچرڈ ہارلینڈ (Richard Harland) کی کتاب "Beyond Super Structuralism" چھپی۔

۱۹۹۴ء: ایڈورڈ سعید کی کتاب "Representation of the Intellectual" شائع ہوئی جو کہ ایک خطبہ ہے۔

۱۹۹۵ء: فرانسیسی فلسفی، ادیب اور نقاد ژیل ویلز (Deleuze) نے خودکشی کی۔

۱۹۹۷ء: جیوڈتھ بٹلر (Judith, Butler) نے Excitable Speech: A Politics of Speech Act لکھی۔

۱۹۹۷ء: جوناتھن کلر (Jonathan Culler) نے مختصر کتاب "Literary Theory" لکھی۔

OO

خاکہ II

ساختیات

دبستان
روسی ہیئت پسندی
پراگ کا دبستان
کوپن ہیگن کا دبستان
جنیوا کا دبستان
باختن کا دبستان
شکاگو کا دبستان
ماسکو – ٹرٹو دبستان
نیویارک کا دبستان
آکسفورڈ کا دبستان
ییل کا دبستان
کونیٹنٹز کا دبستان

پس ساختیات
ڈسکورس تنقید
تاریخ کار تنقید
ثقافتی ڈسکورس نظریہ
منفعی ڈسکورس کا نظریہ
لسانی ڈسکورس کا نظریہ
آئیڈیالوجیکل ڈسکورس
اقلیتی ڈسکورس (مخاطبہ)
سابقہ نوآبادیاتی نیوکلیائی مخاطبہ
رد تشکیل
پس رد تشکیل
نیوکلیائی تنقید
نظریہ قبل متن
نئی تاریخیت
نئی نئی تاریخیت
نفسیاتی نظریہ
قاری اساس تنقید
موضوعی تنقید
مظہریاتی تنقید
قاری کی تجزیاتی تنقید
ادبی ماہیت کی تنقید
رواجی قرأت کی تنقید
قاری کی نفسیاتی تنقید
سیاہ فام مطالعے
ایونک تنقید
نظریہ قبولیت
قبولیت کا جمالیاتی نظریہ
پس نوآبادیاتی تنقید
رد نوآبادیاتی تنقید
گے، لزبن تنقید
کوئر نظریہ
رد گے، لزبن تنقید
تانیثی تنقید
پس تانیثی تنقید
رد تانیثی تنقید
نئی تانیثی تنقید
گائنو تنقید
امریکی تانیثیت
سیاہ فام تانیثیت
فرانسیسی تانیثیت
مارکسی تانیثیت

پہلا باب

ساختیات کی کہانی-۱

ساختیات کی کہانی-۱

فرد کے تخلیقی اور تنقیدی محرکات اس وقت بہتر طور پر ہمارے ادراک میں آسکتے ہیں جبکہ ان کے پس منظر کا سلسلہ وار ارتقا، ہمارے ذہنوں میں ہو۔ خصوصاً جب علم و ادب کی بات ہوتی ہے تو ہمارے یہاں الجھاؤ اور مغالطے زیادہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کہی جانے والی بات صاف طور پر انسان کی سمجھ میں آجائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ جس علمی یا ادبی مسئلے پر لکھنے والا اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اس میں مطالعے، مشاہدے، تجربے اور کافی حد تک تخلیقی فکر کا قحط ہوتا ہے۔ اول تو ہمارے مصنفین اور ناقدین مغربی فکر سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، یہ محرومی آگے چل کر ان ہی راہوں پر چلنے کی پختہ عادت میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اجنبی رویوں اور نامانوس فکری الجھنوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مضمون میں ماحولیاتی اور عمرانیاتی حوالے سے ساختیات کے عمومی تاریخی پس منظر پر نظر ڈالی جائے گی کہ ساختیات کیسے پیدا ہوئی؟ اور لسانیات کی ساختیات سے قبل کے ابتدائی زمانے میں ساختیات کے بین بین جو رویے تھے ان کی کیا نوعیت تھی جو لسانیات، صوتیات، قواعد، بیانیہ، روداد نگاری، تشریح متن کے علاوہ دیگر مکتبہ ہائے فکر پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔

اس مضمون کا مقصد بھی یہی ہے کہ تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ساختیات کی مبادیات کو سامنے لایا جائے۔ اس میں عمرانیاتی، بشریاتی اور ماحولیاتی ہونے کے علاوہ لسانی ساختیات کے قدرے نئے رویے بھی ہیں جن کو ساختیات کے تصور وحدت کا ارتقائی مزاج بھی کہا گیا ہے۔

ساختیات بنیادی طور پر کسی ایک معروضی یا موضوعی اجزاء کے مطالعہ کا نام ہے جو شعوری اور ذہنی تعلق کے ذریعے سے ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں۔ ساختیات وہ طرز فکر ہے جس کی ابتدا دو سو برس پہلے کے لگ بھگ ہوئی۔ نیڈ (Ned) کے مطابق یہ تصور ۱۷۴۶ء سے بھی پہلے کا ہے، زیادہ تر لوگ اس خیال سے متفق ہیں کہ ساختیات کے تصورات ڈیڑھ دو سو سال قبل نمایاں طور پر دنیا کی فلسفیانہ اور فکری تاریخ کا باب بنے۔ ۱۶۰۲ء میں کیمپین (Campion) نے لکھا تھا:

> "یہ ناموں کا جھگڑا نہیں ہوگا، صرف فطرت کی صحیح ساخت کو سمجھا جائے تو اس کے اصول دو قدم آگے اور عجیب و غریب حصے پر محیط ہوں گے۔"
>
> (Observations in the Art of English, PO ESIE P. 16)

یہ تعریف خاصی پیچیدہ ہے لیکن کیمپین کے ان الفاظ سے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے یہ تعریف ادب کے تجزیہ کے لئے بیان کی ہے جس میں کسی کتاب یا اس کے ایک باب، ہیئت، نظم کی سطر یا ٹکڑا، ایک یا ایک سے زائد جملوں کا تجزیہ یا الفاظ و زبان کی بابت کوئی نئی بات، یہاں تک کہ کسی لفظ کے بارے میں تجزیہ کے علاوہ کتاب یا تحریر کے فکری ذیلی نظام اور اس کی غیر رسمی ساختیات پر بھی بحث کی جاتی ہے جس میں بہت سے موضوعات کے علاوہ واقعات کی بھی جانچ کی جاتی ہے جس سے کسی تخلیق یا تحریر کے ساختیاتی تجزیے کا ربط بھی ہو۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد فکری حلقوں میں بحث چلی کہ ساختیات صرف بشریات اور اس سے متعلقہ مظاہر کی آگہی کا نام ہے اور خاص کر امریکہ میں جارج مرڈوک، انگلستان میں اے آر ریڈکلف، ان کے شاگردوں اور مقلدوں اور فرانس میں کلوڈ لیوی اسٹروس نے اس سلسلے میں اپنے نظریات اور افکار کا اظہار کیا۔ خاص کر ریڈکلف کا انداز فکر اسٹروس سے خاصا قریب دکھائی دیتا ہے، پھر بھی انگلستانی اور فرانسیسی فکری رویوں نے ثقافتی بشریات کو مختلف انداز میں برتا لیکن یہ دونوں فکری چلن زیادہ مغالطے پیدا نہیں کرتے۔

۱۹۴۵ء کے بعد ساختیات کی فیشن ایبل اصطلاح کسی حد تک فکری ہنگامہ آرائی کا مظہر تصور کی جاتی رہی۔ ساختیات کے تاریخی پس منظر میں انگریزی اسٹرکچر (Structure) ہمارے ذہن کو کسی چیز کے بنانے یا تعمیر کرنے کی طرف لے جاتا ہے حالانکہ سولہویں صدی میں اس

اصطلاح کے معنی کو کسی مجموعہ میں پائے جانے والے اجزاء کے آپسی روابط سے لیا جاتا رہا اور ایک زمانے تک ساختیات کی اصطلاح کو تشریح کا علم بھی سمجھا جاتا رہا۔ یہ رویہ اس زمانے میں خاصا مقبول رہنے کے بعد جلد ہی عمرانیات کی تشریح کی صورت میں ظاہر ہوا پھر دو صدیوں کے انتظار کے بعد "عمرانیات" کے علم کی بنیادیں پڑیں جو سیاسی فلسفے کی نامیاتی مشابہت تھی۔ اس زمانے میں ہابس کو ساختیات کا بانی کہا گیا۔ گو ان کی اپنی کتاب "لیوایتھن" (Leviathan) میں کہیں بھی ساختیات یا معاشرتی ساختیات کے کسی تصور یا اس سے ملتے جلتے لفظ کا تصور موجود نہیں لیکن ہابس کے ان افکار میں ہمیں کہیں نہ کہیں موضوعی، نامیاتی، تصوراتی سطحیں ضرور نظر آتی ہیں جو کسی نہ کسی طور پر اداروں کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہیں جبکہ ہربرٹ اسپنسر نے معاشرتی ساختیات کو قدرے نئے انداز میں دیکھا اور استقرائی عمرانیات اور عمومی حقائق کے معروضی ساختیاتی وظائف پر اپنے تصورات کی بنیاد رکھی۔ ساتھ ہی معاشرتی تغیرات کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا۔ اسپنسر کے نظریات بنیادی طور پر ذہن کی تشریحی تمثالیں ہیں۔ یہی تصورات فرانسیسی ماہر عمرانیات ایمل درکھائم کی فکر پر بھی اثر انداز ہوئے۔ انہی افکار نے آگے چل کر ریڈکلف براون کو بھی متوجہ کیا۔

۱۹۸۰ء میں درکھائم نے "معاشرتی ساختیات" پر لیکچر دیتے ہوئے نامیاتی مشابہت پر بحث کی اور یہ بتایا کہ "ہمیں ان مصنفین کی تحریروں کی تفہیم میں کسی قسم کی مشکل نظر نہیں آتی۔ معاشرہ زندہ مخلوق کی طرح ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے سے مشابہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں، معاشرے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں، ایک اجزاء دوسرے اجزاء کی کسی نہ کسی طور پر مدد کرتے ہوئے ایسے تعلق کی بنا ڈالتے ہیں جو وظائفی ہوتے ہیں۔

یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا معاشرہ اصل میں "نامیاتی" ہے؟ معاشرتی تصور کے بعد نامیات کی حدود کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں؟ معاشرتی صحت اور اس کے امراض کی نوعتیں کیا ہیں؟ یہ سوالات بعض دفعہ ذہن کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ یہ تمام بحثیں کسی معاشرتی ڈھانچے کے انتہاپسندانہ نمونے ہیں۔

دوسری جانب مارکسی ادب و تنقید نے نامیات کی بڑھتی ہوئی آواز پر اپنے ردِ عمل کا اظہار

کیا حالانکہ اینگلز، مارگن اور کارل مارکس نے پیداوار، اقتصادی ساختیات، عدالتی، سیاسی ساختیے، ہیئت اور معاشرتی شعور کی جو بات کی ہے وہ اپنے مزاج میں تمام کی تمام بشریاتی ہے۔ مارکس کے تمام معاشرتی اور سیاسی استعارے "نامیاتی عنصر" سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن ساختیاتی تصور ان مارکسی اصطلاحات کے "نظام" کے تصور سے لبریز نظر آتے ہیں۔ "نظام" کے لفظ کا سیاق اپنے مزاج میں، ساختیات، ساختیات اور ہیئت کے تصورات سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ کچھ سال قبل عمرانیاتی علوم میں Infrastructure اور Macrostructure کی اصطلاحات رائج ہوئیں۔ خاص کر عمرانیاتی اور بشریاتی علوم کے علاوہ ادبی تنقید میں "بدساختیات" کا تصور بھی ملتا ہے جو علم و ادب کے علاوہ لسانیات میں تخلیق کے ان رویوں سے بحث کرتا ہے جس میں کسی خاص اقتداری ماحول، مصلحت انگیزی، معاشرتی جبر کے تحت یا فرد اپنے ذاتی ذہنی مزاج سے "بدساختیات" کی ظاہری اور باطنی کیفیت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر "بدوظائفیت" (Dysfunctional) کی اصطلاح کو بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ "بدوظائفیت" کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک ایسا معاشرتی عمل جو ایک بڑے معاشرتی نظام میں انتشار کا باعث ہو۔ Dys کے معنی "بد" یا "خراب" کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی منفی وظائفی حرکیات اپنی جگہ مسلم ہیں۔ یہ اصطلاح بنیادی طور پر طبی سائنس سے متعلق ہے جو عضو کی بہبود کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ "بدوظائفیت" کی منفی اصطلاح ساختیات اور معاشرتی عمل کی تفہیم کو آسان بناتی ہے جو معاشرتی ساختیات کے اخلاقی فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے جیسا کہ درکھائم نے اخلاقیات کی بات کی ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بڑے بڑے فکری اور تخلیقی مسائل سے بھی بحث کرتی ہے کیونکہ معاشرتی سائنسدان یا عمرانیات دان ادبی اخلاقی فیصلے نہیں سناتے لہٰذا وہ اخلاقی پہلوؤں کو برتنے میں تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں یا پس و پیش کرتے ہیں وہ اخلاقی سطح پر غیروابستہ رہتے ہیں اور یہ تصور ساختیات کے تجزیاتی عنصر میں خاص طور پر ممد و معاون بھی ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جارج زل نے کردار اور رویوں کو پرکھتے ہوئے اس کے وظائفی امکانات سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے عملی پہلو کی اصطلاح کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

اینگلز کے تصور "قبائل سے قبل ادوار" کو مارگن نے ساختیے کی بنیادوں میں تلاش کرتے

ہوئے خونی رشتوں کو اس کی بنیاد بتایا لیکن ہم کسی بھی زاویہ فکر سے ساختیات کی کوئی حتمی تعریف اخذ کرنے میں ناکام رہتے ہیں اسی طرح ہمارا ذہن معاشرتی احکام، معاشرتی نظام اور معاشرتی ہیئت کی کسی بھی نوعیت کو واضح کرنے سے محروم رہے گا۔ غالباً مارگن پہلے ماہر بشریات ہیں جنھوں نے نظام (System) کے لفظ کو بیان کیا۔ بشریاتی علوم میں نظام اور ساختیات کی اصطلاحات ایک دوسرے سے مترادف نہیں ہوتیں لیکن ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بھی مشکل ہی ہوتا ہے۔

مرڈوک نے ساختیات کو معاشرتی حوالے سے پرکھنے کی سعی کی، انھوں نے حتمی درجہ بندی کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے "سماجی ساختیات" (Social Structure) کی اصطلاح استعمال کی جہاں انھوں نے Static اور Sterile کے تصورات دیے اور اس بات پر زور دیا کہ ساختیات طریق کار کا بدل ہے۔ لیلین نظام (The Linnaean System) کے تحت انھوں نے ڈارون کے بعد یہ بتایا کہ تبدیلی کا طریق عمل ایک قسم کا فطری انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں سکونیات (Static) کے تصور کو نئے معنی دیتے ہوئے واٹ (Vogt) نے اس بات کا اظہار کیا کہ ساختیات کا تصور یکساں طور پر سکونیات میں بیک وقت منکشف اور ممیز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس تصور سے ملتا جلتا تصور انگلستانی بشریاتی علوم میں بھی ملتا ہے، ساتھ ہی اس زمانے میں امریکی عالموں نے حرکیات کے تصور کے طریق کار پر بحث کرنا شروع کی۔ آج ہم واٹ کے طریقہ کار سے خاصے ناواقف ہونے کے سبب تاریخی طریقہ کار کی حس سے بے بہرہ ہیں جس میں عقائد، تاریخی جبریت اور قوانین کی معاشرتی تبدیلی ایک نظر میں واضح ہو جاتی ہے۔ یہ خیال بھی عام ہے کہ "ہم وقتی" (Synchronic) مطالعہ "سکونیات" کے مطالعہ کو زیادہ ٹھوس بناتا ہے کیونکہ یہ تصور حرکیاتی نظریے کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے لیکن حقائق کے باہر اس کا وجود نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مرڈوک نے کہا کہ اس اتنی تخصیص کی شناخت، ساختیات اور طریقہ کار کی رنگارنگی ہے۔ یہ ساختیات کو صوری معنویت سے آشکار کرتی ہے جو صوتیہ کی حتمی معنویت ہے۔

فورٹس (Fortes) کے مطالعہ زمان معاشرتی ساختیات، اور "آشنتی کے مطالعہ سرگزشت" (An Ashanti Case Study) ۱۹۵۸ء میں شائع ہونے والے مقالات کا مجموعہ اصل میں

Synchronic مطالعہ کی بنیاد پر تھا جو برطانوی نقطۂ نظر سے معاشرتی ساختیات کی بنیاد بھی تھی لیکن مرڈوک اس کو رد کرتا ہے کیونکہ کوئی بھی اس کو سکونی مظہر نہیں کہتا۔ ساختیات کا لفظ سب سے پہلے مرڈوک نے استعمال کیا۔ اس لفظ سے تشکیلی معنویت کی بو آتی ہے کیونکہ معاشرہ مختلف خود مختار رویوں سے تشکیل پاتا ہے۔ اس میں نامیاتی نمونے بھی دکھائی دیتے ہیں جبکہ انگلستانی ساختیاتی مکتبہ فکر کے سب سے ممتاز نمائندے ریڈ کلف براؤن کے نظریے کے تحت معاشرے کو حاضر نامیات اور میکانیت کے مقابل کہا جا سکتا ہے کیونکہ معاشرے کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت وسیع شے یا معروض (Object) نہیں ہوتا جو کچھ تخلیق کر سکے لیکن یہ ساختیات کا مطالعہ ہے اور آزاد ہوتا ہے اور اس نظام کے اجزاء سے بحث کرتا ہے اور کسی نہ کسی سطح پر وظائف کو سمجھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ یہ اجزاء دوسرے نظام کے کارمنصبی کا کلی طور پر احاطہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے باہمی تعلق پر نظر رکھتے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں ریڈ کلف براؤن نے ہیئت پسندی کا بشریاتی مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں اپنی کتاب Nature Science of Society لکھی۔ ۱۹۳۶ء میں بیٹسن (Bateson) نے میلنووسکی اور بینڈک کی تحریروں کا ثقافتی تجزیہ کیا تو دوسری طرف اس نے ریڈ کلف کے ساختیاتی نقطہ نظر کی تائید بھی کی۔

ریڈ کلف کے ساختیاتی نقطۂ نظر کو گہرائی سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنا تصور میلونووسکی کے ثقافتی تصور کے ردِ عمل کے طور پر پیش کیا۔ وہ تاحیات معاشرتی نظام کی تصوراتی عمومیت کے پہلوؤں کو تلاش کرتا رہا۔

انگلستان میں ریمن فرتھ اور آئی اے رچرڈز نے وظائفی نظریے کی بابت اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے میلونووسکی سے اپنی الگ راہ نکالی اور ریڈ کلف کے نظریہ کو کلی طور پر مسترد کر دیا جس کے تحت ریڈ کلف نے ایک صوری ساختیات کا نظریہ پیش کیا تھا۔

انگلستانی مکتبہ فکر کے علاوہ جرمنی کے عمرانیات دان ماکس ویبر (Weber) (۱۹۲۰ء - ۱۹۶۴ء) نے درکھائم کے نظری ڈھانچے سے استفادہ حاصل کیا۔ لنٹن (Linston) وہ پہلا بشریاتی لکھنے والا ہے جس نے ویبر کے تصورات، کردار اور رتبے کا مطالعہ کیا۔ لنٹن ریڈ کلف سے بہت متاثر تھا۔ نیڈل (Nadel) نے ۱۹۵۷ء میں ویبرین نظریات کے بشریاتی

مطالعے کی بنیاد رکھی۔ نیڈل نے The Theory of Social Structure نامی کتاب لکھ کر انگلستانی ساختیات کو نئے فکری رویوں سے سیراب کیا جس میں ویبر کے تصورات آئیڈیل ٹائپ، نوکر شاہی، روحانی قیادت، کو پرانکلو گروپ کو سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

بشریاتی اور عمرانیاتی علوم نے ساختیات اور اس کے وظائف پر شروع سے ہی اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ ادھر لسانیات کا میدان بھی کسی طور پر پیچھے نہیں رہا کیونکہ تحریری ساختیے میں جہاں کئی لسانی ارکان اسم، فعل، مفعول وغیرہ کلی ڈھانچے کی تشکیل کرتے نظر آئیں گے تو دوسری جانب تحریر کا غیر صوری حصہ بھی ہوگا جس میں لسانیات یا صوتیات کا وجود ہوتے ہوئے بھی ان کے اجزاء ایک دوسرے سے منسلک نہیں ہوتے۔ ایک ہی تخلیق میں ہزار ہا معنی نکل سکتے ہیں۔ یعنی بعض دفعہ ایک ہی شعر میں معنویت کی کئی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جہاں صوتیات، آہنگ، قواعد، مواد، معاشرتی اور سیاسی رمزیات اور لسانی امتیاز ایک ہی شعر میں نت نئے مفاہیم کے دروازے کھولتا ہے۔ جس طرح ملٹن کی گم گشتہ جنت میں فرشتوں کی بغاوت، فرشتوں کا زوال اور آدم و حوا کی بابت بہت سی باتیں غیر صوری تعلق کی غمازی کرتی ہیں مراد یہ ہے کہ ہر تخلیق میں پیاز کے چھلکے کی طرح معنی کھلتے رہتے ہیں۔

ساختیات لسانی اور ادبی سطح پر بیسویں صدی کا ایک ایسا علمی اور فکری طریقۂ تجزیہ نگاری ہے جس میں جزوی اور کلی سطح پر ادبی و لسانی حرکیات کے وظائفی تعلقات کو بنیاد بناتے ہوئے ایک مخصوص نظام کو مدِ نظر رکھ کر ثقافتی معمولات، اقدار، رسم و رواج، علائم، کہانیوں وغیرہ کے ادبی متن پر بحث کی جاتی ہے۔

فرڈیننڈ ساسر (۱۹۱۳ء-۱۸۵۷ء) جنھیں جدید لسانیات کا بانی بھی کہا جاتا ہے، انھوں نے اپنے مطالعہ لسانیات Philology میں لسانی تصورات کا خلاصہ پیش کیا۔ ان کے یہ افکار ۱۹۱۶ء میں ان کی موت کے بعد سامنے آئے۔ جب ساسر کے شاگردوں نے ان کے لیکچرز اور مضامین کو A Course in General Linguistics نامی کتاب میں محفوظ کیا، جو جدید لسانیات کے ساختیاتی مطالعہ کا سب سے اہم موضوع بن گئی۔ ساسر غالباً پہلے لسانی عالم ہیں جنھوں نے لسانی ساختیات کے نئے اصول وضع کیے۔ خاص طور پر ان کی نشانیات (Semiology) کی وضع کردہ اصطلاح کو بہت شہرت ملی جو دراصل اشاروں کی سائنس ہے۔ نشانیات ساختیات کے

لسانی طریق کار کو وضع کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے اور لسانی مطالعے کو مزید ٹھوس اور سائنسی مزاج بھی دیتی ہے۔ ساسر نے بیسویں صدی کے شروع میں ہی زبان کی اجتماعی اور معاشرتی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے زبان کے سماجی ڈھانچے سے بحث کی نہ کہ فردی بولیوں اور انداز بیان سے۔ غالباً ساسر ہی زبان کے قواعد کا بانی بھی ہے۔ وہ لسانی ڈھانچے کی بات ضرور کرتا ہے نہ کہ معنیات کی۔ وہ بولیوں کے مقابلے میں زبان کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ساسر زبان کی گہرائی میں اتر لاکر شعوری سطح پر زبان کی وظائفی وسعتوں کا بھی سراغ لگاتا ہے۔ لہٰذا اس کے اس لسانی ماڈل کو تاریخی ماڈل نہیں کہا جا سکتا۔ (ساختیاتی اصطلاح میں Synchronic کا وجود ہوتا ہے جبکہ Diachronic کا وجود نہیں ہوتا) ساسر نے انفرادی تکلم (پیرول یعنی فرد جو زبان تخلیق کرتا ہے) اور عام بول چال میں استعمال کرتا ہے اور زبان Langue کو ایک نظام کا حصہ بتایا۔ کیونکہ ساختیاتی ماہر عنصر کے نظام پر زور دیتے ہیں۔ مثلاً ساسر قدر (Value) کے لفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ قدر کا لفظ زبان ہے جو عام تصورات کی محدودیت کی دوسری وسعت ہے۔ قدر کا ہم معنی لفظ ڈر یا اندیشہ (Fear) دہشت (Dread) اور ڈر (Fear) ہیں جو اس کے باہمی اختلاف سے معنی تعین کرتے ہیں۔

لیکن اس میدان میں مزید ارتقا ساختیات کی صورت میں سامنے آیا۔ صوتیات کو امریکہ اور یورپ میں انفرادی تکلم (parole) کے اصولوں پر جانچنے کی بھی کوشش کی گئی، جو نہایت ہی وضاحت کے ساتھ زبان کی ادائیگی اور صوتیات کا تجزیہ کرتے ہیں اور Langue کی سطح پر ان سوالات کے جوابات حاصل کیے گئے جو صوتیات، آواز کے زیر و بم کے وظائف سے مبرا تھے، ساتھ ہی لفظ اور معنی کے درمیان جو فاصلہ تھا اس کو بھی پاٹنے کی کوشش کی گئی۔ ساسر نے اس نظریے سے بھی انکار کیا کہ زبان ایسے الفاظ کا دوسرا نام ہے جس سے اشیاء کے نام تجویز کیے جاتے ہیں یعنی اشیاء اور مظہر میں کسی قسم کا تعلق یا رابطہ نہیں۔ خاص کر انفرادی تکلم کی نوعیت کچی اور ناپختہ ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی ابلاغ کا عمل جاری رہتا ہے کیونکہ معاشرتی ماحول سے پیدا ہونے والا شعور تکلم زبان میں مکمل طور پر ذہنی تصورات سے فیض حاصل کرتا ہے۔ ساسر کے امریکی ہم عصر چارلس سینڈرز پرس نے اسی قسم کا تصور دیا جسے اس نے Semiotic کا نام دیا۔

بشریاتی مطالعوں نے اساطیری بحث کو بھی رواج دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی ماہر بشریات کلاڈ لیوی اسٹروس نے سا سیر کے نظریات پر نظر ڈالتے ہوئے لسانی ساختیات کے نئے اصول ترتیب دیئے۔ ساتھ ہی اسٹروس نے سالویک ماہر لسانیات این ایس ٹروب ڈیکسی اور رومن جیکب سن سے بھی استفادہ حاصل کیا۔

اسٹروس نے ساختیات کے چار اصول یا طریق کار وضع کئے:

۱۔ ساختیات لاشعوری سطح پر ثقافتی مظاہر کے ذیلی ساختیے کا تجزیہ کرتی ہے۔

۲۔ اس حوالے سے ذیلی ساختیے کے عناصر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں لیکن ان کے روابط آزاد موضوعات میں شمار نہیں کئے جاتے۔

۳۔ یہ عناصر نظام میں مجرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔

۴۔ یہ عناصر فطری ہوتے ہیں جن کو بین السطور کے تنظیمی نمونوں کا نام بھی دیا گیا ہے۔

انسانی، ادبی مطالعہ میں ساختیات زیادہ بیانیہ روداد نگاری (Narratology) کے میدان میں زیادہ سرگرم عمل ہے جو بیانیہ کی نفسیاتی عناصر سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں مسودے کی حیثیت نہیں ہوتی۔ زبانی روایتی اور اساطیری کہانیوں سے لے کر ہیرو کی شخصیات کے روایتی ناٹکوں پر نظر ڈالنے کے علاوہ ان کے وظائف اور کیفیات سے بھی بحث کی جاتی ہے۔

۱۹۶۰ء میں فرانسیسی نقاد رونالڈ بارتھ نے اس موضوع پر کام کیا اور ۱۹۶۰ء کے بعد یہی فرانسیسی روایت امریکہ کی لسانی اور ادبی تنقید کا بھی حصہ بنی۔

ساختیات کی قدر ساختیے کی ظاہری سطح سے بھی بحث کرتی ہے۔ اس بحث میں مارکس اور فرائڈ بھی آتے ہیں جس میں فرد کے شعور کے شخصی نظام، ذہنی کیفیات، معاشرتی وجود اور لسانی تجربات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ساختیات کا مطالعہ غیر انسانی ہے۔

۱۹۶۱ء میں اسٹروس نے نشانیات کے علم کی حدود میں رہ کر ساختیاتی بشریات کے علم میں نئی راہیں کھولتے ہوئے نشانیات کے علم کو نئے فکری نظام سے متعارف کروایا اور کوڈ اور لسانی کنونشن کا مطالعہ کرتے ہوئے انسانی اور حیوانی لسانی "اظہار" کو نئے معنی دیئے۔ انھوں نے لوک بیانیہ کہانیوں میں نئے صوتیاتی نظام کا بھی انکشاف کیا۔ دراصل نشانیات بھی اسٹروس کے یہاں ساختیات کا مرکزی تصور ہے۔ اسی نئے وصف کو چھٹی دہائی میں بین الاقوامی نشانیات

کے مطالعے نے قبول کیا۔

تاحال ساختیات کے طریق کار اور اس کے اصول دن بہ دن نشانیات کے علم میں نئی وسعتیں پیدا کر رہے ہیں جس سے فرانس اور خاص کر امریکہ کے فکری حلقوں میں تنقیدی میدان میں نیا ردعمل دیکھنے میں آ رہا ہے۔ جہاں Antithetical اور Schismatic منصوبوں پر کام ہو رہا ہے، خاص کر Gilles Deleuze کا Schizonalysis دریدا کا ردتشکیل (Deconsturction) مائیکل فوکو کا اضاف (Geneology) اور جولیا کریسٹوا (Julia Kristeva) کے فکری تصور Semanlysis کی مغرب میں بڑی دھوم ہے ساختیات کے ان نئے فکری نظاموں نے امریکہ میں پس ساختیات (Post Structuralism) کو پروان چڑھایا۔

انیسویں صدی کے آخری حصے میں اور بیسویں صدی کے شروع کی دہائی میں فکر و آگہی کا انتشار اور فرد کی علیحدگی کا بھیانک منظر نامہ سامنے آیا جو غالباً تراکیب کی تخصیص کی وجہ سے پیدا ہوا، خاص طور پر فلسفہ، جو انسانی سائنس کی ملکہ کہی جاتی تھی، اس نے نئے فکری الجھاؤ، مغالطے اور پیچیدگیاں پیدا کرنے کے علاوہ فرد کی عظمت کا نعرہ لگاتے ہوئے اس کو محدود سے محدود تر کر دیا۔ چاہے وہ وٹگنسٹائن کا لسانی فلسفہ ہو یا وجودی یا لایعنی فکر یا نوآبادیات میں بسنے والے فلسفی کا خواب، یا اس کی ذلت آمیز پسپائی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ساختیات نے چھٹی دہائی میں وجودیت کے شعلوں کو سرد کر کے رکھ دیا جو بقول بعض ساختیوں کے غیر منظم اور بے ہنگم فلسفیانہ اور فنکارانہ رویہ تھا۔ لسانی فلسفوں نے لسانی دنیا سے آگے اور پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ وجودی فرد کی بیگانگی کی بات کرتے تھے یہ بیگانگی معروض کے علاوہ فرد سے انسان کے تعلق منقطع ہو جانے پر اصرار کر رہی تھی اور لایعنی صورت حال کے وجود کا بھی اس زمانے میں ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ رسل کی منطق سے لے کر سارتر کی "متلی" تک فکر انتشار کے سائے میں دیکھی گئیں۔ اسی زمانے میں جارج لوکاس نے روایتی انسان دوستی کی بات کی۔

ساختیات نے اس بات کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا کہ وجودی اور لایعنی فکر میں ثقافت اور تہذیب نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ساختیات نے علم و ادب کو نئی فکری تہذیب سے ہی روشناس نہیں کروایا بلکہ فرد کو تہذیبی اور بشریاتی حوالے سے اپنے بارے میں سوچنا بھی سکھایا بلکہ ماحولیاتی ادراک کا ایک ایسا شعور بخشا جس میں فرد نہایت ہی منظم ہو کر سائنسی بنیادوں پر اپنے

ماحول کے احوال کی آگہی حاصل کرنے لگا۔ اس مرحلے پر ساختیات تین بنیادی عوامل کا احاطہ کرتی تھی۔

۱۔ بیسویں صدی کی عمومی دانشورانہ طرز جو ادبی اور لسانی کاوشوں کی واضح تصویر پیش کرتی ہے۔

۲۔ ادبی نظریہ کے تحت ساختیات جدید عہد کی ادبی نوعیتوں اور اس کے مزاج کو ارتقائی شکل دیتی ہے۔

۳۔ ۱۹۶۰ء میں ساختیات نے ادبی نتائجیت کو نیا دانشورانہ مزاج دیا جو اس سے قبل بے سمتی کا شکار تھا۔

ساتھ ہی ساختیات کے مطالعے میں دو بنیادی نوعیتوں کے پوشیدہ نکات بھی تھے۔ یہ نکات خاصے سنجیدہ تھے کیونکہ انسانی فکر اپنے ماحول سے کٹ گئی تھی۔ اس علیحدگی کے احساس نے ان نکات کو فکری صورت میں ابھارا۔

۱۔ معاشرتی اور ماحولیاتی مظاہر اس تصور کا جوہر نہیں ہیں لیکن یہ ساختیات کے باطنی ڈھانچے کو بیان ضرور کرتے ہیں۔ (بکھرے ہوئے اجزاء کو جوڑ کر نئے تلازمے یا نئے انسلاکات وضع کرتے ہیں) یوں ساختیات معاشرتی اور ثقافتی تصورات کو نئی معنویت سے روشناس کرواتی ہے۔

۲۔ معاشرتی اور ماحولیاتی مظاہر نہ صرف معروضی حقائق اور واقعات ہیں بلکہ یہ مطالعوں کے نئے اشاروں اور ان کی نئی تفہیم میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساختیات قاری کو قاری ہی تصور کرتی ہے کیونکہ قاری مصنف نہیں ہوتا اور وہ کسی تحریر یا تخلیق میں سے اپنی ذہنی استعداد اور بلوغت سے ہی معنی نکالتا ہے۔

دوسری طرف یہ بھی کہا گیا کہ ساختیات غیر انسانی فکری نظام ہے جو اپنی وضع کردہ سچائی کو ناپتا اور تولتا ہے، خاص کر ادب و زبان کے نئے اوصاف کو اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر جانچتا ہے جس میں عموماً اچھے خاصے بھاری بھرکم کردار اور تصورات کو دو چار لفظوں میں ختم کر دیا جاتا ہے اور کسی ادبی تخلیق کو ثقافتی اور معاشرتی احوال میں جانچا جاتا ہے۔ یوں تحریر پر ساختیاتی نقاد کی گرفت کمزور ہو جاتی ہے۔ رابرٹ موزیل کی تحریر The Man Without

Qualities اور کافکا کی تحریریں اس ضمن میں آسکتی ہیں۔ اسی لئے اور یگاوائی گیٹ کا کہنا ہے کہ "ساختیات فن کا انسانی زوال ہے۔" یوں تجریدیت کی پیچیدہ ترین راہیں سامنے آتی ہیں، فنکارانہ اور تخلیقی عمل کا بڑے ہی بیہودہ انداز میں استحصال کیا جاتا ہے۔ انسانی ذہن کی اصل فکر کو بھی ساختیات اس طور پر تباہ و برباد کرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زور معروض کے تجربے پر دیتی ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ایک رسمی تصور دلچسپی کا سبب بن جاتا ہے۔ یوں ساختیاتی نقاد اپنے "تشکیکی ذہن" سے کسی تحریر یا تخلیق کے مکمل متن سے بے وفائی کرتے ہیں اور کسی تخلیق کا رنگ و روپ اور اس کے وجود کو اصل میں پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ میلارمے کا بیان ہے کہ "دنیا کا وجود تصنیف کا عروج ہے۔" میلارمے کا یہ انتہا پسندانہ بیان ایک طرف تو چونکا دیتا ہے تو دوسری طرف یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ فن کا مقصد معروض کو پیش کرنا نہیں ہے بلکہ اصلی فن پاروں کی تخلیق ہے۔ ادب کی زندگی میں تصوریت کا اپنا مقام ہے جو دنیا کے طریق کار کو مربوط شکل میں پیش کرتی ہے۔ یہیں سے ساختیات کے لسانی پہلوؤں کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اس مرحلے پر ساختیات ادب کی ریڈیکل جدیدیت کے متن کا انکشاف کرتی ہے جیسا کہ ہمیں جوائس، لوتھر، ماؤنٹ، روسل اور ملارمے کے یہاں نظر آتا ہے، جو ادبی کائنات میں لسانی حوالے سے ایک فکری تنظیم کا سبب بنتا ہے یوں تخلیقی تجربہ مقامیت کی حدود توڑ کر ثقافتی اور لسانی دائروں سے نکل کر ہر سو پھیل جاتا ہے۔

ساختیات کا جداگانہ مزاج ہے جو بعض دفعہ پڑھنے والے کو غیر متوقع باتوں سے بھی چونکا دیتا ہے اور بعض دفعہ غیر اہم باتوں کو اتنا اہم بنا دیتا ہے کہ مغالطے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے تخلیقی نمونے بیسویں صدی کے اولین دور سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خاص طور پر اندرے ژید کا شعور ذات سے لبریز ڈرامہ Counterfeiters ہے، اس کی دوسری مثال جوائس کی Ulysses ہے لوئی خورخے بورخیس کا تقریباً تمام کا تمام تخلیقی عمل بھی انہیں رویوں سے بھرا پڑا ہے۔ ادیب کا کام روایت کو توڑ کر فکری طریقہ کار کی نئی تشکیلیت کی تخلیق ہوتی ہے اور یہی تشکیل نو ساختیات میں کسی حد تک تخلیقی رجحان کو نئے شعور کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

جیسا کہ ہم اس بات سے آگاہ ہیں کہ جدید ساختیات پر ثقافتی بشریات کا گہرا اثر ہے اس لئے یہ قیاس عام ہے کہ ساختیاتی مطالعے "لوک آتما" لئے ہوتے ہیں۔ ساختیات کا فرانسیسی

کتب تاریخی تنقید اور سوانحی تنقید کا کھلا لیکن کسی حد تک جارحانہ رد عمل تھا۔ جس پر فرانسیسی جامعات کی تدریسی تنقید کا گہرا اثر تھا۔ نئی اینگلو امریکن تنقید کا سہارا لے کر ساختیات وایس متن کی تنقید پر حاوی ہو گی، ساتھ ہی ساختیات نے اپنی نوخیزی میں اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ طریقہ کار کے ڈھانچے کو اپنائے بغیر ہم کسی ساختیات کے نظریے کو نہ فروغ دے سکتے ہیں اور نہ اس کی اپنی شناخت ممکن ہو سکتی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ تحریر کے متن کا اپنے حوالے سے مطالعہ کیا گیا، اپنی ہی وضع کردہ اصطلاحوں سے اسے معنویت کا لباس پہنایا جانے لگا۔ انہیں باتوں کو دیکھ کر رولان بارتھ نے ساختیاتی تنقید کے درمیان خط کھینچتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ "تنقیدی متن کے سیاق میں جو بھی معنویت ہوتی ہے وہ ادب کی سائنس ہے یا یہ شاعرانہ سیاق صورت ہو گی۔" رسمی ساختیہ ہی متن کی حدود کو متعین اور منظم کرتا ہے۔ ادبی تخلیقات لسانی صورت میں ہی شناخت کی جا سکتی ہے اور زبان سے کسی تخلیق کا فکری یا جمالیاتی نظام کی تشکیل ممکن ہوتی ہے اور فکری نتائج کا ظہور ہوتا ہے۔

ادب کا پہلا اصول یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نشانیات کا نظام ہے۔ جملے اور فقرے بذات خود نشانیات کا نظام ہیں۔ اگر ہم روایتی ادبی ذہن سے سوچیں تو یہ تعریف ہمیں عجیب سی اور مروجہ تعریفوں سے مختلف لگے گی۔ ساختیات تخلیق یا تحریر کو "معنی" سے "معنی نما" بنا کر نئے رنگ و روپ میں بیان کرتی ہے۔ ادھر ثقافت اس بات پر زور دیتی ہے کہ "نشان" کو فطری مظہر کے طور پر سوچا اور سمجھا جائے یوں ساختیات میں جب "معنی نما" اور "تصور نما" کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کسی خاص ادبی حدود اور ثقافتی ماحول میں رہ کر کوئی تخلیقی عنصر پیدا کیا جائے۔

ساختیات ثقافتی نظام کی تفہیم بھی کرتی ہے جو تخلیقی تحریروں کے پس منظر میں رواں دواں ہوتی ہے۔ فرد یہ جانتا ہے کہ ماحول اور ثقافت میں کئی مصنوعی نمونے، مزاج اور رویے سرگرم عمل ہیں، ان کا سراغ لگاتا ہے اور اسی جستجو کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روایت کو کھنگالتے ہوئے تحریر میں کئی نئے مزاجوں کا انکشاف ہوتا ہے، نئی تخلیقی معنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر متن کے مطالعے کے دوران بہت سے نئے کوڈ سامنے آتے ہیں جو فرد کے رویوں کی مختلف جہتوں کو ابھارنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً فرد اور معاشرے کے رشتے، شخصیت اور انحراف کی

صورتیں، عمل اور محرکات کا تعلق اور کئی علامتی رویوں میں اپنی جلوہ نمائی کرتے ہیں۔

خاص کر بیانیہ طریقہ کار میں متن کی حدود میں رہتے ہوئے منتشر منطقی خیالات کو ساختیات کا عمل اظہار کی معنویت کو گہرائی اور گیرائی دیتا ہے۔ یہ خالصتاً نتائجی تجربہ ہوتا ہے جو متن کے معروضی ڈھانچے سے متعلق ہونے کے علاوہ رویے کی نئی شناخت کا سبب بنتا ہے۔

یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ کوئی نقاد جب بھی کسی تخلیق یا تحریر کا ساختیاتی مطالعہ کرتا ہے تو دوران مطالعہ بہت زیادہ ساختیاتی عنصر کو تحریر میں لانے سے معذور رہتا ہے۔ یہ بات بہت مثبت ساختیاتی قدر ہے اور نہ مثبت معنوی صورت۔ لیکن یہ دشوار اور خاص کٹھن مرحلہ بھی ہوتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ساختیاتی نقاد ادب پارے کو "تصور" کا رنگ دے دیتے ہیں۔ "معنی" یا "معنی نما" کے طور پر بھی اس کی گرہیں کھول دیتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ "نشانیات" کے لئے یہ بہت قابل تو نہیں ہوتا کیونکہ ہیئت تحریر کی معنویت کی صحت (درستگی) کرتی ہے جو کہ پھسپھسے اور بے جان نشان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور یہ مسئلہ بھی پریشان کر دیتا ہے کہ کبھی تو اس کے کئی معنی نکلتے ہیں اور کبھی یہ عمل بھی کوئی معنی پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ یعنی ایسی فطری میکانیکی کا انکشاف ہوتا ہے، جس سے نقاد آخر تک آگاہ نہیں ہوتا۔

ساختیات ہمیشہ ان مستثنیات سے بحث کرتی ہے جو قابل مطالعہ ہوں جہاں نشانیات، ضابطہ، اساطیر، رمزیات، علامتیں ساختیاتی تجزیہ نگاری میں خاصی معاون ثابت ہوتی ہیں اور انسانی حس ہی تجربے کے حوالے سے ساختیات کے متن کو تشکیل دیتی ہے۔

جدید فرانسیسی ادبی تاریخ میں ایلن روبی ژالیڈ نے ساختیات کو قدرے نئی صورت میں بیان کیا۔ ان کے ناول میں پرانے تصورات، کردار، پلاٹ اور موضوع ایک للکار کی صورت میں سامنے آئے ہیں اس کے علاوہ کلوریل سسین، مچل بوٹل، فلپ سولر اور ژان رچاڑد کی تحریریں ناول اور تنقید نگاری کے بین بین نظر آتی ہیں، جس میں متن نگاری بہت ہے بر ساختیاتی نظریے کے نمونے سے مشابہ ہیں۔ جدید فرانسیسی ساختیاتی فکشن میں اسٹین ہیٹ کی کتاب The Noucean Roman ہے جو اپنے طور پر خاصی متنازعہ بھی ہے۔ ادھر امریکی ناول نگاروں میں جان برتھ، جان شیور اور کرٹ وانی گٹ جونیر کو نقاد ساختیاتی ناول کہتے

ہیں۔اس کے علاوہ جان فاول کی کتاب The French Lieuteant Woman کو بھی ساختیاتی تجزیہ کیا گیا لیکن اس کتاب کے لئے یہ بات ذرا مشکل ہی سے کہی جاسکتی ہے کہ اس پر ساختیاتی اثرات ہیں۔ خاص طور پر ۱۹۷۳ء کے بعد فرانس میں ساختیات نے خاصی ریڈیکل صورت اختیار کرلی تھی۔ جبکہ امریکہ میں ایک تجزیاتی حوالے کے طور پر استعمال ہوتی رہی اور یہ ''پیانے'' ہی جدید حسیت کے ردّعمل بنے رہے۔

جب اس صدی کی چالیسویں دہائی میں ''ساختیات'' کی اصطلاح عمومی طور پر لسانیات، نفسیات، ثقافتی بشریات اور عمرانیات علوم میں استعمال ہونا شروع ہوئی تو یہ اصطلاح کوئی فکری عقیدہ نہ بن سکی اور نہ ہی اس نے اپنے آپ کو کوئی مکتبہ (School) قرار دیا حالانکہ اس کے اطلاقی پہلوؤں اور ضوابط میں ہمیشہ تضاد پایا گیا۔ خاص طور پر اس قسم کے تضادات اور اختلافات امریکی ماہر ساختیات اور یورپی ساختیات دانوں کے درمیان وجہ نزاع بھی رہی (یہ صورتحال آج بھی موجود ہے) عموماً یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ ساختیات جامعات میں کی جانے والی تدریسی تحقیق ہے جو معروضی تفتیش کا مطالعہ ایک باضابطہ نظام کے تحت کرتی ہے کیونکہ نظام (System) اشیاء کے اجزاء کا ایک دوسرے سے منسلک ہونے کا دوسرا نام ہے یا یوں کہہ لیں کہ یہ اولین صورتحال یا تعلق عناصر کا باضابطہ تجریری نظام ہوتا ہے۔

رومن جیکب سن (۱۹۷۱ء) نے صوتیات کے نظام اور اس سے متعلق دیگر پہلوؤں کو ارتقائی شکل دی۔ انھوں نے فرد کی فطری لسانی تربیت سے بھی بحث کی اور اس سلسلے میں بارہ بڑے اختلافات کی نشاندہی کی۔ انھوں نے Non Vovalic, Vocals Verus, Voiced Verus, Abrupt Versus Continuant Voiceless وغیرہ کے نام گنوائے ہیں۔ جیکب سن کا صوتیات کو بیان کرنے کا یہ انداز خالصتاً ساختیاتی ہے۔ جیسا کہ ہر نظام میں ''عنصر'' ہوتا ہے جو ان دونوں کو امتیازی طور پر اور جداگانہ انداز بخشتا ہے۔ ان مخصوص حالات میں سارا مسئلہ بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے جس میں اختلاف کے اظہار کا دوہرا نظام پایا جاتا ہے جس کو اسٹروس نے نہایت ہی ذہانت سے سمجھنے کی کوشش کی۔ شاید اسٹروس ہی وہ پہلے ماہر بشریات ہیں جنھوں نے اس کے آفاقی اطلاق کو زبان کے لفظ کی صورت میں بیان کیا۔

ثقافتی حوالے سے ساختیاتی لسانیت میں ''ترتیب وروایت'' اور ''نتائجی روابط'' کو بھی

محسوس کیا گیا کیونکہ کسی جملے کو بناتے ہوئے یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ یہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح جڑے ہوئے الفاظ کا سلسلہ ہے۔ اسٹروس نے لسانیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اساطیر کا بھی تجزیہ کیا کیونکہ بیانیہ واقعات اپنے آپ میں ترتیب وار زنجیر کی طرح ہوتے ہیں جن کو نتائجی روابط اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مظاہر کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے۔ درکھائم کی ساختیاتی فکر بھی سارتر کی فکر سے کسی طور پر علیحدہ نہیں ہے۔ درکھائم جدید عمرانیات کے بانیوں میں گنے جاتے ہیں۔ خاص کر بشریاتی ساختیات کے حوالے سے درکھائم اور مارسل موس کی مشترکہ تحریر De quelques Formmes Primitives De la classification (۱۹۰۳ء) عصری نفسیات اور فرد کی ذہنی نتائجیت کے بارے میں لکھی گئی ہے جس میں بڑی ہی منطقی بحث پڑھنے کو ملتی ہے جو مغربی معاشرے کے پس منظر میں ہے۔ اس میں ٹوٹمک معاشرے کا بھی ذکر ہے جہاں قبائلی معاشرتی وظائف اور افراد کے معاشرتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔

ادب کے مارکسی اور انگلستانی مکتبہ فکر، دونوں ہی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب معاشرے کے لئے لکھا جاتا ہے، سماجی آگہی ہی ادب کا مقصد ومنشا ہے۔ ساختیات نے اس خیال پر بڑے سخت ردّعمل کا اظہار کیا ہے کیونکہ ساختیات میں متن کی باطنی صفات پر بحث کی جاتی ہے اور یہ خیال بھی بہت واضح تھا کہ ادب پورے معاشرے کے متعلق کوئی بات حتمی طور پر کہنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے۔ ساختیات کے فکری اور دانشورانہ ماخذات کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ یہ بہت ہی الجھا ہوا مسئلہ بھی ہے کیونکہ ساختیات ماسکو، پراگ، کوپن ہیگن اور پیرس کے یکسر مختلف دانشورانہ ماحول میں پروان چڑھی۔ جیسا کہ ہم سب کے علم میں یہ بات ہے کہ اگر صرف ''صوتیات'' کی اصطلاح کو ہی اٹھا کر مختلف ماحول سے اٹھنے والی ساختیاتی فکر کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے تو یہ ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہوگا۔ کچھ یہی حال فرانسیسی بشریات اور امریکی Syntastical کی لسانیات کا ہے۔

اس سلسلے میں جاناتھن کلر کی کتاب Structuralist poetics خاصی اہم ہے جس میں ساختیات کے متعلقات اور پیچیدگیوں پر بحث کی گئی ہے کیونکہ ادب کی اپنی شناخت ہوتی ہے نہ کہ محض عمرانیات یا بشریات —— لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشرے سے ادب کا تعلق تو ہوتا

ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک "ساختیاتی تنقید" معاشرے سے "آزاد" ہوتی ہے۔ معاشرتی اثرات اس تنقید میں آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔

بیسویں صدی میں جب لسانیات کا دروازہ کھلا تو یہ کہا جانے لگا کہ یہ دراصل اٹھارہویں صدی کی لسانیات کا تسلسل بھی ہے۔ اس دور میں امریکہ اور یورپ میں اپنے اپنے انداز سے ساختیاتی لسانیات پر فکری مباحث شروع ہوئے۔ خاص طور پر یورپ میں تقابلی فلسفے کی مدد سے تحریری دستاویزات کا مطالعہ کیا گیا۔ اس زمانے میں اہل علم نے تاریخی تجزیے کو بنیاد بناتے ہوئے لسانیات اور ساختیات پر اظہار خیال کیا۔ اس زمانے میں زیادہ زور عصری لسانیات اور اس کی ساخت پر دیا گیا جس میں جنیوا کا لسانی مکتب پیش پیش رہا۔

امریکہ میں لسانی ساختیات پر کچھ ماہر بشریات نے کام شروع کرتے ہوئے قدیم امریکی شہروں کی ثقافت، زبان، علائم وغیرہ پر تحقیق کی۔ اس سلسلے میں ان عالموں کو اس لئے مشکل کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کی زبان کا کوئی تحریری یا مسوداتی، دستاویزاتی ثبوت نہ تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ زبان ختم ہو جاتی یا یورپی زبانوں کے امریکہ میں رائج ہو جانے سے گم گشتہ زبان کی صورت میں کہانی بن جاتی امریکی لسانی عالم فرنس باس (Franz Boss, 1858-1942) نے Hand Book of American Indian Languages نامی کتاب لکھی۔ اس کتاب کے شائع ہونے کے کوئی پندرہ سال بعد ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir, 1884-1939) نے اپنی مشہور کتاب Language لکھی۔ ان دونوں کتابوں نے امریکہ میں لسانی فکر کا انداز ہی بدل کر رکھ دیا۔

امریکہ اور یورپ کے مکاتب فکر نے مل کر لسانیات کی ساخت کو نئے چلن سے آشنا کیا۔ خاص کر سا سر کے لسانی افکار نے اہل علم کو لسانیات کے موضوع پر از سر نو سوچنے کی دعوت دی۔ اس سلسلے میں فرانس، چیکوسلواکیہ، سوئزرلینڈ، ڈنمارک میں خاصی سرگرمی بھی دیکھنے میں آئی۔ (خاص طور پر پراگ کا لسانی حلقہ جو ۱۹۲۶ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس حلقے نے بہت شہرت حاصل کی) اس دور میں زبان کے طرز اور قواعد پر نہایت زوردار بحث بھی ہوئی۔ یہ بحث جو زبان کے حوالے سے شروع ہوئی تھی وہ سا سر کے اثرات کے تحت لسانی صوتیات، نشانیات اور لسانی ساختیات کی طرف مڑ گئی۔

امریکہ میں بولی جانے والی زبانوں پر بشریاتی انداز میں مطالعے شروع ہوئے۔ خاص کر

"متن" اور اس سے متعلق میدانوں کا نئے انداز سے تجزیہ کرنے کی ابتدا ہوئی۔ زبان کے نظریہ اور تجزیے پر ۱۹۳۳ء میں لیونر بلوم فیلڈ (Leonar Bloomfield - 1887-1949) نے کتاب "Language" لکھی۔ اس کتاب میں صوتیات، قواعد اور بیانیہ لسانی ساخت پر بڑی عالمانہ باتیں کی گئیں۔ اپنی اس تصنیف میں انھوں نے کئی نئی لسانی تکنیکوں کو اپناتے ہوئے جملوں کے ساختیاتی مظہر پر نگاہ ڈالی تو دوسری طرف کردار اور رویوں کے نقطہ نظر سے بھی زبان کو پرکھنے کی کوشش کی، ساتھ ہی قواعد اور ساختیاتی لسانیات کا فردیات کے حوالے سے بھی تجزیہ کیا گیا۔ غالباً اسی سبب سے بلوم فیلڈ کی اس کتاب کو "ساختیاتی" قرار دیا گیا۔ یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے لسانی عالم تھے جنھوں نے لسانی ساختیاتی مطالعے کو ایک نیا سائنسی انداز دیا۔

یہاں مختصراً اوتم نوم چامسکی (Avtam Noam Chomsky, 1928) کا حوالہ دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ۱۹۵۷ء میں Syntatics Structures لکھی، جس میں انھوں نے "افزائشی قواعد" (Generative Grammar) کا تصور دیا اور پچھلی دہائی میں ساختیات اور رویہ سازی پر جو کچھ کہا گیا اس کو یکسر رد کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ فرد کے ذہنی حقائق کو پہلے تسلیم کیا جائے کہ لوگ زبان کو کیوں استعمال کرتے ہیں اور زبان استعمال کرنے والوں کی کیا ذہنی سطح ہے؟ چامسکی کا یہ نظریہ آج بھی متنازعہ ہے۔

لسانی ساختیات کے مختلف زاویہ ہائے فکر ہیں جو ایک دوسرے سے بہت جداگانہ ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہیں۔ یہ تمام نکتہ ہائے نظر لسانیات کی ساختیاتی فکر کو رنگارنگی ہی نہیں بخشتے بلکہ سوچنے والے اس موضوع پر لاشعوری طور پر تقابلی انداز بھی اپنا لیتے ہیں:

۱۔ <u>وظائفی جملے:</u>

یہ انداز پراگ مکتب فکر کا ہے جس میں زبان کا اظہار اطلاعاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ انداز لسان آج بھی چیکوسلواکیہ اور مشرقی یورپ کے ممالک میں عام ہے، صوتیاتی اثرات ہر اس اہم جملے سے متعلق ہوتے ہیں جو حرکی کردار، لسانی ابلاغ میں ادا کرتے ہیں۔

۲۔ <u>انحصاری قواعد:</u>

یہ اصطلاح سب سے پہلے ۱۹۵۰ء میں فرانسیسی ماہر لسانیات لوسین ٹیسن نائیر (۱۹۵۴ء-

۱۸۹۳ء) نے بیان کی۔ ان کے خیال میں انحصاری قواعد صوری قواعد کی ایک شکل ہے۔ یہ قواعد عنصر اور تشکیل کے تعلق سے پروان چڑھتے ہیں۔

۳۔ Tagmemics

یہ نظریہ ۱۹۵۰ء میں ماہر لسانیات کے ایل پایک (Pike) (پ ۱۹۱۲ء) نے پیش کیا جس میں لسان کی ہیئت اور اس کے عملی محرکات پر زور دیا گیا اور Emic اکائیوں کے تضادات کو بیان کیا گیا جو عملی طور پر زبان میں تعمیری کردار ادا کرتے ہیں جو طبعی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں۔

۴۔ درجاتی قواعد:

یہ نظریہ سب سے پہلے ۱۹۶۰ء میں امریکی لسانی ماہر ایس ایم لیمب (Lamb) (ب ۱۹۲۹ء) نے دیا ان کے نقطۂ نظر سے زبان ایک نظام ہے جو ساختیے کی تہہ (پرت) سے جڑی ہوئی ہے۔

۵۔ ترتیب وار زبان:

۱۹۶۰ء میں انگلستان کے ماہر لسانیات ایم اے کے ہالی ڈے (Holiday) (پ ۱۹۲۵ء) نے کہا کہ قواعد میں نظاموں کا جال بچھا ہوا ہے جو نظام صوتیات سے منسلک ہوتے ہیں۔ یہ ترتیب کا نتائجی تجزیہ کرنے کے علاوہ اظہار کو معنویت کی نئی سمتوں سے آشنا کرتے ہیں۔

ان افکار کے علاوہ آسٹرین نژاد نظریہ دان لیو اسپٹزر (Leo Spitzer) (۱۸۸۷ء-۱۹۶۰ء) نے ساختیاتی لسان کے حوالے سے اسلوب کے خدوخال اور اس کے جمالیاتی ردعمل کے تعلق پر نگاہ ڈالی ان کا یہ مطالعہ ''لسانی دائرے'' (Philological Circle) کے نام سے مشہور رہا۔

ارادہ

شناختی خدوخال

نمونہ معنویت کی توثیق

خدوخال کا بیان اور تجزیہ
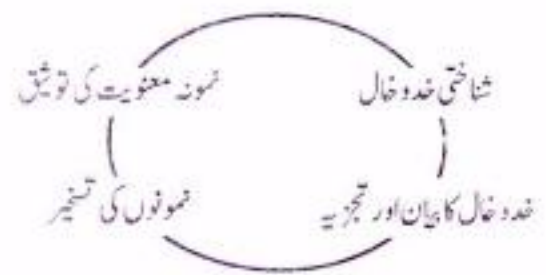
نمونوں کی تسخیر

اس خاکے کا آخری مرحلہ اصل ارادے کی توثیق ہے لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ کسی ادبی یا تخلیقی متن کے خدوخال کو پہلے شناخت کیا جائے کیونکہ یہی شناخت آگے چل کر

تجزیہ، نمونوں کی تسخیر اور توثیق کے عمل کو مکمل کرتی ہیں۔

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی ساختیات کی دنیا میں اس لئے اہم تھی کہ اس زمانے میں ساختیات کو نئے انداز سے سوچنے کی رسم شروع ہوئی خاص کر لسانی قواعد کے سلسلے میں نئے تجرباتی انداز کو اپنایا گیا اور ساختیات کی نشانیات کو نئی نظری بنیادیں فراہم کی گئیں جن میں چامسکی کا روایتی لسانی ساختیاتی قواعد پر شدید ردِ عمل بھی شامل تھا۔ اسی ردِ عمل نے ''افزائشی نظریے'' کی بنیاد رکھی۔ ''افزائشی نظریے'' کا شعور متن کے قواعدی نظام پر محیط ہوتا ہے جس کے آٹھ اہم پہلو ہیں:

۱۔ کیس گرامر:

یہ اصطلاح سب سے پہلی امریکی ماہر لسانیات چارلیس فلی مور (Charles Filimore, 1929) نے استعمال کی۔ اس لسانی نظریے میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ترتیب وار قوانین (حالتیں) جملوں یا فقروں کی ساخت میں بنیادی عنصر ہوتے ہیں۔

۲۔ تعلقی قواعد:

اس زاویہ نگاہ کے تحت قواعد کا تعلق (موضوعی یا معروضی دونوں ہی صورتوں میں) لسانیات کا بنیادی نکتہ ہے لیکن جملوں کی صوری درجہ بندی اصل میں بنیادی برقی نظریہ ہے جس میں اسم اور فعل کی بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔

۳۔ ایکس بار (X-Bar) کا نظریہ:

یہ نظریہ برقی قواعد میں مختلف نوعیتوں کی ساختیاتی راہیں نکالتا ہے اور قواعد کی ترتیب نو بھی کرتا ہے اور بار سسٹم کے نظام میں پائے جانے والے رمز اور اشاروں کو ایک دوسرے سے ممیز بھی کرتا ہے۔

۴۔ ماینٹگو قواعد:

اس قواعد کے اصول کی بنیاد امریکی ماہر منطق رچرڈ ماینٹگو (۱۹۳۰-۷۰ء) نے فراہم کی۔ انھوں نے زبان کی منطق کے قریبی روابط کو بیان کیا۔

۵۔ ساختیاتی قواعد کا مرحلہ تعمیم:

یہ نظریہ افزائشی نظریے کی تغیر پذیر فطرت (کردار) کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا

جب تک وہ قواعد کے تجزیے کے لئے ارتقائی ساخت پر زور نہ دے۔

۶۔ وظائفی قواعد:

قواعد کے مختلف زاویہ نگاہ اور خاص کر قواعد کی صوری حالت اور اس کے متبادل اپنے مزاج میں بیحد تجریدی ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ زبان کا نتائجی نظریہ بھی ہے اور دوسری طرف زبان کے معاشرتی بین العمل کے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور جملوں کے نتائج اور ترتیب وار مزاج کی ساخت کی نوعیت کو اُجاگر کرتا ہے۔

۷۔ حقیقت پسندانہ قواعد:

اس نظریے کے تحت قواعد کے تجزیے میں نفسیاتی حقائق اہم ہوتے ہیں۔ قواعد کے صوری نمونے نفسیاتی عوامل سے منسلک ہوتے ہیں اور لسانیات کے بین السطور میں رویے کا بھی اپنا ایک کردار ہوتا ہے جیسے ہم "یادوں" کو یا انسانی تعلقات کے ماحولیاتی رویوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۸۔ نیٹ ورک قواعد (Net Work Grammar):

اس قسم کے قواعد "تحقیقی" دنیا سے باہر پروان چڑھے اور مصنوعی دانش نے اس تصور کو آگے بڑھایا۔ تمام افراد جملوں کی زبان کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔

(کیمبرج انسائیکلوپیڈیا آف لنگویج، ڈیوٹ کرسٹل، ص ۲۰۹-۲۰۷)

"فکر، لفظ اور دستاویز" کے تحت گریگ واٹسن (Graig Watson) نے استغراق کا میدانی نظریہ پیش کیا (۱۹۸۰ء-۱۹۷۰ء)۔ اس نظریے کے تحت لفظ کا استغراق اور مظہر زبان کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ گریگ نے اپنے اس نظریے کو اس شکل میں پیش کیا:

قوت ادراک کا میدان

دائرہ

استغراق کی لہر —— لفظ —— اور —— مظہر

استغراق

تجربہ + معنی نما

معنی نما - تجربہ

اصل مختصر نام (دستخط)

ذات (سیاق)

نحو / فرہنگ —— طریق کار

میدان (زبان / معروض)

اس کے علاوہ گریگ نے لفظ کا بھی تجزیہ کیا، انھوں نے ذاتی نام کے علاوہ معنویت کے تصورات اور نشانیات کے ماحولیات سے تعلق کو زمان کے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کی کیونکہ لفظ کی قدر لفظ ہی ہوتا ہے۔ اصل میں اشیاء کی بحث ایک قسم کا "ویژن" ہوتا ہے۔

افزائشی طریقہ عمل

تجرباتی قدر —— زبان کی سطح / متن کی سطح

عملیات

اس نظریے کو آگے بڑھاتے ہوئے گریگ نے ذات اور متن کی تنظیم کا خاکہ بیان کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے اس خاکے میں نہ تفاصیل بیان کیں اور نہ تشریح کی ہے۔

ذخیرہ الفاظ (فرہنگ)

تخفیف

(تشکیل)

لہجہ / ہیئت

لہجہ / تعلق

ابتدائی تجربہ / متن

اجتماع / وسعت

تفہیماتی Hermeneutic (مظہر)

حیات، ابتدائی سرایت (تیز فہمی)

متن

اطلاعات

(میدان ادراک)———(تقریر یا خطبہ)

تنظیم

معنی خیز (حرکات)

خیالی خاکہ

زبان - تجربہ

ذات

عمل (Performance)

حکم امتناعی

(حوالہ: "لینگویج" جلد نمبر ۳، بروس اندوور اور چارلس بریسٹن، ۱۹۸۲ء)

زبان کی ساختیات کو زبان سے ہی بیان کیا جاتا ہے لیکن ساختیات زبان کے کوئی فرہنگ، نحو، قواعد اور کوڈ وغیرہ نہیں بناتی جن کو ہم تاریخی یا تصوراتی فریم میں سجا سکیں۔ زبان اور اس کے قواعد خالصتاً موضوعی نہیں ہوتے لیکن انسانی فکر اور رویے اس کی ساخت میں کبھی کبھار تغیر کا سبب بنتے ہیں۔ زبان معنوں اور صوتیات کے درمیان رابطے کا کام کرتی ہے، ساتھ ہی ایسے اصول بھی تشکیل دیتی ہے جن کی مدد سے انسانی کردار اور جسمانی حرکات کو ابلاغ کی معنویت بھی ملتی ہے لیکن لسانی ساختیات میں تجرید زبانی گفتگو کی صورت میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ فرد جب زبانی کلام کر رہا ہوتا ہے تو اس کے الفاظ یا جملوں کی کمزور نشست و برخاست کو ذرا مشکل ہی سے شناخت کیا جاتا ہے کیونکہ بعض دفعہ ہر ادا کئے جانے والا جملہ قواعد کے ساختیاتی اصول پر پورا نہیں اترتا۔ لہٰذا انسانی تکلم میں قواعدی اور غیر قواعدی دونوں ہی اقسام کے عناصر کو شناخت کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح لسانی ساختیے کی قواعدی نوعیت میں اُتار چڑھاؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔
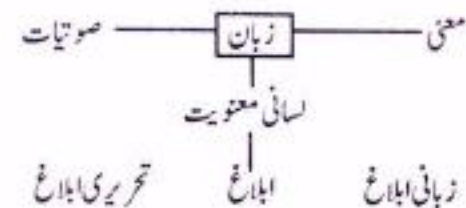
عمرانیات یا بشریاتی ساختیات اور لسانی ساختیات کے مزاج میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے کیونکہ فرد کی عمرانیاتی ساختیات کسی طور پر زبان کی ساختیاتی فطرت سے علیحدہ نہیں۔ مزاج اور رویوں کی اسی مشابہت نے ساختیات کے علم کو زیادہ وسیع اور عام فہم بنادیا ہے کیونکہ اس علم کی تفہیم کے لئے کسی بھی مخصوص "اصول" کو سامنے رکھ کر پرکھا جاسکتا ہے۔ انسانی رویوں میں حرکت اور سکون سے علم ساختیات کو آفاقی رنگ ملا ہے۔

○○

SELECTED READINGS

------------------	Academic American Encyclopedia, 1983, 18th Deluxe Library Edition, Dunbury, Connecticut, Grolier Incorporated, 303-304.
Bach, Emmon,	Synatactic Theory, 1974, New York Hold, Rinebart Winston.
Blua, Peter,	1960 Structural Effects, American Sociological Review 25 178-193.
Breshnanj,	Sentence Stress and Syntactics in Transformattions in Approaches to Natural Language, Edited by Hintikka, Dordrecht D, Reidel 1973.
Chomsky, N	Synatactic Structure, 1975 The Hague, Mounton
Crystal, David	The Cambriadge Encyclopedia of Language, New York Cambriadge University Press 82, 79, 407-409.
Culler, Jonathan	Jacques Derriad Instructralism And Since, Edited by John Sturrock.
Duncan H.D.	Language and Literature in Society, Chicago, University of Chicago Press, 1953
De George RT (ed)	The structaralist, New York, Doubleday, 1972.
------------------	Encyclopedia of World Literature in the 20th Century Volume 4, 263-265.
Fortes, meyer	(1949) 1963, Time and Social Structure, An Ashanti Case Study, Page 54-84 In Meyer Fortes (Editors) Social Structure Studies Presented to A.R. Redcliffe - Brown, New York, Russell

Fortes, Meyer — 1953, The Structure of unilineal Descent Groups, American Anthroplogist, New Series 55-17-41.

Gellner, Ernest — What is StructuralismK London, Time Literary Supplement 1981 July 31 881-883.

Hymes, D Fought, J. — (1981) American Structuralism, The Haque

Lip King Lawrence Litz, Waton a. (Ed) — Modern Literary Critism, 1900-1970 - 1972, New york

Levistrauss, Claude — (1958) 1963, Structural Anthropology, New York, Basic Book-First Publish in French.

Levy, Marion J Jr. 1952 Structure of Society, princeton University Press.

Murdock, George P. — 1949 Social Structure, New York. Macmillan (Paperback Edition was published in 1965 by the Free Press)

Nadel S. — Theory of Social Structure, London: Cohen And West Glennoe Ill, Free Press Published Posthumously, 1949.

Parson, Talcoot — (1937) 1949 The Structure of Social Action, Glencoe Ill, Free Press

Radcliffe-Brown AR — (1952) 1961 Structure And Function in primitive Society : Essays And Addresses London, Cohen & West Glencoe Ill, Pree Press.

Scholes, Robert — Structuralism And Literature, 1974, New Haven And London Yale University Press.

Tanne D.S Bachhan J.G. — 1964 Structural Versus Individual Effects, American Journal of Sociology 1969, 589-595

Timpanaro, Sebastiono — Structuralism And its Successors, Contemporary Literature, 1981 Fall, 600-622

Vogt, Evon Z. — 1960 On The Concept of Structure And Process In Cultural Anthropology, American Anthropologist, New Series 1962, 18-33

Wight Dorist T. — Structuralism Is Dead, Ball State University Forum 1989 Summar 53-59

دوسرا باب

ساختیات کی کہانی-۲

ساختیات کی کہانی-۲

اس کائنات میں موجود ہر چیز کسی نہ کسی طور پر اپنی ساختیے کا احساس دلواتی ہے۔ اگر ساخت انسانی دنیا سے الگ کر دیا جائے تو ہر چیز بے شناخت اور مہمل ہو کر رہ جائے گی۔ جہاں تک علم و ادب کا سوال ہے ساختیات مختلف صورتوں میں مختلف ہائے فکر کو نت نئے روپ دیتی رہی ہے۔ مثلاً لسانیات کی ساختیات کا روپ عمرانیات کی ساختیات سے مختلف ہے، جبکہ ریاضی یا نفسیات سے متعلقہ ساختیاتی بحث ایک دوسرے سے مختلف مزاج کی ہے۔ ساختیے کے آپسی اختلاف سے کسی مخصوص علم کی ساخت کی شناخت پیدا ہوتی ہے۔ معاشرتی مظاہر مختلف رسم و رواج میں داخل ہو کر نئی ساختی معنویت پیدا کرتے ہیں۔

بیسویں صدی میں شعر و ادب جہاں دیگر فلسفیانہ، عمرانیاتی، بشری اور انسانی علوم سے متاثر ہوا، وہاں ساختیات نے ۶۰ کی دہائی میں جدید لسانی اور ادبی تنقید پر اپنے گہرے اثرات ثبت کئے۔ اس سے قبل ادبی تنقید کو انسانی و عمرانیاتی علوم سے علیحدہ ہی تصور کیا جاتا تھا۔ ساختیات نے جدید تنقید کو اس صورت میں وسعت دی کہ ادب انسانی سائنس (علوم) میں بھی اپنی معنویت تلاش کرنے لگا۔ بلکہ اس کو "سائنٹفک تنقید" بھی کہا گیا جو ادب کی تمام اصناف کا احاطہ کرتی تھی۔ دوسری طرف ساختیات نے ان الجھے ہوئے سوالات کے جوابات بھی دیئے جو امریکہ اور بالخصوص یورپ میں لبرل علوم کے فروغ کے بعد غیر انسانی ہو گئے تھے۔ ماہر بشریات ایلفرڈ کروبر (Alferd Krober) نے ساختیے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ بھرتی (فالتو) کا تصور ہے جس کو جوڑا نہیں جاسکتا۔" جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ علم غیر انسانی ہے۔ کچھ اینگلو امریکن اس کو فرانس سے برآمد کی ہوئی شے سے زیادہ اہمیت نہیں

دیتے۔ ۱۹۷۵ء میں جدید زبانوں کی ایسوسی ایشن نے جوتھن کلر کی کتاب Structuralist Poetics کو رسل لوویل "ادبی انعام" دیا۔ ادھر اینگلو امریکن اکیڈمی نے صحت مند یا بیمار ساختیات کی جب حوصلہ افزائی کی تو یہ تصور امریکہ میں تنقیدی نظام کا اہم وظیفہ ثابت ہوا۔

چھٹی دہائی میں ساختیات کی اصطلاح کو دیگر تصورات کے ساتھ ساتھ خاصی ڈرامائی صورت بھی ملی۔ اسی دوران اس نظریے کو انضباتی مظہر بھی تصور کیا جاتا رہا لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ ساختیات نے اپنا میدان خود ہی بنایا اور اس نظریے نے تصورات کی بہتات میں خاصی تخفیف کی۔ یہ ادبی مطالعہ میں دقیق قسم کی جکڑ بندیوں سے اپنے آپ کو ہمیشہ سے ہی ذرا آزاد رکھنے کی کوشش میں رہی۔ خاص کر سوس ماہر لسانیات فرینڈ ڈی ساسر (۱۹۱۳ء-۱۸۵۷ء) نے زبان کا جب ایک نظام (یا ساختیے) کی صورت میں تجزیہ کیا اور اسے انفرادی تکلم سے ممیز کیا۔ جبکہ امریکی ماہر لسانیات چارلس ایس پرس انیسویں صدی میں اور اس سے قبل قواعدیات کے میدان میں سترہویں صدی میں پورٹ رائل فرانس میں کام کر چکے تھے۔ ان تمام لسانی کاوشوں میں یہ بات اہم تھی کہ ان لوگوں کو زبان کی اصولی حدود سے متعارف کروادیا جائے۔ ساسر کے یہاں ساختیات کا تمام منصوبہ (اسکیم) ثقافتی اشارہ سے جنم لیتا ہے یا اس کو ہم کسی طور پر معنویت کی نمائندگی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ (اسی نکتے پر پرس نے بھی طویل بحث کی ہے) جس میں ایک طرف (من مانے!) معنی نما (Signifier) (مثلاً درخت کا لفظ) اور تصور نما (Signified) (درخت کا تصور) سے متعارف کروایا گیا۔ اس کے علاوہ ساسر نے چار Dichotomies کو بھی بیان کیا۔

(۱) لینگ اور پاول:

لینگ ایک طرح کا معاشرتی نظام ہے مثلاً ہم اردو جانتے ہیں۔ اس کا ایک نظام ہے۔ جب دو مختلف لوگ اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کی زبان ایک دوسرے سے علیحدہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ لیکن جو زبان فرد بول رہا ہے وہ پاول ہے یعنی لینگ اجتماعی نوعیت کا وظیفہ ہے جبکہ ہم پاول کو انفرادی نوعیت کا لسانی وظیفہ کہہ سکتے ہیں۔

(۲) ہم وقتی (Synerhonic) غیر وقتی (Diachronic):

جب ہم کسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی چاہئے کہ

وہ زبان سو سال پہلے کس طرح بولی جاتی تھی یا چار سو سال قبل اس کو کس طرح استعمال کیا جاتا تھا یہ بات حاضر مطالعہ سے غیر متعلق ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی زبان کا مطالعہ اس طرح کریں کہ آج جو زبانیں رائج ہیں، ان کا موازنہ سو سال پہلی والی زبان سے کریں تو یہ مطالعہ Diachronic ہوگا۔ ساسر کے بقول زبان کا مطالعہ اس طرح کرنا چاہئے کہ جیسے وہ آج بولی جارہی ہے وہ تب ہم وقتی Synchronic مطالعہ ہوگا۔

(۳) سنٹیگمیٹنگ / پیراڈائی مینک (Paradigmatic)

لسانی عناصر میں آپس میں دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں یا اس سے روابط ابتدائی نوعیت کے ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ایک سطر سے دوسری سطر میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً "میں کل وہاں جاؤں گا" یہ الفاظ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس تعلق کو سنٹیگمیٹک تعلق بھی کہا جاتا ہے۔ ایک اور روابط کی صورت حال بھی اُبھرتی ہے۔ یہ وہ الفاظ ہوتے ہیں جو جملے میں شامل نہیں ہوتے۔ مثلاً "میں کل وہاں جاؤں گا، تم کل وہاں گئے تھے، وہ پرسوں یہاں آیا تھا۔" ان جملوں میں "میں"، "تم" اور "وہ" کا آپس میں قریبی رابطہ ہے۔ یہ پیراڈائی مینک تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ اس صورت حال میں ہم ایک وقت میں ایک اکائی (یونٹ) کا مطالعہ کریں گے۔

(۴) "تصور نما" —— "معنی نما"

دنیا میں قریب قریب ہر چیز کے نام ہیں۔ اشیاء اور ان کے ناموں کے درمیان فطری رابطہ نہیں ہوتا۔ یہ رابطہ روایتی نوعیت کا ہوتا ہے مثلاً "درخت" کو ہم "پیڑ" یا "جھاڑ" بھی کہتے ہیں۔ یعنی معروض ایک ہوتا ہے لیکن اس کا تعلق براہ راست نہیں ہوتا بلکہ روایتی ہے۔ کیونکہ ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ "درخت" کو "درخت" کہیں گے۔ لہٰذا یہ لفظ ایک عرصے سے چلا آرہا ہے۔ اگر ہم اس بات پر متفق ہو جائیں کہ یہ تلوار ہے تو درخت کا نام تلوار ہو جائے گا۔ یعنی جو بھی رابطہ بنتا ہے وہ معنی کے حوالے سے ہے اور طبعی معروض ہے۔ وہ معنی نما ہے اور جو اس کا نام ہے وہ تصور نما ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو چیز اہم ہے وہ اختیاطی (Arbitrary) رہتی ہے۔ ساسر کے علاوہ بوڈوئن دکورتی (Baudouin Decourthenay) نے بھی لسانی ساختیات کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۵۵ء میں فرانسیسی ماہر بشریات لیوی اسٹروس نے اپنا مشہور مقالہ "اسطور کا ساختیاتی مطالعہ" لکھا۔ گو یہ کلی طور پر بشریاتی مقالہ تھا لیکن یہ بعد کے ادبی اور تنقیدی مطالعوں پر بہت اثر انداز ہوا۔ اسٹروس کے خیال میں فرانسیسی بشریاتی ساختیات "وحشی ثقافت" ہے اور یہ احساس بھی دلوایا کہ اساطیری اور ساکنفک تصورات ایک دوسرے کے متوازن سفر کررہے ہیں۔ اسٹروس نے بیانیہ (روداد نگاری) کا ساختیاتی تجزیہ کرتے ہوئے غیر زمانی یا تاریخی سمتوں کو ماند کرتے ہوئے غیر زمانی پہلو کو اہمیت دی۔ انھوں نے قرات میں غیر زمانی / غیر تاریخی سطح پر بیانہ ساختیہ کو بیان کرتے ہوئے ایڈیپس کی کہانی کے مزاج کا تجزیہ کیا اور یہ مطالعہ اس وقت ایک واضح اور اہم ساختیاتی مطالعہ تسلیم کیا گیا۔ ساختیاتی فکر نو سے ان ادبی تصورات کو بھی اہمیت دی گئی جن کو کم اہم تصور کرکے ماضی میں ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ انہی گم گشتہ تصورات کو ساختیات نے دوبارہ زندہ کرکے انھیں اپنے تجزیات میں جگہ دی جو کہ ادب میں "حس عمومی" کو استعمال کرنے کی بھی ایک انوکھی روایت بن گئی۔ یوں لیوی اسٹروس نے ادبی تجزیے کے لئے نئی ساختیاتی راہیں استوار کیں اور اس کا اختتام اسٹروس کی چھپی ہوئی موضوعیت یا میلان کے بیانہ ساختیے کے تجزیے پر ہوا۔ اسٹروس کے اس مضمون نے جہاں بیانہ تجزیہ نگاری میں ایک انقلاب پیدا کردیا تو دوسری جانب اینگلو امریکن تنقید کو ہیت پسندی کے بیانیہ رجحان پر نظر ثانی کرنے پر بھی اکسایا۔ یہ حقیقت ہے کہ ساختیات کی ادبی ہیت پسندی ہی ہے جو کہ ہمیں نئی امریکی تنقید اور روسی ہیت پسندی دونوں میں ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس "تحریک" کا بنیادی نکتہ ادبی تخلیقات میں متن کا تجزیہ ہے اور اس پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے جس کی مشابہت ہم تجرباتی تنقید میں بآسانی تلاش کرسکتے ہیں۔ یہ دونوں تحریکات ادب کی جنیریک (Generic) ساخت میں ایک موافق نظام میں منظم کرتے ہوئے تحریر کو داخلی طور پر ربط وضبط دینے کے علاوہ قریب ترین موزوں قرات کا انکشاف بھی کرتی ہیں۔ اس صورتحال میں ادب کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے نظام ہیئت پر نظر دوڑائی جاتی ہے، ممکنہ حد تک اس کے خارجی پہلوؤں کا تجزیہ کیا جاتا ہے جو ایک مختلف نوعیت کی پیچیدہ عمومیت ہوتی ہے۔ ہیت میں موجود خاص قسم کے اجزاء ترکیبی مثلاً تمثال، سطر، فکر ایک مخصوص متن کو ادب ایک مخصوص نظام کے تحت تجربہ کرتی ہے۔ نئی تنقید اور روسی ہیت پسندی

دراصل ادبی تجزیہ نگاری کو اہمیت دیتی ہے اور ادب کو ایک نظام تصور کرتے ہوئے عموماً سائنسی طرزِ عمل کو بھی اپناتی ہے۔ خاص کر روسی ہیت پسندی کے مطابق ادب کے لسانی پہلوؤں کو اوّلیت حاصل ہے۔ اسی لسانیات کا رابطہ ۱۹۶۰ء کی ساختیات سے جاملتا ہے جس سے ساختیات کی کئی نئی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

ساختیات کا علم ادب کو اشاروں اور رموز (کوڈ) کا نظام کہتا ہے جس میں ثقافتی جہتیں بھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جہاں شدید قسم کی استدلالیت کے علاوہ کئی غلط قسم کے استدلالی ماڈل بھی ملتے ہیں لیکن ساختیات کوئی جکڑا ہوا تصور نہیں ہے۔ یہ بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ جیسا کہ رونالڈ شیفیلڈ نے "سائنٹفک پروجیکٹ آف دی اسٹرکچرسٹ موومنٹ" میں لکھا ہے: "یہ چھائے ہوئے عقیدے کی منطق ہے، تخمینہ ہے اور عقل و دانش کی قوت۔" روسی ہیت پسندی تک ادبی نظریے کا مقصد کوئی اعلیٰ اور ارفع نوعیت کا نہ تھا سوائے اس کے کہ یہ ایک عملی تنقید تھی۔ ساختیات کے جدید ادبی مطالعے میں صرف یہ کوشش رہی کہ توازن کے ساتھ ادب کی مختلف اصناف کی تفہیم کی جائے۔ اصل میں ساختیات تجزیاتی تکنیک کی توانائی ہے جو اس بات سے متعلق ہے کہ اس تصور کے کئی تصورات میں کمزوریاں بھی پوشیدہ ہیں۔ ساختیات کی توانائی کے متعلق رونالڈ بارتھ نے لکھا ہے "شروع سے ہی ایک لازمی سرگرمی ہے جو ایک معروض کی تشکیلِ نو کرتی ہے اور اس ذریعے سے وظائف کے ضوابط واضح کرتی ہے۔" یہ ضوابط عام طور پر قابلِ فہم ہوتے ہیں جو ادبی معروض کا چربہ ہوتے ہیں۔ غالباً بارتھ کا مطلب یہ ہے کہ ساختیات کی نظر میں متن کی ہم وقتی (Synchronic) سمتوں پر مرکوز رہی ہیں جہاں زبان انفرادی تکلم کی نفی کرتی ہیں۔ مخصوص حالتوں میں متن دیگر متن کی طرح ہوتا ہے۔ ساختیات متن کے اجزائے ترکیبی کی مبادیات وظائف کی مماثلت ہوتی ہے۔ (مثلاً کرداری ارتقا، پلاٹ، تقسیم، نظریہ حیات وغیرہ وغیرہ) جس کو لیوی گلوریل اسٹروس مماثلتیں (Homologies) کہتے ہیں۔ لیکن سب سے بڑا اور اہم غیر تاریخی / غیر زمانی تجزیہ مماثلیاتی سطح پر یہ ہوتا ہے کہ وہ متن کو ایک Paradigm کی صورت میں بھی تخلیق کرتا ہے جو غیر زمانہ نظام کی ساختیاتی ممکنات ہوتی ہے متن کے اندر جتنی بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ ہم وقتی (Synchronic) نظام میں ایک قسم کا مبادلہ ہوتا ہے۔ بہرحال ساختیات کا تعلق Synchronic

Paradigm سے خاصا گہرا ہوتے ہوئے بھی اس کے زمانی تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جس کو ہم غیر تاریخی (Diachronic) سمتیں بھی کہتے ہیں۔ یہ زمان اور معاشرتی تبدیلی سے نظریں چرانے کا رویہ ہے۔ اس رنگ میں کئی ساختیاتی نقاد شروع ہی سے رنگے ہوئے ہیں اس نے ردِ تشکیل (Deconstruction) کی تنقیدی راہیں ہموار کیں۔

ساختیات کی عملی تنقید کے میدان میں کامیابی سے انکار ممکن نہیں۔ خاص طور پر بارتھ کے ساختیاتی تصورات ساختیات کے اوّلین ایام سے لے کر ان کے موت کے بعد آج بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہیں۔ خاص طور پر "نشانیات" پر ان کی کتاب میں نظام کے چلن، بیانیہ ساختیہ، متنیت اور اس کے علاوہ کئی ایسے نادر تصورات ہیں جو کہ بلاشبہ جدید ادبی اور لسانی تنقید میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوئے۔ زیوتن تدزوف (Tzuetan Tudorov) نے بھی بیانیہ ساختیہ کی تشریح و تفہیم کے علاوہ 'جانر' (Genre) کے نظریے اور علامتوں کے نظریہ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ قریب قریب انہی موضوعات پر مائیکل ریفاٹیر (Michael Riffaterre) اومبرٹو ریکو (Umbertoreco) اور اے جے گریماز (A.G. Greimas) نے بھی اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔

ساختیات اپنے اصول اور بندشیں خود بھی تشکیل کرتی ہے۔ خاص طور پر تاریخی معاملات اور اس سے متعلقہ تبدیلیوں کو عمومی نگاہ سے دیکھتی ہے نہ کہ اس کا انداز مطالعہ فردیاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ساٹھویں دہائی کے اواخر میں ژاک دریدا نے اس موضوع پر حتمی قسم کا کام کرتے ہوئے اپنی تنقیدی کتاب Structure, Sign and Play, in the Discourse of the Human Science میں ساختیات کو نئی فکری جہتوں سے روشناس کروایا۔ ان کے خیال میں ساختیات، ساختیے کا روایتی نابینا پن ہے جو کہ غیر خواہش مندانہ تجرید میں نظریاتی اطلاق کے ساختیے کا تصور ہے۔ دریدا کا خیال ہے کہ اگر ہم ساختیے کی نبضوں کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو ثقافت سے باہر نکلنا پڑے گا اور یہ کہ ثقافت سے کٹ جانا ہوگا لیکن یہ کوئی ماورائی ثقافت نہ ہوگی۔ یوں ہم باہر کی ثقافت کا تجزیہ نہیں کر پائیں گے اور نہ ہی ساختیے کے معروض کا ادراک کرسکیں گے۔ دریدا کا یہ خیال ہے کہ "قرات اور تشریح کو ثقافتی ساختیہ کبھی بھی بحسن خوبی سائنسی ماڈل میں بیان نہیں کرسکتیں۔ حالانکہ ساختیے کا علیحدہ رہ کر بھی تجزیہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ساختیہ سنجیدہ قسم (کچھ کی نظر میں خشک نوعیت کا بھی ہوجاتا ہے) کے طریقہ کار میں تبدیل

ہو جاتا ہے۔ کچھ نقاد ساختیات کو باہمی متن سے مختلف تصور کرتے ہیں۔ اور وظیفہ ان کے یہاں ساختیات کی اصل اساس بن جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی لیوی اسٹروس کی ساختیات کی بحث آج بھی اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنی ۱۹۶۰ء کی دہائی میں تھی۔ کیونکہ ان کی ساختیات نے بشریاتی ساختیات کو نئے مزاج سے آشنا کیا جو کنبہ داری سے تبدیل ہو کر ایک وسیع معاشرتی ساختیے کے تصور میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نئے فکری مظاہر کو جنم دیتی ہے اور اسٹروس نے طریقہ کار کو زیادہ صراحت سے بیان کیا جس کو دوسرے لوگ بیان کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ اسٹروس کی اسی تنقیدی جرأت نے مباحث کے کئی دروازے کھول دیے۔ بالخصوص انھوں نے صوتی نظریے کے اجزائے ترکیبی میں اپنے آپ کو کافی حد تک الجھائے رکھا۔ اسٹروس نے سب سے پہلے ساسر کے لسانی خیالات کو بشریاتی اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی۔ لیکن ساختیات کو مجرد تناظر میں دیکھنا، اس تصور کے ساتھ ناانصافی ہوگی، کیونکہ ساختیات مختلف علوم کے بطن سے پیدا ہوئی۔ ساختیاتی اہل فکر کے طریقہ کار، رویوں، زوایۂ نگاہ، طرز عمل نظریات، حوالوں میں **فکری تفاوت** کے علاوہ فکری گوناں گوں رنگارنگی ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اظہار بیان کے **علاوہ ان کا فکری** سیاق بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بعض لوگوں نے تو ساختیات کو بیان کرتے ہوئے نہایت ہی مشکل زبان اختیار کی لہٰذا فکری اظہار پیچیدگیوں کا شکار بھی ہوا۔ بارتھ کے لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ساختیات کو بیان کرتے ہوئے خاصا غیر سنجیدہ لہجہ بھی استعمال کیا۔ لوفے (Lefebver) کی عینیت پسندی اور طنز کو ان کی زبان ابلاغ اور اظہار کا وہ مقام نہ دے سکی جو اس کا حق تھا۔ یہی کچھ مسئلہ فوکو (Foucault) کے Mad House اور Leprosariums کے ساتھ ہے۔ لاکان (Lacan) کی اسطوریہ میں "لاشعوری متن" دراصل اساطیر کی ثقافتی پابندیوں کے تضادات سے جنم لیتا ہے۔ جس کو لیوی اسٹروس نے بھی بیان کیا ہے لیکن بودون (Boudun) انسانی سائنس کے حوالے سے ساختیات کو طریق کار کی ساختیات سے فلسفیانہ ساختیات میں تبدیل کر دیتے ہیں جبکہ اسٹروس ان دونوں کو بغیر کسی تخصیص کے برتتے ہیں۔ "یہ مغالطے جغرافیائی پابندیوں کے سے لگتے ہیں، ہیرس یا چامسکی بطور ماہر ساختیات لیوی اسٹروس کے طریقہ کار کی سطح پر ان کے سائنسی عملیات سے کوئی خاص فلسفیانہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔" (ریمنڈ بورڈن کا موقف)

امریکی بشریات کو چھوڑ کر امریکی عمرانیات اور معاشرتی علوم نے فرانسیسی ساختیات پر نہ ہونے کے برابر توجہ مرکوز کی حالانکہ کئی امریکی درسگاہوں کے شعبہ ادبیات میں ساختیاتی مظاہر پر بحث ہوتی رہی ہے۔ یہ بات تو متفقہ ہے کہ ساختیات ادبی فن کے خارجی، داخلی اور دیگر متعلقہ عناصر کا تجزیہ کرتی ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ساختیات کسی ادبی تخلیق کے متن کی تشریح و تفہیم یا اس کے ابلاغ کو ٹھوس اور سہل بناتی ہے۔ ساختیات اس وقت تک کسی ادبی عمل پر کوئی بحث نہیں کرتی جب تک اس کا مکمل وجود ترتیب نہ پالے۔ جب ادبی عمل کی شناخت، رموز (کوڈ) یا کوئی اور صورت اُبھرتی ہے تو ساختیات اپنی بحث کا آغاز کرتی ہے اور عموماً یہ سوالات اٹھاتی ہے کہ یہ عمل کس طرح اور کیوں سرانجام دیا گیا یا کچھ نتائجی ساختیاتی نقاد یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس عمل سے ادب اور ادیب کو کیا فائدہ ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں آکر ساختیات کی صورت حال خاصی حد تک بدل گئی کیونکہ اس دور میں طریق کار اور اسلوب کے نئے سانچے ترتیب دیئے گئے جو ادبی نظریے اور تنقید کے علاوہ معاشرتی، عمرانیاتی علوم کے مباحث پر بھی اثر انداز ہوئے۔ ساختیاتی تجزیہ نگاری کا بنیادی سیاق این ہارٹ مین (N. Hartmann) اور آر انگرڈن (R. Ingarden) کے مظہریاتی مباحث کے بعد شروع ہوتا ہے جس میں اس بات کا احاطہ کیا گیا تھا کہ ثانوی فن و تخلیق دراصل مختلف ساختیاتی سطحوں سے اپنا آغاز کرتی ہے اور انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ساختیاتی تجزیہ سیاقی مطالعے سے الگ چیز ہے۔ جیسا کہ سوسائٹی فار اسٹڈی آف پوئٹک لینگویج (POAIZ) سے متعلق لوگوں کا کہنا تھا جو ہیت پسندی کی روایت سے قریب ترین تصور تھا۔ لیکن اس نظریے نے ساختیاتی تصور کو نہایت محدود بھی کر دیا تھا اور نہ ہی ہیت پسندوں کے اس گروہ نے ساختیات کی کوئی حتمی تعریف بیان کی اور نہ ہی وہ کسی یکساں تجزیاتی یا تنقیدی طریقہ کار کو اپنا سکے جو ساختیات اور اس کے طریقہ کار کی تفہیم اور تشریح کر سکے۔ یہ طریقہ کار کسی متن کو خلاصے کے طور پر اپناتا ہے اور جیسے تیسے تجزیہ کر کے پیش کر دیتا ہے۔ یہ بات کلی طور پر ادبی تنقید کے لئے نقصان دہ ہے اور ساتھ ہی شکوک کو بھی ابھارتی ہے۔ ساختیات محض متن تک محدود نہیں بلکہ اس کی وسعتیں لامحدود قسم کی ہیں۔ جہاں تک ادبی اور تخلیقی تجزیہ نگاری کا تعلق ہے ساختیات متن سے آگے نکل کر نظام تمثال، رمزیات، اشاروں، تشبیہات، استعاروں اور

کسی حد تک سوانحی پس منظر کو بھی اپنے تجزیے میں شامل کرتی ہے جس میں تاریخی آگہی، وصف، اسٹائل اور فکری دبستان کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

ادب کی یہ ساختیاتی ماڈل کی اکائیاں بہت سی خارجی سطحوں سے گھری ہوتی ہیں اور تخلیق کا مواد ان سطحوں سے تشکیل پاتا ہے، پھر لسان اور زبان کا مسئلہ سامنے آتا ہے جو کہ سیاق کی تخلیق میں پیش کیا جاتا ہے پھر یہ تجزیہ کیا جاتا ہے کہ وہ ادبی زبان کے نظریے سے میل کھاتی ہے کہ نہیں اور آیا یہ تخلیقی عمل کسی نئے اسلوب کو جنم دے رہا ہے کہ نہیں! متن کی دراصل کوئی ادبی معنویت نہیں ہوتی، ادبی عمل کی خارجی سطحیں، اپنی معنویت جب ہی پیدا کرتی ہیں جب متن میں نظام رمزیات یا علامات زوردار ہوں اور قاری کے فہم کا حصہ بنیں، یہ آگے چل کر ایک داخلی معنویت کو بھی جنم دیتی ہے جو تخلیقی متن میں ایک وحدت کے ظہور کا سبب بھی بن جاتی ہے اور یہ سبب نئے استدلالی فکر و تکنیک کو اُبھارنے میں مدد دیتا ہے۔

ادبی یا تخلیقی عمل میں تمثال داخلی ساختیے کو تشکیل دیتے ہیں اور سیاق کا عمل فطرت کے تمام داخلی تصورات کو بھی اُبھارتا ہے جبکہ تمثال ایک جذباتی عنصر کا روپ دھار کر قاری کی تصوریت میں ایک نئی تازگی پیدا کر دیتا ہے جو تخلیق میں پیش کیے جانے والے کرداروں کی مدد سے ایک پلاٹ کا ڈھانچہ ترتیب دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل کی خارجی ہیت ایک شعوری ذہن کو تیار کرتی ہے، جہاں تمثالیت اپنی معنویت کچھ دیر کے لئے کھو دیتی ہے۔ تنقیدی عمل (نظام) کے معنی یہ ہیں کہ زبان کا مواد متن کو منظم ہی نہیں بلکہ متحرک بھی رکھتا ہے۔ خاص طور پر زبان کے صوتی عناصر کسی ادب پارے کی تزئین میں سب سے زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ شاعری میں یہ ساخت، نحو، آہنگ اور اوزان کا ہوتا ہے اور یہی اجزائے ترکیبی ساختیے کو تشکیل دیتے ہیں۔ ایک دوسری صورت حال مکالے کی بھی ہوتی ہے جو وسیع متن کو نئی جمالیات سے متعارف ہی نہیں کرواتی بلکہ کئی ذیلی متنی معنویت کو بھی ظہور میں لاتی ہے۔ ساختیات تجزیہ نگاری کی صحت کرتی ہے اور جدید ساختیات داخلی سطحوں سے سیاق اور مواد میں نئے معانی کا انکشاف کرتی ہے، ساختیاتی طرز عمل ادبی ہیت کی ہیت لفظی (Morphological) اور تاریخی تصوریت کے طریقہ کار کے مختلف الجہت پہلوؤں سے بحث کرتی ہے جو کہ ادبی فن کے لئے ضروری تصور کی گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم تک فرانسیسی فکر کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر نازیوں کے خلاف فرانس کی تحریک مزاحمت نے مارکسی فکر کو خاصا توانا کر دیا۔ لیکن جلد ہی روس میں پائے جانے والے کمیونسٹ نظام کے التباس نے ایک نئی فکری فضا باندھ دی۔ خاص طور پر ژان پال سارتر کے انسانیت کے وجودیاتی تصور نے جدید معاشرے میں فرد کی حیثیت کو شدت سے محسوس کیا۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک سارتر کا انسانیت کا تصور کمیونزم کا دم بھرتا رہا، باوجود اس کے کہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ روس میں کمیونزم ایک جبر کی صورت میں موجود ہے۔ لہٰذا ان کے اس نظریے کو اس زمانے میں شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لہٰذا کچھ ایسی فضا ہموار ہو گئی تھی کہ ساختیات نے نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ فرانسیسی فکری بساط پر اپنی موجودگی کا احساس دلوایا۔ لیکن اس کو اس وقت کچھ زیادہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی کیونکہ نو ساختیاتی افکار کسی نہ کسی طور پر پہلے بیان کئے ہوئے فکری رویوں اور نظریات سے کلی طور پر اپنے آپ کو آزادانہ کروا سکے، مارکسی نظریات کسی نہ کسی طور پر ساختیاتی ہیت میں نظر آئے لیکن وجودیت اور ساختیات کی بنیادیں اور اس کے بنیادی مفروضات فرد کی فطرت اور معاشرتی سطح پر مارکسزم سے یکسر مختلف تھے کیونکہ مارکسزم کے رویوں میں معاشرتی انصاف اور معاشرتی تبدیلی کو زیادہ اور کلیدی اہمیت حاصل تھی اس کے علاوہ وجودیت اور ساختیات کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ ان کی فکر مارکسزم سے یکسر مختلف ہونے کے علاوہ کمیونسٹ شکن بھی ہے۔ غالباً اسی سبب اسٹالین نے سرکاری طور پر روسی ہیت پسندی کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اس پر پابندی لگادی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ بورژوا تصور تھا۔ لیکن اس کے بعد کئی ساختیات دان مثلاً بارتھ، فوکو، لاکان، اسٹراس وغیرہ بیک وقت وجودیت اور مارکسزم سے کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوئے۔ ساختیات کے درخت سے جہاں کئی شاخیں پھوٹیں اسی میں سے سیاسیات کی شاخ بھی نمودار ہوئی۔ لیکن شروع شروع میں یہ دانشورانہ اصولوں پر کاربند رہی۔ خاص کر فرانس میں بائیں بازو کے سکہ بند سیاسی نظریے نے رغبت کے ساتھ ساختیات کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کی اور سوشلزم پر کمیونزم کے زور کو کم کرنے کے لئے ساختیات کا سہارا بھی لیا گیا۔ بنیادی طور پر فرانس کا بایاں بازو ۱۹۵۰ء کے درمیانی حصے میں بے حد دانشورانہ مغالطوں کا شکار تھا کیونکہ ۳۰ء-۴۰ء کی

دہائیوں میں امریکی مارکسسٹوں سے ان کا شدید قسم کا نظریاتی اختلاف ہوا تھا۔ ادھر فرانسیسی ریڈیکل مارکسسٹوں نے پچاس کی دہائی میں روسی کیمونزم کی تلخ حقیقت اور اس کی ناکامی کو بڑے ہی ڈرامائی انداز میں پیش کیا لیکن سوویت مارکسزم نے نظریاتی تضادات اور اختلافات کو جنم دیا۔ روسی کیمونزم کے خلاف فرانسیسی کیمونسٹوں کے ذہنوں میں کافی روشن خیال تصور رہا۔ خاص کر مثلاً مزدوروں کی پیشہ وارانہ یونینز کو ان کی حمایت حاصل رہی۔ اس دہائی میں کیمونسٹوں، سوشلسٹوں وغیرہ کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جاسکتا تھا۔ سرد جنگ کے دنوں میں فرانسیسی بایاں بازو سوویت حکمت عملیوں سے کچھ زیادہ مطمئن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس کا ریڈیکل دانشور طبقہ کیمونزم سے بددل ہوگیا اور جلد ہی انھوں نے وجودیت میں اپنے نظریاتی خوابوں کی تعبیر چاہی کیونکہ وجودیت مظاہر کا گہرائی اور باریکی سے تجزیہ کرتی تھی۔ لیکن چند ریڈیکل دانشوروں نے وجودیت کو شک کی نظر سے بھی دیکھا کیونکہ وجودیت میں انفرادیت کی بو آتی تھی۔ "ہماری تحقیق کی رائے انفرادیت ہے" بعض دفعہ وہ (وجودیت) اپنے آپ سے انحراف کرتا ہے۔ ڈشمنانہ بھی ہو جاتا ہے۔ یہی ہوسرل سے بیک وقت ہمارا بندھن اور انحراف ہے۔ (سارتر اور میرلوپونٹی کا موقف)

یہ امر مسلمہ ہے کہ سارتر کی وجودیت نازیوں کے خلاف ایک شدید قسم کا فکری ردّ عمل تھا۔ جو اذیت ناک معاشرتی مظاہر کی فضا میں فرد کی آزادی کا خواہش مند تھا۔ اسی دوران ساختیات نے جنم لیا جب مارکسزم اور وجودیت نہایت معتزز مقام پر فائز تھے اور اس بات کا احساس دلوایا کہ وسیع فلسفیانہ سیاق میں معاشرتی حقائق کو لاشعور کے عمومی ساختیے میں تلاش کیا جائے (لیوی اسٹروس) بلاشبہ مارکسزم اور وجودیت کے اثرات ان دنوں ساختیات پر بہت گہرے تھے۔ لہٰذا یہ کہا جانے لگا کہ ساختیات بائیں بازو کا نیا قدامت پسندانہ ڈھانچہ ہے۔ لیوی اسٹروس نے سیاسی ساختیے سے بحث نہیں کی گو وہ تاحیات کسی نہ کسی طور پر مارکس کے نظریات سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے یونگ کے شعور اجتماعی اور اشارہ نہی کے تصورات سے بھی اپنے ساختیاتی نظریے کو مزید ٹھوس اور مستحکم بنایا۔ قریب قریب اسی قسم کا ساختیاتی مطالعہ جیکب سن، ہیجل سیلو (Hjelmslev) مارٹینٹ (Matinet) نے بھی کیا۔ جہاں ساسر کے لسانی نظریات کو ساختیاتی طریقہ کار کی شکل میں بھی تبدیل کر دیا گیا جو لسانیات کی

بہت کامیاب تکنیک ہی ثابت ہوئی اس سے لسان اور زبان کی سرگرمیوں کو عالمگیر سطح پر انسانی تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی گئی اور ساختیات کو بیان کرتے ہوئے ہر لکھنے والے نے اپنے طور پر ساختیے کے نظام کو بیان کیا جس پر کسی نہ کسی طور پر فرانسیسی معاشرتی، سیاسی اور دانشورانہ فکر کا گہرا اثر تھا۔ فرانس میں نظریات تضادات اور سیاسی اختلافات نے مختلف ادراک کو جنم دیا جو نیویارک کے دانشورانہ طبقے سے قریب ترین تھا۔ ان دنوں زیادہ تر اہل فکر و ادیب Normale Superieure سے بطور استاد یا شاگرد متعلق رہے جہاں وہ ڈکارٹ، کانٹ، ہیگل، ہوسرل، کیر کے گارد کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف ان بڑے فلسفیوں سے متاثر تھے بلکہ وہ "اینلس" Annales سے بھی متعلق تھے (اس دبستان کو مرس بلاچ اور لوسین فیبر نے ۱۹۲۹ء میں تشکیل دیا تھا) بعد میں ساختیات کو لیوی اسٹروس نے اساطیری ساختیات، لوئی آلتھیوسر نے سائنٹفک مارکسزم، ہنری لوفے نے علیت پسندانہ مارکسزم، پال ریکوئر نے مظہریات، ایلن ٹورین نے تاریخی عمرانیات، ژاک لاکان نے تحلیل نفسی، بارتھ نے ادبی تنقید اور مائیکل فوکو نے معاشرتی تاریخ (مختلف سطحوں پر) کا مختلف زاویوں سے مطالعہ اور تجزیہ کیا۔ لوفے، پال ریکوئر اور ٹورین کو کبھی بھی ساختیاتی ادیب تسلیم کیا گیا۔ لیکن پھر بھی سرجی ماسکوو سکی کا انتہائی فطرت کا مطالعہ تحلیل نفسی یا ایڈ گرسواں کا "پاپولر کلچر"۔ ٹورین کے مطالعوں سے زیادہ مختلف نہیں اور خاص کر بورڈن کا بورلیو پر مطالعہ حقیقت میں براہ راست ساختیاتی مطالعہ تھا۔ اس کے بعد دریدا کا نشانیات کا تصور اور اے جے گریمز کا "جذبات" کا ساختیاتی مطالعہ، بیانیہ ساختیے، بارتھ کے تصور نشانیات سے کم اہم نہیں جبکہ ساختیاتی تاریخ میں لوسین گولڈمین کے تصور "جنیاتی ساختیاتی" پر کم توجہ دی گئی۔ ٹیری ایگلٹن کا ساختیاتی مارکسی نظریہ اصل میں "التھیوسر" عملی تنقید کا نمونہ ہے۔ وہ غیر تاریخی پہلوؤں (متن) اور اس کے نتائج سے زیادہ تاریخی پہلوؤں کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی واقعات معاشرتی، قوتوں کا منہ موڑ دیتے ہیں۔ یہی ایگلٹن کی ساختیاتی ہیت پسندی ہے۔

ساختیاتی مطالعوں میں مختلف دبستانوں کی گونج صاف سنائی دیتی ہے جہاں انتہائی علوم کو الٰہیات، سائنس اور دیگر معاشرتی علوم کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً رکیوع، فلابیر، آلتھیوز فلسفی ہیں۔ لیکن لیوی اسٹروس کا میدان بشریات ہے۔ اگر مزید تخصیص کی جائے

تو عمرانیات، ادب اور تاریخ کے مضبوط حوالے بنتے ہیں۔ دوسری طرف بارتھ بہت ہی منفرد قسم کے ادبی نقاد ہیں جو اپنے عمرانیاتی اصول خود ہی وضع کرتے ہیں اور مارکسی سیاق میں اپنے نظریات اور استدلال کو پرکھتے بھی ہیں۔ لاکان کا مطالعہ فرائڈ سے شروع ہو کر فوکو تک جاتا ہے، جہاں ادبی سمتوں کی نئی انحرافیت کا ظہور ہوتا ہے، جن میں تحلیل نفسی، تاریخ اور فلسفہ سب ہی شامل ہیں جو کہ اینگلو سیکسن تجربیت پسندی سے خاصی مختلف ہے۔

۱۹۳۳ء کی شروعات میں ہی این این ٹرویٹ تاسکی نے کہا تھا کہ ساختیات دان آفاقی اصولوں سے کیمیا، حیاتیات، نفسیات، معاشیات اور لسانیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن چوتھی دہائی میں اسٹروس نے جس ساختیاتی طریقہ کار کو وضع کیا اس پر شمالی اور جنوبی امریکہ کی قبائلی اسطور کا غلبہ تھا۔ جہاں اسٹروس نے لسانی اختلافات اور بولی جانے والی زبان کی ترسیل کا کو معاشرتی مظاہر اور حقائق کے ساتھ تجزیہ کیا۔

ساختیات سے متعلقہ مباحث میں کئی اہل فکر نے زبان شکنی کے نظریات بھی پیش کیے۔ مثلاً رکلیوع کے اصل مطالعے کا مرکزی نکتہ زبان سے اختلاف تھا۔ خاص طور پر انھوں نے استعارہ (Metaphor) اور صفت بدل (Metonymy) کے دوہرے پہلوؤں پر شدید نکتہ چینی کی۔ ۱۹۶۰ء میں اسٹروس نے اپنے نظریے کو بیان کیا لیکن ریکوایرو نے زبان کو زیادہ اہمیت نہ دی جو بذات خود استعارہ انکار تھے۔ انھوں نے اسطور کو اولین مقام دیتے ہوئے اس کو فوق الفطری مظہر کہا اور اس تصور کو اپنے طور پر بیان کرنے کی کوشش بھی کی یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ اس نے فرد، وجود اور خدا کے تصور کے درمیان جو خلیج در آئی تھی اس کو انھوں نے ایک دوسرے سے باہم کر دیا۔ لوفے نے ریکٹو کی بیان کی ہوئی فرد اور خدا کی جدلیات پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تصورات کی ترتیب بگاڑ کر اپنی تفہیم (Heremeuites) کو تشکیل دیا ہے جو کسی نہ کسی طور پر لوفے کے مارکسی نظریات کو کالعدم قرار دیتے ہیں۔ لیکن انھوں نے مارکسی لسانی ساختیات کو اشیاء (مادی) کے حوالے سے سوچتے ہوئے سامر کے "نشانیات" کے تصور سے اختلاف کیا جو اشیاء پیغامات (اشتہارات برائے صارفین) یعنی جو معنی نما (Signifier) ہیں۔ لیکن لوفے کے کمزور ساختیاتی خیالات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ لہٰذا انھوں نے اپنی علمی دلچسپی کو عمرانیات اور حضریات کی طرف

موڑ دیا لیکن ان کے نظریات نے ایک مارکسی یوٹوپیا کو ضرور جنم دے دیا جو خاص کر فرانس میں ۱۹۶۸ء کی طلبا کی تحریک میں نظریاتی ایندھن کا کام دے گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی پرانی مارکسی لائن پر پھر آ گئے اور دوبارہ بورژوازی ساختیے کی بات کرنے لگے۔ انھوں نے التھیوزر کے تصور سائنٹفک مارکسزم پر بہت ہی شدید قسم کے حملے کیے۔ التھیوزر مارکس کے اولین "انسانی" تصور کو تسلیم نہیں کرتے تھے جبکہ لوفے مارکسزم کی اصل روح کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ۱۸۴۴ء والے مارکسی مسودے اور جرمن آئیڈ لوجی مارکس کا عبوری علمی کام تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوفے لینن کی ریاست کو نظریاتی ہاتھوں میں لینے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اور لینن کے قریب قریب تمام تصورات و نظریات سے کچھ متفق بھی تھے۔ جو کسی طور پر انقلابی دور میں مسئلہ بنتے ہیں مگر وہ مارکس کے علاوہ فرائڈ اور نطشے کے خیالات سے بھی کچھ کم متاثر نہ تھے جو "انقلاب" میں مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔

لاکاں (Lacan) کی تحریروں میں گو روایتی معاشرتی انقلاب کی گونج سنائی نہیں دیتی لیکن جب وہ شعور پر بحث کرتے ہیں تو اس میں انقلابی تصور کی بو ضرور آتی ہے۔ لاکان کے خیالات میں متن لاشعوری ہوتا ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا اور متن کی جڑیں زبان میں ہوتی ہیں جو ایک مضبوط اور ٹھوس قسم کا انکشاف بھی ہے۔ انفرادی تاریخ کا دوبارہ سراغ لگایا جا سکتا ہے چاہے وہ جذباتی ہیجان کی صورت میں ہوں یا بچپن کی یادوں میں ان کا تجزیہ کیا جائے یا روایت کو کھنگالا جائے۔ لیکن ہم زبان کے ساختیے کو بیان نہیں کر سکتے۔ لاکان کے خیال میں معنویت کی ترسیل صوتی ساختیہ اور نظام رمزیات کا تمام ڈھانچہ نفسیاتی ہوتا ہے لہٰذا ساختیاتی لسانیات کا طریقہ کار تحلیل نفسی میں داخل ہو جاتا ہے۔

مثلاً فوکو کے یہاں معاشرتی صورت حال کے درمیان چھپے ہوئے روابط، تصورات، رسم و رواج، اقتدار کے تعلقات اور خاص کر ان کی ماہیت کے درمیان سترہویں صدی تک کے معاشرتی عناصر کے مختلف سیاق کا سراغ لگایا گیا ہے۔ ان کے خیال میں معاشرتی رموز (کوڈ) کی آگاہی معاشرے میں تبادلے کی صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ بہر حال وہ معاشرتی سطح پر اپنی تجاویز بھی پیش کرتے ہیں جن کا معاشرتی ساختیے میں وجود ہوتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے معاشرتی دیوانہ پن، بیماریوں، جرائم اور جنسیات پر کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن انھوں نے نئی

ساختیات کا سہارا لیتے ہوئے تغیر پذیر ماہیت سے ہمیشہ اختلاف کیا۔ کیونکہ اقتدار پسندی کے رموز سائنٹفک رموز کی آگہی کے پیچھے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے قبل فوکو کو ساختیاتی حوالے سے تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

رونالڈ بارتھ نے لکھا تھا کہ ساختیات کوئی دبستان فکر نہیں ہے اور نہ ہی کوئی تحریک ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں۔ خاص کر اس کو علم تشریح یا قواعدیات سے منسلک کیا جاتا رہا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا رہا ہے کہ ساختیات متن کے اندر ہی رہتی ہے اس سے باہر نکلنے کی اس میں جرأت نہیں۔ جبکہ سارتر کے تصور شعور سے بھی اس کو پرکھا گیا۔ لاکان نے Scilicer کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ Poobeilication Structuralist ہے۔ بارتھ نے بھی ہمیشہ بنے بنائے عقائد سے اختلاف کیا ہے۔ خالص ادبی تنقیدی اصولوں سے بھی انہیں برہمی رہی۔ وہ ساختیات کو ایک "سرگرمی" تصور کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ساختیاتی طریقہ کار "نشانیات" میں پوشیدہ ہے جس میں کسی نظریاتی تناظر کی صورت نہیں ہوتی۔ ان کا طرز عمل بہت زیادہ ذاتی نوعیت کا ہے اس کو شہوانی (Erotic) تنقید بھی کہا گیا اس میں ساختیاتی عناصر نظر آتے ہیں۔ جس ساختیات کو لیوی اسٹروس نے پروان چڑھایا وہ آج اپنی موت آپ مر چکا ہے کیونکہ وہ عالمگیر ذہنی ساختیے کا حصہ نہ بن سکی۔ لیکن اسٹروس کی ساختیات سے کئی فکری مباحث کے دروازے ضرور کھل گئے۔ مثلاً جولیا کرسٹیوا کے خیالات گو نشانیات میں کسی انقلابی فکر کا پتہ نہیں دیتے لیکن وہ علامتی جدلیات کے معنوی ساختیے کا انکشاف ضرور کرتے ہیں۔ ژیل ڈیلز (Deleuze) اور گوتاری (Guattari) اینٹی ایڈی پس نہیں! جیسا کہ پیرس میں لاکاں کا "ایڈی پس" ڈرامہ ناکام رہا۔ جب لسانی سطح پر بچوں کے مسائل، علامتی مباحث ساختیاتی کائنات (علم) میں داخل ہوئے تو ساختیات کی جگہ پس ساختیات نے لے لی۔ یہ بات تو اب پرانی ہو چکی ہے کہ ساختیات وجودیت کا ردعمل تھا لیکن یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ آخر ساختیات کا ساختیات پر سے اعتماد کیوں اٹھ گیا اور آخر کیوں ساختیات وجودیت کا نعم البدل بن سکی؟ ساختیے کے کئی معنی ہیں (یا ہو سکتے ہیں) پہلا یہ کہ اس سے مراد کسی چیز کو تشکیل کرنے کے ہیں جو کہ مباحث کے اجزاء کو ایک دوسرے سے باہم کرتے ہیں اور استعاراتی معنویت کی ایک عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف اس کا لسانیاتی مفہوم یہ بھی ہے جس میں معنویت

اور ہیئت کے اجزائے ترکیبی انسانی جسم کے اعضا کی طرح ایک دوسرے سے باہم ہوتے ہیں اور اپنی کارکردگی سرانجام دیتے ہیں۔ اگر ریاضیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ معنویت کے تجریدی روابط ہوتے ہیں جو کسی صوری ڈھانچے میں مختلف سیاقیات کو بیان کرتے ہیں لیکن اس کی میکانیت میں ساختیات ایک مکمل علم کی صورت میں چھپی ہوتی ہے جو ایک عمرانیاتی سیاق کا احاطہ کرتی ہے۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پراگ سرکل کے لسانی مکتب سے پروان چڑھنے والے رجحانات نے ساختیات کی بنیاد رکھی جو مزید پھیل کر مختلف انسانی اور معاشرتی علوم میں داخل ہو گئی مگر سائنسی صوتیات کو ساختیاتی شکل دینے میں نکولائی ترو بیٹزکی (Nicolai Trubetzkoy) (۱۸۹۰ء-۱۹۳۷ء) نے اہم کردار ادا کرتے ہوئے صوتیات کے مختلف پہلوؤں کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا اور کئی علمی قیاسات قائم کرتے ہوئے یہ بتایا کہ تمام سائنسی اصول اور رویے ساختیات کی خودکاریت کی جگہ لے سکتے ہیں۔ اس قسم کے رویے کیمیا، حیاتیات، معاشیات، نفسیات اور دیگر متعلقہ علوم میں کئے جا سکتے ہیں۔ تیسری دہائی میں راجر بیسٹائڈ (Roger Bastide) نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ساختیات کا تصور حیاتیات سے زیادہ ریاضیاتی تناظر میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات گسٹالٹ کی نفسیات سے محرومی کا نتیجہ دکھائی دیتی ہے۔

ژاں پی ژے (Piaget) نے ساختیات کا صوری تصور پیش کیا جو انسان کے منتشر ذہن کا مطالعہ تھا جس میں انھوں نے کئی اصول واضع کئے۔ جہاں اصول و ضوابط اور ان سے متعلقہ مبادیات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ پی ژے کا یہ تصور طرز عمل سے تبدیل ہو کر اور ای نفسیات میں سما جاتا ہے اور طرز عمل کسی حد تک اس کے ساختیاتی تجزیے کو مشتبہ بھی کر دیتا ہے۔ جس طرح لیوی اسٹروس نے بشریات کو مشکوک بنا دیا لیکن ژاں پی ژے کے مبادلے کے نظریے نے مکمل طور پر ساختیاتی تحقیقات کو بھی بیان کیا جس نے صوری نوعیت کی شکل اختیار کرتے ہوئے معاشرتی علوم کی نئی اور پرانی ساختیات میں خط امتیاز کھینچ دیا۔ خاص کر ریڈ کلف براؤن، جین مکوروو سکی (Jean Mukarovsky) ٹالکوٹ پارسنز نے وظائفی ساختیات کے تصور کو پروان چڑھایا جو کہ فرانسیسی ساختیات کے لئے غیر ضروری تھا۔ ریڈ کلف براؤن

کی معاشرتی ساختیات اور پارسز کا معاشرتی نظام کا تصور بذات خود ایک تبدیلی کا تصور تھا جو کہ ساختیاتی ماڈل میں جوڑ دیا گیا۔ لیوی اسٹروس نے انگلستانی بشریاتی نظریے پر کئی الزامات عائد کئے۔ خاص طور پر آکسفورڈ کے دبستان جس کی قیادت براون کر رہے تھے، خاص کر اسٹروس کے نتائجی خیالات سے مطمئن نہ تھے۔ لیکن اسٹروس نے کبھی بھی پارسز کی وظائفی ساختیات پر اس قدر انتہا پسندانہ تنقید نہ کی۔ حالانکہ براون اور پارسز دونوں ہی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ساختیہ اپنے کائناتی مزاج میں ہمیشہ صوری ہوتا ہے۔ یہ تصور عمرانیاتی علوم میں داخل ہو کر ایک اصطلاح کی صورت اختیار کر گیا اور اس کی تعریف یوں کی گئی کہ "یہ اجتماعی ضروریات اور معاشرتی وظائف کے مابین روابط کا نام ہے۔" ژاں پی ثرے نے بھی ذاتی اصول وضوابط کے نظریے میں قریب قریب انہی خیالات کا اظہار کیا تھا لیکن وہ اس بات کو نظرانداز کر گئے کہ مساویانہ ممکنات کے درمیان مختلف ساختیاتی اکائیوں اور نظام کو اپنے وجود کا احساس دلواتے ہیں۔ انہی بنیادی تضادات کو معاشرتی نظریے کی اصطلاح میں palaeo ساختیات بھی کہا گیا جو جدید ساختیات کا صوری نقطۂ نظر ہے یہ نفس مضمون سے مختلف نہیں ہوتا اور بشریات میں بہت واضح ہوتا ہے۔ آکسفورڈ کا دبستان بشریات جو بھی ساختیاتی مطالعہ Palaeo ساختیات کے حوالے سے کرتا تھا وہ ثقافت کے اختلاف سے جنم لیتا تھا، جو معاشرے کی مضبوطی (Hardware) ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کی نرمی کہاں ہے؟ جدید ساختیات عموماً ثقافتی حوالے سے مباحث کو چھیڑتی ہے نہ کہ معاشرتی ساختیے کی طرف اس کا جھکاؤ ہوتا ہے جس میں وہ زبان اسطوریہ، رسم و رواج اور ثقافت کے علامتی رویوں اور دیگر ثقافتی محرکات وغیرہ کو موضوع بحث بناتی ہے۔ پال ڈی مین کا خیال ہے کہ جب بھی کسی تحریر کا ساختیاتی تجزیہ کیا جاتا ہے تو قرات ہمیشہ مغالطے پیدا کرتی ہے۔ خاص طور پر یہ مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب رومانوی اور ہیت پسند شعرا کی وحدتوں کو تشکیل دیا جا رہا ہوتا ہے اور کسی قسم کی ثقافتی تخفیف، تنقید اور ادب کے تنقیدی اسلوب میں در آتی ہے یہ تشریح کا نتیجہ ثابت ہوتے ہیں۔ ارنسٹ گیلنر (Ernest Gellner) نے سب سے پہلے نئی اور پرانی ساختیات کے اختلافات کی طرف اشارہ کیا جس میں انھوں نے لاک کی ابتدائی اور ثانوی مشابہتوں کے اوصاف کا فرق واضح کیا۔ ان کی نظر میں Palaeo ساختیات کے خدوخال بحیثیت نظریے کے ابتدائی معاشرتی اوصاف ہیں جو کہ اقتصادی اور اقتدار کے روابط میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ جبکہ نئی ساختیات دوسری جانب ہے جو کہ ثانوی نوعیت کی ہوتی ہے یا جس کو ہم ثقافتی رموز (کوڈ) کا سطحی ساختیہ یا معاشرتی وصف کہہ سکتے ہیں لیکن لیوی اسٹروس کے تصور "رشتہ داری" کے مطالعہ میں نئی ساختیات اور پرانی ساختیات کے مابین تقسیم محنت کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ گیلنر کے خیال میں اس ساختیات میں ایک سخت قسم کی ثقافت کا جبر سامنے آتا ہے۔

جدید ساختیات اپنے ماڈل کو ترتیب دینے کے لئے ثقافتی بد ساختیات سے مدد لیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ ثانوی ڈھانچے کو مد نظر رکھتے ہوئے اوصاف کا تعین کرتے ہیں جس کی معنی خیزی ہم مارکس اور فرائڈ کے ساختیاتی ماڈل یا Paroto کی ساختیات میں تلاش کر سکتے ہیں، یہ ساسر کے تصور "نسل" کے ساتھ اپنی رواداری کا احساس دلواتا ہے۔ بنیادی ساختیات سطحی مظہر ہوتا ہے لیکن وہ دیگر مظاہر کو متحرک بھی رکھتا ہے اور اس کی گہرائی میں اترتا بھی ہے لیکن یہ گہرائی ساختیات کے لئے ناکافی ہوتی ہے کیونکہ اس قسم کے عمومی مطالعہ اور تجزیہ کے لئے ایک بڑی افقی میکانیت سے آگہی ضروری ہے۔ اس قسم کی سخت گیر گہرائی مارکس کی ٹیکنالوجی کی قوت اور اس سے متعلق پیداواری نظریے میں نظر آتی ہے۔ اس طرح کی فطری گہرائی فرائڈ کے خیالات میں نہیں ملتی۔ سخت گیر گہرائی یہاں سطحی بن کر فطری زبان کے مظہریاتی قوانین کو ترتیب دیتی ہیں۔ لیکن ساختیات کے چند بڑے اصول یہ ہیں:

۱۔ یہ نتائجی استعاروں اور نامیاتی اصولوں کو تشکیل دینے سے زیادہ صوری اور تغیر پذیر مظاہر کی نوعیتوں کا زیادہ احاطہ کرتے ہیں۔

۲۔ معاشرے میں اس سطح پر اس کی بنیاد ایک خاص مقام پر قائم ہوتی ہے اور اس کا اصل وظیفہ جدید لسانیات کو بیان کرتا ہے چاہے ساختیات معاشرتی علوم میں جتنا بھی رچا بسا کیوں نہ ہو۔

ساختیات کا نامیاتی علامتی سفر بنیادی سطح پر افراد کے باہمی روابط کے مماثلتی رویوں کی طرح ہے، جہاں لکھنے والے کو پڑھنے والا سمجھنا چاہتا ہے، مصنف کا پیغام، قاری، سیاق اور رموز کے حوالے سے شناخت کر کے عمودی اور افقی ادراک کا انکشاف کرتا ہے۔ اس سطح پر

آخر ساختیات "منطق" ہو جاتی ہے جو تجریدی اور ٹھوس بنیادوں پر کبھی کبھار معنیاتی تجربے (نظام) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

○○

REFERENCES

Althusser, Louis Lenin and Philosophy and other Essays, (London, New Left Books, 1971)

Bloom, Harol The Anxiety of Influence: A Theory of Poetry, New York: Oxford University Press, 1973

Burt, Ronald S. Towards a Structural Theory of Action (New York: Academic Press, 1982)

Broekman, Jan M. Structuralism (Dordrecht, Boston, D. Reidel Pub. Co. 1974.

Barthes, Roland, Critical Essays, Trans, Richard Howard, Evanston, Ill: North-Western University Press, 1972.

---------------- Elements of Semilogy, Trans. A. Lavers and C. Smith, New York, Hill and Wang, 1977.

---------------- Writing Degree Zero, Trans. A. Lavers and C. Simith, New York: Hill and Wang, 1977.

Cooper, Barry, Michel Foucault: An Introduction to the Study of his Thought (New york, Edwin Mellen Press, 1981).

Caute, David Communism and the French Intellectuals 1914-1960 (London: Deutsh, 1964).

Cousing, Mark and Hussein, Athar, Michel Foucult (London: Macmillan, 1984).

Culler, Jonathan, The Pursuit of Signs (London: Routedge & Kegan Paul, 1981).

Guller, Jonathan, Ferdinand de Saussure, Baltimore: Penguin Books, 1976.

---------------- Structuralist Poetics: Structuralism, Linguistics, and the Study of Literature, Ithaca, N.Y.: Cornell University Press, 1975.

Eco, Umberto, I.Opera Aperta. Milan. Bompiani, 1962.

---------------- A Theory of Semiotics. Bloomington: Indiana Univ Press, 1976.

Ehrmann, Jacques ed. Structuralism Garden City, N.Y. Foublrfsy, 1970

Greimas, A.J. Structural Semantics: An Attempt at a Method. Trans, Deniele McDowell, Ronald Schleifer, and Alna Velie. Intro. Ronald Schleifer. Lincoln: Univ. of Nebraska Press, 1983

Hawkes, Terence, Structuralism and Semiotics. Berkeley: Univ. of California Press, 1977.

Jokobson, Roman. Fundamentals of Language. The Hague: Mouton, 1975.

---------------- "Linguistics and Poetics." In Style In Language. Ed. Thomas Sebeok. Cambridge, Mass: MIT Press, 19960.

Jameson, Fredric, The Prison-House of Language: A Critical Account of Structuralism and Russian Formalism Princeton. N.J.: Princeton Univeristy Press, 1972.

Kristeva, Julia. Desire in Language, Trans. Thomas Gora, Alica Jardine, and Leon S. Roudeiz, New York: Columbia University, Press, 1980.

Lentricehia, Frank. After the New Criticism. Chicago: University of Chcago Press, 1980.

Levi-Strauss, Chaude, Structural Anthopology. Vols. I and II. Trans Monique Layton, New York: Basic Books, 1963 and 19770

Lane, Michael, Introduction to Structuralism (Basic Books, c1970)

Macksey, Richard and Eugenio Donato, eds. The Structuralist Controversy. Baltimore: Johns Hopkins University Press, 1970.

Morse, David. Romanticism, A Structural Analysis (London: Mac-Millan, 1982).

Posner, Charles (ed). Reflections on the Revolution in France: 1968 (Harmondsworth: Penguin, 1970).

Poster, Mark, Existential Marxism in Post-War France: From Sartre to Althusser (New Jersey: Princeton UP, 1975).

--------------- Foucault, Marxism and History: Mode of Production versus Mode of information (Cambridge Polity P. 1984).

Peirce, Charles S. Collected Papers, Ed. Charles Hatshorne and Paul Weiss Cambridge, Mass Harvard Univ. Press, 1931-58

Propp, Vladmimir. The Morphology of the Folktale. Trans. Laurence Scott. Austim: Univ. of Texas Press, 1968.

Prost, Antoine, Histoire de PEnseinment en France 1800-1967 (Paris: Armand Colin, 1968).

Racevskis, Karlis, Michel Foucault and the Subversion of Intellect (Ithaca: Cornell UP, !1983).

Rajchman, John, Lacan and the Ethics of Modernity, Representations 15 (Summer 1986) pp. 42-56).

Rorty, Richard, Consequences of Pragmatism (Brighton: The Harvester P. 1982)

--------------- 'Philosophy As A Kind Of Writing: An Essay On Derrida'. NLH 10 (1978) PP. 141-60.

Roth, Michael S. 'Foucault's History of the Present' History and Theory 20 (1981).

Russell, Charles, Poets, Prophets, Revolutionaries: The Literary Avant-Garde from Rimbaul through Postmodernism (Oxford UP, 1985).

Riffaterre, Michael, Semiotics of Poetry. Bloomington: Indiana University Press, 1978.

--------------- The World, The Text and the Critic (London: Faber & Faber, 1984).

Schaff, Adam. Structuralism and Marxism (Oxford [Eng.]; Pergamon Press, c1977)

Schnapp, Alain and Vidai-Naquet, Pierre, The French Student Up-rising, November 1967 - June 1968: An Analytical Record (Baston: Beacon P, 1971).

Scholes, Robert, Semiotics and Interpretation (New Havan: Yale UP, 1982).

--------------- Textual Power: Literary Theory and the Teaching of English (New Havan: Yale UP, 1985).

Stregm Uller, Wolfgang, The Structuralist View of Theories (Berlin: Sturock John Structrualism (London, England: Paladhin, 1986)

Seigel, Jerrold, Bohemian Paris: Culture, Politics and the Boundaries of Bougeois Life 1830-1930 (New York: Viking, 1986)

Sheridan, Alsn, Michel Foucault: The will to Truth (London: Tavistock, 1980).

Smart, Barry, Foucault, Marxism and Critique (London: Routledge & Kegan Paul, 1983).

Smith, Joseph H. and Kerrigan Villam, Interpreting Lacan (New Haven: Yale UP, 1983).

Saussure, Ferdinand de. Course in General Linquistics. Trans, Wade Baskin, 1916: Reprint, New York McGraw-Hill, 1966.

Scholes, Robert, Structuralism in Literature: An Introduction. New Haven. Conn.: Yale University Press, 1974.

Tatham, Campbell. "Beyond Structuralism." Genre, 10, No. 1[1977], 131-55

Todorov, Tzvetan, The Fantastic: A Structural Approach to a Literary Genre, Trans. R. Howard Ithaca, N.Y: Cornell Univ. Press, 1975.

--------------- Introduction to Poetics, Trans. R. Howard, Minneapolis: Univ. of Minnesota Press, 1981.

تیسرا باب

وظائفی ساختیات کا سفر
ادب سے عمرانیات تک

وظائفی ساختیات کا سفر
ادب سے عمرانیات تک

ادب کی تنقید میں وظائفی ساختیات (Functional Structuralism) کا مسئلہ ابھی تک بہت کم زیر بحث آیا ہے۔ مغرب میں کچھ لوگوں نے اس پر توجہ ضرور دی ہے، جس طرح ساختیات، ردِ تشکیل، تفہیمات اور جنی ساختیات کو مغرب میں کسی حد تک فروغ حاصل ہوا ہے وہ وظائفی ساختیات کے حصے میں نہیں آیا لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا جا رہا ہے جہاں تنقید اور دیگر علوم باہم ہو کر فکر اور تکنیک کی نئی وسعتوں کو جنم دے رہے ہیں وہاں وظائفی ساختیات سے امید کی جا رہی ہے کہ وہ ادب کے تنقیدی اور فکری نظریے میں نئی جہات کا انکشاف کرے گی۔ گو یورپ اور امریکہ وظائفی ساختیات کے حوالے سے اہم ادبی تنقیدی اور لسانی نظریے کے کسی اہم باب کو نہ کھول سکے۔ وظائفی ساختیات کے وسیع فکری تناظر میں قدیم اور جدید ادب و لسان کے پیچیدہ اور بعید از فہم رموز، ساختیات اور ردِ تشکیل کی موشگافیوں میں الجھ جانے والے سنجیدہ مسائل کو وظائفی ساختیات کے حوالے سے کسی حد تک سلجھایا جا سکتا ہے۔

وظائفی ساختیات کا تصور ادبی اور لسانی تنقید میں عمرانیات، معاشرتی بشریات اور ریاضیاتی علوم سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اس میں وظائفی طریقہ کار کی اہمیت کچھ زیادہ رہی ہے۔ خاص طور پر انیسویں صدی میں جب عمرانیاتی علوم کی طرف خصوصی توجہ مبذول ہوئی تو حیاتیاتی علوم اور عمرانیاتی علوم کی مشابہتوں کو تلاش کیا گیا۔ یونانی روایت کو کھنگالتے ہوئے شروع کے مسیحی دور سے قرونِ وسطیٰ تک شرح اور تشریح کا سفر شروع ہوا۔ نامیاتی (Organic) تمثالوں میں

ہابس (Hobbes) اور روسو (Rousseau) نے نامیاتی تصورات کو اُبھارا۔ جدید عمرانیات کے بانی آگسٹ کامت (Comte) نے سکونی (Static) اور حرکی (Dynamic) امور کا تجزیہ کرتے ہوئے عمرانیات میں معاشرتی نامیات کا انکشاف کیا جو کہ ان کی نظر میں فرد کی حیاتیاتی نامیات تھی۔ یہی تصور آگے چل کر نئی سائنس کی شکل اختیار کر گیا انہی تصورات سے متاثر ہو کر ہربرٹ اسپنسر (Spencer) نے چارلس ڈارون (Darwin) کے تصورات کی مدد سے نئی نامیاتی مشابہتوں کو تلاش کیا۔ انھوں نے ڈارون کی کتاب "اصولِ حیاتیات" (The Principles of Biology) سے متاثر ہو کر اصول عمرانیات (The Principles of Sociology) لکھ کر نامیاتی مشابہتوں کے درمیان ماحولیاتی طریقہ کار کی تفہیم کی۔ ہربرٹ اسپنسر معاشرے کو "نامیاتی" ہی تصور کرتا ہے۔ ثقافتی سطح پر ایمل درکھائم (Durkheim) اور ڈبلیو رابنسن (Robertson) نے وظائفی حقائق کا نیا تصور پیش کیا جس کے زیر اثر ملینووسکی (Malinowski) نے معاشرتی حقائق اور طبیعی گرد و پیش کے عناصر کا تجزیہ کرتے ہوئے تہذیب کے ہر وظیفے کو خاص وظائفی رویوں سے تعبیر کیا۔ درکھائم نے ساتھ ہی کامت کے تصورات اور مائیکو کی معاشرتی لفظیات (Morphology) کا سکونی تجزیہ بھی کیا۔ درکھائم کے دبستان "اینی" (Ann'ee) کے ایک رُکن رابرٹ ہرٹز (Hertz) کے مضمون Death the Right Hand میں ساختیات کی معنویت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن کوئی پچاس سال بعد لیوی اسٹراس نے درکھائم کے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے اساطیر کی درجہ بندی کی جو کہ جدید ساختیات میں تحقیق کی نئی جہت بنی، اس میں سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ تفاعل کے درمیان کسی مظہر و مشاہدہ کی معنویت کیا ہوتی ہے۔ ساتھ ہی اسطور کو ساختیاتی سطح پر پرکھا گیا جو مشاہدے میں آتے ہیں۔ اسٹراس پر ساسر کے لسانی تصورات کا بھی گہرا اثر رہا جس میں وہ درکھائم کے معاشرتی حقائق کی تعبیر تلاش کرتے تھے۔ اسٹراس کے علاوہ نکولائی ٹروبسکی اور رومان جیکب سن پر بھی ساسر کے اثرات بہت گہرے تھے۔ ساسر کے یہی نظریات لیمونٹ (Lamont)، واتھنو (Wathnow) اور براؤن (Brown) تک آئے جو معاشرے کو بھی "متن" قرار دیتے ہیں۔ انگلستان میں ریڈ کلف براؤن، اے سی ہیڈن، ڈبلیو ایچ آر ریور بھی درکھائم کے ہم خیال ہیں جو ان تاریخی قربتوں کو رد کرتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان جو نئی وظائفی ساختیات رونما ہوئی تھی، ادب میں ہنوز عملی

ساختیات بھرپور طور پر شامل نہ ہو سکی۔ بایں ہمہ جین مکوروسکی، ژاکبسن (جیکب سن) اور لیوی اسٹراس نے خاص حد تک ادبی تنقید کے عملی ساختیاتی تصور کو فروغ دیا۔ ادبی تنقید میں عملی ساختیات کے عموماً اہم نکات یہ ہیں:

(۱) مشاہداتی مظاہر کیا ہیں، جن کو ہم تخلیقی نمونے کہہ سکتے ہیں۔

(۲) کن حالات میں تحریر لکھی گئی، کیا ان کی کوئی تجرباتی توجیہہ ہو سکتی ہے یا اس تحریر نے کسی اہم مظہر کا انکشاف کیا ہے؟

(۳) تحریر میں جو نقطہ نظر بیان کیا جا رہا ہے، اس کا طریق کار کیا ہے؟ کیا اس عمل سے تحریر میں پائے جانے والے انسانی، متنی اور سیاقی رشتوں میں کوئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے؟

(۴) کیا مطابقت، انجذاب، تصادم اور تعاون کی صورت حال سامنے آتی ہے؟

(۵) مخصوص لسانی عمرانیاتی یا بشری ساختیے کے حوالے سے عملی کارکردگی کی کوئی جہت سامنے آ رہی ہے؟

(۶) کیا تخلیقی عمل سے کوئی نئی ساختیاتی معنویت ظاہر ہوتی ہے؟

وظائفی ساختیاتی تنقید میں تخلیقی یا لسانی عمل کا منطق سے زیادہ سائنسی اسلوب سے مطالعہ کیا جاتا ہے جس میں تصورات کا مختلف سمتوں سے تقابل و تفہیم کرتے ہوئے مظہریاتی نقطہ نظر سے نمونوں (پیٹرن) کی تجرید کو سلجھایا جاتا ہے۔ رابرٹ مارٹن نے ساختیات کی اس نہج کو بہت قدامت پسندانہ رنگ دیا۔ حالانکہ اس نظریے اور تکنیک میں ایسی کوئی بات نہیں کیونکہ اس نظریے کے مطابق تخلیقی عمل کے امور کی تشریح اس مخصوص تخلیقی نتائج کو دیکھ کر بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ تخلیقی یا لسانی عمل کی ساختیاتی وسعت چاہے کسی بھی نوعیت کی کیوں نہ ہو یہ عموماً متن، سیاق، رموز اور اساطیری علائم سے متعلق ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی لاتعداد ذیلی عناصر جن میں اجتماعی تصورات بھی شامل ہوتے ہیں، تحریر کے عملی ساختیے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس میں ثقافت کا ماحولیاتی عنصر سب سے زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ یہ مختلف عناصر ہی "تخلیق کل" یا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ یوں تو بیانیہ حقائق سے بھی تخلیق کا عملی ساختیہ تشکیل پاتا ہے لیکن اخلاقی تصورات ان پر کوئی زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ اخلاقی تصورات موضوعی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے جب اس تصور کو عمرانیاتی سیاق میں کوئی

تخلیق کار اپنی تحریر میں جگہ دیتا ہے تو اسے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ مغربی ادب میں خاص کر امریکی
ادب میں جوناتھن ایڈورس (۱۷۵۳ء-۱۷۵۸ء) اور اردو میں نذیر احمد اور راشد الخیری کے
یہاں نظر آتا ہے۔ انتظار حسین کے افسانوں میں بالخصوص یا ن م راشد کی نظموں میں جو تھوڑی
بہت اساطیری فضا ملتی ہے وہ بہر حال کسی نہ کسی صورت میں عمرانی حقائق اور اس سے متعلقہ
حرکیات کی صورت میں تخلیقی سطح پر ساختیاتی نوعیت رکھتی ہے ان کے تخلیقی نظام میں وظائفی
ساختیات کے دس اصول ایسے ہیں جو ادب کے تخلیقی عمل کے اجزا بھی ہیں:

(۱) تخیل، ابلاغ اور اظہار
(۲) متن، سیاق، رموز کا ذہنی خاکہ اور اس کی عمرانیاتی تعبیر
(۳) فرد اور اس کے اجتماعی ساختیے کا ادراک
(۴) ارتباط، تفاعل، عمرانیاتی تبدیلی کی رفتار
(۵) فرد کے مزاج سے آگہی
(۶) مظاہر کی موضوعی و معروضی توجیہ
(۷) فرد کے ذہنی ساختیے اور معاشرتی تخلیقی وظائف کے درمیان در آنے والی رکاوٹیں
(۸) تخلیقی اظہار میں در آنے والی تشکیک جو تخلیقی اقدار کی صورت اختیار کر جاتی ہے
(۹) ہیئتی اور حقیقی تخلیقی ساختیے کا باہمی انحراف و ارتباط
(۱۰) تجربے کا موضوعی اور معروضی تجزیہ

ساختیاتی عمرانیات کے تمام مسائل وظائفی مظاہر میں پوشیدہ ہیں۔ عمرانیات اصل میں
ساختیات کے ہی زیر اثر رہی، جس میں پہلا مقام اتصال نسبت / اضافیہ (Relativism) کا ہے
جو کہ معاشرتی ساختیات کو عمیق مطالعے کے لئے فوقیت دیتی ہے جو فطرت اور ثقافت کی ضد
(Anti-Thesis) یا نفی سے متعلق ہوتی ہے۔ ان فکری مباحث میں خصوصی حوالہ نسلیات،
ثقافت بشریات، عمرانیاتی لسانیات اور نسلی ساختیات کا ہوتا ہے۔ جب ہم درکھائم، ٹونیس،
ماؤس، بواس، کوپر، میلنوسکی، وڑیکا، ریڈ کلف براؤن، ہینگل، ٹالکوٹ، پارسنز، مارٹن، زیونی،
کوزو اور کنگسلے ڈیوس جیسے عمرانیاتی محققین اور نقادوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس حوالے سے
سب سے زیادہ لوئی کلوریل اسٹروس کا ذکر کیا جاتا ہے جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک برازیل کی

جامعہ ساؤ پولو میں شعبۂ عمرانیات کے صدر نشین تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ اوپر جن لوگوں کا
ذکر کیا گیا ہے وہ سب ہی عمرانیات اور نسلیاتی ادراک کو معاشرتی ساختیہ تصور کرتے ہوئے
اس میں معاشرتی زندگی کی معنویت اور ثقافت کو تلاش کرتے ہیں لیکن ان سب نے اپنے
اپنے طور پر مخصوص قسم کے "معاشرتی ساختیے" کا عندیہ ضرور دیا ہے۔ لیکن لوئی اسٹروس کا
معاشرتی ساختیہ فکری سطح پر سب سے زیادہ فلسفیانہ سمتوں کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ انھوں
نے روسو کو ہی نہیں بلکہ مارکس، فرائڈ، ساسر، ژاں پال سارتر کے فلسفوں کا گہرائی سے مطالعہ
کیا تھا۔ لہٰذا ان کی بشریاتی تحریروں میں بھی اعلیٰ درجے کی ادبی علمیت نمایاں طور پر نظر آتی
ہے وہ یہ دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ یہ فلسفہ ہے یا ادب۔ انھوں نے مغرب کے تصور حیات کو
زمانی محسوسات اور تجربات کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغرب میں
ثقافتی تبدیلی بہت تیز نہیں ہے۔ وقت اور سچائی دوبارہ مخالف سمتوں کی طرف سفر کررہی
ہیں۔ اس احساس نے لیوی اسٹروس کے یہاں کئی رنگارنگ پس کرب (ناسٹلجیا) کو ابھارا۔ اس
سلسلے میں اسٹروس کی دو مثالوں کو سامنے رکھا جاسکتا ہے جو انھوں نے برازیل میں قیام کے
دوران بشریاتی تحقیق میں وضع کی تھیں۔ وسطی برازیل میں برورو (Bororo) نامی قبیلہ آباد ہے۔
یہاں کے باشندوں کی زندگی مغرب کے لوگوں کی طرح مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے،
جہاں اصل مسئلہ "موت" کا ہے۔ جب اس قبیلے میں کسی آدمی کی موت ہوجاتی ہے تو برورو
کے لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ موت کے آجانے سے گھر کے نئے سرپرست (بیوی) کی
زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، لیکن اس کا اثر پورے معاشرتی ساختیے پر ہوتا ہے۔ موت
فطری بھی ہوسکتی ہے لیکن بیک وقت وہ ثقافت شکن بھی ہوتی ہے۔ موت کا سانحہ اصل میں
انسانی رشتوں کے نمونوں (پیٹرن) کو بھی تبدیل کردیتا ہے۔ خاص طور پر ترقی پذیر اور
پسماندہ معاشروں میں جہاں یک اکائی خاندان کی روایت قائم ہے گھر کے واحد کمانے والے
کے مرجانے سے فطری ادارے "خاندان" کی حرکیات میں تبدیلی رونما ہوجاتی ہے جو کسی نہ
کسی طور پر ثقافت پر اثرانداز ہوتی ہے۔

ایک دوسری مثال کچھ یوں ہے کہ کیڈویو (Cadvevo) قبائل کے ریڈ انڈین اپنے چہروں
کو Geometrical Designs کی شکل میں رنگ کرتے ہیں جو کہ مرد کے لئے ایک بڑا اعزاز

ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کا فطرت سے ثقافت کی طرف تبادلہ ہوتا ہے جو کہ ذات کا شعوری تبادل بھی ہے جس کی علامتی طور پر تشریح نہیں کی جاسکتی اور یہ مقامی ریڈ انڈین فطرت کو حاضر علامتیں تصور کرتے ہیں۔ انہی علامتوں کی وجہ سے وہ مقامی ثقافت میں اپنی نمائندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس قسم کے بشریاتی تجزیات نسلیاتی مطالعوں میں کسی قسم کے اضافے کا سبب نہیں بنتے جسے ماحولیاتی ساختیات کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہو۔ مثال کے طور پر لوسین گولڈ مین کی تنقید بنیادی طور پر "تاریخ عمرانیات" کی تنقید ہے جو یہ بتاتی ہے کہ کس طرح ساختیات سے متعلق افراد عمرانیاتی رسائی سے مدد لیتے ہیں جن میں رابرٹ مارٹن کا معمولات کا تجزیہ، ٹالکورٹ پارسنز کا وظائفی مطالعہ شامل ہیں۔ گولڈ مین کے یہاں معاشرتی ساختیہ اور معاشرتی وظائف تاریخ کو متحرک رکھتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ بشریاتی تقسیم ہے جس میں فرد کی فطرت کا تاریخی مطالعہ کیا جاتا ہے جو معاشرتی ساختیہ اور معاشرتی وظائف سے متصادم ہوتا ہے۔ ساختیات دان بھی ساختیے سے وظائفی پہلوؤں کو علیحدہ کرتا ہے اور بنیادی تاریخی کرداروں کو مسخ کر دیتا ہے۔ گولڈ مین نے شاید ہی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہو کیونکہ یہ حاضر حقائق کے کھلے ہوئے سوالات ہوتے ہیں جو مناسب طریقوں سے مستقبل میں انکشاف کئے جانے چاہئیں۔

عموماً یہی اصول ساختیات کا سب سے کٹھن قسم کا اصول تصور کیا جاتا ہے جو ساختیات کے متعلقات کے ساتھ منسلک ہے اور یہی ان اصولوں کے نتائج بھی مرتب کرتا ہے۔ ایک مستحکم اور ٹھوس قسم کی صوری ساختیات کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ساختیات کے عمومی افکار بلاشرکت غیرے تجزیہ کئے جائیں۔ بہر حال ساختیات عمرانیاتی ہیئت میں بھی مطالعہ کی جاسکتی ہے جو کہ ماڈل بھی تشکیل دیتی ہے لیکن یہ تاریخی تبدیلی کا کوئی موضوع نہیں بن پاتی۔ جب بھی وظائفی ساختیات ماڈل تشکیل دیتی ہے تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ بیان کر رہی ہے۔ وہ واضح طور پر تخلیقی سطح پر معاشرتی حقائق کا اظہار ہے (ماڈل حرف آخر نہیں ہوتے) مثلاً لیوی اسٹروس نے اپنے تمام ساختیاتی مطالعوں میں یا تحقیقی بین السطور میں وظائفی رسائی اپنائی ہے۔ اس مرحلے پر خصوصی مسائل کے موضوعاتی تانے بانوں سے اچانک مڈبھیڑ ہو جاتی ہے اور پارسنز جیسے لوگ بھی تو ینت پسند کے عمرانیاتی نزاع میں گھر جاتے ہیں۔ گولڈ

مین کے خیال میں یہی وظائفی پہلوؤں کے فردی عنصر معاشرے میں موجود اداروں کی قوتوں کو متعین کرتے ہیں اور انھیں پروان چڑھاتے ہیں۔ ان کے خیال میں وظائفی پہلو تغیر کے مسائل تک مشکل ہی سے پہنچ پاتے ہیں۔ گولڈ مین کی اس بات سے جزوی طور پر اتفاق کیا جاسکتا ہے لیکن وظائفی ساختیات اپنے مطالعوں میں تغیراتی مظاہر سے ہی اپنی فکر کی تزئین کرتی ہے۔ یہ وظائفیت بھی وظائفیت سے دور نہیں رہی۔ یہ دونوں تصور ہمیشہ سے لازم و ملزوم رہے ہیں۔ اس میں حقیقی دریافتوں کے امکانات شامل نہیں ہوتے۔ یہ مسائل جنی (Genetic) ساختیات سے اپنی شراکت کا احساس دلواتے ہیں۔

اس موقع پر بہت سے اصطلاحی مغالطے جنم لیتے ہیں۔ یہ امتیازات ساختیے اور وظائف کے درمیان واضح طور پر اپنا وظیفہ سرانجام نہیں دے رہے ہوتے۔ یہ اصل میں وظائفی حرکیات ہوتی ہے جو بین المتنیت کو وسعت دے سکیں اور وہ تمام فکری مسائل کو اپنے پیچھے چھوڑ آتی ہے۔

جنی ساختیات ایک تاریخی تصور ہے اور یہ اپنے مزاج و اصل میں عینیت پسندی بھی ہے یہ ایک بار پھر مطالعوں کے پس منظر میں تاریخی یا غیر وقتی (Diachronic) جنی پہلوؤں کو عارضی طور پر غائب کر دیتی ہے لیکن اس قسم کی تنقید نے ساختیات کے غیر تاریخی تصورات کے تاریخی پہلوؤں کا اس نظر سے بھی مطالعہ کیا کہ شاید غیر تاریخی عوامل تاریخی عوامل کا سبب ہوں۔ گولڈ مین کے خیال میں سائنٹفک عمرانیات میں نزاعی مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ افراد کے خیالات کا جائزہ لیا جائے اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچا جائے یا لوگوں کے متعلق عکاسانہ اطلاعات جمع کی جائیں کہ وہ آجکل کیا کریں گے۔ اصل مسئلہ تو اس بنیادی طریقہ کار میں تاریخ کے مبادلیاتی ساختیے کا ہوتا ہے۔ یہ فرد، گروہ اور معاشرتی طبقات میں توازن پیدا کرتا ہے۔ یقیناً یہ اس وقت ہوتا ہے جب ساختیہ وظائفی نوعیت کی حرکیات سرانجام نہیں دے رہا ہوتا جو نئی تفصیلات کا انکشاف بھی کرتی ہیں۔ عمرانیات کا بنیادی وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ مبادلیاتی معاصر کے پرانے ساختیے کو ان مسائل و امور سے چھپایا جاتا ہے جس کا تعلق عملی حقائق سے ہوتا ہے جو کبھی نہ کبھی واضح طور پر ظاہر ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر طریقہ کار کے نقطہ نظر سے سوچتے ہوئے ٹالکورٹ پارسنز کے نظریات سے استفادہ کیا جائے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ

وظائفی ساختیات نے فرانسیسی غیر وظائفی ساختیات کے تقابل سے جنم لیا ہے۔ پارسز کے خیال میں وظائف کسی موجودہ ساختیے میں اپنے وجود کا احساس دلواتے ہیں۔ جب یہ مخصوص ساختیے میں وظائف سرانجام دینے میں ناکام رہتے ہیں تو یہ بدوظائفیت (Dysfunctional) کی شکل میں اُبھرتے ہیں۔ کیونکہ عمرانیات میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وظائفیت حاضر ساختیہ ہے جو معاشرے میں کسی نہ کسی طور پر رائج ہوتا ہے۔ اس سے طریقہ عمل کے عناصر جنم لیتے ہیں اور یہی ہیت بدوظائفیت کی صورت میں ابھرتی ہے۔ کیونکہ حاضر انکار برتاؤ کے کرداری حوالے سے کوئی فکری جہت معاشرے میں منتقل نہیں کرپارہے ہوتے۔ فردی استدلالیت کی تخلیق کرتا ہے اور نیا ساختیہ ہمیشہ وظائفی ہوتا ہے۔ یہ مستقبل میں نئے فکری دروازے کھولتا ہے۔ پہلا اہم اسلوبیاتی قدم یہ ہوتا ہے کہ معروض کا پہلے مطالعہ کیا جائے اور اس کے بعد معنویت کی گہرائی میں اترا جائے یہ اصل میں معروض کے وظائفی روابط ہوتے ہیں جو ہمیشہ اجتماعی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔

وظائفی عمرانیات کے حوالے سے ساختیاتی عمرانیات کے بنیاد گذاروں میں ژان ایمری (Jean Amery)اور فرانسکیو فریٹ(Franciois Furet) کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے فرانسیسی ساختیات کی حدود متعین کیں۔ ایمری اور فریٹ کے نظریات کو سامنے رکھتے ہوئے شی وے (Schiway) نے یہ کہا کہ "عمرانیات کی تشریح کا ساختیاتی بنیادی نظریہ احساس محرومی کا شکار بائیں بازو کے دانشوروں کے فلسفے کا مرہون منت ہے۔" اصل میں نفی دانش ہی بنیادی ساختیاتی فکر کا محرومانہ اور اعلیٰ اظہار ہے۔ یہ نظریہ تین مرکزی موضوعات (Themes) کی تخفیف تھی۔

(۱) تاریخ سے انکار

(۲) موضوع سے انکار

(۳) فرد سے انکار

اس کے علاوہ مغربی معاشرے کے قنوطی نظریے کو بھی ابھارا گیا۔ ان لوگوں میں لیوی اسٹروس، مائیکل فوکو اور رونالڈ بارتھ وغیرہ پیش پیش تھے۔ اس شوروشغب میں ساختیات نے نئی سمتوں کی طرف سفر کیا جن میں سے اہم سفر مارکسزم سے متعلق ساختیات کی جانب تھا

جو کہ ایک ایسے نظریے کی تشریح میں تھا جو کہ غیر نظریاتی تھا اور یہ لوگ اپنے نظریے کی تصدیق حاضر زمانے کی کائناتی ٹیکنوکریسی کی ہیت سے کروارہے تھے۔ تخلیقی سطح پر اس قسم کا وظائفی ساختیہ امریکی ناول نگار تھامس پنچن کے ناول "وی" (V) میں نظر آتا ہے۔ اور تشکیل کی تنقید سے صرف نظر کرکے دیکھا جائے تو جیکولن دریدا کا نیوکلیائی تنقید کا مزاج بھی کائناتی ٹیکنوکریسی کے جبر سے پیدا ہوتا ہے جو اپنے رویوں سے معاشرے پر اثرانداز ہونے والے ٹیکنوکریسی کے اثرات کے وظائفی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔

اسی ہنگامہ آرائی میں ایمری نے ساختیات کے تاریخی تصورات پر توجہ دی۔ خاص طور پر انھوں نے بائیں بازو کے دانشوروں کی محرومیوں پر گہری نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ انھیں صاف طور پر اپنے انکار میں تخفیف کرنی چاہئے تاکہ وہ عنوانی لیت ولعل میں ملوث ہونے سے بچ جائیں اور اس "انقلاب" سے دستبردار ہوجائیں جس کو وہ غالبا قبول نہیں کرسکتے۔ ایمری کے خیال میں بائیں بازو کے لوگوں کے ذہن تاریخی تناظر کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھ پارہے اور نہ ہی ان کے ذہن تاریخی عوامل کے لئے صاف ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مثالی صورت میں فرانس کا کردار اس حوالے سے ایک عظیم قوت کا حامل تھا۔ اس کے پس منظر میں ایک طویل تاریخی سفر اور متفرق سیاسی عوامل پوشیدہ تھے اور نئے عالمی مطالبات فرانس اور فرانسیسی فکر کو اس بات پر اکسارہے تھے کہ ساختیاتی فکر کا سفر اب تھیم (Theme) کی موضوعی سمتوں کی طرف ہونا چاہئے۔

اس دور میں اسی قسم کی کئی فکری پیچیدگیوں نے کئی محرومیوں کو بھی جنم دیا اور اس سے منفی نتائج بھی برآمد ہوئے۔ خاص طور پر لیوی اسٹروس اور اس حلقے میں شامل دوسرے لکھنے والوں کے یہاں اضافی عناصر کے تصور میں کئی منفی پہلو در آئے اور یہ فکری مغالطے اور پیچیدگیاں زیادہ عرصے تک رائج رہیں، وقت کے ساتھ ساتھ اس فکر پر تجزیات ہونا کم ہوگئے۔ واضح طور پر یورپ اس مرحلے میں داخل ہوگیا تھا کہ قومیت پسند تاریخ کے تصور کو رد کردیا جائے۔ مگر بعد میں آنے والے تصورات میں تاریخ کسی نہ کسی طور پر بھی مثبت امکانات کو تلاش کرنے کا سبب بنی۔ اس سلسلے میں ایک متضاد پہلو یہ بھی رہا کہ عمرانیاتی تجزیے نے ساختیاتی مباحث میں کئی منفی عناصر کو بھی ابھارا اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والی محرومیوں کو نہایت ہی

خوش نما شکل میں ابھارا۔

آلتھیوز اور فوکو کا اس سلسلے میں انسان شکنی کا نظریہ تھا جبکہ کارل مارکس نے اپنے اختتامی نظریات میں انسان کے فلسفیانہ بشریاتی پہلوؤں سے کبھی بھی اتفاق نہیں کیا۔ ساختیات سے دلچسپی رکھنے والے دیگر لوگوں نے ٹروازم (Truism) کے موضوعی فلسفے میں ساختیاتی خوابوں کی تعبیر تلاش کرنا چاہی اور یہ تصور آہستہ آہستہ ختم گیا کہ ساختیات اپنے فلسفیانہ تناظر میں کوئی کمزور "فلسفہ" ہے۔ ایمری اور فراؤڈ کو اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ مغرب میں ساختیات کو تبلیغی ((مسیحی) شعور نے چرالیا ہے جو یورپ میں اپنی گرفت کسی حد تک کمزور کر چکا ہے، اور انسانی مرکزیت کی عملیات روز بروز زندگی میں سطحی ہوتی جا رہی ہیں۔ شی وے (Schiway) نے اس سلسلے میں تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یورپ کے دانشور نمایاں طور پر "نظریہ خلا" کا شکار ہیں، جہاں ساختیات محض کوئی راستہ متعین نہیں کرتی، ساتھ ہی ساتھ منفی رجحانات بھی پروان چڑھے۔ اس زمانے میں پرانی باتوں کی بھی تجدید کرنے کی کوشش کی گئی اور تب قوم کے مخصوص ذہن کو اس مقدر کے حوالے سے تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی جو کہ مخصوص قسم کے مرتبے کو متعین کرتا تھا، ساختیات نے بعد ازاں دوسری جنگ عظیم سے پرے رہ کر فرانس میں اپنا آغاز کیا اور جلد ہی روسی ہیت پسندی کی طرف رجوع ہوا اور نئی فکر کی ابتدا کے لئے وہ بیسویں صدی کے شروع کے زمانے میں واپس چلے گئے۔ یہی ہیت پسندانہ روح تقریباً تمام یورپ کی فکری فضا میں سرایت کر گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب دانشوروں کا ایک گروہ جو نسلی لسانیات، نشانیات اور ریاضی کے حوالوں سے نئے جمالیاتی اور سیاسی افکار کی راہیں متعین کر رہا تھا جو تمام کا تمام ہیت پسند اصطلاح سے متاثر تھا جن کے ذہن دائیں اور بائیں بازو کی خیمہ بندیوں سے پاک تھے۔ لیکن یہ تمام کا تمام فکری ردعمل عقائد شکنی اور اضافیت شکنی پر مبنی ضرور تھا۔ اس وقت یورپ میں چند سیاسی قوتیں ضرور ایسی تھیں جو یہ چاہتی تھیں کہ اضافیت پسندی کو عملی فکری شکل دے کر سامنے لایا جائے۔ یہی رویے فکری سطح پر نفی دانش کا رویہ لے کر ابھرے۔ اس گرما گرم فکری فضا میں عقائدی مارکسزم اور اسٹالن ازم پر بھی بڑے زور و شور سے بحث و مباحثہ ہوا۔ روس کے انقلاب کے بعد عقائدی فضا قریب قریب دس سال قائم رہی۔ اس کٹھن وقت میں دانشوروں اور ادیبوں کے لئے یہی ایک

راہ باقی رہ گئی تھی کہ روس سے نقل مکانی کی جائے لہٰذا "پراگ سرکل" کے وجود نے جنم لیا جو "ماسکو سرکل" کی ہی ایک شکل تھی۔ دوسرے عشرے میں کچھ لکھنے والے کوپن ہیگن منتقل ہو گئے۔ یہی سلسلہ آگے بڑھ کر نیویارک کے لسانی سرکل کی صورت میں سامنے آیا۔ اس دور میں لیوی اسٹروس نے ترتیب وار فلسفے سے مدد لیتے ہوئے اس بات کا احساس دلوایا کہ فلسفہ یہ نہیں جانتا کہ انقلاب کیا ہوتا ہے۔ یوں اسٹروس نے تاریخی تناظر کو اس طرح دکھایا کہ انقلاب کا حصہ کمزور یا چھوٹا نظر آیا۔ اسٹروس نے بنیادی طور پر کسی فلسفے کو بیان نہیں کیا جس میں کسی قسم کی ترتیب موجود نہیں تھی۔ یہ روسی انقلاب ہی تھا جس نے ہٹلر کی Reich کو جنم دیا۔ یہ کسی طور پر ساختیاتی فکر کے ارتقا کا باعث تھی لیکن نہ ہی یہ انسانی فلسفہ بن سکا اور نہ ہی اس کو نفی دانش کہا جا سکتا ہے۔

اگر دوسری جنگ عظیم سے قبل فرانسیسی و نظامی ساختیات اور اس کے بعد کے عرصے کے رجحانات کا مشاہدہ کیا جائے تو اس میں کئی الجھنیں سر اٹھاتی ہیں۔ جنگ سے قبل ہیت پسندوں اور ساختیاتی لکھنے والوں کے درمیان ایک اختلافی رویہ ضرور ملتا ہے جو کہ عقائد شکن اور غیر قوی تصورات کی بنیاد پر تھا۔ اس میں اضافیت پسندی کا تناسب بھی کچھ کم نہ تھا لیکن دوسری نسل نے یہ اختلافات کم کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر غیر عقائدی تصورات کو انھوں نے کم اہم جانا اور یوں اضافیت، عدمیت اور نفی دانش میں تبدیل ہو گئی (اضافیت سے یہ مراد بھی لی جاتی رہی کہ علم انسان کے لئے اضافی ہے) یہ وہ حالات تھے جن میں یہ سوال نہایت ہی شدت سے ابھرا جو کہ اپنی جگہ اہم بھی تھا کہ اس مخصوص فکری ماحول میں کس کو ساختیات پسند کہا جائے اور کسے نہیں؟ یقیناً آلتھیوزان معنوں میں ساختیات پسند ہیں مگر اس سے قدرے کم لیکن کسی حد تک مائیکل فوکو کو بھی ساختیات سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اوپر کی گئی بحث کے حوالے سے لیوی اسٹروس ساختیات کے دائرے سے باہر نظر آتے ہیں۔ عمرانیاتی تجزیہ بہت ذمہ داری کی بات ہے۔ تھوڑی سی بھی فکری اور تکنیکی کمزوری مفاہیم کو تبدیل کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر یہی تجزیے معتبر اور صحیح طریقوں سے کئے جائیں تو ہم ساختیاتی اہل فکر جو مخصوص قسم کا فلسفیانہ، عمرانیاتی، بشریاتی، لسانی، ادبی یا سیاسی ذہن کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمارے ذہن مخصوص چلن کے مواد سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح

سینٹ گرمین ڈیس پرس کے وجودی اور دیگر فلسفی جیسے سیمن ڈی بیویرا، لیس منڈرین (Les Mandarins) کو ایک دوسرے سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔

معاشرتی نفسیات کے مختلف اجزاء نے ساختیاتی مظہر کو بطور ایک چلن کے اپنایا۔ علاوہ ازیں پیرس کے حلقے، ناشروں اور مدیروں کی معاشرتی سرگرمیاں نئے جرائد و رسائل کے شائع ہونے کا سبب بنی۔ جن میں سب سے اہم رسالہ Revegauche تھا لیکن ایمری اور فروٹ نے کئی دلچسپ انکشافات کیے۔ انھوں نے ساختیات کی فیشن زدگی سے بچایا لیکن ساختیات کا مظہر ابلاغ عامہ کی زد میں آکر ایک مخصوص فیشن کی تخلیق کر گیا۔ خاص طور پر ۱۹۵۸ء کے بعد لیوی اسٹروس کی کتاب "ساختیاتی بشریات" شائع ہوئی حالانکہ اس سے قبل ان کی کتاب کے مختلف حصے کئی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ یہی معاملہ لاکان کے ساتھ تھا۔ ان کی کتاب Ecrits ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی جبکہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین ۱۹۳۷ء سے مختلف رسائل میں جگہ پاتے رہے تھے۔ جب یہ مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے تو اس میں لاکان نے ایک بھی نئے لفظ کا اضافہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ مضامین دو کتابوں میں ترتیب دے گئے تھے۔ ان دونوں کتابوں میں منطقی عمرانیات کے تصورات کو متعلقہ حقائق کے ساتھ جوڑ کر مزید عمیق مطالعہ کی سعی کی گئی جو کہ نہ ہی ایمری، فروٹ اور نہ ہی کوئی دوسرا کر سکا۔

فلسفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایمری کے تمام مشاہدات نفی دانش کے ذیل میں آتے ہیں۔ کہیں کہیں عمرانیاتی تجزیے کا روپ لے لیتے ہیں اور بعض جگہ کمزور اضافیت پسندی کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی زمانے میں یورپ کے کئی فکری حلقے نئے نئے فکری فیشن اپنا رہے تھے۔ ان میں سب سے نمایاں "نفی دانش" کا رویہ تھا جس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ عمرانیات کا ایک سوال یا مفروضے یا ایک متنازعہ فی مسئلہ کے طور پر تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ عمرانیات بذات خود کسی قیاس یا متغیرہ کا تجزیہ کرتی ہے، چاہے یہ مظہر ساختیات کے متعلقات سے بحث کرتا ہو کہ نہ کرتا ہو۔ یہاں تک کہ دونوں اپنی سچائی کا ثبوت بھی دے دیں اور جب تک وہ نفی دانش کو بطور معنی خیز فلسفیانہ تصور کے نہ اپنالیں۔ اضافیت کے لئے یہ تصور نہیں کیا گیا کہ ان میں ساختیاتی معنویت پوشیدہ ہو اور نہ ہی اس بات کی توقع رکھی جاتی ہے کہ نفی

دانش کا تصور کتنی گہرائی یا گیرائی سے ساختیاتی Milieux سے اختلاف کر رہا ہے۔

نطشے نے اضافیت اور نفی دانش کے درمیان رشتہ تلاش کرتے ہوئے ان دونوں تصورات کی تہہ میں اتر کر ایک طنزیہ لہجہ بھی اختیار کیا۔ "اس کی آنکھیں ہیں۔ ابوالہول کی دو آنکھیں۔ لہٰذا وہاں بہت سی سچائیاں ہیں۔ نتیجتاً وہاں کوئی سچائی نہیں۔ اور متن کے مابین Penseesavvage قریبی ساختیاتی رشتہ استوار کرتے ہیں۔" اس قسم کی سچائی نطشے اور فرانس میں انتھوئن ڈی سینٹ ایکسپوری وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔ ساختیات کی اس نوع کی عملیات لیوی اسٹروس کے تصورات و خیالات سے متحرک ہوتی دکھائی دیتی ہے جو کہ کسی نہ کسی طور پر نطشے کے فلسفیانہ ذہن کی حد بندی کرتی ہے۔ نطشے نے ہی قدیم فکر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ غالباً اسی سبب سے مغرب میں یہ تاثر بھی پھیلا کہ مغرب ذاتی تشکیک، اخلاق اور عبث پسندی کی سچائی ہے۔ انہی رجحانات نے زندگی کو نئی عملیات سے روشناس کرواتے ہوئے زندگی کی نئی شعوری تاریخ کو جنم دیا جو کہ مزید a'priori حس کی تاریخ کو شناخت نہیں کر پا رہی تھی لیکن اس میں مرکزی حیثیت انسان ہی کی تھی جو معنویت کو تخلیق کرتا ہے جس سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نطشے نے جن ساختیاتی تصورات کا مطالبہ کیا ہے وہ "پس نفی دانش" کی اقدار ہیں۔ نفی دانش خود اپنی گواہی اپنی ہی زبان سے دیتی ہے اور یوں وہ کچھ نئی اقدار کو بھی ابھارتی ہے۔ یہ اقدار مخفی نہیں ہوتی اور نہ ان کو محدود معنویت میں پرکھا جاسکتا ہے۔ نطشے کا کہنا ہے "اصل انسان کی قدر انسان کی تقدیر سے بڑی بہت بڑی ہے۔ اب تک کے کسی آدرش تک...... تیقن بھی معقول ہوسکتا ہے۔"

حتمی طور پر ہم یہ نہیں جانتے کہ ہمارے اعمال کی اقدار قابل پرکش ہیں۔ ان تمام میں ہم امکانات کے خلا کے معروض تناظر کو دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم "عمل" کو رد بھی کر دیتے ہیں۔ ہم منصف نہیں لیکن یک طرفہ (Ex-party) فیصلہ کرتے ہیں۔ (لیوی کلوریل اسٹروس کا موقف) اس قسم کی عملیات مغربی ثقافت میں نفی دانش کی اقدار کے حوالے سے جانی جاتی ہیں اور جب اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ ساختیات محض فیشن نہیں تو یہ بات لوگوں کو بری بھی لگتی ہے۔ خاص طور پر یورپ کی تاریخ کی تصویر جب بنائی جاتی ہے تو شعور کی تاریخ کا نیا باب کھل جاتا ہے۔ یہ یورپ میں ایک حد تک قومیت پرستانہ انداز کی ہوتی ہے۔

پھر یہ تصور سر اٹھاتا ہے کہ انسان کا تناظر ہی تخلیقی ہوتا ہے جو معنویت کا بھی انکشاف کرتا ہے اور فلسفے کو تکنیک میں تبدیل کرنے کو میرا تصور نہیں کرتا۔ یہ رومانی اور قنوطی سطح پر کسی ثقافت میں متنازعہ فیہ نہیں ہوتا لیکن "تصور" اور تکنیک میں جو بنیادی تفاوت ہے اس کو ذہن میں ضرور رکھنا چاہئے۔ حال کی ہماری نسلیں کوشش کے باوجود سائنس اور تکنیک کے خلاف جم کر کھڑی نہیں ہوسکتیں لیکن ہماری زندگی کی وجودی راہیں ہمارے کردار کی تفاصیل کو دن بہ دن ایک تنظیمی منصوبے میں تبدیل کر رہی ہے اور ہم اس بات کا مظاہرہ نمایاں طور پر اپنے خیالات میں کرتے ہیں اور آخر کار سائنسی اور تکنیکی کائنات کی درجہ بندی کے غلام ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان کا ذہن ہے جو تجریدی ہے۔ بہرحال ہم خود انسان اور اپنی سائنس کے درمیان رشتہ قائم کرلیتے ہیں۔ انسان کی یہ تسخیر اور اس کی دنیا جو کہ مضبوط (ٹھوس) دنیا ہے (فوکو کا موقف) انسان عینیت پسندی سے دستبردار ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی سائنسی جبر کو خوش آمدید کہتے ہیں کیونکہ انسان کی زندگی کو کسی نہ کسی طور پر اسی کے ادھورے پن سے بہت صدمہ پہنچا ہے۔ یہ ادھورا پن اس کی وجودی انا کی سائنس اور ٹکنالوجی کے روبرو پسپائی کے بعد رونما ہوا لہٰذا فرد نے اپنے ماحول کے عمرانیاتی وظائف پر شک کیا۔ معاشرتی ادراک اور اس کی حرکیات چاہے جتنی بھی ٹھوس اور مستحکم کیوں نہ ہوں لیکن فرد کا ذہن اور دل ایک اندوہناک تجرید کا شکار اس وجہ سے ہوا کہ معروض و موضوع کے ساختیاتی وظائف متضاد سمتوں میں سفر کر رہے تھے۔

بیسویں صدی کے شروع میں ادب کی جو تشریح کی گئی اس میں ساختیات کو ہیت پسندی کے معنوں میں لیا گیا اور یہ دونوں تصورات (ساختیات اور ہیت پسندی) قریب تر ہوتے ہوئے بھی ادب کے وظائفی پہلوؤں کو اجاگر نہ کرسکے اور نہ ہی اس سے ملتا جلتا تصور ادب میں شناخت کیا جاسکا لیکن جین مکوروسکی نے ۱۹۲۰ء کے بعد ادب کا صحیح معنوں میں زندگی کے ان نئے حقائق سے پردہ اٹھایا جو نئے تخلیقی اور عمرانیاتی رشتوں کا بھی انکشاف کرتے تھے۔ کیونکہ رمزیات اور ساختیات نے ادب کو ہمیشہ پیچیدگیوں سے دوچار کیا۔ ہیت پسندی کو ابتدائی سطح پر ادبی عمل تسلیم نہیں کیا گیا یعنی ادبی ترتیب کے لحاظ سے اس کی ساختیات کو نہ سمجھا گیا لیکن مکوروسکی نے ادب کی ساختیاتی تفہیم کی، جس میں شاعرانہ حقائق سے فنکارانہ

ساختیے کی منتقلی پر روشنی ڈالی گئی کہ کس طرح تخلیقی عمل اجتماعی شکل اختیار کرتا ہے۔ شعری ساختیہ اجتماعی خمیر سے جنم لیتا ہے جو اصل میں عمرانیاتی حقائق ہوتے ہیں۔ جب ہم کسی ادبی عمل کو متفرق مظاہر سے علیحدہ رکھ کر تجزیہ کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں لینی چاہئے کہ ساختیہ انفرادی عمل یا فن ہے۔ یہ مسلسل طور پر کل "قومی" شاعری کو پروان چڑھاتا ہے۔ عناصر کا غیر مادی انتخاب عوام کی قرات کے شعور میں جگہ پاتا ہے جس کو "ساختیہ" کہا جاتا ہے۔ ذاتی تخلیقی عمل اعلیٰ درجے کے ساختیاتی نظام کے تحت تشکیل پاتا ہے۔ اس مرحلے پر نہ ہی کوئی مکر آمیز عمل متوقع ہوتا ہے اور نہ ہی ساختیہ اپنے وجود کو منوانے کے لئے کوئی متبادل راستہ اختیار کرتا ہے۔ مادی کائنات میں یہ کوئی جھوٹا عمل نہیں ہوتا، پھر بھی یہ خارجی دنیا کے کسی نہ کسی مظہر کا انکشاف ضرور کرتا ہے جو کہ شعور کی رو میں بہہ کر ہی تخلیق پاتا ہے جس کو "حاضر فنکارانہ روایت" بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس تخلیقی عمل میں بغیر کسی رکاوٹ کے تغیرات، ارتقائی منازل سے گذرتے ہیں۔ اس نوع کا فنکارانہ ساختیہ صحیح معنوں میں لفظ کی حسی قدر سے اپنی عمیق وابستگی کا شدت سے احساس بھی دلواتا ہے۔ انفرادی تخلیقی عمل کا ساختیہ مخصوص قسم کا فن ہوتا ہے جو غیر مساعد حالات میں ارتقائی صورتحال سے دوچار ہوتا ہے لہٰذا فن کی بنیادوں پر اسے انفرادی عمل نہیں کہا جاسکتا لیکن جو فنکارانہ رواجوں (Conventions) اور معمولات کے ڈھیر میں غیر انفرادی اور اپنی فطرت میں معاشرتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ (مکوروسکی کا موقف)

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے کے اولین برسوں میں جین مکوروسکی نے ساختیات کے ارتقا کا تجزیہ شروع کردیا تھا۔ اس وقت تک ساختیات کی تشریح "ساختیہ بطور نظریاتی امتیازات" کے تحت کی جاتی تھی زبان کے نمونوں کے مطابق ٹھوس بنیادوں پر اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ زبان کا تمام کام اور ڈھانچہ غیر مادی اور غیر انفرادی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی یہ کسی نہ کسی سطح پر ارتقائی ساختیے کے تصور کو جنم دیتے ہیں۔ مکوروسکی کے مطابق ساختیہ کے تصور کو فن کے امتیازات اور خدوخال کے ساتھ دیکھنا چاہئے۔ اس سے نظریں نہیں چرانی چاہئیں کیونکہ فن کا تعلق معاشرتی مظاہر سے ہے جو کسی نہ کسی طور پر معاشرتی مظاہر کی تشخیص کرتا ہے۔ لیکن اب ساختیات اس طرح بیان نہیں کی جاتی جیسے وہ شروع کے زمانے

میں کی جاتی تھی اور یہ کہا جاتا تھا کہ یہ غیر انفرادی ہوتی ہے۔ یہ ایک یقیناً غیر مادّی فنکارانہ روایت ہے، جو کہ کسی طبقے (کمیونٹی) کا شعوری وجود ہوتا ہے۔ لوگ معمولات کے ساختیے کو مجموعی طور پر مکمل کرتے ہیں۔ ان تمام ساختیاتی علامات اور رویوں کو مکورووسکی نے وظائفی ساختیات کے حوالے سے بھرپور انداز میں اپنی تحریروں میں جگہ دی جس کا تمام کا تمام پس منظر ہیت پسندی کے بنیادی تصورات سے منسلک دکھائی دیتا ہے۔ مکورووسکی اور ان کے مقلدین ادب کو بنیادی طور پر ساختیہ تصور کرتے ہیں، جس میں سب سے اہم نکتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شاید ہی اظہاریت سے اپنے عمل کا آغاز کرتے ہوں۔ ساختیاتی تشریح اپنے مطالعے کو شروع کرنے سے قبل اس بات کا تعین ضرور کرتی ہے کہ بین الموضوعیت ادبی تخلیق کی اجازت دے رہی ہے کہ نہیں! اور کسی تخلیقی عمل میں پائے جانے والے معروضی احوال کی نوعیت کیا ہے؟ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ تمام باتیں مکورووسکی اور ان کے مقلدین کے لئے کافی نہیں ہوتیں اور نہ ہی یہ لوگ ان باتوں سے مطمئن ہوتے ہیں۔ ساختیات یہ چاہتی ہے کہ اجتماعی شعور کو ابھارا جائے جس میں بنیادی زاویہ نگاہ ادبی عمل (تخلیق) کے فن سے ہو، جس کے پس منظر میں جمالیاتی تصورات کی معروضیت بھی اپنی جلوہ نمائی کرتی ہو۔ بی۔ کرمخمین کے بقول۔ "یہ عمل کی اظہاریت کا معاشرتی شعور (ساختیہ) ہوتا ہے۔" ساختیاتی جمالیات کا تعلق معروضی وصف سے بھی ہوتا ہے جو جمالیاتی اشیاء کے معروض کا فن کے نظریے سے تجزیہ کرتی ہے لیکن اس سے یہ معنی نہیں اخذ کر لینے چاہئیں کہ مادّی حیات کی جو آگہی ہے وہ غیر مادّی ساختیہ ہے۔ مراد یہ کہ حرکیاتی توازن کے خارجی انکشافات کی قوتیں ذاتی عناصر سے لبریز ہوتی ہیں۔ (مکورووسکی کا موقف)

اندرے بوجنار نے اپنی کتاب "سلاویک اسٹرکچر ازم" کے صفحہ ۵۴ پر ادبی عمل اور ساختیات کا جو منصوبہ پیش کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

ا۔ ادبی ساختیہ (ضوابط اور معمولات کا نظام) ادبی عمل جو کہ ساختیہ ہوتا ہے کیونکہ یہ ادب کے ساختیے سے بھی باہم ہے (زبان اور ادبی رموز)

۲۔ جمالیاتی معروض جو ادبی عمل سے متعلق ہے اور جو ادبی ساختیے کے روبرو ہوتا ہے۔ ادبی ساختیہ (نظام / سسٹم، قوانین اور معمولات)

اس منصوبے کو دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انفرادی ادبی عمل اور جمالیاتی معروض ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ چاہے ساختیاتی نقاد ان دونوں تکنیکی اصطلاحوں میں ردّ و بدل بھی کر دیں۔ ساختیہ ادبی سیاق کی ہی ایک قسم ہے جس میں جمالیاتی معروض کے سوالات اور تقارب کا اس حوالے سے تجزیہ کیا جاتا ہے کہ اس میں قاری کے نقطۂ نظر (پوائنٹ آف ویو) کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے چاہے اس کے پیچھے نظام ادبی معمولات کو اجاگر کر رہے ہوں۔ لیکن جمالیاتی معروض کا کبھی بھی کوئی انفرادی وجود نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ معاشرتی نوعیت کا ہوتا ہے کیونکہ جمالیاتی معروض کو معروضی ماحول کے حوالے سے ہی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ معاشرتی عوامل ہی معروضی جمالیات اور اس کے معمولات کی آگہی میں پیش پیش ہوتے ہیں اور مختلف معاشرتی ماحول سے اخذ بھی کئے جا سکتے ہیں۔ یہ مخصوص مادّی عمل مختلف قسم کے فنکارانہ ساختیے کو بھی جنم دے سکتا ہے۔ مختلف جمالیاتی معروض اس امر سے بھی متعلق ہوتا ہے کہ معمولات کے تضاداتی رویوں سے ساختیاتی وظائف جنم لیتے ہیں۔ فرد کا شعور جن تصورات کے ساتھ ادب کی قرات کرتا ہے اس سے جمالیاتی معروض ذہن میں ضرور تشکیل پاتا ہے جو جمالیاتی قدر کو کسی طور پر اپنے حواس میں بسا لیتا ہے اور کوئی حتمی تعریف اپنے طور پر طے بھی کر لیتا ہے۔

جمالیاتی معروض کی تشریح مکمل طور پر مظہریاتی جمالیات سے مختلف ہوتی ہے۔ کئی وظائفی ساختیاتی نقادوں نے بی۔ کرمخمین اور آر۔ ایگنرن کے تصورات سے اپنی تحریروں کی تزئین کی ہے کیونکہ یہ دونوں نقاد اس بات پر متفق تھے کہ فنکارانہ عمل شعور سے حاصل ہوتا ہے (اس کو اجتماعی شعور نہیں کہا جا سکتا!) اور نہ ہی اسے معروضی عمل کا ڈھانچہ کہا جا سکتا ہے جو کہ لسانیات اور ادبی رموز سے حاصل کیا جا سکتا ہو۔ یہاں تخلیقی عمل میں کئی تشکیلی عوامل در آتے ہیں اور پیچیدگیاں بڑھ جاتی ہیں۔ اصل معروض کی جمالیاتی بصیرت یا دوسرے لفظوں میں جمالیاتی معروض بعض دفعہ "موضوعیت" کی شکل میں اپنا روپ دکھاتا ہے۔ یوں مختلف جمالیاتی جہات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس موقع پر جمالیاتی معروض کے متعلق کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی اور معروض نفسیاتی حوالوں سے تجزیہ ہونا شروع ہو جاتا ہے تب قاری یا نقاد پس تخلیقی عمل سے دوچار ہوتا ہے اور اس عمل کو پھر نہیں دہراتا کیونکہ خارجی عمل

مادّی ردِّ عمل کی سمتیں اختیار کر جاتی ہیں۔ یوں تخلیقی عمل ایک ایسی چیز کا روپ دھار لیتا ہے جو پس تخلیق کا ردِّ عمل قرار پا کر تشخیص کے نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے اور مخصوص "مسئلے" سے براہِ راست اجاگر کرتی ہے۔ یہ تخلیقی عمل میں نئے فکر و نظر کا اضافہ کرتے ہوئے "فنکارانہ مزاج" کو بھی اُجاگر کرتا ہے۔

مکورو وسکی اور بی۔ کر مینن دونوں ہی اس بات پر متفق ہیں کہ متفرق جمالیاتی معروض فنکارانہ عمل میں شریک ہوتے ہیں حالانکہ سرسری نگاہ ڈالنے سے یوں لگتا ہے جیسے معروضی جمالیات کو ایک ہی کھونٹی پر لٹکایا جا سکتا ہے اور اس میں وسعتِ فکر کی گنجائش نہیں۔ ساختیات دانوں کے نزدیک تمام افراد اور ان کے تمام موضوعی تصورات اصل میں خارجی نوعیت کے ہوتے ہیں لہٰذا مکورووسکی نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ معروضی جمالیات کے تصور کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مظہریاتی تصورات میں کچھ تبدیلیاں لائی جائیں جس سے یہ ہوتا ہے کہ تصورات کی معنویت کلی طور پر مخالف سمتوں میں اپنا سفر شروع کر دیتی ہے اور اپنے اصل تصور سے باہم ہو جاتی ہے، یہاں آکر تمام مسئلہ قاری کی ذہنی سطح پر آکر ٹھہر جاتا ہے کہ وہ تخلیقی عمل کو سمجھنے میں کامیاب ہے یا اسے یہ عمل سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ یہ یقیناً انفرادی نفسیات اور کسی حد تک اجتماعی نفسیات کا بھی مسئلہ ہے۔ یوں معاشرتی ماحول میں بالائی (سپر) اور عام افراد کی ذہنی سطح کی درجہ بندی بآسانی کی جا سکتی ہے۔

ادبی عمرانیات ہی ادب کی اعلیٰ جمالیاتی قدروں اور اس کے وظائفی اصول و ضوابط کا مطالعہ کرتی ہے جو کہ کسی طور پر ادبی تاریخ کی جانب محتاط مگر ایک چھوٹی سی مراجعت ہوتی ہے۔ مکورووسکی نے ۱۹۳۲ء میں پراگ کے ایک ہفت روزہ جریدے سے مصاحبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ادبی تاریخ میں جلد ہی تنقیدی لائحہ عمل کو اوّلیت دی جائے گی۔ مکورووسکی کا یہ محاسبہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت کو محسوس کیا کہ ادبی تنقید کا ایسا دبستان بنایا جائے جو ہیئت پسندی سے مختلف ہو۔ (ارسطو کی تھیوری آف پوئیٹری اینڈ فائن آرٹ، مترجم ایس۔ ایچ۔ بوچر، ۱۸۹۳ء صفحہ ۷)

ساختیہ ہی تخلیقی عمل کے تمام روابط کو ایک کڑی میں پروتا ہے اور افہام و تفہیم سے ان رشتوں کے اجزاء کی فطری قدر کو بھی محسوس کرتا ہے، جس میں ایک معذور قسم کی حسد کی فضا

بھی محسوس کی جا سکتی ہے، لیکن روابط کا یہ عمل سکونی نہیں ہوتا۔ اس مقام پر ساختیے کا توازن کمزور نہیں ہوتا مگر اس عمل میں زبان (لینگ) اور انفرادی تکلم (پیرول) کی دو متضادیت (Dichotomy) کی شناخت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ یہ توانا قدر (a'priori) قدر کی پابند نہیں ہوتی لیکن یہ کلی روابط کا خاکہ در پیش کرتی ہے، جس کے بطن سے ساختیے کی سطحیں بھی ابھرتی ہیں جو اس تصور کو اُبھارتی ہیں کہ مظہریات تجربی حقائق نہیں ہوتے۔ یہ بذاتِ خود تو عمل وظیفہ سر انجام نہیں دیتے مگر وظائف کے رشتوں کو اجتماعی شعور (نسل اور ماحول) میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ مختلف ساختیے اپنے عمل مراتب کے اعتبار سے دوسرے ساختیے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کو زمان و مکان، فن یا ماحول کے حوالے سے شناخت کر کے ایک دوسرے سے ممیز بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں ساختیے کی فطرت محض صوتی ہو کر نہیں رہ جاتی۔ یہ عمل مضبوط روایت کے انعکاس سے دیکھا جاتا ہے جہاں روایت دوسری روایت میں منتقل ہو جاتی ہے اور اس عمل سے ساختیے میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ یوں مروجہ ساختیے نئے روپ کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ساختیہ زائد جمالیاتی اقدار کے وظائف کو بیان نہیں کر پاتا جو ادبی تاریخ کے مطالعے میں ممد و معاون ثابت ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تخلیقی عمل کا سیاق لسانیات اور جمالیات کی اقدار سے گھرا ہوا ہو۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ قدر بذاتِ خود ایک وسیع اجتماعی شعور کا تناظر فراہم کرتی ہے۔ اس عمل کے ساتھ ہی ساختیاتی حرکیات اور تاریخی اضافیت کا دائرہ مزید وسیع ہو جاتا ہے۔ یوں ایک مخصوص قسم کے ساختیے کے جبر کا بھی احساس ہوتا ہے جس میں جلد ہی کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن میں زمان (نسل) اور مکان (ماحول) کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

مکورووسکی کے نزدیک فن کے وظائف معمولات اور اقدار سے ترتیب پاتے ہیں اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ تاریخ کی نوعیت اضافیاتی ہوتی ہے جو کسی فیصلے کی تصدیق نہیں کرتی۔ یہ حد درجہ اختلافی قسم کا نظریہ ہے۔ بہر حال اقدار کا وسیع تجزیہ ہی اجتماعی شعور کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا مباحث کی کوئی عملی حیثیت نہیں رہ جاتی جو سیاق سے جنم لیتی ہو اس لئے اساختیے کی ٹھوس روایت کو تفہیم و تشریح کے ذریعے ہی جانا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے مغالطے ادبی تاریخ،

ساختیات کے حد کی اصولوں میں در آتے ہیں جنھیں کئی ادبی سلسلوں میں شناخت کیا جاسکتا ہے لیکن ان دائروں کے باہر ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ مکورووسکی کے خیال میں ساختیاتی عناصر پر اثرانداز ہونے والے قوانین سے نظام مراتب کو جنم دیتے ہیں، جو ایک تبدیلی کی صورت میں نمودار ہوکر سخت گیر قسم کے نظام میں بدل بھی جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر ادب جدلیاتی خودکاریت اور زبان اظہار کا "پرسکون" وظیفہ ہے جو کہ جیکب سن کے نزدیک لسان اور دیگر اشیاء کا "وقتی" تعلق ہے۔ مکورووسکی کے بقول ساختیاتی نظم (Order) مکمل طور پر ادب کے حوالے سے معاشرتی حقائق تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ یہ تمام نکات تاریخی شعریات اور ادبی عمرانیات کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ زیڈ ریڈ یو لک (۱۸۵۶ء-۱۷۸۸ء) نے The Sublimity of Nature میں اس بات کا تاثر دیا ہے کہ نظم (Poem) کے وظائف میں تقسیم یک طرفہ ہوتا ہے جو کہ معاشرتی قوتوں کی اصطلاح سے قریب تر ہونے کا بھی اشارہ کرتا ہے۔ جمالیاتی وظائف سے قطع نظر جس میں معاشرتی حالات لازمی تصور کیے گئے ہیں۔ اس میں مکورووسکی ریڈیکل طور پر چھوٹے وظائف کے کردار کو بھی نمایاں کرتے ہیں جو ادبی عمل میں شریک ہوتے ہیں۔

ماہر نسلیات پیٹر بوگٹ یارو (۱۹۷۱ء - ۱۸۹۳ء) کے دعویٰ (Theorem) کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھیں اس بات کا خیال ہے کہ وظائف بذات خود عمل میں حقیقتاً کلیدی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، جو کہ لوک گیت، لوک ریت اور جادوئی کمالات کی تشخیص بھی کرتے ہیں۔ بوگٹ یارو کے خیال میں "مظہر "سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ لوک ریت سے متعلق معروض کے کئی وظائف ہوتے ہیں لیکن معاشرے کا نظام مراتب اصل میں وقت کے وظائف کو تبدیل کرنے کا سبب ہوتے ہیں جس میں ماحول اور معاشرتی طبقات کو سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ ماحول اپنی اقدار اور جمالیات خود بناتا ہے۔ جس طرح پنجاب کے چند دیہی طبقوں (کمیونٹی) میں گرہ کٹ اور چوروں کا ایسا طبقہ بھی موجود ہے جہاں چوری کرنا معاشرتی حوالے سے جمالیاتی قدر ہے۔ مراد یہ ہے کہ چوری کرنے سے فرد کی معاشرتی حیثیت میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ ملکی قانون کے تحت یہ جرم ہے۔ پڑھا لکھا طبقہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ یہ عمرانیاتی فریم ورک کو تبدیل کردیتا ہے اس کے نتیجے میں فلسفیانہ، مذہبی، قانونی وظائف

کے کئی اختلاف کا ظہور ہوتا ہے تب یہ ساختیے کو تبدیل کرنے کا سبب بن جاتا ہے جو عمرانیاتی ادبیات کا ہدف بھی بنتا ہے۔

مکورووسکی نے وظائفی نشانیات پر بھی ایک طویل بحث کی ہے۔ ان کے بقول حقائق ہی "نشان" کو جنم دیتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب علامت، علامت پسندی پر اثرانداز ہوتی ہے۔ مثلاً ہم جب اپنے بازوؤں پر کالی پٹی باندھتے ہیں تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ ضرور کوئی سانحہ ہوا ہے، کسی کی موت ہوئی ہے یا کوئی حادثہ رونما ہوا ہے۔ اگر ہم کہیں دل بنا ہوا دیکھتے ہیں تو اس سے مراد محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر کار یہ معنیاتی نظام مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور انسانی موضوع کو منور کرتا ہے۔

غیر ثالثی (Unmediate)

معروض میں قریب ترین تصور	عملی	نظری	موضوع میں قریب ترین تصور
	جمالیاتی	علامتی	

نشان

(یہ خاکہ ایف۔ ڈبلیو۔ گلین کی کتاب "ہسٹاریکل اسٹرکچر" صفحہ ۱۷۷، سن اشاعت ۱۹۸۸ء سے لیا گیا ہے)

آفاقی سطح پر اس خاکے کا متن بشریاتی نوعیت کا ہے۔ مکورووسکی نے جیکب سن اور دیگر ہیت پسندوں سے اثر قبول کیا لہٰذا ان کی تحریروں میں جمالیاتی وظائف کچھ زیادہ ہی حاوی ہیں۔ اس لئے مکورووسکی کے یہاں جمالیات اور نشانیات کا تصور بین بین چلتا ہے جو عملی سطح پر ایک ایسی جمالیات کو روشناس کرواتا ہے۔ اس میں نہ کوئی انوکھا پن ہے اور نہ ہی تازگی لیکن جمالیاتی حقائق کا تصور ضرور ابھرتا ہے۔ وہ جو انقلابی تبدیلی کا خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں، جس میں سب سے اہم "جمالیاتی نشان" کا سفر ہے۔ دراصل ان کے یہاں تبدیلی کا جو تصور ملتا ہے وہ کل حقیقت سے عبارت ہے۔ اس مرحلے میں موضوع کی نظریاتی رسائی کا تمام کا تمام زور علامتی وظائف پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔ جہاں علامتی وظیفے کے تضادات سے علامت اور حقائق میں رابطہ تشکیل دیا جاتا ہے یعنی علامتی وظیفہ بحیثیت ایک ثالثی کے نمودار ہوتا

ہے۔ تب یہ مخصوص علامتی جمالیات میں تضاداتی وظائف کے نظریے کی بنیاد بنتا ہے جس کو ساختیاتی علامات بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ علامتیں اپنے ساتھ اپنے اوزان بھی لاتی ہیں۔ یہ جمالیاتی وظیفہ علامتی وظیفے میں تبدیل ہو کر نشان کا معروض بن جاتا ہے جو کہ بآسانی علامتی نشان اور جمالیاتی نشان سے چند حقائق کے تناظر میں ایک دوسرے سے ممیّز کیا جاسکتا ہے۔ موضوعی رویے ایک "کل حقیقت" میں اپنا مقام پاتے ہیں۔ "معروضی جمالیات کا مسئلہ جمالیات پسندوں نے ہی اٹھایا ہے جو کہ مکورووسکی کی نظر میں ذہنی سطح پر بالائی (سپر) انفرادی ساختیہ ہوتا ہے اس بات کا بھی عندیہ دیتا ہے کہ اسے قاری کی نفسیات سے علیٰحدہ رکھا جائے۔ معروضی جمالیات کا سارا عمل اعلیٰ انفرادی نوعیت کا حاصل ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ تمام جمالیاتی معروض کی باتیں ساختیات کے لئے سودمند بھی ثابت ہوں۔ قاری کا انفرادی ادراک ہی یہ فیصلہ کرپاتا ہے کہ کس طرح ساختیاتی عمل اپنے عہد کے ادبی معمولات کا انکشاف کرتا ہے۔" (وڈیکا کا موقف) وڈیکا کے خیال میں عملی تنقید ادراک کی ایسی مرکزیت ہے جس کا ساختیات کے عصری ادب سے موازنہ کیا جاسکتا ہے جو کہ کسی طور پر نقاد کے لئے مخصوص قسم کی جہت بھی ہو سکتی ہے جبکہ کرمنین کے یہاں جمالیاتی معروض کا تصور اور ساختیات کے لکھنے والوں میں زیادہ انتشار کا شکار ہے۔ معروضی جمالیات صحیح طور پر افراد میں ہی شناخت کی جاسکتی ہے لیکن اسے فردِ واحد مکمل طور پر منکشف نہیں کرپاتا اور یہ ضروری بھی نہیں کہ تخلیقی عمل کو انفرادی سطح پر قاری مکمل طور پر سمجھ پائے۔

۱۹۷۰ء میں ایچ۔ آر۔ جیوس (Jauss) یا ایچ۔ سرویکا (Cerveka) نے انگرڈن کی تاریخیت اور وڈیکا کی تاریخیات کو تجزیہ کرتے ہوئے ان کے معروضی جمالیاتی تصور کو "بنجر" (Infertile) قرار دیا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ تاریخیت کی بغیت ایک دوسرے سے ممیّز کی جاتی ہے اور معروضی مظہر ایک مخصوص ذہنی سطح سے شروع ہو کر کسی نہ کسی طور پر موضوع کی جمالیات یا کسی ایسی فنکارانہ یا تخلیقی جہت کا اظہار کر دیتا ہے۔ تشکیل کا یہ عمل بہت ہی آہستہ ہوتا ہے لہٰذا جدید تنقید و تحقیق میں کسی مخصوص مظہر کو کئی اجزاء میں تقسیم کر کے تجزیہ کیا جاتا ہے تاکہ تجربی سطح پر کسی حتمی نتیجے کو اخذ کیا جاسکے یا کسی ایسی رائے کو دریافت کیا جاسکے جو فکر کی کسی نئی جہت کا سبب بنے۔ فکر کی یہ نئی جہت اصل میں عمرانیاتی مظاہر ہوتے ہیں جو تصور

زماں کو توسیع دیتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کے متوقع مظاہر کو قدرے مضبوط تخلیقی اور تنقیدی ایقان میں تبدیل کر دیتے ہیں جو تحیر کا سبب بھی بن سکتے ہیں اور نئی تاریخیت کو بھی جنم دے سکتے ہیں۔ دریدا نے ہوسرل کے مظہریاتی نظریے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زمان کے وظائف کے طرزِ فکر کو ختم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ رجحان اس وقت تک تناقص (قولِ محال) کے دوسرے کنارے پر اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی تجربے کے خالص میلان یا روش کو ابھارے۔ دریدا نے اس موضوع پر "آف گرامیٹالوجی" صفحہ ۶۰ اور "رائٹنگ اینڈ ڈیفرینس" صفحہ XIV میں خاصا صراحت سے لکھا ہے۔

خاتمۂ کلام

تخلیقی عمل میں وظائف کے ساختیاتی دھاروں کو کبھی روکا نہیں جاسکتا، یہ فطری ہوتے ہیں۔ اطلاقی تجربہ پسندی تخلیقی عمل کی تزئین تو کر سکتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ تخلیقی وظائفی عمل کو یکسر تبدیل کر دے۔ وظائفی ساختیات بعض دفعہ موضوعی واردات کو معروضی واردات (مظہر) میں تبدیل کر کے کسی مخصوص مظہر کی تفہیم اور اس کی تشکیلات میں نئے ظائف کے مظاہر کا انکشاف کرتی ہے۔ جمالیاتی وظائف کی کئی نئی جہات دریافت ہوتی ہیں، جہاں تناقص اور کبھی کبھار ابہام کی صورت بھی در آتی ہے جو ساختیاتی سطحوں کی پرتیں اس طور پر کھولتا ہے کہ تشکیک کا عمل جو کہ تذبذب کا شکار ہوتا ہے کسی حد تک قطعی نتائج اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

○○

REFERENCES

Alexander, Jeffrey C. (ed), Neofunctionalism, Beverly, California, Sage, 1985

Alesander, Jeffrey & Paul Colony, "Toward Neofunctionalism Socilogical Theory" 3:11-32, 1985

Aristotle. Aristotle's Theory of Poetry and Fine Arts, Translation S.H. Butcher, New York, Dover, 1951.

Bailey, R.W. etal, eds. The Sign Semiotics Around the world, Anbor-Michigan Slavic Publication, 1978.

Bojtar, Endre. Salvic Structuralism, John Benjamins Publishing Company, Amssterdom/Philaddphia, 1985

Cuzzort, R.P.E.W King 20th Century Social Thought, Third Edited by Rihchard and Eiston, New York, 1980.

Galan, F.W. Historic Structures. University of Texas Press, 1985.

Giddens, Anthony. The Constitution of Society: Out Line of the Theory of Structure, Berkeley. University of California Press, 1984.

Goldmann, Lucien. Essays on Method in the Sociology of Literature, Telos Press, St. Louis, MO. 1980 (Translation and Edited by William Q. Boelho.)

Lemert, Charles C. "The Uses of French Structuralism in Sociology" In G.Ritzer, ed. Frantiers of Social Theory. New York, Columbia University Press, 1990.

Lesser, Alexander "Functionalism in Sociel Anthropology" American Anthropologist 37:386, 373-1952

Levy Marion J.Jr. The Structure of Society, Princeton University Press. 1952

Merton, robert K. Social Theory and Social Structure Rev. ed. New York Pfree Press, 1957.

Mukarovesky, Jan. Structure, Sign and Function, Translated, Jogh Busbe and Peter Stemer, New Haven Yole University Press, 1978.

Nagel, Ernest, "Formalizing of Functionalism" In his Logic without Metaphysics, Glencoe, Ill, 1956.

Vodicka, Felix "The Integrity of the Literary Process" Poetic (1972): 5-15

چوتھا باب

جرمن ساختیات

جرمن ساختیات

جرمن ساختیات کا مطالعہ جرمن فکر کے مخصوص پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو یہ معلوم ہو سکے کہ جرمن فکر میں ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ ساختیات اپنی معنویت کو اجاگر کرنے کے بعد اپنی وسعت اور مخصوص بندشوں کے ساتھ ارتقاء کے منازل طے کرتی گئی۔ اس باب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ جرمن فکر میں ساختیات کی فکری راہیں کس طور پر ہموار ہوئیں اور وہ کون سے بنیادی فکری وصف تھا جس نے جرمن فکر میں ساختیات کو ادبی تنقید سے باہر نکال کر لسانی و بشریاتی علوم سے بھی منسلک کر دیا۔

ساختیات سے متعلقہ مباحث میں فرانسیسی اثرات سب سے زیادہ گہرے ہیں۔ اس باب میں جرمن فکر کے حوالے سے اس بات کی نشاندہی کی جائے گی کہ کس طرح براہ راست اور بالواسطہ فرانسیسی ساختیات جرمن فکر سے متاثر ہوئی۔

اس باب کو موضوعاتی درجات میں تقسیم کر کے قدرے مرکزی مطالعے کی شکل دی گئی ہے تاکہ جرمن ساختیات کی فکری طرز پر شاخوں کو بآسانی شناخت کرتے ہوئے اس کے بنیادی مزاج سے آگہی ہو۔

ساختیات کی سرحدیں متعین کرنا خاصا دشوار ہے۔ "ساختیات" بذات خود ایک متنازعہ تصور ہے جس کو کسی مجرد تصور کے زنداں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو یہ پہلے سے تشکیل شدہ تصورات اور قیاسات کی بنیاد پر اپنی فکر کو تشکیل دیتی ہے اور نہ کسی مخصوص آئیڈیالوجی سے وابستہ ہے۔ یہ مخصوص قسم کے قیاسات، کائنات، معاشرہ اور ماحول، انسان کے بارے میں مفروضات ترتیب نہیں دیتی اور نہ کسی مخصوص قسم کی تحقیقی وظیفے یا طریقۂ کار کی منطق

اور علمیات کے اصولوں پر بحث کرتی ہے بلکہ معاشرتی و فطری سائنسوں، لسانیات سے ہوتی ہوئی ادبی نظریے کی وسعتوں میں نئے فکری اُفق تلاش کرتی ہے۔

ساختیاتی فکر تنقیدی میدان میں کئی رویوں اور رجحانات کے علاوہ جدید فلسفے اور سائنس پر بھی انتقادات کے دروازے کھولتی ہے اور ساختیات کے مخصوص مزاج کے تحت تفتیش کے میدان میں نئی سائنس بن جاتی ہے۔ ساختیات لسانیات کا سب سے اہم حوالہ بنتے ہوئے معنیات تک رسائی کر پاتی ہے۔ اس مقام پر ساختیات اپنی اصطلاحات وضع کرتی ہے اور ساختیے کے حوالے سے اصطلاحات کے خدوخال بھی کسی حد تک بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جن میں فکری نظام، اس کے عناصر، ارتباط اور وظائف "معنی نما"، "تصور نما" تشبیہ کاری اور نحویات کی ساختیات معنویت کو اُجاگر کرتا ہے۔ ساختیات کی تاریخ اور اس کے تسلسل میں سیاق کو رومانی انداز میں برتتے ہوئے فن کے سائنسی نظریے کا اشارہ بھی ملتا ہے جس میں تشبیہاتی حوالے سے متنازعہ تنقید کے چلن کی بھی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ جرمن فکر میں ساختیات نہ تو آئیڈیالوجی ہے اور نہ علم و دانش کی کوئی جہت ہے۔ کیونکہ بہت سے فکری معروضات، مظہریاتی عوامل کو مکمل طور پر سمجھنے کے بعد ان کی جب شیرازہ بندی ہوتی ہے تو فکر کی ترتیب نو کی جاتی ہے اور فکر میں فطری ترتیب ابھرتی ہے جو فکری رشتوں کے شناسا اور مضبوط رشتوں سے خارج کے اصل خلاصے کے عنصر کو دریافت کر لیتے ہیں۔ یہ معطیات کو جمع کر کے، دوسری لاعلم اور ناتجربے کار تکنیک سے الگ رہ کر، خارج اور باطن کے درمیان بین العمل کی صورتحال کا سراغ لگاتی ہے جہاں نئے ادراک کی درجہ بندی ہونے کے بعد فکر کی تعمیر نو ہوتی ہے۔ جرمن ساختیات کی فکری روش کی مخصوص تاریخی اہمیت بھی ہے جو متن کے باہمی عناصر کو وسیع تناظر میں پیش کرتی ہے اور ادبی نظام کی حدود میں رہتے ہوئے اسے عوام کا ڈسکورس حاصل ہوتا ہے جس کو Reibied اور a'historical کے ناطے سے زیادہ حرکیاتی اور تاریخی بنا دیا جاتا ہے یہ نظام کی مبادلیات کے ساختیاتی تصور کو مستحکم کرتے ہوئے خارجی مبیج کے اصولوں کو وضع کرتی ہے۔

جرمن میں ساختیات کا پس منظر

جرمن ساختیات کی تاریخ ابھی خاصی مختصر ہے اگر اس کے پس منظر میں اترا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں دیگر فکری اور علمی مباحث میں ساختیات کی جھلک کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتی ہے۔ جرمنی میں ساختیات کی بحث بیسوی صدی کی چھٹی دہائی کے وسط سے شروع ہوئی جس نے تاریخی متن اور اس کے ارتقا کو نئے فکری موڑ دیے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمن ادب دیگر ادبیات سے وہ تعلق برقرار نہ رکھ سکا جو اسے رکھنا چاہیے تھا اور جرمنی سے باہر ترقی پسند تحریکوں کے ساتھ وہ اپنا ملاپ نہ رکھ سکا جس کی وجہ سے خاص طور پر جرمنی میں "نسلی شاعری" اور ادب و فن کو فروغ ہوا۔ یہ اس وقت کے جرمنوں کے نزدیک "داخلی مہاجرت" تھی جس نے انھیں اعلیٰ سیاسی تحقیقات سے لے کر علم و ادب کے نظریے سے دور کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام کے بعد کے دو عشروں کا وقت اس فضا سے چھٹکارا حاصل کرنے میں صرف ہو گیا کہ کسی طرح نازی ازم کے زیر اثر سیاسی آئیڈیالوجی اور وابستگی کے مخصوص رویوں کو خیر باد کہا جائے، جس نے جرمنی کو دنیا سے الگ تھلگ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ اصل میں جنگ عظیم دوئم کا شدید فکری ردعمل تھا۔ اس سبب سے جرمن فکر الجھ کر رہ گئی۔ خاص طور پر سب سے پہلے سیاسیات اور تاریخ سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے وجودیت کو نئے فکری اسلوب کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ خاص کر مارٹن ہیڈیگر کی تحریروں کا اس رجحان پر گہرا اثر تھا۔ ہیڈیگر نے لسانی بنیادوں پر زبان کو جوہر کے وجود کی معنویت سے منسلک کر کے زبان کو ہستی کے شعور کی بنیاد بتایا ہے کیونکہ زبان ہی اصل میں بولتی ہے اور فرد کی گفتگو ہی زبان کے تقاضوں سے منسلک ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے نقاد ایمل سٹیجیز (Emil Staiges) نے اپنی تحریر Grundergiffe Der Poetica میں ہیڈیگر کی زندگی میں ہی تخلیق کا تاریخی نظریہ پیش کیا جو بعد میں جرمن جامعات میں متنی ادب کا سب سے مقبول موضوع رہا۔ دوسری جانب داخلی نوعیت کی ہیت پسندی تھی جو اپنا زیادہ زور شعری زبان پر دیتے ہوئے باطنی واردات کے مسائل کو اجاگر کرتی تھی یہ ایک طرح کی جمالیاتی وحدت بھی تھی جو کہ تاریخی سیاق سے باہر رہ کر "جمالیاتی وحدت" کے تصور کی تفہیم کرتی تھی۔ اس زمانے میں سٹیجیز نے

نصابی نوعیت کی ایک کتاب Kunst Interetion (1955) لکھی۔ اس میں انھوں نے تشریحات کو "فن" کہتے ہوئے تشریحات کے علم کو باطنی، ادراکی اور تخلیقی سرگرمیوں سے منسلک کر دیا اور کھلے الفاظ میں یہ بھی کہہ دیا کہ تشریحات نہ ہی کوئی سائنسی تفاعل ہے اور نہ ہی اسے علمی اصولوں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کی نظر میں فن اس وجہ سے اپنا آغاز کرتا ہے کہ فنکار کی جمالیاتی حسیت کی تشریح کی جا سکے۔ وہ اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس وقت ادب پاروں کی تشریح میں مشکل ہوتی ہے جب اس کو تاریخی تناظر میں نہ دیکھا جائے۔ اس میں تاریخی نوعیت کے شعری رموز پوشیدہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس میں تاریخی صورتحال کے تانے بانے ان کے وظائف سے منسلک ہوتے ہوئے تخلیق کار کے کام کی درجہ بندی بھی کر دیتے ہیں۔

قریب قریب یہی رویے، اسلوب اور Morphology کے وصف میں بھی نظر آتے ہیں جو کہ تاریخی مسائل سے نظریں نہیں چراتے اور تخلیق کے بین الموضوعی تحلیلی طریقہ کار کو اصطلاحی شکل میں بیان کرتے ہوئے اسے تشریحات کا "خالص" (Pure) فن کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہارسٹ اوپل (Horst Oppel) نے Morphologiche Literaturwissen Scaaft (۱۹۴۷ء) نامی کتاب لکھی جو کہ اس فکری تحریک کی ابتدا بھی بنی۔ ایک سال بعد ہی ولف گینگ کیسر (Wolfgang Kayser) کی Das Sprachliche Kunstwer منظر عام پر آئی جس نے جامعاتی حدود میں خاصا فکری ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کیونکہ اس کتاب میں فرانسیسی تشریحات، متن کی تکنیک اور امریکی نئی تنقید کو جرمن فکر پر لادنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر انھوں نے ریلک اور وارنر کی کتاب "تھیوری آف لٹریچر" (۱۹۵۹ء) سے متاثر ہو کر ان کے ادبی اور تنقیدی نظریات کو تنقیدی لائحہ عمل بنانے کی کوشش کی۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ اسٹیجیز اور کیسر کی یہ دونوں کتابیں جلد ہی نصابی دائرے سے نکل کر جرمن ادبیات کی تاریخ میں "ادبی تنقید" کا شاہکار قرار پائیں۔

جرمن فکریات نے تقریباً اسی وقت ساختیات میں دلچسپی لی جب پانچویں اور چھٹی دہائی میں دیگر یورپی ممالک میں ساختیات نئی فکر، تنقیدی اور تحقیقی و علمی مظہر کے طور پر نمودار ہو چکی تھی۔ جرمنی میں سب سے پہلے یہ ساختیات کی فکری اولین تحریک تھی جس کو اس سے

پہلے سالویک مطالعوں تک محدود رکھا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں وی۔ ایلرچ کی کتاب "روسی ہیت پسندی" شائع ہوئی جس نے مغرب کی ساختیاتی فکر میں خاصی دھوم مچادی۔ لیکن ۱۹۶۴ء میں جب اس کتاب کا جرمن ترجمہ ہوا، تو جرمنی میں اس حوالے سے مباحث کے کئی دروازے کھل گئے۔ یہ سال جرمن ساختیات کی فکر کے لیے نیک فال ثابت ہوا کیونکہ ۱۹۶۴ء میں بی۔ ایچ۔ ایشنرام (B.H. Eichenraum)، وی۔ سکووسکج (V.Skovskij) اور جے۔ تجانوف (J. Tynjanov) کی تصانیف جرمن میں ترجمہ ہو چکی تھیں جو دو جلدوں میں ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئیں۔

روسی ہیت پسندی اصل میں پراگ کے دبستان کی ساختیات اور نشانیات کے پس منظر میں پروان چڑھی۔ یہی صورت حال جرمنی کے ساتھ بھی پیش آئی۔ اس فکری ارتقا نے مروجہ جرمن فکری فضا میں اس بات کے آثار پیدا کر دیے کہ جرمن تنقیدی و علمی فکر پر نظر ثانی کی جائے۔ بالخصوص اس زمانے میں یہ کوشش کی گئی کہ روسی ہیت پسندی کا ماڈل بنانے کے عمل میں باطنی ساختیے اور ادبی ڈسکورس کی جانچ کرتے ہوئے، ترتیب کے ساتھ ادب کے تاریخی اصولوں کی صحت کی جائے۔ یہ اصل میں تجانوف اور جیکب سن کے لسانی اور ادبی تحقیق و تنقید کے پیمانے تھے جو جرمن ساختیات میں ۱۹۶۶ء میں نمایاں طور پر نظر آئے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سکووسکج کی نشانیات کے تصور کے اثرات بھی ابھرے۔ چیک ساختیات "ڈوبچیک" (Dubcke) کے زمانے میں اور جرمن طلبا کے بائیں بازوں کے احتجاج نے ادبی مطالعوں کا رُخ موڑتے ہوئے مارکسی ادبی نظریے کو دوبارہ موضوع بحث بنایا لیکن یہ لوگ جبر کے روایتی تصور اور اشتراکی حقیقت پسندی سے دور رہے۔ اس تناظر نے جرمن فکر میں معنیاتی ساختیات اور نئے مارکسزم پر مثبت اور تشکیلی نوعیت کا مکالمہ شروع ہوا اور دونوں جانب سے ساختیات میں دلچسپی کا اظہار کیا گیا جس میں آئیڈیالوجی اور علیت کے تضادات تھے۔ یہ ساختیات کے مارکسی ڈھانچے میں قرون وسطی کے طریقہ عمل کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے جس کا بنیادی ڈھانچہ معیشت کی بنیادوں پر کھڑا تھا۔ یہ اصل میں سپر "اسٹرکچر" کا حصہ تھا جو آگے چل کر "عمرانیاتی عملیات" کی صورت میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ساختیات اور مارکسیت کے اس فکری مکالمے نے سوویت یونین اور پولینڈ کے فکری حلقوں میں دھوم مچادی اور رومان انگرڈن (Roman

Inarden) کے بعد جرمنی میں سب سے زیادہ پولستانی ادبی نظریے کا چرچا ہوا۔

جرمن فکریات پولینڈ کی جامعات میں موضوع بحث آئیں جن میں ادبی ابلاغ کی مظہریات کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔ اس سے زیادہ جرمن ساختیاتی فکر نئے ہیت پسند ہے۔ لوتمین (J.Lotman) اور دیگر روسی تصورات سے متاثر ہوئے۔ خاص طور پر "تارتو" (Tartu) اور اسٹونیا (Estonia) کا مکتب اس حوالے سے سب سے نمایاں ہے۔ نشانیات کے نظام اور حقیقت کے ماڈل کو پالینے کے لیے ریاضی اور لسانی طریقہ کار کو تجزیے کے لیے استعمال کیا گیا جو کہ ادب کی متاجیت کو ٹھوس بنیادوں پر تشکیل دیتا ہے۔ ان فکری سرگرمیوں نے جرمن ساختیات میں Sytactic اور معنیاتی (Semanic) مطالعے سے اس بات کا احساس دلوادیا کہ لوتمین کی تحریروں کا جرمن فکر پر گہرا اثر ہے۔ اس کی کتاب Stukurachudo ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کے دو جرمن تراجم ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آئے۔

جرمن ساختیات کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جس وقت ساختیات کی گونج یورپ میں ہوئی تو زیادہ تر ممالک کی ساختیاتی فکر پر فرانسیسی اور کسی حد تک اٹلی کی ساختیاتی فکر کی مہر چسپاں تھی، لیکن جرمن ساختیات نے اپنی ساختیاتی فکر کی تزئین مشرقی یورپ کے فکری اور علمی رویوں سے کی۔ اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کرلیا جائے کہ جرمن ساختیات نے فرانسیسی اور اطالوی ساختیات کو سرے سے ہی رد کر دیا۔ ساتھویں دہائی کے اواخر میں بارتھ سی بگ (Sebag) اور گولڈ مین جرمن تنقیدی فکریات پر ظاہر ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں تودوروف (Todorov) برماند (Bremond) کے "قواعد اور بیانیہ" کی ساختیاتی مباحث کو جرمنی میں متعارف کروایا گیا تھا تو دوسری جانب ساختیاتی "نشانیات" کے سلسلے میں گریماز اور ساختیاتی اسلوب کے میدان میں ریفاٹیر (Riffaterre) کے مابعد نظریات کی تفہیم و تنقید ہوتی رہی۔ "تیل کویل" Syncretism (Tel Quel's) کی تحلیل نفسی، مارکسیت نے آئیڈیالوجی اور ساختیات کے چند متنازعہ فکری مسائل کو ابھارا جس سے جرمن فکریات میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ ساختیاتی فکر میں اطالوی اثرات فرانس کے مقابلے میں معقول نوعیت کے تھے۔ خاص طور پر ایکو (Eco) کی "نشانیات" کے تصورات جرمنی میں ایک زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔ اس کے بعد انگلستان اور امریکہ کے ساختیاتی مباحث کو جرمنی میں شہرت ملی۔

جرمن ساختیات کا ارتقا بھی بہت ترتیب سے ہوا۔ اپنے اندر تاریخی منازل کی نشاندہی کرنے کے علاوہ ساختیاتی فکر سے متعلقہ مخصوص رویہ کبھی کبھی "مکتب" (School) کی صورت میں بھی سامنے آیا۔ اس پر "لیبل" بھی چسپاں کئے جاسکتے ہیں کیونکہ نظریہ دانوں، نقادوں اور محققین نے اپنے طور پر اس حوالے سے سوالات اٹھائے اور تحقیق و تنقید کی ساختیاتی فکر کو اپنے اپنے اسلوب سے سیراب کیا۔

لسانیات اور ادبی تجزیات

ساختیات میں ادبی مطالعوں کے اثرات سے قبل ادبی متن کی تشریح کی گئی جس کی بنیادیں تاریخی حوالے سے زبان کو اہمیت دیتی تھیں۔ ساختیات کا بنیادی ڈھانچہ زبان کو غیر تاریخی قرار دیتا ہے۔ اس کے ذیلی نظاموں میں شاعری اور ادب بھی آتے ہیں جو "آئیڈیا" اور "کردار" کی صورتحال کو اہم قرار دیتے ہیں۔ اسے ادبی متن ترتیب نہیں دیتا لیکن جب لفظ زبانی تکلم کا حصہ بنتا ہے تو اس میں انسانی ذہن و مزاج اپنی طرف سے بے حد کم و بیشی کر دیتا ہے اور Verbal Artifacts بن کر رہ جاتی ہے اور زبان کا یہی تفاعل ادبی مطالعوں میں تنازعات کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ یوں لسانی سطح پر مبالغہ آرائی شروع ہو جاتی ہے اور ادبی تجزیات میں Linguisification کی صورتحال متوقع ہو جاتی ہے جس کو بیروش (Beirwisch) اور باوم ارتنر (Baumgartner) نے اپنے تصورات میں اہم جگہ دی۔ بیروش کے تصورات اصل میں چامسکی کے لسانی تصورات ہیں، جن کو شعری اہلیت سے اخذ کرتے ہوئے ثانوی سطح پر اس کے اصولوں کو خورد برد کر کے اپنے لسانی تصور کو آراستہ کیا گیا جبکہ باوم ارتنر اپنے طور پر یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ان کے بنائے ہوئے پیمانے شعری متن کی "نسل" کے لئے ہیں۔

جرمنی میں Generative-Transformational Grammar کا شروع میں خیر مقدم کیا گیا لیکن بعد میں اس تصور کا اعتدال پسند اقدامات کے ساتھ مطالعہ کیا جانے لگا جس کی مثال Lili-Zeitschrift Fur Literaturwissen Schaft Und Lingustik (۱۹۷۰ء) سے دی جاسکتی ہے جو کہ اصل میں کئی تنقیدی و تدریسی نتائج کا نچوڑ تھا۔ اس باب میں یہ کوشش کی

گئی کہ زبان کی ماہیت کو سمجھتے ہوئے ادب کے غیر منقسم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے جو کہ Taxonomic یا مولود قواعدیات کی اصطلاح کی تشریح کرتے ہیں۔

شروع سے ہی اس بات کو طے کر لیا گیا تھا کہ ادبی متن کو لسانی اصطلاح میں ہی بیان کیا جاسکتا ہے جو زبانی کلام کے ظہور کی بنیادوں پر ساختیے کو مزید تجریدی اور پیچیدہ بنا دیتے ہیں اور زبانی کلام کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ لہٰذا ادب کا مطالعہ و تجزیہ خالصتاً لسانی بنیادوں پر کر دیا جاتا ہے۔ یہی لسانی جبر ادب کی تقریباً ہر صنف پر حاوی نظر آتا ہے جس میں جملوں اور سطروں کا بطور متن کے تجزیہ کیا جاتا ہے اسی دوران جرمنی میں Transphrastic کا متنی قواعدی تصور ابھرا جو پیراگرافوں میں جملوں کے تصورات سے لے کر کل متن کی میکانیت سے بحث کرتے ہوئے سیاق کی نشست و برخاست اور اس کی بندشوں سے بھی روشناس کرواتا تھا جس سے یہ بات عیاں ہوتی تھی کہ سیاق کو غلط طریقے سے بیان کرنے سے متن کمزور ہو جاتا ہے۔ موریس (Morris) نے نحویات کے امتیازات پر بھی بحث کی جس کو وہ نحویات کے "زبانی نشان" کہتے ہیں۔ نحویات کا ایک حصہ اس کے اصل سے متعلق ہوتا ہے اور اپنی علامتوں کو مزاج کے وقوع پذیر حصار میں ان کی تکمیل کے مراحل سے گذرتا ہے۔ یہ صورتحال ایک حد تک نتائجی ہے۔ اور بدیعیات سے اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کرتی ہے۔ یہ مزید وسعت پا کر نئے نظریے کی قبولیت کا مرحلہ وار حل پیش کرتی ہے اور لگتا ہے کہ نحویات کا نظریہ ابلاغی نظریے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

ان تمام محدود عناصر کے باوجود لسانیات کا شعری نظریہ اُبھرتا ہے جو اپنے طور پر شعریت (Poeticity) اور جمالیات کے تصورات کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ اپنے طور پر شعریت اور جمالیاتی متن کا تجریدی نکتہ بھی فراہم کرتا ہے جو کہ باطنی سطح پر رومن جیکب سن کے "ساختیانہ" (Structurization) کے تصور سے قریب ہے۔ جیکب سن نے اس سلسلے میں کہا تھا کہ شعری تفاعل، پیغامات کا مجموعہ ہوتا ہے جس میں ساختیات کے کلیدی تصور کے اتصال کو اپنایا جاتا ہے۔ یہ تصورات سے لے کر متن کی سطروں کی ترتیب نو کرتی ہے، یہ شعریات کے متن کی درجہ بندی کرتے ہوئے نحویات کی مشکل پسندی سے شعری نظریات کو جنم دیتی ہے اور یوں عملی تشریحات کا عمل شروع ہوتا ہے۔

نشانیات میں "افزائشی" (Generative) نشانیات کا ذکر نہیں تھا نہ ہی لیکوف (Lakoff) اور نہ ہی چامسکی نے استعارے کے نظریے میں جرمنی کے مہیا کیے ہوئے نشانیات کے ماڈل کو بیان کیا۔ غیر تشکیلی قسم کے نشانیات میں اولمین (Ullmann) انگلستان میں وینرچ (Weinreich) فرانس میں گریماز (Greimas) اور جرمنی میں کوزوریو (Coseriu) دلچسپی لے چکے تھے۔ نشانیات کے تصور کے خدوخال نے سب سے پہلے اس بات کی دعوت دی کہ "زبان کی عمومی جہت "Paradigmatic" کے درمیان "طریقہ / معمول" (Tenor) اور "وسیلے" (Vehicle) کا تجزیہ کیا جائے۔ (آئی اے رچرڈ) اور استعاراتی متبادل اور اس کے سیاق کے درمیان نحوی روابط تلاش کیے جائیں جس کی عدم تشریح میں فرہنگ برابر کی شریک ہے۔" (کوزوریو)

اسلوبیاتی ساختیات ابھی تک طریقہ کار کے مسائل کو حل نہ کر سکی، فی زمانہ الموضوعی کے رجحان نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا لیکن شماریات کی میکانہ روش نے اسلوب کے تجزیات کو بام عروج تک پہنچا دیا جبکہ حاسب (کمپیوٹر) کے طریقہ کار سے جرمنی میں وہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے جو امریکہ نے اس میدان میں حاصل کیے ہیں۔

دوسری طرف مقداریت (Quantitative) کی تحقیق نے لسانی مطالعوں کو کئی شاخوں میں تبدیل کر دیا، خاص طور پر ذاتی متن اور گروہی یا اجتماعی متن کی دو اہم شاخیں جدید لسانیاتی علوم میں ایک اہم مقام پا چکی ہیں۔ یہ فقط صوتیاتی، عروضی، نمونہ لفظ (Morphological)، لغوی، معنیاتی اور نشانیاتی خدوخال کا موازانہ کرتی ہیں۔ اسلوب کو پس پشت ڈال کر اس عمل کے پس منظر میں جمالیات اور شعریات کے کئی مقداری نوعیت کے تصورات تجربے میں آئے ہیں، جو ادبی نظریے کے تجزیے کو آگہی عطا کرتے ہیں۔ جرمنی میں اس تحریکی رویے کو چھٹی دہائی میں سٹٹ گارٹ (Stuttgart) گروپ نے سب سے پہلے متعارف کروایا۔ شروع میں ان کے خیالات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا کیونکہ مقداریت جمالیات کے تصور کو مجروح کر کے ضائع ہی نہیں کر دیتی بلکہ اس سے کئی پیچیدگیاں بھی اُبھرتی ہیں۔ بینز کے اس تصور نے زبان کے ادبی اور جمالیاتی نظریے کو عملیات کے زیر اثر رکھ کر ساختیاتی شعریات اور اس کے نمونوں کا تجریدی ڈھانچہ پیش کیا جو ایک عرصے تک کسی فکری بھول کی وجہ سے صورت گری کا تسلسل برقرار نہ رکھ سکا۔

ان تمام نحویاتی اور نشانیاتی مباحث کے باوجود لسانی شعریات اسلوب کے تجزیے سے ہی وابستہ رہی۔ لیکن یہ تجزیاتی رویہ روایت اور قدامت کے حصار کو توڑ کر جلد ہی تجربی اصولوں میں منتقل ہو گیا۔ جرمنی میں ساختیات سے متعلقہ مباحث شروع ہونے سے قبل اسلوبیات کا ایک مخصوص رویہ شعریات کے میدان میں نظر آتا ہے جس کے بنیاد گزاروں میں وسلر (Vossler) اسپٹزر (Spitzer) اور ہاز فیلڈ (Hatz Field) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ساختیات کی اسلوبیات Styleme کے تصور سے شروع ہو کر "Foregrounded" کی ایک بھول کے تحت پس منظر کے معمولات شکن وظائف ثابت ہوئے کیونکہ اس سے قبل متن معمولات کے یک زمانی تصور اور متعلقات سے بحث کی گئی۔ لیکن اس کے برخلاف تاریخی حوالے سے جتنی ساختیات نے شعریات کے مطالعے پر زور دیا جس کا اصلی سیاق نحویاتی نوعیت کا ہوتا ہے جو اصل میں نحوی معنویت کا پس منظر لیے ہوتا ہے جس سے شعری انتقادات میں نظریاتی اور عملی نوعیت کے مسائل اُبھر آئے۔

دو فکری رویے جدید جرمن اسلوبیات کو مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ اسی فکری ثمر سے بعد میں ساختیات نے بھی استفادہ کیا۔

(۱) عہد کی تشریح کرنے والے فعل (Tense) کے قواعدیاتی مسائل کو ان رشتوں کا پتہ چلانا تھا جس کا وقت سے تعلق تھا۔ یہ فعل کے نحوی پہلو بھی تھے جو اصل میں لسانیات کے بنیادی مسائل تھے۔ اس نے اپنے طور پر معنویت میں توسیع پا کر فکشن کی تنقید تک اپنا دائرہ پھیلا لیا جس نے اس کے اپنے روایتی نظام کو عارضی رشتوں کی صورت میں پیش کیا۔

(۲) دوسرا استعارہ نظریے کا تھا جس کی نشوونما بدیعیات کے روایتی نظریے کے زیر اثر رہ کر رُک گئی لیکن یہ سلسلہ روایتی نظریے کا جمود توڑ کر نئے انداز میں اس وقت منظر عام پر آیا جب استعارے نے نئی تنقید کے Polysemy کے تسلط سے نجات حاصل کرتے ہوئے استعارے کی معنویت کو مشکوک بنا دیا۔

الہامیت کے تصور نے اس مخصوص دبستان کو بچائے رکھا لیکن پھر بھی ترتیب وار نظریے کا ارتقا ہوتا نظر آیا۔ تب بدیعیات کے نظریے کے پس منظر میں نئی ساختیاتی دلچسپیوں کی تہوں کو دریافت کیا گیا، جس میں سب سے اہم نشانیات کی ساختیات تھی۔ ان تین اقسام کے

بیانیات

ساختیات سے متعلق مباحث میں بیانیات کی باقاعدہ علمی حیثیت ہے جو کہ اب سائنسی صورت حال بھی اختیار کر گئی ہے لیکن گذشتہ چالیس سال سے علم بیانیات کی قواعدیات (Handlungsgrammatik) میں بڑی عرق ریزی کرنے کے بعد بیانیہ کے ڈسکورس کی تحلیلی نوعیت کا ارتقا ہوا جس کو جرمن زبان میں Erzahlertypologie کہا جاتا ہے۔ بیانیات اصل میں بیانیہ کے متن کا نظریہ ہے۔

بیانیات کے میدان میں دو اہم شاخوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۱) کہانی کے بین السطور میں متن کے نمونوں کا مطالعہ۔

(۲) بیان کے ڈھانچے کا تفسیر و بیان (ڈسکورس)

اوپر درج کئے ہوئے پہلے نکتے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے اقتباس کی محدودیت کی ایک مخصوص فضا متن کے بیانہ میں تصور کر لی جاتی ہے جبکہ اس کے برعکس History کی کوئی بھی قسم متن کو تشکیل دے سکتی ہے اور یہ نظریہ اپنے طور پر اپنا اطلاق کرتا ہے اس حوالے سے Analyse Du Recit کا دبستان سامنے آتا ہے جس میں بارتھ، برمانڈ (Bremond) تودوروف (Todorov) اور کئی ماہر نشانیات کے نام لئے جاسکتے ہیں جو کہ بیانہ اور ڈرامائی تخلیق کے درمیان حد فاصل کھینچتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں بہت سے نقاد اس نظریے کی غلط تشریح کرتے ہوئے اس کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں جو اصل میں اس نظریے کی کمزوریاں نہیں ہیں۔ بیانہ کی عمارت تو ہی متن کے عمیق ساختیے کا انکشاف کرتی ہے جو زبان کے اصل ظہور سے مختلف ہوتی ہے جس کا ہم عمیق سطح پر جاکر موازنہ کر سکتے ہیں۔ (جیسا کہ ڈرامہ اور ناول ہے)۔

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ جرمنی کی بیانیہ تحقیق پر فرانسیسی ساختیاتی دبستان کا گہرا اثر رہا کیونکہ اس موضوع پر کئی اہم تصانیف فرانسیسی سے جرمن میں ترجمہ ہو چکی تھیں لیکن نشانیات کے نظریے سے جرمن اسکول نے کم استفادہ حاصل کیا جبکہ روسی ماہر علم بیانیات اور بنیاد گذار پراپ (Propp) نے اس امر کی طرف توجہ دلوائی کہ نظام ہی ایک طریقہ کار ہوتا

ہے جس سے حالات میں تبدیلی کی جاسکتی ہے حالانکہ پراپ کا نظریہ سخت قسم کا تنابی اور دخالی نظریہ تھا جو ایک عرصے سے خارج از بحث تھا۔ پھر بھی بیانیات سے پہلے کے متعلقہ نظریات نے ادبی نقادوں کے لئے خاصی الجھنیں پیدا کیں مگر اس سلسلے میں جرمن اہل فکر اور نقادوں کے یہاں کسی قسم کی مشکلات دیکھنے میں نہیں آتیں کیونکہ جرمنی میں بیانیات کے نظریے کو کئی شاخوں میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کی درجہ بندی کرنے کے بعد اس کے ہر میدان کی صراحت کے ساتھ تشریح کرتے ہوئے آفاقی سطحیت کی پیچیدگیوں اور مغالطوں سے دامن بچالیا گیا لیکن یہ درجہ بندی ایک پہلو سے اس سبب بڑی حوصلہ شکن بھی ثابت ہوئی کہ موافق عناصر عمیق ساختیے کو بہتر طور پر بیان کر سکتے تھے۔ اس قسم کے مباحث برمانڈ نے Log Ique Du Recit میں اٹھائے ہیں۔ اور یہ احساس بھی ہوا کہ فرہنگ اصطلاح اور تحلیلی طریقہ کار کو ایک دوسرے کے بعد مطالعہ کیا جاسکتا ہے اس طریقہ کار کا اطلاق قصہ کہانی اور لوک کہانیوں کی بیانیہ ہیت کو مطالعہ کرنے کے لئے بہتر تکنیک ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جرمن ساختیات کے میدان میں قواعدیات اور بیانیات کی آگہی ایک کٹھن مسئلہ رہی ہے لیکن جب بیانیہ فکر و تکنیک جرمنی سے فرانسیسی کہانیوں کے حوالے سے نمونہ بنتی ہے تو اس میں اختصاص معدوم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ جب فرانسیسی عمیق ساختیے کی چھلنی سے گزرتا ہے تو فرانسیسی اصول اور اپنے وضع کیے ہوئے طریقہ کار کی مدد سے اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رسائیوں (Approaches) اور اصطلاحوں کی وسعت کو گولچ (Gulich) اور ریبل (Raible) نے نہایت ہی باریکی سے ترتیب وارانہ انداز میں مطالعہ کر کے ان دبستانوں اور تنقیدی وسعتوں کا پتہ چلایا جو عملی تنقید کا حصہ تھے۔ ان کے بنائے ہوئے اصولوں میں کہیں بھی کہانی کے نمونوں کی تشکیل نو کا ذکر نہیں جو زبان کی سطحی ساختیے کے حوالے سے شناخت کئے جاسکتے ہوں یا جو کہانی کے نمونے میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں جس سے ادبی متن کے سطحی ساختیے کا مناسب طریقے سے تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں پر کہانی کار کے اس رول (Role) سے بھی بحث کی جاتی ہے جس کے تحت وہ کہانی کو بیان کرتا ہے۔

ایک دوسری رسائی جرمن ساختیات و فکریات کا حصہ رہی ہے جس میں بیانیہ کی عمارت نو کے لیے عمیق ساختیے کے ڈھانچے سے مدد لی گئی ہے جو کل اصل میں مولود مبادلیاتی قواعد

کی تبدیل شدہ شکل تھی۔ اصل مسئلہ محاورے اور طرز کلام کی جملہ واحد میں منتقلی سے متعلق ہے جس سے متن کی صحیح تصویر اُجاگر ہوتی ہے۔ اس رویے نے مکمل متن کی تشریح اور فرانسیسی ماہر نشانیات نے سطحی اور عمیق ساختیے کی نشاندہی بھی کر دی (جس کو بعد میں مائیکرو اور گلوبل اسٹرکچر بھی کہا گیا) عمیق ساختیہ بیانیہ میں وقت اور مقام کا احاطہ کرتا ہے اور واقعات کے عمل کی تفہیم کو ممکن بناتا ہے جس سے مباحث (انسان کے ہاتھوں تکمیل پانے والا عمل) کے دھارے سے پھوٹتے ہیں اور کئی مبادلیات کی صورت حال جن میں اضافے، حذف اور تبادلے کے تکنیکی نکات اُبھرتے ہیں۔ یہاں نقاد کئی اصول بناتا ہے تاکہ بیانیہ متن کو ضبط تحریر میں لاکر مطالعہ اور تجزیہ کرے۔ نشانیات کی قواعدیات اس مقام پر آکر اعلیٰ درجے کی تجریدیت کو ابھارتے ہوئے اس نظریے کے اطلاق میں مشکلات پیدا کر دیتی ہے اور نظریاتی اثرات عملی تجزیات سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔ کئی اہم فکری مسائل غیر متوقع طور پر اُبھر کر پریشانی کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس عمل کے دوران غیر ہیت پسندانہ ابہام لسانی ساختیے کے جبر کے تحت متن کے قواعدیات کا پیدا عنصر اُبھر آتا ہے۔ سطحی معیار کے کئی ٹکڑے کامل متن میں در آتے ہیں جو فعل کی مراتبیات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ اصل میں ابلاغ کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں جس میں کہانی بیان کرنے والے کی مابعد ابلاغ کے رویئے بھی سامنے آکر ایک موضوعی فضا کھڑی کر دیتے ہیں اور بعض دفعہ جملوں کے ساختیے کے متبادل بھی تلاش کئے جاتے ہیں لیکن اب تک تقاضیانے کا یہ عمل تسلی بخش ثابت نہیں ہوا۔ متن کے ٹکڑے "ذیلی متن" کے سلسلے میں تبدیل ہو کر کسی نئے تناظر کی گرہیں نہیں کھولتے اور نہ ہی بیانیہ کے تجزیے کے لیے کوئی نئی تکنیک کا عندیہ ملتا ہے۔

وینولڈ (Weinold) کا کہنا ہے کہ بیانیہ متن ابلاغ کے نظریے کے فریم ورک میں رہ کر اپنا سفر مکمل کرتا ہے اور اسی عمل کے دوران قاری اپنا نکتہ نظر وضع کرتا ہے اور کئی دیگر اثرات اور عوامل جن میں بیانیہ کا محرک (مصنف) کے آئیڈیا، بیانیہ کی سطح اور عمیق ساختیے کے مباحث گہرے سے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں (وینولڈ نے اس کے لئے قدیم (Primitive) یا باقاعدہ / اصلی (Normal) کی بیانیہ ہیئت کو بیان کیا ہے، جس میں قاری کی شرکت پر بھی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جو کہ ادبی متن کو خوش آمدید کہتا ہے اور اصل میں متن سے

جمالیاتی وابستگی کے باعث جنم لیتا ہے۔ قاری کے یہاں دوران قرأت "جذبات"، "تجسس" اور "خوف" کے محرک حاوی ہوتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ متنازعہ مسئلہ اس وقت سامنے آتا ہے جب قاری متن کے ساختیے کی بنیاد پر اسے قبول کرتا ہے۔ وینولڈ کا نظریہ "بند" قسم کا ہے جو بنیادی سطحی اور عمیق ساختیوں کے دائرے میں چکر لگا کر خود ہی دم توڑ دیتا ہے مگر پھر بھی یہ بہت سے سطحی ساختیوں کی نشاندہی کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔

ایک اور قسم کی بیانیہ شاخ جرمن ساختیات میں شناخت کی جاسکتی ہے جو شروع سے ہی زبان کو بیان کرتے ہوئے بیانیہ کا حصہ بن جاتی ہے جس کے اصل متعلقات کو بیانیہ کی وساطت سے ہی تشریح کرتے ہوئے بیانیہ اور ڈرامائیت کا روایتی معنوں میں مطالعہ کیا جاتا ہے جس کو روایت کے تناظر میں ساختیاتی بحث سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اس حوالے سے اسٹینزل (Stanzel) اور لیمرٹ (Lammert) کے نام اُبھرتے ہیں جنھیں ساختیاتی توسط سے کبھی شناخت نہیں کیا گیا، انھوں نے روایتی بیانیہ ساختیے پر پڑے ہوئے کئی پردوں کو نہایت ہی جرأت کے ساتھ اٹھاتے ہوئے بیانیہ کے نظریے میں کئی اضافے کئے۔ ان کے اثرات جرمنی سے باہر فرانس اور اینگلو امریکن تنقید میں بھی نفوذ کر گئے۔ ان دونوں ناموں کے ساتھ ہی بیانیہ تحقیق کا نیا باب کھلا جس نے بیانیہ مباحث میں کئی فکری دروازے کھولے اور تفصیل سے ان کی گہرائیوں میں اتر کر وقت کے بیانیہ اور واقعہ نگاری کی علم تاریخ (Chronology) کو نئے روپ میں پیش کیا جس پر لیمرٹ کے نظریات کا اثر رہا۔

بیانیہ میدان میں سب سے اہم کلیدی مسئلہ وقت کی ترتیب کا رہا ہے جو بیانیہ متن پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اس مسئلے کا مولر (Muller) نے گہرائی سے مطالعہ کرتے ہوئے ناول کی مخصوص وقت (دورانیہ) میں قرأت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ساتھ ہی کہانی کے بیانیہ کو دیئے جانے والے وقت پر بھی نظر ڈالی جس کی وجہ سے مائیکرو اسٹرکچر کے متن کی عارضی درجہ بندی ہو جاتی ہے۔ شروع میں بیانیہ متن پر جو مباحث ہوئے۔ ان کو پس منظر میں رکھتے ہوئے واقعہ نگاری کی تاریخ (Chronology) کا بیانیہ ساختیے کے تناظر میں مطالعہ کیا گیا جس کا تذکرہ نہ ہی جرمنی سے باہر ای۔ ایم۔ فوسٹر (Forster) اور نہ ہی بوتھ (Booth) کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

کہانی کا تجزیہ کرنے میں بیانیہ کی تکنیک نے کئی رُخ بدلے۔ نئے بیانیہ ڈسکورس ہوئے، جس میں قابل خلق افسانے کی درجہ بندی کرتے ہوئے قاری سے اس کے تعلق پر بھی بحث کی گئی۔ اسٹینڈل کی نوعیات کے مطالعے نے کاملاً ایک ایسے نظریے کو پالیا جو کہ یقیناً ابلاغ کا نظریہ تھا، جس میں قاری کے رول کا "اصل" اور "نقل" کی بنیادوں پر ابلاغی سطح پر مطالعہ کیا گیا۔ قریب دو عشروں کے بعد ادبی نظریہ دانوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ اصل قاری اور نقلی بیانیہ ابلاغ کے نظام میں سب سے زیادہ اثرانداز ہوتے ہیں اور یہ متن کے ساخیتے کی صورت کو بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ جس میں سب سے اہم نکتہ "تناظر" کا ہوتا ہے۔ ایک جانب تو کہانی کے ارتقا کے نکتہ نظر کو پیش کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس کے خدوخال کو دوسرے عناصر سے علیحدہ رکھ کر پیش کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ اس کا تعلق بیان کی ہوئی کہانی سے بہت گہرا ہوتا ہے پھر بھی قاری اپنی محدود توانائیوں اور ذہنی سطح کی بنیاد پر ہی متن کو تقسیم کر پاتا ہے اور بعض دفعہ باہر کے تناظر کو محدود سطح پر محسوس کرتے ہوئے متن کی معنویت کو اپنے طور پر تسخیر کر لیتا ہے۔

بیانات کے علم میں اس کے علاوہ "کلام" کے خصوصی مسائل سر اُٹھاتے ہیں (جو باقاعدہ (Normal) نوعیت کے ہوتے ہیں جو فرد ماضی بعید سے اخذ کرتا ہے) ساتھ ہی ساتھ باطنی مانولوگ اور شعری بازیافت بھی ہوتی ہے۔ جرمنی میں بیانیات کے میدان میں جو رویے سامنے آئے اور جو پیش رفت ہوئی وہ جرمن ادبی انتقادات پر تو اثرانداز ہوئی لیکن فرانسیسی ماہر نشانیات کے یہاں کئے ہوئے نظریات پر جرمن ساختیات نے گہرائی سے نظر ڈالتے ہوئے مبادلیات کے مولودی قواعدی نظریے اور متن کے بیانیہ کی آگہی کی جہاں اس سے جہاں جرمن فکر کو فائدہ ہوا وہاں فکری مغالطوں اور پیچیدگیوں نے بھی جنم لیا۔

ڈجک (Dijk) نے بیانیہ ابلاغ کے مطالعے کو مزید وسعت دیتے ہوئے متن کے بیانیہ تجزیے کو نئے اُفق دیئے اور انھوں نے اپنے سے پہلے کی جانے والی تحقیقات اور تکنیک سے بے بہرہ ہو کر ان مسئلوں کی جانب توجہ نہ کی جو پہلے سے مطالعہ ہو چکے تھے جبکہ دیگر جرمن نظریہ دانوں نے روایت کی رسائی کو بنیاد بناتے ہوئے ڈسکورس کا تجزیہ کیا اور ابلاغ کی کئی سطحوں کا ادبی متن کے حوالے سے مطالعہ کیا۔ ان دونوں گروہوں میں فکری اور تکنیکی تفاوت

اس سبب سے تھی کہ ان کے خیال میں نظریے کو زیادہ تخلیقی ہونا چاہئے لیکن نظریاتی مطالبات خاصے آرزومندانہ تھے۔ پھر بعد میں اس گروہ نے بیانیہ کے متن کی تشریح اور اس کے عملی تجزیے کے خصوصی پہلوؤں میں دلچسپی لیتے ہوئے بیانیہ ڈسکورس کیا۔

بدیعیات

تقریباً دو ہزار سال سے انتقادات کی کلاسیکل تھیوری میں بدیعیات کو سب سے زیادہ موضوع بحث بنایا گیا۔ بدیعیات لسانیات کے ایسے اصول ہوتے ہیں جو تقریر و تحریر پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ بدیعیات کے کلاسیکی نظریات دانوں کا کہنا ہے کہ بدیعیات کا مطالعہ فصاحت پر اثرانداز ہوتا ہے۔ ادبی تنقید میں بدیعیات ہی ایک ایسا علم ہے جو لسانیات و خطابت سے لے کر ادبیات کے کئی شعبوں کو نکتۂ اتصال مہیا کرتا ہے اور تکلم کے خدوخال کو بھی کسی حد تک واضح کرتا ہے۔ روایتی طور پر بدیعیات کے علم میں اصطلاحات کا جنگل اُگا ہوا دکھائی دیتا ہے، جو تکلم کے تقریباً ہر گوشے کی لسانی و قواعدی سطح پر مبالغے کی حد تک اثرانداز ہو کر اپنے مخصوص لسانی جبر کو اجاگر کرتا ہے لیکن جب سے لسانیات اور ادبیات کی تنقید نے نئے تجزیاتی پیمانے استعمال کرنا شروع کئے تو بدیعیات کے کئی اصول مسخ ہو کر رہ گئے۔ چھٹی دہائی اہم رہی کہ اس نے بدیعیات کی روایت کو زندہ کیا، اس نے استعارے اور متبادل اسم (Metonymy) کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کو دو مختلف ادبی حرکیات قرار دیا۔ اس سلسلے میں بلجیم کے گروپ "یو" (U) نے جیکب سن کی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے بدیعیات کے نظامیانہ کا قدرے سختی سے لسانی بنیادوں پر تجزیہ کیا جو کہ کتابی صورت میں Rhetorique Generale میں شائع بھی ہوا۔ ان مطالعات نے بدیعیات کے سلسلے میں کئی نئے نظریات وضع کرتے ہوئے کئی دعوے بھی کئے اور بدیعیات کے نظریے کو ابلاغ کے عمومی نظریے سے منسلک کر دیا۔ لسانیات کا لہجہ ترغیب پسندانہ ہوتا ہے لہٰذا Persudere کا لفظ جرمن بدیعیات میں کلیدی مقام حاصل کر گیا۔ ساختیات کی نئی دلچسپیوں میں بدیعیات کا نہ ہی قدیم فکری نظام کے تحت مطالعہ کیا گیا اور نہ ہی اسے مکمل طور پر رد کیا گیا۔

ساختیات کے مقاصد میں لسانی سطح پر بدیعیات کی کٹھن اور ترتیب وار درجہ بندی

کرتے ہوئے بدیعیات کی کلاسیکل تعریفات سے کسی حد تک الگ رہ کر اس کی پرانی اصطلاح میں تخفیف کی گئی اور اس کی چار بنیادی لسانی تشریحات کی گئیں۔

(۱)اضافہ (۲) تفریق (۳) تبادلہ (۴) تبادلیات

اور متن کی بنیادوں پر اسے مزید چار شاخوں میں تبدیل کیا گیا۔

(۱) لسانی (۲) مطالعۂ لفظ (Morphological) (۳) نحوی (۴) معنیاتی

لسانی ساختیات کا یہ نظام مائیکرو درجہ بندی کے لئے قدرے نیا نہیں تھا لیکن مائیکرو ساختیات نے استعارے کے نظریے کی ایک حد تک تفہیم کی۔ اس نئے طریقہ کار کے تحت نقادوں نے متن کے تجزیے کی کئی جہات کو دریافت کیا جو اپنے طور پر بدیعیات کے ساختیاتی تجزیے کے قدرے آسان پیمانے بھی تھے۔ ان کو بازار کاری کے رویے نے اطلاقی مزاج میں تبدیل کر کے تشہیر کی کاروباری دنیا میں روشناس کروایا۔ خاص کر امریکہ میں ایک نیا انقلاب آیا اور بدیعیات ایک اطلاقی علم کی صورت بھی اختیار کر گئی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ترقی یافتہ معاشروں میں بدیعیات کا نظریہ نشانیات کے نظریے کے ساتھ مدغم ہو گیا تھا جس نے زبان کو عملی اور غیر عملی شاخوں میں تبدیل کر دیا۔

اس کے علاوہ نقادانِ بدیعیات نے دور سائیوں تک پہنچنے کی بھی کوشش کی جن میں نتائجیت کا نظریہ اہم تھا۔ دوسری جانب تکلم کا ترغیباتی نظریہ آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اس ترغیبی تکلم کے سلسلے میں بدیعیاتی حوالے سے بحث اس قدر جذباتی ہو گئی کہ ہر چیز اور فکری مباحثے "مجذوب کی بڑ" ہو کر رہ گئے اور بات یہاں تک پہنچی کہ ایک طرف تو یہ بھی کہہ دیا گیا کہ تکلم کا عمل ترغیبی نہیں ہوتا اور اس کی تخلیق تجزیات کے عناصر کو ممیز نہیں کر سکتی، جبکہ دوسری سطح پر اس کا لسانی ساختیے کی سطح پر تجزیہ کرنے کے بجائے بدیعیات کے عمرانیاتی اطلاق پر بحث کی گئی۔ اس میں سیاسی جمہوریت تک کی بحث بھی شامل تھی یوں بدیعیات لسانیات کو معاشرتی سطح پر کئی اختصاصی پیمانوں کے علاوہ مہارت کی نئی آگہی سے آشنائی بھی ہوئی۔

ڈسکورس کا تجزیہ یا متن کی لسانیات

لسانی ڈسکورس کا سب سے زیادہ مشاہدہ لسانی متن میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ وہ عنصر

ہے جس کی بنیاد پر متن کی معنویت اور اس کی لسانی میکانی حرکیات کو شناخت کیا جا سکتا ہے۔ چاہے نقادانِ فن اس سے گریز ہی کیوں نہ کریں یا اس سے اتفاق — مگر یہ حقیقت ہے کہ زبان ہی ادبی مطالعوں میں سب سے پیش پیش رہتی ہے۔ زبان ہی جملوں کی معنویت کے پیمانے فراہم کرتی ہے جو آگے چل کر لسانی تجزیات میں ادب یا شعریات کو کسی نہ کسی مخصوص ساختیے کی اہلیت سے متعارف کرواتا ہے۔ لسان کے ساختیے کی کلاسیکل تعریف سے قدرے اختلاف بھی کیا گیا، کیونکہ زمانے کے ساتھ ساتھ زبان کے مقاصد اور اس کے وظائف میں بھی تبدیلی آئی جو مجرد جملے کے لسانی و متنی تجزیے سے متعلق تھی۔ خاص طور پر جرمنی میں متنیت کی لسانیات کے لیے Text Linguistik کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اصل میں "متنی نحو" (Makros Syntax) یا "ڈسکورس تجزیے (Disurs Analyse) کے ہم معنی ہیں۔ ڈسکورس تجزیے کی اصطلاح سب سے پہلے زیڈ۔ ایس۔ ہیرس (Harris) نے پانچویں عشرے میں ایک مطالعاتی پروجیکٹ میں استعمال کی جو بعد میں امریکہ سے جرمنی و فرانس بر آمد کی گئی۔

"ڈسکورس تجزیے" کا تصور لسانیات اور ادبیات کے تجزیاتی میدان میں بہت مفید ثابت ہوا۔ نحوی مطالعات میں Transphrastic اصولوں کو اپنایا گیا اور کئی مختصر اور قوس مطالعوں میں Pronoun کے تجریدی لسانی منصوبوں میں ایک یوٹیپائی فضا بندھ گئی۔ ان مطالعوں نے نئے لسانی اور ادبی "اتصال" کو جنم دیا مگر "متن" کا کوئی واضح تصور سامنے نہیں آ سکا۔ یوں متن کی سمتیں غیر متعین ہی رہیں۔ متن کا باطنی معیار یک زمانی عنصر سے زیادہ قریب تھا جبکہ معنیاتی سطح پر اس کے اجزائے ترکیبی نتائجی وحدت کے وظائف سے پڑتے تھے۔ یہ بعض دفعہ اس نظریے کے عملی ہونے پر ادبی و لسانی تنقید میں تشکیک کا سبب بن گئے۔ اس کے علاوہ اس حوالے سے "جملہ کا وظائفی تناظر" کا نظریہ بھی ڈسکورس کے تجزیے میں اپنی شرکت کا احساس دلاتا ہے جس کو ایف ایس پی (Function Sentence Perspective (FSP) کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس نظریے کو پراگ دبستان کے ماہر لسانیات متھیوز (Matthews)، بینز (Benes) اور ڈینس (Danes) نے متعارف کروایا۔

اس تصور میں دو موضوعات (نکات) اہم تھے:

(۱) موضوع کا متنی پھیلاؤ (ڈینس)

(۲) ابلاغی حرکیات (فرباس Firbas)

یہ دونوں اصطلاحات موضوع کی آگہی میں ڈسکورس کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں اس میں موضوع ہی اہم ہوتا ہے تو دوسری جانب ہر آگہی اس کے موضوع کا حصہ بنتی ہے (نفس مضمون، تبصرہ وغیرہ) جو تصوراتی فریم ورک ادبی اور غیر ادبی متن کی آگہی کے ارتقائی درجہ بندی میں ممد و معاون ہوتا ہے اور بیانیہ ساخت کا ہوتے ہوئے بھی ''دلائل'' سے پر ہوتا ہے اس کو بعض دفعہ بیانیہ متن بھی کہا جاتا ہے۔ اگر اس نظریے کے مقاصد کو صرف نظر کر دیا جائے تو ادبی متن پیچیدگی کا شکار ہو کر اس کی اصل ماہیت، تعریف اور موضوع در موضوعات کے سوالات کی گہرائیوں میں اتر کر ''اصل مسئلہ'' موضوع سے ہٹ جاتا ہے اور ساختیے کا متی تجزیہ ابہام کا شکار ہو کر بعض دفعہ دم توڑ دیتا ہے۔

اس سلسلے میں کئی اہل فکر نے غور کیا۔ خاص کر ''ایف ایس پی'' کے تناظر میں وین رچ (Weinrich) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ''موضوع'' کو ''تبدل'' (Rheme) سے مختلف ہونا چاہئے کیونکہ یہ اصطلاح معنیاتی نوعیت کی نہیں ہے لیکن اس میں نحوی خدوخال ضرور ملتے ہیں جو کہ متن کو فعل کے جبر سے آزاد کرواتے ہوئے نحوی قالب میں ڈھال دیتے ہیں جیسے مثبت، منفی، واحد، جمع، فاعل، مفعول، مکمل فعل، مددگار فعل —— اس قالب کو متی اسکور (Score) کہا جاتا ہے۔ یہ تصورات کے نظام میں نحوی خدوخال کے متن کی تناہی صف آرائی کرتا ہے تو دوسرے میدان میں تجزیے کی اشکال متی ''اسکور'' کے ارتقا کو جنم دیتی ہیں جو موضوع کی تبدیلی کو ایک مقام پر مرکوز کر دیتی ہیں۔ یہ ماڈل اپنے طور تسخیر ذات کی قدر کو روشناس کرواتے ہوئے اس کی محدودیت کا بھی احاطہ کرتا ہے جو کہ انفرادی متن میں نحوی ساخت کا ایک مطلق نظام موجزن پاتا ہے۔ اس کی ایک اور سمت کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ متن کے نحوی پہلو سے اپنی دلچسپی کا احساس دلواتا ہے کیونکہ ''متن کے قواعد'' متن کی نوعیات کو بھی ابھارتے ہیں جو متن کے درجات بھی متعین کرتے ہوئے متن کا حتمی انتخاب کرتے ہیں۔

متی تحقیق کے شعبے میں لسانیات اور لسانی شعریات کے نظریے میں قریبی تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور تخلیقی نظریے کو ترتیب اور عام فہمی سے روشناس کرواتے ہوئے قدیم شعریات کا متی نظریہ نوعیات کو بیان کرنے کے سلسلے میں ''محدودیت'' کے تصور کو ابھارتا ہے اس

لئے کہ متی شعریات کی تحقیق کی جدلیاتی رسائی نے متن کے عام نظریے کو فکشن، نیر فکشن، شعریات، غیر شعریات کے خانوں میں تقسیم کر دیا۔ جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ نظریاتی مطالعوں کی تخلیقیت میں تاریخی اصولوں کا غلبہ زیادہ ہو گیا اور لسانیات کا بنیادی نکتہ تاریخی کائنات کا افتراق بن کے ابھرا۔ لیکن اس سے ناول کی صنف متاثر نہیں ہوئی کیونکہ بیانیہ متن کا نظریہ بیانیہ انداز کا تھا جو بعد میں فکشن اور غیر بیانیہ کی درجہ بندی کا شکار ہو کر فکشن کے متی تجزیے کا سبب بھی بنا۔ لیکن پھر بھی متن کا لسانی نظریہ ایک حد تک برقرار رہا جس نے لسانی نتائجی نظریے کو فریم ورک ہی فراہم نہیں کیا بلکہ اسے وسیع تناظر سے بھی روشناس کروایا۔

کارنپ (Carnap) نے تکلم کے عملی نتائجی نظریے کو نتائجیت کی بین الموضوعاتی تحقیق کا میدان قرار دیا جس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر لینا چاہئے کہ یہ نظریہ ساختیاتی لسانیات یا ادبی تنقید کے حصار میں مقید ہے بلکہ یہ انسانی علوم کی کئی شاخوں سے بھی وابستہ ہے، یہ نتائجی نظریہ خاصا پیچیدہ بھی ہے۔

شلیبن لینگ (Schlieben - Lange) نے لسانی نتائجیت پر بنیادی کام کرتے ہوئے یہ بات بتائی کہ یہ دبستان دیگر سات فکری رویوں سے الگ نہیں کیونکہ یہ تمام دبستان نتائجیت پر ہی تکیہ کرتے ہیں جو اپنی دلچسپی کا آغاز مختلف فکری دلچسپیوں سے کرتے ہیں۔ بقول لینگ یہ تمام کے تمام مکاتیب فکر تجربیت اور عمومی لسانی فلسفے سے ترتیب پاتے ہیں جن میں ویانا سرکل کے کارنپ، وٹگنسٹائن، امریکی ماہر نشانیات پرس اور مورس، تکلم کے فعل کے نظریے کے عالم آسٹن (Austin)، ماورائی فلسفے کے حوالے سے اوپل (Opel)، جے ہیبرماس (J. Habermas) کے نام لئے جا سکتے ہیں، ان میں سے کچھ ایک لسانی رسائی کے ڈانڈے عمرانیاتی اور نفسیاتی علوم سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح محدود معانی میں نتائجی لسانیات اور مبادلیات، قواعدیات کا دوسرا نام ہے (چامسکی، کوزورو، لیک آف اور ونڈر لچ وغیرہ) نتائجیت کا ہی نظریہ لسانی ادبی تنقید میں وہ واحد نظریہ بن کے ابھرا جس کے طریقہ کار اور بین العمل کے رشتوں نے انگریزی زبان بولنے والے ممالک اور جرمنی کے درمیان فکر و اسلوب کا رابطہ قائم کیا۔

جرمن فلسفے کے نتائجی میدان میں وٹگنسٹائن نے سب سے پہلے جملے کی نتائجی اہمیت پر

زور دینے کے عمل میں اس نظریے کو عمومی لسان سے منسلک کرتے ہوئے روزمرہ زندگی سے قریب تر کر دیا جس کو عمومی لسانیات کے فلسفے کے نام سے بھی موسوم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ کسی ایجاد سے کم نہ تھا۔ اس نے لوگوں کو "کچھ کرنے" پر اکساتے ہوئے مطلق صورتحال کا فکری نکتہ فراہم کیا جس کو وٹگنسٹائن "لسانی کھیل" (Sprachspiele) کہتے ہیں، اس کی حدود زبانی ابلاغ سے غیرزبانی ابلاغ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا براہ راست تعلق بولنے والی زبان سے ہے جو فعل اور غیرفعل کے برتاؤ سے منسلک ہو کر اپنا اختتام انسان کے معاشرتی بین العمل پر کرتا ہے۔

وٹگنسٹائن اور کارنپ کے فلسفیانہ نکات کو انگلستان اور امریکہ میں بہت قبولیت حاصل ہوئی۔ امریکہ میں تکلم کے عملی نظریے نے جرمن نژاد فکر سے گہرا اثر قبول کیا۔ امریکی لسانی فلسفے کے اہم نام، آسٹن، اسٹروسن، سیرل، پک اور گریس نے وٹگنسٹائن کے نظریات میں اپنے خوابوں کی لسانی تعبیر تلاش کرنا چاہی۔

ان امریکی ماہر لسانیات نے وٹگنسٹائن کے اس لسانی فلسفے کو نئی ترتیب سے استوار کرتے ہوئے تکلم کے نظریے کو نئے نکات سے آشکار کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کوئی پندرہ سال بعد امریکہ میں یہ نظریہ فکری بھٹی میں پک کر نئی معنویت سے ہمکنار ہو کر دوبارہ جرمن لسانی فکر میں نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھ داخل ہوا۔ جرمنی پہنچ کر یہ نظریہ ابلاغ کی نئی وسعتوں کو تسخیر کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس بار تکلم کا یہ نظریہ ترجمہ کی تھیوری میں سرخرو ہونے کے بعد ترجمے کے میدان میں نئی میکانیت کو کسی حد تک دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔ پھر جرمنی میں صورت حال یہ ہو گئی کہ جب ابھی جرمنی میں تکلم کے لسانی نظریے کی نتائجیت پر بات ہوتی تو اس جرمن روایت کا اینگلو امریکن لسانی تنقید کے بنیاد گذاروں کے ناموں کے بغیر تذکرہ نامکمل رہتا۔ اس رجحان کا ایک مثبت اثر یہ ہوا کہ جرمنی میں تکلم کی لسانی نتائجی فکر بڑھانے میں چھٹی دہائی میں ڈی۔ ونڈرلچ (D. Wunderlich)، ایس۔ جے۔ شمٹ (S.J. Schmidt)، یو۔ ماس (U.Mass)، ڈبلیو۔ کمر (W.Kummer) اور کے۔ او۔ اوپل (K.O. Opel) کے نام اُبھرے، جنھوں نے امریکی اور جرمن لسانی فکر کی آمیزش سے تجزیاتی عملیات کی نئی وسعتیں پالینے کی کوششیں کیں۔

اس مرحلے پر نتائجیت کو تحقیق کے تجربی میدان اور نتائجیت کی شاخ کو تحلیلی علم کی

منطق سے ممیز کرنا ضروری ہے جو تسخیر ذات کے ڈھانچے میں اُبھرتا ہے جو محض نوع کی منطق تو ہوتی ہے جس طرح ہم ریاضی کی منطق یا اخلاقیات کی منطق کو وسیع معنوں میں دیکھتے ہیں جو مظہریات کی استدلالیت کے معیارات پر اپنی تشکیلِ نو کرتے ہوئے نفسیات، معاشرتی لسانیات اور مادّی سماجی نظریے کی شاخوں سے بھی اپنا ارتباط کرتی ہے۔ اس تناظر میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ نتائجیت کا مطمع نظر بیوہار (برتاؤ) کے معاشرتی نظریے سے جڑا ہوا ہے۔ یہ اصل میں تکلم کے تجربے کو معاشرتی وجود کی طرح اپنا ہدف بناتی ہے جو معاشرے میں ایک سماجی نظام پر انحصار کیے ہوئے ہے۔ اس نتائجی شاخ کو ساختیاتی نہیں کہا جا سکتا مگر تجربی تسخیر ذات نفسیاتی اور عمرانیاتی تجربیت کے احوال کے ساتھ قبولیت (Reception) کے نظریے اور بدیعیات کی جانب رسائی کرتی ہے، جن سے بائیں بازو کے نقاد ہمدردانہ طور پر اتفاق کرتے ہیں جو نتائجیت کے نظریے سے ہی پھوٹ کر مارکسی، نفسیاتی لسانیات کا حصہ بنتی ہے جیسا کہ ہمیں اے۔ اے۔ لیونٹیو (A.A. Leontiev) اور جی۔ کلاز (G. Klaus) کے تجزیات میں محسوس ہوتا ہے۔

ساختیات کی دوسری شاخ تکلمی عمل کا مفروضاتی ڈھانچہ ہے جو بڑی ہی عرق ریزی کے بعد نتائجیت کی حدود میں داخل ہو کر تکلم کے "مثالی" عملی نظریے کو متعین کرتا ہے اور نتائجیت تکلم کے عملی نظریے Elocutionary Acts اور تکلم کے سیاقی خدوخال (جن کا فہرستی تاثر ہوتا ہے) کو واضح کرتا ہے لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ تمام اصناف کے نقاد نتائجیت کے معاشرتی عناصر سے متعلق نہیں ہوتے جو تکلم کے عملی نظریے میں Perlocutionary قوتوں کے عمل دخل کو بڑھا کر سماجی معنویت کو تشکیل دیتے ہوئے دو افراد کے درمیان زبانی اور غیر زبانی ارتباط کا سبب بنتے ہیں اور بولنے والا (جس کے پس منظر میں Elocutionary قوتیں ہوتی ہیں) اپنے متوقع ردعمل کا اظہار کرتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس صورت حال میں گفتگو کرنے والا "مصلحت" کو اپنا لے۔ ان اختلافات کی عمرانیاتی رسائی کے تحت تشریح کر دی جاتی ہے۔ ان نفسیاتی اور عمرانیاتی احوال کو زبانی برتاؤ کے تحت ہی ابلاغ کیا جاتا ہے۔ اس صورتحال کے تحت جرمن نقاد متنازعہ تکرار کا شکار ہو کر یہ طے نہیں کر پاتے کہ یہ تمام بحث و مکالمہ حد درجے کا "عینیت پسندانہ" ہے یا بہت زیادہ "تجربی" نوعیت کا ہے جس کی مثال لوہمین

(Luhmann) کا ہیبر ماس کی "ابلاغی اہلیت" کے تصور سے حد درجے کا اختلاف ہے جس سے یہ نظریہ عینیت پسندی اور تجربی فضا میں معلق ہو کر مزید پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے۔

تناجیت نے جرمن لسانیات پر گہرا اثر ڈالا۔ خاص طور پر ڈی۔ وندرلچ (D. Wunderlich) نے تکلم کے نشانیاتی نظریے کو مزید وسعت دیتے ہوئے معاشرتی لسانی نظریے کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ وندرلچ کا تناجی نظریہ اور مقاصد اس بات کی تفسیر کو بیان کرتے ہیں کہ تناجی صورتحال میں گفتاری نظام کس طرح روبہ عمل ہوتا ہے۔ یہ پہلے جرمن لسانی محقق ہیں جنھوں نے تکلم کے عملی نظریے کو اختصاصی نقطہ نظر سے پیش کیا جو اصل میں اینگلو امریکن تناجی روایت کی مکمل آگہی ہے جس کو انھوں نے جرمن روایت کے حوالے سے مزید آگے بڑھاتے ہوئے کئی نئے تصورات کو متعارف کروایا۔ وندرلچ کے نظریات تکلم کے سیاق میں ہے۔ رہبین (J. Rehbein) اور کے۔ ایلرچ (K.Elrlich) نے مزید وسعت دیتے ہوئے "مثالی اہلیت" کے تصور کو متعارف کروایا کیونکہ زبانی اور غیر زبانی گفتار اپنے باطن میں اختلافی ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ گفتگو کرنے والے کا "ادراک" ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق گفتار کی لسان اور تناجیت کی اہلیت پر کیا جا سکتا ہے۔ تکلم کے بلواسطہ اور بلاواسطہ تعلق میں بلاوجہ وسیلہ براہ راست نہیں ہوتا جیسے طعن رمز کا مزاج ٹھیک ٹھاک طریقے سے تجزیہ کرکے نظریہ بننے میں مدد دیتا ہے لیکن وندرلچ نے ہے۔ آر۔ راس (Ross) کی منطقی تناجیت کی رسائی سے شدید اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ "تناجیوں کے نزدیک مقاصد اور تصورات کا رشتہ افراد کے درمیان ہوتا ہے نہ کہ اس کا تعلق مسائل کے حل سے متعلق ہوتا ہے جو گفتار کی سچ اور جھوٹ کی صورتحال میں ہمارے مشاہدے میں آجاتے ہیں۔"

تناجی نظریے کی بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نظریہ پہلے سے فکری بساط پر موجود تھا مگر اس کو "اصطلاح" سے بعد میں موسوم کیا گیا۔ اینگلو امریکن اور فرانسیسی فکر نے اس اصطلاح کو وسعت دیتے ہوئے جرمن فکریات پر بھی اثر ڈالا جس کے پس منظر میں سٹیلنیکر (Stalnaker)، سٹروسن (Strawson)، فلمور (Fillmore)، لوکاف (Lakoff) اور ڈوکراٹ (Ducrot) کے نظریات رواں دواں تھے۔

اس نظریے کو بڑی احتیاط کے ساتھ لسانی مطالعوں میں جگہ دی گئی اور اس نظریے کو

اصطلاح کے طور پر پیش کرکے ایک مخصوص رویے کی اساس قرار دینے کے لیے کئی برس لگے۔ نقاد اس بات سے متفق ہیں کہ تناجیت کے لسانی نظریے کو "قبل خیال" نظریہ ثابت کرنے کے لئے فرد، اشیاء اور ناموں کی موجودیاتی مشابہت کا سہارا لیا گیا لیکن بعد میں کئی متنازعہ مسائل بھی اُبھرے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ نشانیات کے لسانی علم میں لسانی خدوخال کا نظام تناجی سیاق سے آزاد ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس بات پر زور دیا گیا کہ "قبل خیال" (Presupposition) کو تناجی تجزیے کی کسوٹی پر بھی پرکھا جائے اور اس کا تعلق گفتاری عمل سے منسلک ہو۔ لہٰذا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ نشانیات اور تناجیت کا نظریہ ہی "قبل خیال" تصور کی موثر تفہیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان مناسب رشتوں کا انکشاف کرکے غیر متعلق باتوں سے کنارہ کشی کرتا ہے۔ لیکن "قبل خیال" کا تصور مخصوص آگہی کی صورت گری کرتا ہے بلکہ گفتاری محرک (فرد) کے وظیفے کو بامعنی بناتا ہے لہٰذا کئی اہم متنازعہ سوالات کے ساتھ یہ بحث آگے بڑھی جس میں گرائس (H.P. Grice) نے نمایاں طور پر حصہ لیتے ہوئے نشانیات اور تناجیت کے حوالے سے گفتار پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا۔

ادبی متن کے حوالے سے تناجی تصورات مثالی تکلم کے نظریے کے طور پر اٹھاتے ہوئے اس بات کو نمایاں طور پر بتا دیا گیا تھا کہ اس بحث سے ادبی نوعیت کے تمام مسائل حل نہیں ہو سکتے لیکن یہ ضرور ہوا کہ اشتہاری بازار کاری، سیاسی تقاریر اور تدریسی میدان میں اس کے اطلاقی پہلوؤں سے فائدہ اٹھایا گیا۔ پھر بھی لسانی نقاد ادب کی تنقید میں "ادبی" کا عنصر تلاش کرتے رہے اس سلسلے میں روسی ہیئت پسندی نے عملی قدم اٹھاتے ہوئے ادب کے لسانی متعلقات سے بحث کا آغاز کیا۔ تکلم کے لسانی نظریے نے سب سے پہلے ادبی ہیئت کو عام لسانیات سے ممیز کرتے ہوئے اصل زبان اور فکشن کی زبان کے تفاوت سے بھی بحث کی کیونکہ فکشن کی لسانیات کا لہجہ عام انسانی معاشرت میں "اصل" نہیں ہوتا اور یہ آسانی سے عام لوگوں تک اپنا ابلاغ نہیں کرپاتی لہٰذا "ردعملیات پر کئی الزام آتے ہیں جو اس کے فہرتی تاثر کو کم کردیتا ہے۔

تکلم کا نظریہ اصل میں "قبل خیال" نظریہ ہے جو کہ ادبی متن کے نامناسب تمثیلی نظریاتی

اصطلاحات سے مالا مال ہے یہ بعض دفعہ پریشانی کا باعث بھی بنتے ہوئے ترتیب کے ساتھ مطالعہ ہونے والے لسانی اور ادبی تجزیات کے لئے تھکن اور عدم اعتبار کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس نظریے کا ہر رُخ اپنے طور پر سخت گیر تصور کیا گیا ہے کیونکہ متنی نتائجیت "موضوع" اور "زائد" کو دو حصوں میں بانٹ کر Elocutionary Act کو وسیع کر دیتی ہے جو کہ شعری متن اور ڈرامائی مکالموں کے تجزیات میں "قبل خیال" کے تکلمی نظریے کا شروع سے ہی تجزیہ کر چکی ہوتی ہے۔

نظریہ قبولیت

نظریہ قبولیت مکمل طور پر ادبی متن کی کوئی نئی رسائی نہیں جس کو جرمنی میں Rezeptions Athetik کہا جاتا ہے۔ نظریہ قبولیت کو روشناس کروانے سے قبل پروفیسر ہانس روبرٹ یاؤس (H.R. Jauss) نے "معیاتی سرکل" کی بنیاد رکھی لیکن اس سے قبل نظریہ قبولیت کے سکّے کا ایک رُخ ادبی اور لسانی تنقید میں تکلم کے ادبی نظریے کی تنقید میں نظر آتا ہے جس نے اس امر کو جان لیا تھا کہ ترتیب وار مباحث کے بغیر نظریہ قبولیت بے معنی ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں قاری کو یہ ادراک ہو چکا تھا کہ ادب اور لسانیات کے میدان میں اس کے ادراک و ذہن کا بھی حصہ ہوتا ہے جو متن کی معنویت کو متعین کرتے ہیں لہٰذا ولف گینگ ایزر اور یاؤس نے قبولیت کے نظریے کے اصولوں کو مرتب کرتے ہوئے جرمن انتقادات کے میدان میں نئے سوالات اٹھائے کیونکہ اس زمانے میں قبولیت کے نظریے نے جدیدیت کی تحریک سے متاثر ہو کر کئی امتزاجی رویوں کو اپنے یہاں جگہ دی جس کا نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ ان مباحث میں روایتی تشریحات کا رجحان قریب قریب ختم ہو گیا اور جو کچھ روایتی تشریحات باقی رہ گئیں وہ تاریخی تسلسل کی آگہی تک محدود ہو کر رہ گئیں حالانکہ قاری کے کردار کی اہمیت ادبی مباحث میں مسلمہ ہے۔ یاؤس وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ کس طور پر قبولیت کا نظریہ جاذبیت کا سبب بنتا ہے لیکن جب ادبی تاریخ لکھی جاتی ہے تو تاریخی واقعہ نگاری کم درجے کے کلاسیکی کاموں کو اہمیت نہیں دیتی یا اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن قبولیت کے نظریے میں ان "کم

درجے" کے کاموں کو اہمیت دینے کے عمل میں متنی سطح پر غیر زمانی اور تاریخی رسائیوں کے درمیان رابطے کا کام کرتے ہوئے کئی فکری روابط کی تشکیل کے کام میں یہ الجھے ہوئے سوالات کے جوابات دینے کے قابل ہو جاتی ہے جس کے لئے لسانیات اور ادبیات کی تنقید کا شعبہ ایک زمانے سے خاموش تھا، اس کے لئے یاؤس نے اپنے ایک مقالے میں "تصویری مناظر کی توقعات" (Erwartungshorizont) اور "تصویری مناظر کے اُفق" (Verschmelzung) اور "زمرہ (تعریفی) کی تبدیلی" (Paradigmenwechsel) جیسی اصطلاحات استعمال کیں جو کہ اس سے قبل "نظریہ قبولیت" کے مابعد لسانی نظریے میں استعمال کی جا چکی تھیں۔ ان اصطلاحات کو بہت سے نقادوں نے نئی اصطلاحیں سمجھ لیا جس سے کئی مسائل سامنے آئے اور ان تصورات کے کئی اجزاء ترکیبی جن میں لسانیات ادب اور آئیڈیالوجیکل عنصر اہم تھا، بھی کئی افتراقات کا سبب بنے۔ لہٰذا ان مسائل اور پریشانیوں سے بچنے کے لئے اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ قاری سے فاصلہ رکھا جائے کیونکہ اس سے تخلیق کار کی توقعات مجروح ہوتی ہیں۔ کیونکہ فطری عمل ادبی متن کو تشکیل دیتا ہے اور ادبی متن کا معاشرتی تفاعل میں قاری کا معاشرتی ماحول ایک اہم مگر مخصوص قسم کی حسیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ یاؤس نے اپنے مقالے میں کئی اہم نکات اٹھائے ہیں، حیرت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے مارکس اور ساختیاتی نقادوں اور محققین کو خاصا آڑے ہاتھوں لیا جبکہ نقاد اس بات کو جانتا ہے کہ قاری کا سماجی برتاؤ متن پر اثر انداز ہوتا ہے جو اپنے طور پر ابہام اور پیچیدگیوں کا سبب بھی بن جاتا ہے جس سے پیچیدہ سوالات اُبھرتے ہیں جو نقادوں کو ہی نہیں بلکہ ماہر عمرانیات کو بھی پریشان کر دیتے ہیں۔ یاؤس کے نظریات میں کئی طریقہ ہائے عمل کے مسائل سے بھی بحث کی گئی ہے۔ خاص کر ان کے قبولیت کے نظریے کے دو اہم طریقہ کار کے اسالیب پر ایزر، کوچ (Koch)، وینیرچ (Weinrich)، وائینولڈ (Wienold) اور وولف (Woolf) نے خاصی عرق ریزی کی ہے۔

(۱) قبولیت کے نظریے میں متنی ساختیے اور اصلیت کے مابین رشتوں کا سراغ۔

(۲) قبولیت کو کن معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

پہلا نکتہ قبولیت کے نظریے سے متعلق ہے جس کو تشریح کے احتیاطی معنوں پر اختتام

پذیر نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اصلیت کے انکشاف کی کئی کاوشیں متن میں بہر حال موجود ہوتی ہیں جو کہ نظریات انعکاس کا سبب بھی بن جاتی ہیں پھر بھی باطل عناصر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں لہٰذا ضروری ہو جاتا ہے کہ ''جھوٹی'' قسم کی اصلیت کو اُجاگر کیا جائے۔

ورننگ (Warning) نے اس بحث پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ قبولیت کے نظریے کی نبضیں فنی تجزیات سے کنٹرول ہوتی ہیں، اس سے یہ معنی اخذ کر لئے جائیں کہ تشریح کا عمل نئی تنقید کی روایت ہے لیکن یہ ابلاغیات سے منسلک فنی تجزیہ بھی ہے۔ یاؤس اس حوالے سے امکانی (مخفی) معنویت (Sinnpotention) کے تصور کو اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بدقسمتی ہے کہ ہم متن کی معنویت کو بیان کرنے میں ناکام رہے ہیں اور متن کی اصلیت کے سلسلے کو اس کے ساتھ ہی زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ ان مسائل کے حوالے سے نقاد دو خیموں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ پہلا گروپ یہ کہتا ہے کہ اس متن کی کوئی معنویت نہیں ہوتی جو قاری کو تسلیم نہ ہو۔ اس پر یہ سوال کیا گیا کہ آخر قاری متن کو کس طرح سے قرأت کرتے ہوئے اصلیت کی گہرائیوں میں کہاں تک غوطہ زن ہوتا ہے؟ لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ تجربی تحقیقات کا مزاج قبولیت کا ہوتا ہے۔ اصل میں مسئلہ کچھ یوں ہے کہ قاری کسی ماحولیاتی حصار میں بیٹھ کر متن کو پڑھ رہا ہے۔ قبولیت کے نظریے کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ قاری کا معاشرتی، ثقافتی اور ادبی پس منظر متن کی ''ادبیت'' کو متعین بھی کرتا ہے جبکہ قبولیت کی تاریخ ہمیشہ سے قاری کے رویے کی جانچ بھی کرتی رہی ہے۔ تجربی تحقیق نے قبولیت کے نظریے میں اس بات کو بھی جگہ دی ہے کہ کس طرح ایک متن کو دوسرے متن سے تقابل کرنے کے بعد پس منظر کے ماخذات کو دریافت کیا جاتا ہے۔

دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ معنویت کا فریم ورک متن کے ساختیے کو تشکیل دیتا ہے، ابلاغ کی ادبی تنقید تک یہ بھی کہا جاتا رہا کہ یہ متن کا ساختیاتی تجزیہ ہے۔ نظریۂ قبولیت اور ابلاغی نظریہ اس صورتحال کو ایک ساتھ تناظر میں لاتے ہیں لیکن یہ رسائی بے حد مفید ہونے کے باوجود اصل قبولیت کے متن کو اثرات سے ممیز کرتی ہے جس میں مصنف کا ارادہ اور غور و فکر حاوی محرک ہوتے ہیں۔ اسی کو یاؤس نے اپنے ایک مضمون میں ''نااہلیت کا نظریۂ

قبولیت'' کہا۔ افتراق کی یہ فضا متن کے ساختیے کو اغلاط سے پاک کرتی ہے جس کی مدد سے قاری متن کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر عمیق نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ''قبولیت کی جمالیات'' تنقیدی میدان میں قبولیت کا نظریے کا تجریدی وظیفہ بھی ثابت ہوتا ہے اور قاری متن کے ساختیے کا حصہ بن جاتا ہے لیکن یہ نظریۂ قبولیت تجربی تحقیق کا حصہ بنتا ہے تو یہی خیالات اور افکار مزید گہرائی اور مائیکرو رسائی کے تحت تجزیہ کیے جاتے ہیں۔ ان باتوں کی طرف بھی توجہ مرکوز کی جاتی ہے جن کے سبب حادثاتی طور پر کئی فکری عوامل بین السطور آجاتے ہیں جو کہ اصل موضوع یا بحث کا حصہ نہیں ہوتے اور دستاویزی شہادتوں کے بغیر ادبی متن کی قبولیت کا مسئلہ بے روح جسم کی طرح کا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات نشان خاطر رہے کہ قبولیت کی تجزیات کا تجزیہ ساختیاتی نہیں ہوتا لیکن تاریخی نوعیت کی تحقیق کی تفہیمی شاخ ضرور بن جاتا ہے۔ گریماز نے نظریہ قبولیت کے حوالے سے ترتیب وار تجربیت کو بیان کرنے کی کوشش کی جس میں قبولیت کے تاریخی طریقہ کار کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ ایک مسئلہ اس طور پر بھی پریشان کرتا ہے کہ ترتیب وار تصورات کی حدود میں نظریہ قبولیت کو ''قبولیت'' کے حوالے سے کیسے بیان کیا جائے۔ لہٰذا یہ کہا گیا کہ طباعت کا عمل حاضر قاری کی پریشانی کا اصل سبب ہے، جو کہ اعلیٰ درجے کی ایک ایسی درجہ بندی ہے جس کا شکار ہو کر ''قاری پیشہ ور'' بن جاتا ہے، جس میں ادبی نقاد سے لے کر عام قاری تک سبھی آتے ہیں۔ یوں نقلی قاری تنقیدی متن اور قرأت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ قبولیت کا نظریہ اس بات کو تسلیم کرتا رہا کہ عدم آگہی کی وجہ سے ''نظریۂ قبولیت'' خود بھی بہت سے فکری مسائل کو نہیں سمجھ پاتا لہٰذا اس نے خود بھی بیان کی ہوئی فکری تعریفات سے اس نظریے کی فضابندی کر دی۔ مگر بعض مباحث نے اس مطلع کو بہت صاف کر دیا کہ قاری کے معاشرتی احوال اور ذاتی شخصیت کا شائبہ قرأت پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے جس کا تعلق بصری اور نوری عنصر سے بھی ہے، جس سے ''نقلی قاری'' کی بھی شناخت ہو جاتی ہے جبکہ یہ خیال بھی خاصا قوی معلوم ہوتا ہے کہ اصلی قاری متن کی اصل روح دریافت کر لیتا ہے۔ لہٰذا اس پر ''نقلی قاری'' کی مہر منطبق نہیں کی جاسکتی۔ اس مسئلے کو ولف گینگ ایزر (Iser) نے ''ساختیے کی فریاد'' (Appeal Structure) کہا جو متن کو باہمی رضامندی سے متعین کرتی ہے۔ اگر فیشن ایبل مباحث اس درمیان میں داخل

ہو جاتے ہیں تو قبولیت کی سطحوں سے اس کو بیان کیا جاتا ہے اور اس عمل میں بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قبولیت کا نظریہ شعوری طور پر کچھ کہے بغیر رخصت ہو جاتا ہے کیونکہ باہمی رضامندی کی فضا ہی قاری کو متن کا اصل ادراک پالینے کا محرک بنتی ہے۔

قبولیت کا نظریہ خاصی وسعت کا حامل ہے لیزا وارنگ (Warning) نے اس نظریے کے کئی ذیلی موضوعات میں تخفیف کردی کیونکہ نقادوں نے اس کو مخصوص قاری سے متعلق کر کے رکھ دیا جو کہ اس نظریے کی مکمل و بحسن و خوبی تشریح نہیں کر پاتا۔ شروع میں قبولیت کے نظریے نے ابلاغی محرکات و نظریات سے جان بوجھ کر نظریں چرائیں جس سے صورتحال بے حد نازک ہو گئی۔

نشانیات:

نشانیات کا میدان لسانیات و ادبیات کا ہی نہیں بلکہ بشریاتی اور معاشرتی علوم کا بھی مفید حصہ رہا ہے کیونکہ الفاظ انسانی حسیت اور بین العمل کے وظائف میں سب سے اہم عوامل کی صورت میں جلوہ نمائی کرتے ہیں۔ خاص کر غیر گفتاری نشان نظام نشانیات کا علم ایک ایسا علم ہے جس سے نشان یا نشانیات کی اصطلاح کی بہتر طور پر تشریح ہو جاتی ہے۔ نشانیات کی عام تعریف جتنی آسان ہے، اس کی نظریاتی تفصیل اتنی ہی پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ جرمن نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ نشانیات، پیغامات اور نشان کی معروضی سائنس ہے جو ایک مخصوص نظام کے تحت نشانیات کا مطالعہ کرتی ہے جس کے بنیادی اصولوں کے ماخذات لسانیات اور فلسفہ ہیں جو ہمیشہ علمیات سے کنٹرول ہوتے ہیں کیونکہ اسی حوالے سے فرد "لفظ" کی صداقت کا ادراک اور تجزیہ کرتا ہے۔

باوجود لسانی نشانیات کے نظام کی مخصوص بندشوں کے ساختیاتی لسانیات۔ نشانیات سے ہمیشہ متعلق رہی ہے جبکہ اس امر کا بھی خدشہ ظاہر کیا گیا کہ لسانی مبالغہ آرائی جدید نشانیات کے باطن میں موجود ہوتی ہے جس نے لسانی جمالیات کی کائنات میں کچے پکے واہموں کو جنم دیا، جو عقلی اور منطقی شواہد کو دھیما کر دیتے ہیں۔

نشانیات کا علم و تحقیق ساسر اور لیوی اسٹروس کے لسانی مطالعوں کے بعد شروع ہوئیں۔

ان دونوں کے انقلاب آفریں لسانی تصورات نے ساختیاتی لسانیات کے مباحث کے کئی دروازے کھول دیئے۔ ان کے مطالعوں کی رسائی اور نفس مضمون لسانی ساختیات کے وسیع تناظر میں تھے، جس کے تحت زبان ایک اثر پذیر محرک ہے۔ اس کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن نشانیات کی ایک ایسی شاخ کا بھی ظہور ہو چکا ہے جو لسانی حوالے سے نفسیاتی، مابعد الطبیعاتی اور عمرانیاتی مسائل کے تعلق کو دانستہ طور پر نظر انداز کرتی ہے۔ یہ حقیقی دنیا کے معروضی مسائل کے ساتھ "نشان" کا مطالعہ کرنے کے عمل میں ان مختلف فکری تناظر کے بین العمل کا اشارہ دے کر نئے فکری رشتوں کی بازیافت چاہتی ہے۔

جرمنی میں میکس بینز (Max Bense) اور ای۔ والتر (E. Walther) نے نشانیات کو بظاہر طبی فلسفہ (Madical Philosophy) کے اصولوں سے جوڑ دیا ہے۔ یہ اصول پرس کے نشانیاتی نظریے سے اخذ کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر ان کے "تکوینی تصورات" نے نشان کی معنویت کی تین اصطلاحوں میں تشریح کی ہے۔

(۱) بیان (خاکہ) (۲) معروض (۳) تشریح

بعد ازاں انھوں نے "نشان" کی درجہ بندی کرتے ہوئے اس کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا:

(۱) شبیہ (۲) اشارے (۳) علامتیں

میکس بینز کے ان تصورات اور نظریات کی وجہ سے ایک وقت میں بہت ہنگامہ کھڑا ہوا کیونکہ انھوں نے پرس کے اس تعارفی اور سادہ سے مضمون کو صوری منطق اور انسانی مطالعوں کے "وظائفی ضبط" (Cybernetics)، اطلاعاتی نظریہ اور سائنس کے دقیق اصولوں سے جوڑتے ہوئے نشانیات کے نظریے میں ایسی پیچیدگیاں پیدا کیں کہ اس سے نشانیات کا علم ٹوٹ پھوٹ سا گیا اور کئی متعلقہ تصورات ابہام کی نذر گئے۔ جب مسئلہ بہت سنجیدہ ہو گیا تو بینز نے کہا کہ نظامیانہ کے ہیت پسندانہ عمل سے پہلے اور نشان کے طریقہ عمل کو نشانیات کے نظریے میں شامل کرنے سے قبل مختلف علوم کی شاخوں (مثلاً علمیات، جمالیات، لسانیات، متن کے نظریے، ریاضی، فن معماری، تصویری خاکہ (Design) وغیرہ) سے رجوع کرنا ضروری ہے اس کا اختتامی بیان جو پرس کے ایک مقالے سے اخذ کیا گیا تھا کہ "ہمارے تمام افکار اور آگہی" "نشان" سے اخذ کئے جاتے ہیں"۔ تمام ابلاغی نظام نشان کا ہی مرہون منت

ہوتا ہے جس میں زبانی اور غیر زبانی گفتار کی حرکیات بھی شامل ہیں۔ یہاں تک کہ باہر کی دنیا کی تمام اشیاء کو فرد "نشان" کے حوالے سے شناخت کرپاتا ہے۔ اس کو ہم اوپر بیان، معروض اور تشریح کے زمرے میں بیان کرچکے ہیں۔

۱۹۷۶ء تک بینز کے نشانیات کا یہ دبستان سٹٹ گرٹ (Stuttgart) کے نام سے جرمنی میں خاصا معروف رہا۔ اس مکتبِ فکر سے متعلق اہلِ فکر نے Semiosis نام سے ایک مجلہ بھی نکالا جس نے نشانیات کے حوالے سے ہر اس تحریک اور رجحان کی بھرپور انداز میں کڑی تنقید کی جو غیر منطقی ہیئت کا حامل ہوتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں منطقی صوریت سے عدم آگہی اور نظر بچا کر نکل جانے کا رویہ نشانیات کی تفہیم میں غیر سائنسی رجحان کو فروغ دیتا ہے۔ بینز کی اس موضوعی منطق نے نشانیات کے نظریے کو نئی معنویت کا جامہ پہنایا جس سے اس علم کی عملی اور اطلاقی جہتوں کو متعین کرتے ہوئے نئے لسانی تصورات و نظریات کو نئی توانائی فراہم کی گئی۔

جرمنی کے نقاد جی کلاز (G. Kalaus) نے معروض کو مخصوص ہیئت پسندانہ (جس کو وہ نئی ثبوتیت کہتے ہیں) سیاق میں مطالعہ کرکے نشان کے ان معروضی مسائل کی عملی صداقتوں کی نشاندہی کی جن کی بہتر طور پر تشریح نہ کی جاسکی۔ انھوں نے نئی ثبوتیت کے نقطۂ نظر سے نشانیات اور نشان ذہنی اشیاء اور حقیقت کے درمیان فکری روابط تلاش کرتے ہوئے انھیں بے حد رسومیاتی بنادیا اس میں سب سے متنازعہ پہلو "نشان" کا اصل اشیاء سے تعلق کی "نفی" تھا۔ انھوں نے مادّی نظریات سے نشان کی روایتی معنویت کو جوڑ کر حقیقت کی توجیہات پیش کیں جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ دیگر عناصر سے نشان کا رابطہ منقطع ہوگیا۔ انھوں نے نشانیات کے فکری حوالوں کو مارکسی علمیات سے منسلک کردیا۔ کلاز سے مورس (Morris) تک تمام ماہر نشانیات کے اس علم کو نحویات، نشانیات اور عملیت کے تین واضح حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد اس میں سے چوتھا حصہ بھی نمودار ہوا جس کو Sigmatics کہا گیا جو نشانیات کے تصور کا ہی ایک ذیلی حصہ ہے۔ اس کے تحت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ نشان میں یہ وصف یا اہلیت ہوتی ہے کہ وہ اصل اشیاء کی اپنے طور پر تشریح کرسکتا ہے۔ Sigmatics کا تصور ابھی تک مفروضاتی ہے اس کے تنقیدی عملیات اور نظریاتی حوالے سے کوئی واضح تصور

سامنے نہیں آسکا جس کو دیکھ کر یہ کہا جاسکے کہ اطلاقی کلام اور تنقیدی تحقیق میں اس تصور کا کوئی مستقبل ہے۔ کلاز کی نظریاتی عرق ریزی نے لسانی بنیادوں پر اطلاقی نظریے کو پیش کیا۔ اس کا زیما (Zima) نے سنجیدگی سے مطالعہ کرتے ہوئے منطقی نشانیات سے شدید اختلاف کیا جس کو بینز "اصل" اور تکنیکی جمالیات کہتے ہیں۔ اس کے سائنسی متعلقات سائنسی علوم سے قریب تر تھے۔ لہٰذا یہ نظریہ ادب و لسان سے زیادہ منطق اور ریاضی کے میدان میں مقبول ہوا۔ ان کو کسی طور پر سرمایہ دارانہ نظریہ دانوں نے اُچک کر اقتدار و قوت حاصل کرنے کا پیمانہ بنالیا۔

نشانیات کے لئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سائنسی لسانیات کا تنقیدی انعکاس ہے لہٰذا زبان مابعد — مابعد کی ایک قسم ہو کر رہ گئی جو فرانس سے نقل مکانی کرنے کے بعد بارتھس، گریماز اور کرسٹیوا کی ذہنی کاوشوں کے سبب "تنقیدِ ذات کی تنقید" ثابت ہوئی جس کو زیما نے "سائنٹفک ڈسکورس" بھی کہا جو کہ بیانیہ ڈسکورس کے تصور سے مشابہ ہے۔ ان تمام مباحث نے مختلف قسم کے ردِعمل کو ابھارتے ہوئے نشانیات کے منطقی سیاق پر نئی بحث کا آغاز کیا جو خاصی منفی بھی رہی کیونکہ نشان کا مابعد لسان تصور نظریاتی تنقید سے نظریں چراتا ہے جبکہ نشانیات مابعد نشانیات کا نظریہ ہے۔

جرمنی میں نشانیات کے کئی فکری رویے ملتے ہیں جن میں زیادہ تر نشانیات سے متعلق مبادیاتی قسم کے کام ہیں جو بہت بنیادی نوعیت کے ہیں جبکہ بیسویں صدی میں امریکی، اطالوی اور فرانسیسی نشانیات دانوں نے (جن میں پرس، مورس، ساسر، ایکو (Eco) شامل ہیں) اس پر مختلف جہتوں سے نظری اور اطلاقی تنقید و تحقیق کی۔ خاص طور پر ڈبلیو۔ نوتھ (W. Noth) نے اس نظریے کو اشتہاری دنیا سے متعارف کرواتے ہوئے اس امر پر توجہ دلوائی کہ متن زبانی اور غیر زبانی ابلاغ میں اظہار کا سب سے قوی محرک ثابت ہوتا ہے۔ نشانیات کی تحقیق کو لسانی طریقہ کار نے وسعت سے ہمکنار کیا۔ مثال کے طور پر جے۔ ٹرابنٹ (J. Trabnt) نے اس تصور کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے لوئی ہیلم سلیو (Hjelmsleve) کے Glossematics کے تصور کا ایک رُخ سے تجزیہ کرتے ہوئے ساری زبان کو "تاثر" قرار دیا۔ ہیلم سلیو کا ساختیاتی لسانی تجزیے کی رسائی پہلے ہی نشانیات کی لسانیات میں داخل ہوچکی تھی جس کو "نتائجی نشانیات" بھی کہا گیا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ٹرابنٹ کا فکری اختصاص ادبی متن کی جمالیاتی

جہتوں کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ اس سے قبل ادبی متن کا صرف ساختیاتی لسانیات کے حوالے سے تجزیہ اور مطالعہ کیا جاتا تھا۔ خاص طور پر متحرک فلموں کا اس لسانی درجہ بندی کے تحت تجزیہ کیا جاسکتا ہے جس کو "فنکارانہ متن" (Artistic Text) بھی کہا جاتا ہے۔ نشانیات کا علم لسانی جبر کے اندر رہ کر ہی اپنے مباحث شروع کرتے ہوئے نشان کی سائنسی توجیہات کو سر کرتا ہے جس میں معمار کاری، تصویری خاکہ، طب، موسیقی، مصوری، مجسمہ سازی، رقص، خطابت، اداکاری، ادب اور فلسفہ سب ہی شامل ہیں۔

نشانیات کے میدان میں پوسنر (Posner) اور ہارتھ (Harth) کی تحریروں سے مختلف تحقیق کی شاخیں نمودار ہوئیں، جس کا تعلق نشانیات کے فکری اور تحقیقی مسائل سے تھا۔ اس کی ان دونوں ماہرین نے رینکے (Reinecke) کے ساتھ مل کر تشریح و تفہیم کی کیونکہ نشانیات کا علم نشان کے لسانی نظریے سے متعلق تھا اور نشانیات کے فکری مسائل جس طرح لسانی نظریے میں مسائل کھڑے کر رہے تھے اسی طرح کے مشابہ مسائل ساختیاتی لسانیات میں بھی کھڑے ہوگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل فکر نے نشانیات کے ساتھ بہت جلدی کرتے ہوئے اس سے کئی توقعات وابستہ کرلی تھیں جن کا پورا ہونا اتنی جلدی آسان نہ تھا۔ ساتھ ہی کچھ لسانی نقاد نشانیات فکر کی تکمیل کے لئے اس کے اختلافی پہلوؤں کی طرف مائل ہوئے جو لسانیات کے حوالے سے حد درجے کی محدود آگہی تھی۔ پھر انتقاد ساختیاتی سطح پر Metrical تجزیے کی طرف متوجہ ہوئے جس کو نئی نشانیات کی کامیابی کہا جانے لگا اور نشانیات کا نیا "لیبل" Semiotic کی اصطلاح کے ساتھ جلوہ گر ہوا جس نے کئی سائنسی نوعیت کی فیشن ایبل رسائیوں تک کمند ڈالنے کی کوششیں کیں اور کسی حد تک وہ اپنی ان کوششوں میں کامیاب بھی رہے۔ خاص طور پر اطلاقی اور بازارکاری کے نقطہ نظر سے اس نظریے کو خاصی قبولیت ملی۔ یہاں تک کہ ڈرامے اور ادب کے میدان میں حیرت انگیز طور پر متن کے تجزیات اور غیر گفتاری ابلاغ کنھن حرکیات نشانیات کی رسائی بہت غیر معروف بھی ہوگئی۔ خاص طور پر فسٹر (Pfister) نے اس سلسلے میں ڈرامائی تجزیے کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا۔ اس تجزیے کا خصوصی سیاق گفتاری اور غیر گفتاری رموز سے متعلق تھا جس میں ڈرامائی متن، قرأت کے متن کا حصہ نہیں رہا اور اس متن کی قرأت سے اپنی "علیحدگی" اختیار

کرتے ہوئے متن کا بصری (Visual) نظریہ پیش ہوا جو تھیٹر کی تنقیدی اور تحقیقی دنیا میں اب بھی بہت معتبر اور مقبول ہے۔

خلاصۂ کلام

جرمن ساختیات اور اس سے متعلقہ موضوع اصل میں آفاقی سطح پر "مبادلیاتی نظریے" سے منسلک ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر فکر و لسان کے تجربات اور اسلوب کی بازگشت نے اس کے فکری تناظر کو وسیع کیا۔ ساختیات جرمنی میں بین العلوی موضوع رہا، کیونکہ وہاں کی ساختیات نے فطری بشریاتی آگہی کے ساتھ اس کے اطلاقی پہلوؤں پر بھی توجہ دی۔ اس نے پس ساختیات ہی نہیں بلکہ ردِ تشکیل کو وسیع تناظر میں لاکر پس ردِ تشکیل کا بھی دبے الفاظ میں عندیہ دیا۔ اس میں سب سے اہم سائنٹفک معروضیت کا پہلو ہے جو متن کے ساختیاتی ابلاغی نظریے کو بھی جنم دیتا ہے اور وظائفیت کے اسی تنقیدی نظریے سے عمرانیاتی سسٹم تھیوری کا نظریہ نمودار ہوتا ہے۔ اس کو "لہومین" (Lyhmann) اور ان کے ہم نواؤں نے پروان چڑھایا۔ نظام وظائف سے جنم لیتا ہے نہ کہ نظام خود بہ خود اپنے طور پر جنم لے کر ساختیے کی تشکیل کا سبب ہوتا ہے۔ اس فکری ڈھانچے سے جرمنی کے کئی ادبی نظریہ دان متاثر ہیں جن میں گومبرچ (Gumberecht)، شمٹ (Schmidt)، اسٹیرل (Stierle) اور وارنگ (Warnig) کے نام نمایاں ہیں۔ جرمن ساختیات ایک عقلی مظہر ہے جو غیر مشاہداتی مظہریات کو تحقیقی طریقہ کار کی سائنسی رسائی کے ساتھ مشاہداتی بنادیتا ہے۔ اس میں متن میں پوشیدہ انسانی رویوں سے لے کر اضطراب کی ان پرتوں کو دریافت کیا جاتا ہے جو انسانی رشتوں کا ردعمل ہوتے ہیں۔ لہٰذا جرمن ساختیات کا ڈھانچہ فرانسیسی جمالیات اور امریکی نتائجیت سے جہاں مدغم ہوتا نظر آتا ہے وہاں پر وہ اپنی اصل "عقلی منطق" کے حوالے سے ان سے علیحدہ اور منفرد بھی دکھائی دیتا ہے۔

○○

REFERENCES

Barthes, Roland. "The Pleasure of Text". Translated by Richard Miller, New York, Hill & Wang, 1975.

Bleich, David. "Logic of Interpretion" Genre 10 (Fall 1977(, 363-94.

Booth Wayne C. "The Retoric of Fiction" Chicago University of Chicago Press, 1961.

Fish, Stanley, Doing What Comes Naturally, Changes Rhetoric and the Practice of Theory in Literary and Legal Studies. Clarendon Press, Oxford, 1990.

Fokkema, D.W. and Kunne-Ibseh, E. The Theories of Literature in the Twentieth Century. Structuralism, Marxism, Aesthetics of Reception, Seniotics, C. Hurst, London, 1977.

Holub, Robert C. Reception Theory. A Critical Introduction, Methuen, London and New York, 1984.

McGregor, Graham and Whiter's (eds) Reception and Response. Hearer Creativity and the Analysis of Spoken and Written Text, Routtedge, London, 1990.

Lindner, Monika and PFister, Manfred "Structuralism in Germany" A Survey of Recent Developments, Structuralist Review, Vol. 11, No. L Winter 1980, Queens College Press, New York, NY.

Weimann, Robert. "Reception Aesthetics and the Crisis of Literary History" Translated by Charles Spencer Clio, 5, 1975:3-33.

پانچواں باب

جینیاتی ساختیات اور گولڈمین

جینیاتی ساختیات اور گولڈ مین

لوسین گولڈ مین کی ادبی اور عمرانیاتی فکر نے ساختیات کے میدان میں اس طور پر توسیع کی کہ یہ ساختیات کے روایتی فنی رویوں سے ہٹ کر ایک سائنسی اور منطقی ادب کی بنیادیں تلاش کرتے ہیں جس سے ادب کا جمالیاتی پہلو بھی متاثر نہ ہو اور عمرانیاتی حقائق کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

گولڈ مین نے ادب اور عمرانیات کے درمیان جینیاتی ساختیات کا پل تعمیر کر کے کئی فکری مغالطے کھڑے کیے وہاں کئی برسوں کے لسانیات اور ساختیات کے کئی گمشدہ اور الجھے ہوئے پیچیدہ سوالات کے جوابات کا سراغ لگانے کی کوشش کی جو گولڈ مین سے پہلے ادب اور عمرانیات کی فکری فضا میں معمہ بنے ہوئے تھے۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء میں گولڈ مین کا پیرس میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے ایک سال بعد "ٹائمز" کے ادبی صفحہ پر ڈیوڈ کونیڈ کا ایک مضمون شہ سرخیوں سے شائع ہوا اس میں بڑے ہی دلچسپ انداز میں گولڈ مین کے ساختیاتی اور عمرانیاتی ذہن کی توضیح پیش کرتے ہوئے ان کے تنقیدی، تحقیقی اور فلسفیانہ رویوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا گیا کہ انھوں نے کئی "شہدا" کو عالم نیند میں چہل قدمی کے لئے اکیلا چھوڑ دیا جن میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ جہاں وہ ادب کی عمرانیات کے مرتبے کا استحقاق حاصل کرتے ہیں۔ گولڈ مین کی موت کے ساتھ ہی ان کے تنقیدی نظریات اور تعصبات کو بہت سے نقادوں نے منفی رنگ بھی دیا۔

گولڈ مین کے زیادہ تر نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ انھوں نے اپنے ابتدائی خیالات کو بعد

میں از سر نو ترتیب دیتے ہوئے "دلیل" اور "استدلال" کو کم ہی اہمیت دی۔ گولڈ مین کا سب سے بڑا کارنامہ یا ان کے تنقیدی اور فلسفیانہ ذہن کا نچوڑ ۱۹۵۶ء میں جینیاتی ساختیات کی صورت میں سامنے آیا جس کو وہ عظیم ادبی اور فنکارانہ اظہار کے تناظر کے ذہن تک رسائی کرواتا ہے اس کے پس منظر میں ادب اور معاشرے کے ارتباط کی فکر پوشیدہ ہے جو مزید توسیع پا کر ادب کی عمرانیات کی صورت میں گولڈ مین کی تحریروں میں جا بجا نظر آتی ہے اور اسی فکر میں کہیں نہ کہیں ساختیات کا نیا میدان جزوی ساختیات (مائیکرو اسٹرکچر ازم) کے تصور میں ہمارے ذہن میں ترتیب پاتا ہے۔ ان کے فلسفیانہ ذہن نے تاحیات ثقافتی اشیاء، خاص طور پر فنکارانہ تخلیق کاری (ادب)، تصوراتی تشکیلیت (فلسفہ)، معاشرتی اور نظری ساخت کا تکون تشکیل دیتے ہوئے تمام مسائل کو معاشرتی سیاق میں دیکھا۔ ان کی تمام فلسفیانہ موشگافیاں نیو ہیگل ازم سے شروع ہوتی ہیں جو بعد میں مارکسیت میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ انسانی رویوں کا نتائجی مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ژان پی ژے کے انسانی موضوعات کی انفرادیت سے بھرپور فکر سے استفادہ حاصل کرتے ہیں جو ژان پی ژے کے لئے تو انفرادی نوعیت کا ہے مگر گولڈ مین ژان پی ژے کے اس انفرادی تصور کو اجتماعی صورت دے دیتے ہیں جیسے وہ "جینیاتی ساختیات" کہتے ہیں۔ (یاد رہے کہ گولڈ مین نے کچھ عرصے ژان پی ژے کے ساتھ کام بھی کیا)

جینیاتی ساختیاتی نہ صرف ایک طریقہ کار ہے بلکہ یہ عمرانیاتی ماڈل پر نئے تحقیقی مباحث کو جنم دیتی ہے جو ثقافتی حوالے کو بنیاد بناتے ہوئے کوئی بہت زیادہ قابل تعریف نتائج کے اسباب پیدا نہیں کرتی۔ ۱۹۶۰ء میں فرانسیسی ساختیات نے ادبی اور فلسفیانہ فضا میں چونکا دینے والے رویوں سے علم و ادب کو نئی وسعت دی۔ لوئی اسٹروس، لاکان، فوکو، آلتھیوزر وغیرہ نے اشارہ فہمی کا نہایت ہی گہرائی سے تجزیہ کیا اس کو بعد میں رونالڈ بارتھ نے نئے فکری رویوں کے ساتھ آگے بڑھایا، جس کے پس منظر میں ساسر کے بنیادی تصورات کی چھاپ تھی۔ لسانیات کے اشارہ فہمی کا ماڈل (جو بارتھ کی نظر میں من گھڑت ہے) کو متن کے مختلف اجزاء ترکیبی کو موضوعی حوالے سے پرکھا گیا۔ اس سے پہلے متن کی اصطلاح کو صرف معروضی حوالے سے تجزیہ کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا تھا، جہاں اس کے

تجریدی پہلوؤں کو مطالعہ کرتے ہوئے معاشرتی اور تاریخی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ ساختیات کے حوالے سے متن کے مطالعے میں نئی وسعتوں کا اضافہ ہوا اور باریکیوں میں جھانکتے ہوئے متن کے داخلی روابط سے بحث کی گئی کیونکہ تخلیق میں متن کا ایک خود مختار نظام رواں دواں ہوتا ہے جو کہ متن کی آمد کی حقیقتوں کو اُجاگر کرتا ہے کیونکہ یہاں نظری صورتحال جینیاتی ساختیات کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔

ہیئت پسندانہ ساختیات کے متعلق گولڈ مین نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ معاشرتی حقائق اور تاریخی سمتوں کے طریقہ کار کا رد ہے۔ جینیاتی ادب تاریخی نوعیت کا ہوتا ہے اس میں فلسفیانہ اور ادبی متن کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تاریخی فریم ورک میں رہتے ہوئے متبادل توجیہات تلاش کی جاتی ہیں چاہے ادب کی گمشدہ اصطلاحوں اور معنوں کو دوبارہ کیوں نہ ہی زندہ کیا جائے۔ گولڈ مین کے خیال میں جینیاتی اور غیر جینیاتی ساختیات دراصل انسانی کردار کے ادراک سے ممیز کی جاسکتی ہیں۔

(۱) انسانی کردار بحیثیت کردار کے ایک وسیع بساط پر پھیلا ہوتا ہے۔

(۲) ساخت انسانی رویوں کا لازمی جز ہے جو کہ تاریخی اور سوانحی پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ جہاں سابقہ ساخت اور کردار کا مخصوص سیاق ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔

دلائل کے یہ دو تضادات جو ایک دوسرے کا تقابل اور موازنہ کرتے ہیں اور ساختیات کی تاریخ کا ٹھوس بنیادوں پر بھی مطالعہ کرتے ہیں کیونکہ اس سطح پر نتائجی حقائق کی صورتحال سے بھی نظریں نہیں چرائی جاسکتیں جو کہ حرکی نوعیت کی ہوتی ہیں جہاں ساختیات کا انتشار پھر سے مجتمع ہوجاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ مظاہر کئی نئے مسائل کو جنم دیتے ہیں۔ سائنسی تجزیہ نگاری کے علاوہ ایک خاص قسم کے نتائجی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے تصورات کو پھر سے باندھا جاتا ہے۔ یہاں جینیاتی ساختیات کا عمل اثر پذیری کی ہلکی سطح پر آجاتا ہے مگر اس تصور کے چند فطری عناصر کو طریق کار سے کسی طور پر بچا کر بھی رکھے جانے میں مدد لی جاتی ہے۔ اس مرحلے پر گولڈ مین عارضی طور پر اپنے ہی بنائے ہوئے تاریخی ماڈل سے باہر بھاگ نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، جدلیات میں پناہ حاصل کرتے ہوئے اپنی ہی دلیل کو نظریاتی رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

روایتی عمرانیات اور ادبیات (مثلاً پلخانوف) میں بنیادی فرق یہ ہے کہ گولڈ مین طریقہ کار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے سابقہ معاشرتی، تاریخی، ماحولیات کو سیاق کے طور پر برتے ہیں جو کہ معاشرتی تاریخی تناظر میں نئی حرکیات کو جنم دیتی ہیں۔ یہ ان کے یہاں غالب نظریہ بن کے اُبھرتا ہے۔

جینیاتی ساختیات بنیادی طور پر جرمنی کی نئی علیت پسندی ہے جو فطری سائنس اور ثقافتی یا بشریاتی سائنس کے درمیان فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ گولڈ مین کے خیال میں فطری سائنس میں اسطور دنیا کا مادّی مظہر ہے جو بغیر کسی ترتیب کے مطالعہ کیا جاتا ہے یہ ایک ایسے سائنسی طریقہ کار کو وضع کرتا ہے جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور مطالعہ کرنے والا دنیا کے موضوعی مظاہر کا تجزیہ بالکل اسی طرح کرتا ہے جیسے وہ پہلے معروضی مظاہر کا مطالعہ کررہا ہوتا ہے، معاشرتی اور تاریخی احوال میں پہلے ہی سے حدود کی خاصی جکڑبندیاں ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ گولڈ مین کے یہاں معروض اور موضوع کا تعلق تاریخی ہوتے ہوئے بھی جدلیاتی ہے۔ انھوں نے ہیگل کے غیر تنقیدی تصور کی اصطلاح "کلیت" (Totality) کو بھی خوش آمدید کہا جو مکمل موضوعی اور معروضی تصورات کا احاطہ کرتی ہیں۔

جینیاتی ساختیات میں نزاع اس وقت سامنے آئے جب اسے Pseudo مارکسی حوالے سے پرکھا گیا اور اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی گئی کہ ادب صرف نقل ہے اور فنکارانہ عمل کو دوبارہ زندہ کرتے ہوئے عمرانیاتی تصورات کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا جس کے ردِّ عمل سے نیا نظریہ سامنے آیا اور کئی میکانکی اور منصوبہ جاتی راہوں کو اپناتے ہوئے ادب کو براہ راست مارکسی "ماتحتی" میں دے دیا گیا، جہاں ایک طرف ادبی تخلیق کے پیچھے معاشرے کا عمرانیات اور اقتصادی ڈھانچہ ہے تو دوسری طرف ادبی تخلیق کا ڈھانچہ ہوتا ہے۔ گولڈ مین کا جینیاتی ساختیات کا نظریہ کمزور سیاسی، ادبی اور معاشرتی نظریات اور عقائد کا مجموعہ ہے جو کہ نہایت عجلت میں سرانجام دیا گیا۔ یہاں ذہن، زیما (Zima) کے مماثلتی اصولوں کے تجربات کی طرف بھی رجوع ہوتا ہے۔ زیما نے اصول مماثلت (Principle of Homology) کو جمالیاتی ساختیہ اور معاشرتی ساختیہ میں تقسیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ گولڈ مین کے تصورات کونت کے نظریات کا "الوداعیہ" ہے۔ زیما نے گولڈ مین کے بورژوازی فلسفیانہ افکار کی تین سطحیں بتائی

ہیں۔

(۱) انفرادی سطح: اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تجربیت، روشن خیالی اور عقلیت پسندی کا ظہور ہوتا ہے۔

(۲) المیاتی سطح: جب کونت اور پاسکل کے تصورات کے برعکس جایا جاتا ہے۔

(۳) جدلیاتی سطح: جب ہیگل، مارکس اور لوکاش کے نظریات کو بیان کیا جاتا ہے۔

گولڈ مین کے نزدیک بڑی توجیہہ تجریدیت کے لئے ہوتی ہے۔ کونت اور پاسکل کے تصورات "نااہلیت کا المیہ" ہیں جو کہ پس انفرادیت کا تصور ہے اور انفرادی موضوع ہے۔ ٹھوس آگہی ہی 'اجتماعی' "نقطہ نظر ہوتا ہے (فردیاتی ماورائیت) اور موضوع ہی تاریخی طریقہ کار کی نشاندہی کرتا ہے۔ اوپر زیمانے مماثلتی اصولوں کی جو تین سطحیں بتائی ہیں وہ رے ژان اور پاسکل کے جینیاتی ساختیات کے بنیادی اصول ہیں۔ رے ژان کا ذاتی شعور وجودی شعور کی شکل اختیار کر جاتا ہے جبکہ جدلیاتی ماورائیت دنیا کا انقلابی تصور ہے۔ جو انسانی معاشرے کی جانب فرد کی ذاتی مراجعت ہے جس کی مثال ژان ژینے کے ڈرامے 'اندرے مارکیس کے ناول' اردو میں ن۔م۔ راشد کی شاعری اور انور خان کے افسانے ہیں۔ تخلیقی عمل ہمیشہ مقتدر ہوتا ہے جو خصوصاً معاشرتی گروہوں کے شعور کی عکاسی کرتا ہے۔

گولڈ مین کے یہاں فطرت کا معاملہ بہت جلد علم الادراک سے تبدیل ہو کر تاریخیت میں داخل ہو جاتا ہے اور فوراً ہی جدلیاتی روپ دھار لیتا ہے۔ یوں معروض یا موضوع کی شناخت محض تاریخ کا جز بن کر رہ جاتی ہے۔ یہاں جدلیاتی طریقہ کار کا عمل جینیاتی ساختیات اور معروضی دونوں ہی زاویوں سے پرکھا جاتا ہے جس کو ہم تاریخی سیاق میں پرکھ سکتے ہیں غیر وقتی (Diachronic)۔ تو دوسری سطح پر ٹھوس ساختیاتی ڈھانچے کو ایک خاص زمانی رویے کے ساتھ مستحکم کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے جو ایک قسم کا غیر تاریخی یک زمانی تصور ہے ہم وقتی (Synchronic View)۔ یہاں گولڈ مین تاریخی شناخت کی گہرائیوں میں اترتے ہیں وہ علم الادراک کی مشکلات سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں۔ ان کا تاریخی زاویہ نگاہ اصل میں ادب یا عمرانیات کا ہم وقتی (Synchronic) منظر نامہ ہے۔ وہ معروضی سطح پر معاشرت کے تاریخی حقائق کو تلاش کرتے ہیں جو ان کے یہاں علم الادراک کے انسانی مسائل ہیں۔

لوئی اسٹروس کے بقول معاشرتی حقائق اور اس کے نتائج دراصل زبان کی اصل ساخت ہے جو زبان کے موضوع (اس سے متعلقہ اشیاء بھی!) کو مکمل طور پر اظہار کا جامہ نہیں پہناتی۔ کیونکہ اس کے شناختی اجزاء بے نام (گمشدہ) ہوتے ہیں۔ زبان کی خود اپنی حقیقتیں ہیں اور وہی اپنی سچائی کے اصول اپنے ہاتھوں سے ترتیب دیتی ہیں۔ زبان اپنا معروضی ڈھانچہ خود ہی بناتی ہے اور جب چاہے بگاڑ بھی دیتی ہے کیونکہ انسانی استدلال اس بارے میں کسی سوال کا جواب دینے سے قاصر رہتا ہے۔ گولڈ مین کا نقطہ نظر کلی طور پر فرد کے کردار کا اظہار ہے جنھیں فرد کچھ مخصوص حالات میں بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ وہ ژان پی ژے کے تصورات کے زیر اثر رہ کر انسانی حقائق کو دوہری صورتوں میں برتتے ہوئے انھیں قدیم ساختیات سے باہر نکال پھینکتے ہیں (جس کو رد ساختیات بھی کہہ سکتے ہیں) کیونکہ یہ تصور نئے معاشرتی گروہوں کی کلیت کی ساخت تو بھی کرتا ہے اور نئی ساخت سے ضروریات کے مطابق نئے مطالبات تسلیم کراتا ہے جو جلد ہی موضوع اور معروض کے درمیان میزانیہ بن جاتے ہیں۔ گولڈ مین کے نزدیک انسانی حقائق اقتصادی، معاشرتی، سیاسی یا ثقافتی نوعیتوں کے ہوتے ہیں اور تاریخی اشیاء کی فکرو موضوع کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ یوں موضوع "انفرادی" نوعیت سے اپنی شکل تبدیل کر کے اجتماعی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ شاید اس لیے فرد ماورائی کا موضوع آگے چل کر فرد کے باہمی تعلقات میں منتقل ہو جاتا ہے۔

یہ تصورات ساختیات کے بنیادی مفروضات ہیں جو کہ کسی نہ کسی طور پر ہیگل، مارکس، فرائڈ اور لوکاش سے وضع کیے گئے ہیں یہ ساختیات کے جینیاتی تصور کو تشکیل دینے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور تمام مفروضات اس بات کا احاطہ کرتے ہیں کہ معاشرے میں انفرادی یا اجتماعی طور پر فرد کے اعمال "لایعنی" نہیں ہوتے چاہے فرد کسی مقصد (مقاصد) کو حاصل کرنے میں کامیاب رہے یا اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔

جینیاتی ساختیات انسانی سائنس کے ایک خصوصی سیاق کے ساتھ تاریخی اور ادبی پس منظر میں تجزیہ کرتی ہے۔ انسانی سائنس کو گولڈ مین "طریقہ کار" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جہاں سے انسانی روابط کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اس موضوع کے تحت سائنسی تحقیقات (انکوائری) پیچیدگی پیدا کرتی ہیں کیونکہ نہ ان کی مشابہتیں ایک جیسی ہوتی ہیں اور نہ ہی ان میں کسی قسم

کی یکسانیت پائی جاتی ہیں۔ یہ یکسانیت ادب کے دو بڑے مکتبِ فکر، مراد مارکسی اور فرائڈین اسکول کے اختلاف سے شروع ہوتی ہے جن کے طریقہ کار اور اندازِ فکر میں بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ انسانی حوالے سے جینیاتی ساختیات کی اہمیت اس وجہ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ یہ موضوع اور معروض کے درمیان توازن پیدا کرتا ہے اور ان دونوں تصورات کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کرتا ہے لیکن بعض دفعہ یہ مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے کہ توازن کے اس عمل کے دوران موضوع کا ذہنی ساختیہ اور خارجی دنیا اس کے کردار سے کنٹرول ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یوں ایک نئے نظامِ توازن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

انسانی حقائق دو اقسام کے طریق کار کو تشکیل دیتے ہیں۔

(۱) ردِ ساختیات: جو پرانی ساخت ہوتی ہے۔
(۲) ساخت کاری: ایک قسم کی نئی کلیت کی جو کسی معاشرتی گروہ کی پیداواریت میں در آتی ہے۔ اس کمی کو "توازن" کا عمل کسی طور پر بہتر بناتا ہے۔

ساختیات کا کہنا ہے کہ جب ہم "حقائق" کی بات کرتے ہیں تو اس عمل میں "موضوع" کا عمل بھی کارفرما ہوتا ہے۔ جب وہ دیگر نوعیات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ان تصورات کے ردِ عمل کے طور پر متفرق ریڈیکل رویے سامنے آتے ہیں جن میں حقیقت بھی ہو سکتی ہے (جس کو ہم تجربی، استدلالی یا مظہریاتی کہہ سکتے ہیں) اور انفرادیت سے Epiphenomenonاور اس میں سے اجتماعیت کا نظارہ صرف اور خالصتاً مقتدر موضوعیت میں کرتے ہیں۔ آخر کار جدلیاتی تصوریت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس میں ہیگل اور مارکس کے افکار کو برتا جاتا ہے یہاں رومانیت اجتماعیت کا اصل موضوع بن جاتا ہے اور یہ فراموش کیے بغیر کہ اجتماعیت فرد کی پیچیدہ صورتحال کے بین المتعلقات کو بیان کرتے ہوئے انسانی ساختیے کی انتہائی موضوعیت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے جو ہمیشہ کردار سازی کے زیرِ اثر بحث کی جاتی ہیں۔

فرد اپنی زندگی میں ہر لمحہ آگہی کے عمل سے گزرتا ہے۔ آگہی کا مسئلہ اس بات کی آگہی ہے کہ "حقیقت "کیا ہے؟ اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہتا ہے۔ جب رومانوی سطح پر آکر سوچا

جاتا ہے تو اس کا انداز متصوفانہ ہو جاتا ہے اور یہاں فرد کسی بھی حقیقت کی تشریح کرنے سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ تخلیقی عمل کائنات انسانی اور کائنات کے تجربی نمونوں کے درمیان باہم پراسرار وحدت کا نام ہے۔ تخلیق کے متصوفانہ رویہ اور ذہنی کیفیات سے معروضی اشیاء کے ساتھ لامحدود قسم کے حسی اور تجربی روابط ہوتے ہیں جن میں جذبات کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن تخلیقی مفہوم کا اصل سرچشمہ فرد کا اجتماعی شعور ہوتا ہے۔ تخلیق میں حقیقت کا شعور فنونِ لطیفہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن یہ اس قسم کی گروہی حقیقت نہیں ہوتی جو سوسائٹی یا فلسفیانہ فکر کے بعد فرد کے تجربے میں آتی ہے۔ گولڈمین اس بات کو واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ ادب گروہ سے متعلق ہوتا ہے نہ کہ فرد سے، جس نے اسے تحریر کی شکل دی ہے۔ جدلیاتی نقطہ نظر سے اس کے انفرادی پہلوؤں سے بھی انکار ممکن نہیں اور نہ ہی عقلیت پسندی، نہ تجربیت پسندی اور نہ ہی مظہریت پسندی معاشرے کی ماحولیاتی حقیقت اس کی خارجی صورت حال سے انکار کرتے ہیں جہاں فرد کی عملی حقیقت ایک ثقافتی روش پر سفر کرتی ہے۔ اس مقام پر دو مسائل سر اٹھاتے ہیں:

(۱) موجودہ گروہ اور اس کی عملیات میں کس طرح روابط کا نظام انجام پاتا ہے
(۲) جو عمل سرانجام دیا جا رہا ہے وہ گروہ سے کس قدر متعلق ہے۔

پہلے مرحلے پر (خاص طور پر جارج لوکاش کی تحریر) جس چیز کی طرف کروٹ بدلتی ہیں وہ ادب کی عمرانیات کا علم ہے --- عمرانیات کے دیگر ادبی مکتبِ فکر چاہے وہ بڑے ہوں یا نئے، وہ اس بات کو متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادبی متن کے اجتماعی شعور کی نوعیت کیا ہے؟ یہ طریقہ کار بعض دفعہ خاصے مفید نتائج کا بھی موجب ہوتا ہے تو بعض دفعہ اس کے منفی پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن میں دو بہت اہم ہیں۔

(۱) ادیب سیاق کے عناصر کو اجتماعی شعور سے حاصل کرتا ہے جو اس کے اردگرد بکھرے ہوئے تجربی پہلوؤں کی معاشرتی حقیقت ہوتی ہے اور منتشر ہوتی ہے ان میں کبھی بھی کسی ترتیب وار نظام کی کوئی شکل دکھائی نہیں دیتی یہاں لکھنے والا صرف چند نکات ہی اخذ کر پاتا ہے اس مرحلے پر خاص طور پر عمرانیاتی طریقہ کار متن میں تلازمہ بندی کرکے اس ڈھیلی

گرفت میں وحدت کی صورت پیدا کردیتے ہیں اسے خصوصی کلیدی ادبی نوعیت کے نکات کا نام دیا جاسکتا ہے۔

(۲) معاشرے کے فوری پہلوؤں کو اجتماعی شعور دوبارہ زندہ کرتا ہے جب ادیب اپنی تحریروں کے متعلقہ متن میں ذاتی تجربات کو کم بیان کرتا ہے۔

اس موقع پر جینیاتی ساختیات اپنے اظہار میں مکمل طور پر ایک تغیر پذیر مظہر بن جاتی ہے جہاں بنیادی قیاسات ادبی اور تخلیقی کردار کی اجتماعی تصویر کو اجاگر کرتے ہیں اور جہاں "حقیقت" اور "کائنات" کا ساختیہ مماثلت (Homolous) کا ذہنی ساختیہ بن جاتا ہے جو کسی مخصوص معاشی گروہی صورت حال میں یا کسی دانشورانہ روابط میں ایک دوسرے سے منسلک ہوتا ہے۔ سیاق کی اس سطح پر تمثالی کائنات کو ساختیات کی بانہوں میں ہی نگہداشت میسر آتی ہے اور اس قسم کی فضا بن جاتی ہے کہ تخلیق کار کی سوچوں کو مکمل آزادی کے ساتھ اپنی بات کہنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ یہاں ذاتی تجربہ جہاں اپنے تمثالی جمال سے لطف اندوز ہوتا ہے تو دوسری جانب ادبی تجزیے کا مرحلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

یہاں آکر عمرانیات، ساختیاتی عمرانیات سے جدا ہو جاتی ہے، اصل چیز جو سامنے آتی ہے وہ کسی نہ کسی طور پر فرد کا اجتماعی شعور ہوتا ہے جہاں علم الادراک کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ تمام انسانی گروہوں کے افعال ایک شعور کے تحت کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ساختیاتی مفروضات تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ اور حقائق کو جاننے کی سعی کی جاتی ہے۔ اجتماعی شعور کے حوالے سے دانشورانہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کے ساختیے کو عارضی یا جزوی عنصر کے طور پر تسلیم کر کے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جہاں اس کے آپسی تعلقات کو مماثلتوں (Homologies) کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے جو اصل میں ایک ثقافت کو تشکیل دے رہے ہوتے ہیں۔

ذاتی ساختیہ کو آج بھی مارکسی اور فرائڈین نظریات کے زیر اثر مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کے مخصوص طریقہ کار کو اپنا کر دلائل دیتے ہوئے نتائج مرتب کئے جاتے ہیں۔ لیکن گولڈ مین کو اس طرح فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ جب نظریات اور طبع زاد فکر، عقیدے (پتھر کی لکیر) کا روپ دھار لے تو فکر میں جمود کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے اور مسئلہ اتنا جذباتی

ہو جاتا ہے کہ بنی ہوئی بات بھی بگڑ جاتی ہے (اس کی مثال مارکسی اور فرائڈین اسکول کی پرانی دشمنی ہے، ان دونوں مکاتب نے ادب، معاشرتی اور بشریاتی علوم پر اچھے اور برے دونوں ہی اثرات مرتب کئے اس سے سب واقف ہیں)۔ گولڈ مین نے فردیاتی ماورائیت کو موضوعیاتی ساختیات کی شکل دینے کی بھی کوشش کی جو کہ فرد کے داخل کا ذہنی اور جذباتی اظہار ہے جو ان کی نظر میں "عمل کردار" ہے جہاں وہ فکر کے دو انتہا پسندانہ پہلوؤں کو ذہن میں بسائے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ان کی فکر پر شہواتی معنویت اتنی حاوی ہے کہ ان کے معاشرتی مفاہیم انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں تو دوسری جانب وہ انفرادی سرگرمیوں کو کچھ زیادہ ہی معاشرتی معنویت کا رنگ دے دیتے ہیں اور وہ ان دونوں مظاہر میں شدت جذبات سے مجبور ہو کر کچھ زیادہ ہی روابط کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ اگر گولڈ مین کی جینیاتی ساختیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو انکشاف ہوتا ہے کہ انھوں نے جو بھی دلائل ساختیاتی سیاق میں دیئے ہیں کہیں وہ لوکاش کے طبقاتی شعور کے تاریخی نظریے کی عمرانیاتی / ساختیاتی تشریح تو نہیں ! جس میں تاریخی مادّیت کے نظریے کا بھی دبے الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے۔ لوکاش نے ہیگل اور کونت کے تصورات کو جس طرح رد کیا، گولڈ مین نے انھیں مزید توسیع دی جہاں لوکاش کے منطق سفر کو ہیگل کی جمالیات میں بھی تلاش کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ دیگر ساختیاتی نقادوں کے مقابلے میں گولڈ مین نے خاص عمرانیات سے بھی سب سے زیادہ استفادہ حاصل کیا خاص کر انھوں نے جینیاتی ساختیات کی بنیادیں جرمن عمرانیات دان میکس ویبر کے تصورات میں تلاش کرتے ہوئے جہاں وہ ویبر کے مواد (Data) کی تجزیاتی جامعیت کے قائل ہیں جو تحقیق کا سب سے اہم داخلی عنصر ہے جو انسانی کردار کے مطالعہ میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور کسی طور پر مظہریت یا نفسیاتی تجزیے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں، جہاں سے معنویت کے افعال، اور واقعات کو شعوری بنیادیں فراہم ہوتی ہیں اور اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ تاریخ اپنا مطالعہ سب سے پہلے فرد کے احوال کی آگہی سے شروع کرتی ہے۔

جینیاتی ساختیات کا تصور اصل میں "ہیت پسندانہ ساختیات" کے خلاف گولڈ مین کا شدید قسم کا فکری ردِّ عمل ہے۔ وہ ہیت پسندانہ ساختیات کو "ناقابل قبول" قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ لوئی اسٹراوس نے ساختیات کے سلسلے میں یہ رویہ اپنایا تھا کہ کسی نظام کا فطری میلان یہ

ہوتا ہے کہ معاشرے سے ریڈیکل راہوں کو مٹا دیا جائے کیونکہ اس کی تمام تر دلچسپی تاریخ اور معنویت کے مسائل میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ تمام کی تمام کیت، ہم آہنگ فلسفہ خود اپنے ہاتھوں سے ہی تشکیل دیتا ہے۔ ہیت پسندانہ ساختیات کونت ازم کی مقدارئیتی کی موضوعیت کے درمیان ڈولتی ہے۔ جبکہ آلتھیوزر (Alhesser) کا کہنا ہے کہ "یہ مادیت کی تشکیل نو کرتی ہے۔" لیکن ساتھ ہی ساتھ جینیاتی ساختیات علم الادراک کے ان مباحث کو بھی چھیڑتی ہے جو ہیت پسندانہ ساختیات کے بنیادی مسائل ہیں۔ گولڈ مین نے ہر اس ساختیاتی تجزیے کی کھل کر مخالفت کی جس میں معاشرتی اثرات اور عوامل کی اہمیت کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ خاص طور پر ان کی جینیاتی ساختیات اس عقائدی و نظامی ساختیات کی پر زور مذمت کی جو تخلیق کو ان کے اصل معنوں سے دور کر دیتی ہے۔ بشریاتی ساختیات وہ اس حد تک قبول کرتے ہیں جہاں تک ان کا مخصوص نظریہ متاثر نہ ہو اور ثقافتی مظاہر کی گتھیاں سلجھیں (حالانکہ انھوں نے لوئی اسٹروس کی ساختیاتی ثقافتی بشریات کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا)۔

گولڈ مین ادب کی تفہیم کے لئے کسی تحریر میں پوشیدہ عناصر اور دیگر اجزاء کی شناخت کو ضروری تصور کرتے ہوئے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ کسی تخلیق یا تحریر کے پس منظر میں تاریخی شعور اور ان کی بنیادوں میں معاشرتی عوامل کو تلاش کئے بغیر ہم صحیح طور پر ادب کو نہیں سمجھ سکتے۔ گولڈ مین کا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ تحریر میں جو لا تعداد عناصر مختلف اکائیوں کی صورت میں بکھرے ہوتے ہیں ان کے باہمی روابط کو بھی تلاش کرنا ضروری ہے جس کو وہ عمومی، تخلیقی تکنیک سے موسوم کرتے ہیں۔

گولڈ مین نے جینیاتی ساختیات کو بیان کرتے ہوئے محنت کش طبقے کی صارفیت پسند معاشرے میں ارتباط کے مسئلے پر بھی اپنے ردِّ عمل کا اظہار کیا کیونکہ بقول مارکسی فلسفہ، محنت کشوں کا طبقہ وہ واحد طبقہ ہے جو نئی ثقافت کی بنیادیں رکھتا ہے لیکن وہ معاشرے سے مربوط نہیں ہوتا۔ اگر روایتی عمرانیاتی ذہن سے سوچا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ثقافتی تخلیقیت جب ہی پیدا ہوتی ہے جب ذہنی سانچے اور تخلیق کار کے درمیان ہم آہنگی ہو۔ یہاں معاشرتی گروہ کی ہی اہمیت ثانوی ہو جاتی ہے۔ جیکولس لیتھارٹ نے لکھا ہے کہ "بحیثیت ایک مارکسسٹ دانشور کے یہ صورتحال مایوس کن ہے۔ محنت کش طبقے کے انضمام کا نعرہ چھنی

دہائی میں لگایا گیا جو ثقافتی تخلیقیت کا کالعدم نظریہ ہے جس کو مارکسی نقاد گولڈ مین نے بیان کیا ہے۔ "اس بیان کی اس طور پر بھی تشریح کی جا سکتی ہے کہ دنیا کا تناظر ایک تالثی ساخیہ ہے اسی تصور کو لے کر گولڈ مین نے اپنی کتاب Towards A Sociology of Novel میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو مفروضات کے مماثلیاتی (Homological) ارتباط کے مابین ایک قسم کی ریڈیکل ساختیاتی تفریق پیدا کر دیتے ہیں۔ جینیاتی ساختیات میں سب سے اہم عنصر عمرانیاتی اور عصری ادب کے مسائل ہیں جو تخلیقی عمل سے لے کر معاشرے کی کلیت سے منسلک ہیں بقول گولڈ مین یہ ادیب کا مبادلیاتی تصور ہے جو نظامی نوعیت کا ہوتے ہوئے بھی معروضی نوعیت کا احاطہ کرتا ہے کیونکہ اجتماعی شعور، انفرادی شعور سے ارفع ہے۔ انفرادی شعور عموماً اس سطح پر آ کر اجتماعی شعور کو واضح طور پر فریب میں مبتلا کر کے خود موضوع سے باہر راہِ فرار اختیار کر جاتا ہے۔

گولڈ مین کی تصور جینیاتی ساختیات کو غیر منطقی ساختیات بھی کہا گیا۔ وہ فرد کے تخلیقی رویوں کو ایک وسیع معروض کے تناظر میں دیکھتے ہیں جہاں مارکسی عمرانیاتی شعور کو ساختیاتی بنیادیں فراہم ہوتی ہیں۔

گولڈ مین کے بعد جینیاتی ساختیات کے میدان میں سرگرمی خاصی مدھم پڑ گئی ہے۔ آج انھیں انتقال ہوئے کوئی اٹھائیس (۲۸) سال گزر گئے ہیں لیکن ان کے جینیاتی ساختیات کے تصور کو کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ملا جو ان کے تصورات کو توسیع دے۔ دوسری وجہ آج کا عالمی معاشرہ جس غیر نظریاتی اور غیر وابستہ (غیر سکّہ بند) راہوں پر گامزن ہے اسے گولڈ مین جیسے لوگوں کے ریڈیکل اور انقلابی نظریوں کی ضرورت نہیں شاید یہ صورت حال اس سبب پیدا ہوئی کہ یہ وقت کا تقاضا ہے کیونکہ آج بیسویں صدی کے اختتام پر ادب اور معاشرہ تخلیق کار سے مختلف نوعیت کے مطالبات کر رہا ہے کیونکہ دنیا کے مسائل کی نوعیت اور حالات کی صورات حال پہلے سے یکسر نہیں تو خاصی حد تک ضرور بدل گئی ہے۔

لوسین گولڈ مین کا جینیاتی ساختیات کا فلسفہ ایک شکست خوردہ فلسفہ ہے اور جذباتی وابستگی کا اظہار ہے جہاں ادب اور معاشرے کی تمام تر "حقیقت پسندانہ" توجیہات عینیت پسندی کی ڈھول ثابت ہوتی ہیں۔

گولڈمین کی جینیاتی ساختیاتی تنقید کا فکری ڈھانچہ

مصنف

علم الادراک

واقعات

اجتماعی شعور —— جینیاتی تنقید —— تاریخی مادیت —— رد ساختیات

بین المتنی تنقید

نقال تنقید

مظہریات

ادب —— صوری تنقید —— حقیقت —— موضوعیت

اثر پذیری تنقید

ساخت کاری

قاری

RERERENCES

Adorno, T.W. Prisms: Cultural Criticism And Society', Superman, London, 1967.

Gaute, David. Portrait Of The Artist And Midwife; In Time Literary Supplement, 26 November, No. 3639, 1465-1466, 1971.

Cros, Edmon. Theory And Practice Of Sociocriticism, University of Minnesota Press, Minneaplies, MN. 1988, pp 3-19.

Comrie, Bernard. Genetic Classification, Contact, and Variation, Georgetown University Round Table on Languages And Linguistics, 1988, p 81-93.

Coldmann, L. The Balcony: A Realist Play, Praxis, 4 1st Published 1960.

Goldmann, L. Cultural Creation in Modern Society, Telos Press, 1980.

Goldmann, L. Towards The Sociology of The Novel, Methuen, London, 1975.

Goldemann, L. Method In The Sociology of Literature: Status And Problem of Method. In Albrecht, Etal 1970.

Goldemann, L. Lukacs And Heidegger, Ruthledge And Kegan Paul, London, 1977.

Goldemann, L. Racine, Cambridge, Revers Press, 1972.

Goldemann, L.Ideology And Writting, In Times Literary Supplement 28, September 1967-903-905.

Goldemann, L."Criticism Dogmatism In Literature" In David Cooper (ed) The Dialectics of Liberation, Penguin, Harmondsworth, 1968.

Goldemann, L. The Huma Sciences And Philosophy, CAPE, London, 1969.

Goldemann, L. The Hidden God, Routledge & Kegan Paul, London, 1964.

Horkheimer, Mand. Adorno, T.W. Dialectic of Inlightemment, Allen Lane, London 1973.

Mackey, Richard (ed) "Velocities Of Change" The John Hookings University Press Baltimore And London 1974 p 82-102 (on Goldemann)Martindale, D. The Nature And Types of Sociological Theory, Houghton Mifflin, Boston 1960 Ch. 17 & 18.

Martindale, D. The Nature And Types of Sociological Theory, Hounghton Mifflin, Boston 1960, Ch. 17 & 18.

Said, Edward W. "A Sociology of Mind", Partisan Review 33 (1966) 444-448. on Lucien Golamann.

Sayre, R. Lowenthal, Goldmann And Sociology of Literature, Telos, No 45 Autumn 1980.

Stamiris, Yiannis. Main Currents In Twentieth Century Literary Criticism A Critical Study, Tory, New York, 1986, p 53-63

Seigaj, Leonard M. Genetic Memory And Three Traditions Of Crow, Perspective On Contemporary Literature, 1983 V. 9 pp 83-93.

Selden, Ramon (ed) The Theory of Criticism, From Plato To The Present: A Reader, Longman, London, New York 1980 p 434-435.

Swengewood, Alan. Scolciological Poetics And Aesthetic Theory, St. Martin New York 1987 pp 25 - 34.

Wawthron, Jerny. Foundation Issue In Literary Theory, Edward Arnold, London, 1987

═══

چھٹا باب

ساختیات اور مارکسیت

ساختیات اور مارکسیت

مارکسی ساختیات جدید فکر و تنقید کا اہم موضوع رہا ہے۔ مارکسیت اور ساختیات ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھی کئی معنوں میں ایک دوسرے سے منسلک نظر آتے ہیں۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو ساختیات اور مارکسیت دونوں کے نظریات میں یہ اہم نکتہ مشترک ہے کہ ہر شے کے وجود میں اس کی ضد کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ ہر شے اپنے افتراق سے پہچانی جاتی ہے۔ ہر شے میں مثبت اور منفی عناصر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے ہیں جن کے سبب کائنات میں حرکت نظر آتی ہے اور تبدیلی کے عناصر بھی اس کشمکش میں در آتے ہیں جن سے فکر کے نئے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔

ساختیاتی مارکسیت کی شروعات دراصل فلسفی پارمینائڈیز (Parmenides)(۴۸۵ ق م) کے مدرسۂ فکر ایلیاٹک (Eleatic) سے ہوا اس نے آفاق کے غیر حرکی ہونے کا نظریہ پیش کیا اور کائنات کی حرکت کو محض اعتقادی یا مانوس تصور دوقسا (Doxa) کہا۔ پارمینائڈیز نے تغیر اور حرکت کا یہ نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسے فکری احاطے میں لانا ناممکن ہے۔ پارمینائڈیز جنوبی اٹلی کے قصبے ایلیا (Elea) میں پیدا ہوا لہٰذا اس کے اس نظریے کو The Eleatic School کہا جاتا ہے۔ اس مکتب فکر کو مابعد الطبعیاتی فکر کا دبستان بھی کہا گیا ہے جس کے تحت خدا کا تصور اس میں تبدیل ہوتے ہی مستقل نوعیت کا تصور بن جاتا ہے۔ پارمینائڈیز نے ہی سب سے پہلے فلسفہ ثبات (Philosophy of Permanence) پیش کیا جو اپنی ترقی یافتہ شکل میں صدیوں بعد علم موجودات (Ontology) کی صورت میں سامنے آیا۔ ان کے بقول علم حقیقت یا وجود سے متعلق ہوتا ہے اور اس کے معروض کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ حقیقت ہی آفاقی

تصورات کو دریافت کرتی ہے۔

پارمینائڈیز نے ہرقلیطس (Hiraclitus) (یہ دونوں ہم عصر تھے) کے اس خیال کی نفی کی کہ ہر شے تغیر پذیر ہے کیونکہ آگ کبھی پانی اور زمین میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان کی اس فکر کو عقلی (Rational) یا جدلیاتی عینیت پسندی (Dialectical Idealism) بھی کہا جاتا ہے۔ ذہن کی وساطت سے ہی کو پایا جا سکتا ہے، جو اصل میں مادّی قسم کی عینیت پسندی ہوتی ہے۔ حقیقت صرف جواز سے حاصل ہو سکتی ہے اور مغالطے میں ڈالنے والی فکر کبھی بھی حقیقی نہیں ہوتی۔ پارمینائڈیز کے ان تصورات کو "التباس" (Illusion) کا نظریہ بھی کہا گیا ہے جو "وجود" اور "غیر وجود" کی حس کو ترتیب دیتے ہوئے حرکت اور تبدیلی کا عندیہ دیتے ہیں کیونکہ تبدیلی کا تصور التباس کو اُبھارتا ہے۔ اصل میں وحدت صداقت کی ہی ہوتی ہے۔ جس میں ٹھنڈا گرم، تاریک روشن کی تکرار ملتی ہے۔ انھوں نے ایک طویل نظم بعنوان "فطرت پر" (ON Nature) بھی لکھی۔ پارمینائڈیز کا فکری سفر آگہی اور علامت کی وحدت سے متعلق ہے۔ نامیاتی وحدت ساخت کی صورت میں اُبھرتی ہے۔ ان کے خیال میں فلسفی کائنات کی اصلیت سے متعلق نہیں ہوتا۔ پارمینائڈیز کا "ایلیٹک" (Eleatic) مکتبِ فکر "ملیسین" (Milesian) مکتبِ فکر کی نفی کرتا ہے۔

پارمینائڈیز کے بعد یونان کے جدلیاتی مفکر ہرقلیطس (۵۳۵-۴۷۵ ق م) نے حرکت اور تبدیلی کے بنیادی عناصر پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ تضادات ہی اشیا کے تغیر اور ارتقا کا سبب ہوتے ہیں لیکن ہرقلیطس کے ان جدلیاتی تصورات کو افلاطون اور اس کے مقلدین کی سکونی مابعد الطبعیات (Static Meta Physics) کے فلسفے نے بڑی حد تک دھیما کر دیا۔

افلاطونی فلسفے کی گونج اور اس کی مخصوص فضا ایک عرصے تک دنیا کے فکری اُفق پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اُنیسویں صدی میں ہیگل (۱۸۳۱ء-۱۷۷۰ء) نے ہرقلیطس کے جدلیاتی فلسفے پر نظر ڈال کر اس کے گمشدہ افکار سے اپنے نظریے کی مطابقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ اصول پیش کیا کہ کائنات میں ہر سو کہیں نہ کہیں تغیر اور حرکت رواں دواں ہوتے ہیں۔ کسی شے کا کوئی علیحدہ تصور نہیں، ہر شے ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہے۔ جس طرح باطن میں

تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اسی طرح اس کی تبدیلیاں مادّی دنیا میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہیگل کی منطقی جدلیات میں اثبات، نفی اور امتزاج (Thesis, Antitesis, Synthesis) اہم ہے۔ ہیگل کے خیال میں نفی کی نفی مثبت سے کیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہیگل کے اس جدلیاتی مظہر کو عینیت پسندی بھی کہا گیا۔

مارکس اور انجلس نے ہیگل کے جدلیاتی تصور کو نیا فکری رنگ دیا۔ ان دونوں نے فکری حرکت پذیری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ارتقائی تصور کو معاشرتی طبقات کی کشمکش میں تبدیل کر دیا۔ مارکس اور انجلس ہیگل کی اس بات کے قائل تھے کہ کائنات اور انسانی فکر ہر لمحہ تغیرات کے عمل سے دوچار رہتی ہے لیکن انھوں نے ہیگل کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ ذہن میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہی مادّی دنیا میں تغیرات کا سبب بنتی ہیں۔ ان کے مطابق حقیقت اس کے اُلٹ ہوتی ہے، تصورات اشیاء کی پیداوار ہیں اور اشیاء کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تصورات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ انھوں نے جرمن فلسفے کے متعلق کہا تھا کہ وہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے اور ہمارا فلسفہ زمین سے آسمان کی طرف جاتا ہے لیکن مارکسی فکریات میں ساخت کا عنصر "مخصوص" معنوں میں وہ نہیں ہے جو ساختیاتی لکھنے والوں کے یہاں ملتا ہے، بعد میں مارکسزم کی جو بھی ساختیاتی توجیحات بیان کی گئیں۔ وہ دراصل انجلس کے تاریخی مادّیت کے تصور کا پیچیدہ تفاعل ہے جس کی بالائی ساخت (Super Structure) سوشل ازم اور معاشرے کے سائنسی نظریے پر کھڑی ہے۔ ٹکر (Tucker) کے بقول جوزف بلاک اور سی۔ اسمتھ سے خط و کتابت کے دوران انجلس نے بلاک کو لکھا تھا کہ اس کے (انجلس) کے پاس کئی ایسے تصورات تھے جو مارکسی ساختیات سے متعلق تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو عارضی درجات تشکیل دیے ہیں۔ وہ یہ ہیں:

(۱) سماجی ساخت (۲) معاشی ساخت (۳) سیاسی اور نظریاتی ساخت

یہ تینوں درجات اعلیٰ ساختیے کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہ تمام امتیازات مکمل طور پر ارتباطی ساختیاتی عنصر سے منسلک ہوتے ہیں، جو دو یا اس سے زائد حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ماؤزے تنگ کا معاشی اور سیاسی نظریات کا ڈھانچہ التھیوز اور پولنٹا (Poulantaz) کے ساختیاتی نظریات کا بنیادی نکتہ ہے جس میں عمیق وجودیاتی گہرائی بھی ملتی ہے۔

مارکسزم کی یہ تین بالائی ساختیاتی سطحوں کے اوصاف ہمیں کسی اصل کے رد عمل کے طور پر تو محسوس نہیں ہوتے لیکن نظریاتی اہمیت اور اس کی اثر پذیری منطقی صورت یا تصوراتی تجربیت کی صورت میں ضرور ابھرتی ہے اور اس کے تمام وظائف عقیدے کی غیر لچک دار شاخ کی طرح ہوتے ہیں۔ جہاں پر مخصوص بندشوں سے باہر نکل کر فکر و خیال کی آزادی کم ہی ہوتی ہے اور متبادل کے کئی جبر سر اٹھاتے ہیں۔ خاص طور پر تاریخ کا عنصر سب سے کلیدی نوعیت کا ہوتا ہے جو پیداوار اور پیداوار نو کے تعلق سے اصل زندگی کا تعین کرتا ہے جو خاص قسم کا اقتصادی نوعیت کا عنصر ہوتا ہے جو اپنے بطن سے سیاسی روپ میں ظاہر ہو کر "طبقاتی کشمکش" کے جبر کی بحث چھیڑتا ہے۔ نظریاتی عناصر تاریخ کی اس روایتی کشمکش کو جبر کی صورت میں پیش کرتا ہے جو مارکسی ساختیات کی نظریاتی بحث کو اپنے ہاتھوں سے تشکیل دیتے ہوئے نئی راہیں تلاش کرتی ہے، جن پر فکر کے ڈھانچے کھڑے کیے جاتے ہیں۔ یہ تمام عناصر خود مختار ہوتے ہوئے بھی تعاملیت کو دریافت کرتے ہیں جہاں انسانی معاشرے میں برپا ہونے والے حادثات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تجربے کا حصہ بنتا ہے۔ انفرادی خواہشات کا تصادم ہوتا ہے جس کو انجلس کے حوالے سے التھیوزر نے "کثیر المعنویت" کہا ہے۔ انجلس کا تاریخی طریقۂ عمل قریب قریب ساختیاتی نوعیت کا ہے جس میں فرد کی خواہش اور توقعات معاشرتی نوعیت کی صورت اختیار کر جاتی ہیں اور معروضی "کل" لاشعور کی قوتوں کا فطری وظیفہ ثابت ہوتا ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ انجلس کا "لاشعور کا تصور فرائڈ کے تصورات لاشعور" سے یکسر مختلف ہے لیکن ان تاریخی تصورات کے نتائج بہت محدود ہوتے ہیں جو تاریخی بھٹی میں ڈھل کر سائنسی سوشلزم کے تاریخی ارتقا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مارکس اور انجلس کے یہاں تاریخی شعور قریب قریب ایک ہی جیسا ہے جو ساختیات کا کلی نظریہ بیان کرتا ہے۔ بلاچ اور اسمتھ کو انجلس نے لکھا تھا کہ اس میں مارکس کے تصورات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

مارکسی ساختیات کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ فلسفیانہ ثنویت اور مارکسی جدلیات میں خاصا تفاوت ہے۔ تجزیاتی امتیازات پر حاوی ہوئے بغیر ساختیاتی تفہیم ناممکن ہے تو دوسری جانب مارکس کی ساختیات کو سمجھنا بھی دشوار ہے۔ فلسفیانہ ثنویت

کے اصول دو آزاد مابعد الطبیعیاتی جواہر اور قوتوں سے ترتیب پاکر صداقت کے اصولوں کو دریافت کرتے ہیں، جن میں معاشرتی حقائق بھی شامل ہیں۔ وجودیاتی ثنویت منطق کی سچائی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مواد اور ذہن کے حوالے سے اخلاق اور مذہبی ثنوی کو ریڈیکل سطح پر علیحدہ کرتے ہیں جو فوراً ہی ذہن کو دیگر متعلقہ احوال سے آگاہ کرتے ہوئے متعلقہ احوال سے آگاہ کرتے ہیں، تاریخ فلسفہ افلاطون کی ثنویت کو پیش کرتا ہے جو اس کے تصور کو "ذی حس" (Sensible) اور "قابل فہم (Intlligible) کی اصطلاح میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ارسطو کے یہاں ثنوی منطق ان کی ثنویت پسندی کے تصور کو "جوہر" اور "حادثے" کی اصطلاح میں بھی منقسم کرتی ہیں جو ہیئت اور مواد کے تصور کا دوسرا نام ہے۔ دریکاٹ نے اس کو "ذہن" اور "جسم" کا نام دیا۔

ثنویت کا تناظر مغربی فلسفے میں اس وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ ہیگل تک فلسفیانہ عینیت پسندی کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا رہا کہ ثنویت عینیت پسندی کا رد عمل (Counterpose) ہے جو "وحدیت" (Monism) کی جانب سفر کرتا ہے جو اصل میں بنیادی صداقت ہی ہوتی ہے تو دوسری جانب تکثریت کا تصور ہے جو کہ وجود کے لب لباب کو قیاس میں لاتا ہے لیکن ثنویت اور عینیت پسندی کے درمیان جو سب سے زیادہ حساس تضاد ملتا ہے وہ جدلیاتی تناظر کا ہی ہوتا ہے۔ خاص طور پر مارکس کی تنقید تک ہیگل کی فکر عینیت پسندی تھی جبکہ فائر باخ کا تمام فکری ڈھانچہ مادیت پر محیط ہے جس نے کئی تصورات کو روشناس کروایا کہ حقیقت معاشرتی اور تاریخی طریقہ عمل کا حصہ ہوتی ہے اور وہ پھر بھی بعد میں جوہر کی ماہیت کا یقین کرتی ہے جس میں تاریخی افتراقات سے لے کر تصادم کے اختلافات سر فہرست ہوتے ہیں جو کہ اجتماعی پسندی، ذات کا مبادلہ اور اقتباطی ارادیت کا میکانی جبر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ تمام تصورات "وحدیت" (Monism) اور "تکثریت" (Pluralism) کا حصہ ہوتے ہیں۔ یہاں ذہن اسپوزا کے Monism کے تصور کی طرف منتقل ہوتا ہے جو اصل میں "کلیت" ہے۔

تاریخی طریقۂ عمل کا معاشرتی سیاق انسان کی عملی سرگرمیوں سے تشکیل پاتا ہے جو ہری اعتبار سے مارکس کی کلیت کا تصور اسپوزا کے مقابلے میں خاصا پھیکا ہے جو کہ ہیگل کی افتراقیت

کی روح سے مختلف ہے لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ مارکس کی ساختیات متونی رسائی سے معاشرتی حقیقت میں تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ متونیت کا دوہرا تصور اصل میں "ساختیاتی وحدت" ہے جو ساسر کے یہاں "نشان" اور التھیوز کے یہاں "اصل معروض" کی صورت میں اُبھرتا ہے جس کو "متنی پیداواریت" (Textual Productivity) وحدت بنادیتی ہے۔

برنارڈ پین گڈ (Bernard Pingoud) نے لکھا ہے کہ لیوی اسٹروس متونیت کے منکر تھے ان کی دانست میں جزئیات اور دانش ایک ہی وحدت میں جڑے ہوئے ہیں۔ مارس کون نوا تھ (Mourice Corn Forth) کا مشاہدہ ہے کہ آلتھیو کی تخصیص "نفی" (Anti Thesis) میں ہے لیکن کلیدی نفی سائنس اور نظریے سے متعلق ہے جو ایک دوسرے سے باہم نہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے باہم ہے۔ متونیت اور مارکسی ساختیات بہر طور ارسطو کی منطق، کاسٹرین وجودیت، کانٹ کا علم ادراک اور ماورائی مابعد الطبعیات، اور روسو کی اخلاقیات کی غیر تحریری روایت ہے جو مارکسی ساختیات کا اخلاقی حصہ ہے۔ مارکسی ساختیات کی جدلیات اصل میں ہیگل کے اس فلسفے سے بچی ہوئی ہے جو کانٹ کے فکری نظام کے اختلافات کے بعد سامنے آیا جو بذات خود ایک ماورائی فلسفہ ہے۔

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ مغرب کی فلسفیانہ تاریخ مارکسی جدلیات کی ماورائی فکر میں متونیت کی عینیت پسندی کے لیے کوشاں ہوتی ہے اور روایت کے انہی دو فلسفوں میں "مخصوص قوم" (Endemic) کی متونی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ساختیات نے مارکسزم کے تاریخی تناظر کو دُھندلا کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ مارکسیت کے دوئی آسا جدلیاتی تصور کو اوّلین دور کی جدلیاتی راہوں پر ڈال دیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعد میں مارکسیت کی ساختیات سائنسی نظریہ بن گئی یا دوسرے لفظوں میں اس کو "منطقی متونیت" کہا جانے لگا جس نے وظائفی ساختیات کی راہیں ہموار کیں اور سسٹم تھیوری (System Theory) کا نظریہ اخذ کیا گیا اور انجذاب اور ارتباط کا نیا سنگم سامنے آیا۔ نظریاتی ارتباط نے ساختیات اور مارکسیت کے معاشرتی نظریے کو نئی فکری سمتوں سے متعارف کروایا اور ساختیاتی مارکسیت کے حوالے سے آلتھیو گولڈ مین، پیئر ماشرے، ایگلٹن، جیمسن، لوفے اور ایلن ڈورین وغیرہ کے نام اُبھر کر سامنے آئے۔

ہیگل کی منطقی ساختیات کی جدلیات اور لیوی اسٹروس

ہیگل کی اثبات، نفی اور نفی کی نفی کی جدلیات کی فکری مثلث میں پہلی دو صورتیں جدلیاتی منطق اور اختلافات کو جنم دیتی ہیں جبکہ تیسری صورت (نفی کی نفی) ان دونوں تصورات کی تفہیم ہی نہیں کرتیں بلکہ یہ مرحلہ افہام و تفہیم کا نکتہ بن جاتا ہے۔ لیوی اسٹروس نے اس منطق کو موضوعی حصار سے نکال کر معروضی شہادتوں میں پیش کیا ان کا یہ تصور "مثلث مطبخ خانے" کے نام سے معروف ہوا۔ اس تکونی تصور کی تین گرہیں ہیں جن کو کچا (Raw) پکا ہوا (Cooked) اور سڑا ہوا (Rotten) کے الفاظ میں پیش کیا گیا، تصور کی یہ گرہیں کسی تصادم کو پیش نہیں کرتیں لیکن اس تصور سے "متونی تضاد" آپس میں آکر مدغم ہو جاتا ہے۔ لیوی اسٹروس کے یہاں خیال کے تحت تازہ اور کچے اور سڑے ہوئے کھانے کے درمیان امتیاز میں فرق ظاہر کیا گیا ہے اس متونی تضاد میں فطرت اور ثقافت کے درمیان نکتہ اتصال موجود ہے۔ اس نکتہ اتصال کے تحت پہلا متونی تضاد دو مخصوص ہستیوں کے ساتھ تصور کیا گیا ہے۔ تازہ یا سڑا ہوا کھانا اپنے امتیازات کو ثقافت اور فطرت کے عمل کے زیر اثر رکھ کر کھو دیتا ہے اور انہی دو عوامل کے تحت کھانا پکایا بھی جاتا ہے لیکن متونی تصور اس مرحلے پر کوئی حتمی ہیئت کو سامنے نہیں لاتا۔ لیوی اسٹروس کی ساختیات میں وظائف کے متونی تضادات کسی قسم کے تصادم کا عندیہ نہیں رہتے لیکن میز اپنے کے امتیازات کو نمایاں ضرور کرتا ہے۔ "مثلث مطبخ خانے" کا یہ تصور ہیئت کے مختلف تفاعل کو ایک کل کارکردگی کی صورت میں پیش کرتا ہے جو ہیگل کی جدلیاتی مثلث سے مشابہ ہے۔ "مثلث مطبخ خانے" کا تصور جدلیاتی مثلث کے تصور میں پوشیدہ روابط کو خاص حد تک کم کر دیتے ہیں لیکن فکری یہ تخفیف ہیگل کی جدلیاتی منطق سے مکمل طور پر انحراف نہیں کرتی لیکن ہیگل اور اسٹروس کے تصورات میں خاصا فرق بھی ہے۔ اس کا مشابہاتی تقابل (Homological Comparsion) ہم ٹریفک کی سرخ (ٹھہر جاؤ) زرد (ہوشیار ہو جاؤ) اور سبز (چلو) بتی سے کر سکتے ہیں۔ سڑک کے چوراہے پر دو متونی تضادات سامنے آتے ہیں یعنی سرخ اور سبز بتی کے درمیان زرد کی صورت میں عبوری وقفہ ہے۔ لیوی اسٹروس کی بیان کی ہوئی منطق بنیادی طور پر ہیگل کی منطق جدلیات

سے ملتی جلتی ہے۔ اسٹراوس کے یہاں ساختیات کا تصور منطقی مشابہت (Logical Homology) سے قدرے مختلف ہے۔ انھوں نے فطرت اور ثقافت کی جس مشابہت کی نشاندہی کرتے ہوئے ثقافتی طریقہ عمل کو "تازہ" اور "کچے کھانے" کے تصور کی مشابہت میں تبدیل کردیتے ہیں جو کہ اصل میں مشابہتی امتیازات ہیں اور صوتی تضادات کا ردعمل بھی ہیں جیسے بڑا چھوٹا، سیاہ سفید، سرد گرم، اوپر نیچے، روشن تاریک، کا تضادی تصور ہم آئے دن اپنی زندگیوں میں تجربہ کرتے ہیں۔ اس عمومی حسیت کے تجربے میں ہمیں فطرت اور ثقافت کے درمیان کسی تصادم یا اختلاف کا سراغ نہیں ملتا کیونکہ یہ بنیادی طور پر تضادات اور امتیازات کا مسئلہ ہے اس قسم کے صوتی تضادات انتشار و تصادم کی راہیں جب ہی ہموار کرتے ہیں جب ان کی نشاندہی اور حدود کو متعین کیا جاتا ہے لیکن فکری سطح پر میزانیہ اور توازن کی صورت حال بگڑ جاتی ہے پھر بھی لیوی اسٹراوس کی مشابہاتی منطق اور ہیگل کی تکوینی منطق میں خاصا تفاوت بھی ہے۔ ہیگل کا تکوینی تصور اثبات اور نفی کے اختلافات سے جنم لے کر جدلیاتی تصادم کی فطرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہیگل نے نظام فکر میں پہلی دو صورتحال (اثبات اور نفی) کا وجود تیسری صورتحال "نفی کی نفی" کے بغیر مکمل نہیں ہوتا لیکن لیوی اسٹراوس کے یہاں دو صورتحال اپنا توازن خود ہی برقرار رکھتی ہیں۔ ان دونوں صورتحال کو اپنے وجود کے لئے کسی تیسری اصطلاح کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہیگل کی فطرت اور ثقافت کی جدلیات ان کی تکوین منطق سے متعلق نہیں ہے جبکہ ان کے یہاں یہ مشابہاتی تصور ضرور ہے۔ ہیگل نے نظام فکر میں فطرت کبھی بھی براہ راست ثقافت سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ فطرت ان کے یہاں نفی (دوسری صورتحال) کے مشابہ ہے۔ منطقی تصور (تصور ذات خود) اور فطرت (تصور کے باہر) اور روح (تصور بذات خود) یہ تینوں صورتحال روح کی تکوین ثابت ہوتی ہیں جس سے موضوعی روح، معروضی روح اور روح مطلق ترتیب پاتی ہے۔ ہیگل کے نظام فکر میں ثقافت کا تصور دو مختلف صورتوں میں تشکیل پاتا ہے جو ایک وسیع تناظر لیے ہوئے ہے، جس میں ثقافت کے معنی مکمل روح کی تکوین کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جبکہ محدود معنوں میں یہ معروضی روح ہوتی ہے۔ وسیع تناظر کے حوالے سے ثقافت "نفی" کا منطقی تصور ہوتا ہے جو اصل میں فطرت سے متعلق ہوتے ہوئے محدود معنوں میں موضوعی روح

سے اختلاف کرتا ہے۔ ان دونوں صورتحال میں ثقافت فطرت سے اختلاف کرتی ہے۔

لیوی اسٹراوس نے ہیگل کے لسانی تصادم کے تصور اور اس کے تضادات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے لیکن چند تبصرہ نگاروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوتی منطق کارکردگی کا وظیفہ ہے جو ہیگل کی جدلیاتی منطق کا مرکزی نکتہ بھی ہے لیکن لیوی اسٹراوس کا خیال ہے کہ اساطیر کا مقصد منطقی ڈھانچے کی فکری گہرائی کو زیر کرنا ہوتا ہے جو ایک قسم کا تضاد ہی ہے اور غیر یقینی ہدف کا انکشاف ہوتا ہے تو یہ اصل تضاد تصور کیا جاتا ہے۔ ہیگل کی جدلیاتی منطق میں اثبات اور نفی کا اختلاف تو نہیں ابھرتا لیکن اصل اختلاف منطقی تصادم کو ضرور ایندھن فراہم کرتا ہے۔ بنیادی طور پر لیوی اسٹراوس کی "تکوینی" فکر کے لیے "جدلیات" کا ہی لفظ استعمال کیا جانا چاہئے۔ اصل میں اس قسم کی فکر کاروبہ عمل ہونا ہی منطق نظام فکر میں "جدلیات" ہوتی ہے۔ لہٰذا 'جدلیات' کے سلسلے میں صرف ہیگل کی دنیا ہی معتبر نہیں بلکہ اس سحر انگیز لفظ کو ہر دور میں اہل نظر نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔

"وحشی ذہن" (Savage Mind) میں لیوی اسٹراوس نے جس "مثلث منطق" کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ صرف وظائف کو ہی متعین نہیں کرتے بلکہ یہ صوتی معاشرتی توازن کی حرکیات کو بھی زندہ رکھتے ہیں۔ اسٹراوس کا تصور مغالطے کھڑے نہیں کرتا اور نہ غلط سمتوں کی طرف فکر کو لے جاکر مسئلے مسائل کا سبب بنتا ہے۔ ان کی جدلیات کا بنیادی مزاج ہیگل کی جدلیات سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ اس سے قبل منطقی نظام، جدلیاتی نظام سے عموماً یکسر مختلف ہوتا تھا لیکن لیوی اسٹراوس کی فکر نے ان دونوں نظاموں کو بنیادی طور پر متوازن کردیا۔

لیوی اسٹراوس کی صوتیت اور ہیگل کی تکوینی منطق میں بنیادی فرق بھی نظر آتا ہے کیونکہ سابقہ فکری نظام "ماتحتی" نظام تھا۔ ہیگل کے نظام فکر کے دو وصف ہیں لیکن وہ اپنی سطحوں پر ایک دوسرے نظام فکر سے یکسر جدا ہیں۔ یہ وصف ساختیاتی تکنیک (Architoctonic) کے نظام میں منظم ہو جاتے ہیں اور قطبین کے مخالف اوصاف (Polorities) لیوی اسٹراوس کے یہاں ساختیاتی سطح پر مشابہاتی (Homological) تصور کے مساوی ہو جاتے ہیں۔ ہیگل کا ماتحتی نظام ترقی پسندانہ ہے جبکہ لیوی اسٹراوس کا نظام روابطی نوعیت کا ہے جو کہ مکمل طور پر

غیر ترقی پسندانہ ہے۔ یہ دونوں نظام فکر مختلف مزاج کے حامل ہیں جہاں زمان و مکان ایک دوسرے کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔

ہیگل کی جدلیات کے نظام کے جوہر کو سمجھنے کے لیے مارکسیت کی جدلیاتی ساختیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ مارکس کی جدلیاتی مارکسیت ہیگل کی جدلیاتی عینیت پسندی کے مطالعے کے بعد ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ مارکس کے اس تصور میں مادّی صورت حال کے درمیان انسان کی وجودیاتی صورت حال واضح بھی ہو جاتی ہے جبکہ ہیگل کے فکری نظام فکر میں یہ جدلیاتی تحریک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مارکس کے یہاں معاشرتی سطح پر طبقاتی ساختیے کا تصور ملتا ہے جس میں دو گروہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور جدلیاتی تصادم کی کیفیت جنم لیتی ہے کیونکہ معاشرے میں استحصال کرنے اور استحصال کا شکار ہونے والے دو گروہوں کے طبقوں کا وجود ہوتا ہے۔ استحصال زدہ طبقے کے حقوق نہیں ہوتے لیکن پھر بھی طبقاتی شعور ان میں ابھرتا ہے۔

ہیگل کے فکری نظام کے ترتیبی عکس کو مارکس نے اصولی طور پر رد نہیں کیا لیکن ہیگل کی تکوینی جدلیات مارکس کے یہاں دوسرے انداز میں سامنے آتی ہے۔ لیوی اسٹروس کی ساختیاتی مشابہتی منطق میں قدیم معاشرتی ڈھانچے میں توازن اور تعاون کی معاشرتی ضرورت پر نظر ڈالی گئی ہے جبکہ مارکس کے یہاں مشابہت اور اس کے روابط استحصال اور استحصال کئے جانے والے طبقے کے معاشرتی ڈھانچے میں موجود تضادات سے جنم لیتے ہیں، لیوی اسٹروس کی مشابہت اصل میں اعزاز ہے جبکہ مارکس کے یہاں یہ تمام کا تمام عمل تصادم سے عبارت ہے۔

لوسین گولڈ مین نے ساختیات کو مارکسی حوالے سے مطالعہ کیا۔ ان کی تحریروں پر جارج لوکاش کے تنقیدی نظریات کا گہرا اثر رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کی فکری فضا میں گولڈ مین کی "انسانی مارکسیت" کا چرچا رہا، انھوں نے اپنی کتاب پوشیدہ خدا (Hidden God) میں کئی اہم تصورات سے بحث کی جس میں ان کا تصور کائنات (World View) کا تصور سب سے زیادہ زیر بحث آیا، جس میں انھوں نے معاشرتی گروہوں (طبقات) کو فکر کا مرکزی نکتہ بناتے ہوئے "تصور کائنات" کے نظریے کی تفہیم کرنے کی کوشش کی۔ گولڈ مین نے اس

بات کو محسوس کیا کہ ادیب کا تصور کائنات فنکارانہ عمل میں "عالم" کو تخلیق کرتا ہے اور ایسے کے نتائج سے ہی ادیب دنیا اور خدا کے استدلال کو رد کرتا ہے (اگر خدا حاضر نہ ہو تو وہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس کی حیثیت خاموش مشاہدہ کرنے والی ہوتی ہے) کتاب میں کئی جگہ ابہام موجود ہے خاص کر اصطلاحات کی ترسیل میں خاصی پیچیدگیاں ہوتی ہیں اسی سبب متن الجھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ خاص کر جب وہ نئی کانٹین ازم (New-Kantianism)، مارکسیت اور مذہبی الحادی اصطلاحات کو بیان کرتے ہیں اور پھر ایک ہی سانس میں "المیے" اور "جدلیات" کے الہیاتی تصور سے دستبردار بھی ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اسے فلسفے کی "جسمانیت" تصور کرتے ہیں۔ گولڈ مین نے اس کتاب میں پاسکل (Pascal) کی فکر کو دریافت کرتے ہوئے سترہویں صدی کے فرانس کی مذہبی تحریک ژن زین ازم اور اشرافیاتی طبقوں کا تقابل کیا ہے خاص کر انھوں نے اس دور کے تین بڑے بحرانوں کی نشاندہی کی:

(۱) روایتی معاشرتی ضابطوں کی عدم تکمیل

(۲) تاؤمسٹ (Thomists) تصور کائنات کی تفریق

(۳) دربار (حکومت) اور معاشرتی پر تین (طبقے) دنیاوی تصادم کا سبب ہوتی ہیں، جس سے رسین اور پاسکل متفق ہیں۔

گولڈ مین کے یہ نکات مارکسی فکر میں ہمیشہ سے ہی پسندیدہ رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے ان تصورات کو گہرائی سے مطالعہ کیا۔ خاص کر فرانس کے روشن خیال طبقے نے ان خیالات کو سنجیدگی سے لیا اور مارکسی فکر میں کلیت کی تاریخیت کی رسائی کو ژن زین ازم کے نظریے کے حوالے سے مارکسی فکر کی گہرائیوں میں اتر کر کئی اعلیٰ ترین موضوعات کا انکشاف بھی کیا۔ یہاں یہ بات خاطر نشان رہے کہ گولڈ مین کے یہ تمام خیالات طبع زاد نہیں تھے۔ ۱۹۳۴ء کے شروع میں فرنز برکینو (Franz Brokenau) نے سترہویں صدی کے فلسفیانہ تناظر میں ایک کتاب لکھی جس پر توجہ نہ دی گئی اور ایک عرصے تک اسے نظر انداز کیا گیا۔ اس تحریر میں پاسکل کے حوالے سے کئی اہم باتیں کہی گئی تھیں۔ خاص طور پر بروکینو نے اس بات کا تاثر دیا کہ ژن زین ازم کے انقلاب کے پس منظر میں پاسکل کی معاشرے کی ضمنی آواز بن کر گونج رہا تھا۔ بحران کے اس دور میں الہیاتی منصب کے معاشرتی کردار کی بازگشت بھی سنی گئی۔

او سین گولڈ مین نے بروکینو کے انھی خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اشرافیائی طبقے Noblesse De La Roba کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ژن ژن ازم کی تحریک، ریسین کے المیاتی ناٹکوں، پاسکل کے فلسفے اور اشرافیاتی طبقے Noblesse De La Roba کے ذہنی ساختوں اور فکری حرکیات ایک جیسی ہیں ژان ژن ازم کی مذہبی فکر حقیقت کا المیاتی تصور ہے کہ فرد گناہوں میں لتھڑا ہوا ہے اور ایک ایسے خدا کے تصور میں معلق ہے جس کا عالم انسانی میں وجود نہیں ہے۔ خدا اس دنیا کو چھوڑ چکا ہے لیکن بندوں پر اپنا تحکمانہ اقتدار برقرار رکھے ہوتے لہٰذا فرد کے لئے یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ مغائرت کے المیے کو گلے لگائے۔ گولڈ مین کا کہنا ہے کہ پاسکل کی فکر اور اشرافیاتی طبقے کے ذہن میں یہی چھپے ہوئے ساختیے کار فرما تھے۔ انھوں نے اس المیاتی حرکیات کو معاشرتی حوالے سے پیش کرتے ہوئے اسے مخصوص قسم کا مارکسی رنگ دے دیا۔ ان کے بقول ژان ژن ازم اس اشرافیاتی طبقے کے نظریے اور احوال کو سمجھتی ہے کہ ان کی تمام کی تمام کشکش دربار (حکومت) اور رومن کیتھولکوں کے خلاف ہے۔ فرنس بروکینو کے ان خیالات کو گولڈ مین نے بڑی چابک دستی سے پیش کیا لیکن کہیں بھی جھوٹے منہ بروکینو کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ "پوشیدہ خدا" کی طرف موڑ دیا، خاص کر پاسکل کے نظریات کی جمالیاتی اخلاقیات اور اس کی مخصوص قسم کی مذہبی زندگی کو موضوع بحث بنایا گیا جو کہ انسانی نوعیت کا گروہی شعور بھی ہے۔ خاص کر پاسکل اور ریسین کا جدلیاتی تناظر مارکس انجلس اور لوکاس۔ کے تصور جدلیات سے کسی طور پر جدا نہیں جو بذات خود گولڈ مین کا جدلیاتی تصور بھی ہے جس میں چھپے ہوئے باطنی المیے جدلیاتی تصور سے مختلف ہیں اور جس کی باطنی طور پر پاسکل کے نظریات سے قریبی مطابقت ہے۔ اس مقام پر جدلیات اس بات کا احساس بھی دلواتی ہے کہ المیہ حقیقت کا ابتدائی (قدیمی) منجمد تناظر یا حقیقت کی جدلیاتی کلیت کی حرکیات بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

گولڈ مین کا فکری مطالعہ پاسکل کے خدا اور فرد کے تصور کی تناظی توسیع ہے کیونکہ پاسکل نے کہا تھا کہ خدا کا وجود ہے لیکن دنیا اخلاقی طور پر شیطانی ہو گئی ہے لہٰذا فرد دنیا میں نمایاں نہیں، فرد کا تعلق دنیا سے کٹ چکا ہے اور وہ باطنی خاموشی کی بھاری قیمت ادا کر رہا ہے۔ انسان اور فرد اس وقت تک قابل نفرت ہیں جب تک یسوع مسیح انھیں آزاد نہیں کروا لیتے

اس عمل میں خدا ثالث کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں گولڈ مین نے نہایت ہی فطانت سے حضرت عیسیٰ کے المیاتی ذہن کی معقول نامیاتی پیش کی ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی الٰہیات کا جدلیاتی تناظر سکونی اور بنجر قسم کا نظریہ ہے۔ گولڈ مین نے ان دونوں تصورات کو اصل تاریخی حوالے سے جوڑنے کی کوشش کی لیکن وہ پاسکل اور مارکس کی فکری یگانگت کو دریافت کر سکے۔

گولڈ مین بنیادی طور پر ادبی نقاد نہیں، لیکن ان کی کتاب Towards of Sociology of Novel ادبی عمرانیاتی نقطۂ نظر سے اہم تنقیدی کام ہے جو گولڈ مین کی مخصوص تنقیدی فطرت کا خاصہ بھی ہے کہ اس میں ساختیاتی حوالے سے تاریخی جدلیات کی مادیت کا تجزیہ کیا گیا ہے جو مارکسی نظریے میں فکر کی نئی جہت بھی ہے۔ جس میں بنیادی تصورات لوکاش کے اولین مارکسی نظریات سے لئے گئے ہیں۔ ان تصورات میں لوکاش نے اپنی فکری جدلیات کی عمارت کھڑی کی ہے۔ عمرانیات کی یہی فکری کلیت جہاں مارکسی فکر سے مغائرت کا احساس دلواتی ہے تو دوسری جانب سکہ بند مارکسیت کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے، جس پر فریک فرٹ دبستان کا بھی خاصا اثر ہے۔ لوکاش نے حرکیاتی ساختیے کے ناطے سے المیے اور ناول کا جو تصور دیا وہ دنیا میں بسنے والے انسانوں کے لیے مکمل طور پر پیچیدہ ہے جس کو گولڈ مین نے اپنی مخصوص تحقیق و فکر کے بعد معاشرتی، معاشی اور سیاسی ساختیے کے تناظر میں نئے مفاہیم سے روشناس کروایا۔ گولڈ مین نے اپنی اس بحث میں لوکاش کے تصورات کو مباحث کے بعد فلسفے اور ادبیات سے جوڑتے ہوئے اس بات کی تحقیق کی کہ باطنی مطابقت معروضی قطعیت سے متعلق ہو جاتی ہے اور دنیا کا "تصور کائنات" بامعنی طور پر کائناتی ساختیے کی شکل میں ابھر کے سامنے آئے اور فہم دنیا کی تمام پیچیدگیوں او توانائیوں کو اپنی مٹھی میں لے لے۔ یہ دنیا درجہ بندی کے بعد ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ گولڈ مین کا خیال ہے کہ حقیقت کو گرفت میں لینے کے لیے تجربیت، عقلیت اور المیاتی تناظر کو مکمل طور پر ایک "کل" کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ ان کے خیال میں دنیا کے تناظر کی ہیئت، شعور کی ہیئت سے منسلک ہے جو کہ اصل میں معاشرتی طبقات سے اپنی جلوہ نمائی کرتی ہے۔ اور "تصور کائنات" ہمیشہ سماجی طبقات کا تناظر ہی ہوتا ہے۔

گولڈ مین کا "تصور کائنات" کا نظریہ بھی شکست و ریخت کے مراحل سے گذرا۔ اس نظریے پر شدید قسم کے اعتراضات ہوئے اور یہ کہا جانے لگا کہ یہ کوئی نظریہ نہیں ہے لہٰذا

گولڈ مین کو کہنا پڑا کہ ''نظریے کے جوہر میں جزوی سطح پر دروغ گوئی ہوتی ہے لیکن اس کے دوسرے رُخ پر دُنیا کا جو نظریہ ہوتا ہے وہ حقیقت کی سچی تصویر پیش کرتا ہے'' لیکن پھر بھی کئی کٹھن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر ''تصور کائنات'' کی فطرت کا باریک بینی سے تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ گولڈ مین کا خیال ہے کہ یہ فوری قسم کے تجزیاتی حقائق نہیں ہوتے لیکن کسی حد تک انھیں ساختیے کے تصورات کہا جاسکتا ہے جو کہ معاشرتی گروہوں کے درمیان سے ہی نشو و نما پاتے ہیں۔ ''تصور کائنات'' کی ادبی اور فلسفیانہ تجریدیت کے دروازے کھول کرنے فکری متن کو دریافت کرنا ہے، ان کا کوئی اپنا معروضی وجود ہوتا ہے مگر نظریات کا اظہاری وجود نہیں معاشرتی پرتوں کے اس جبر میں دلچسپی لیتا ہے جس کا تعلق اصل صورت حال سے منسلک ہوتا ہے۔ گولڈ مین ''تصور کائنات'' کے تصور کو اجتماعی گروہ کی ہیئت گردانتے ہیں جس میں وظائف کا عمل سیمنٹ کی طرح پختہ ہوتا ہے جو افراد کو ایک مرکز پر لاکر ''گروہ'' کی صورت دیتے ہوئے اجتماعی شناخت کے خدوخال کو ابھارتی ہے تو دوسری جانب ''تصور کائنات'' کا تناظر سماجی گروہ کے علاوہ سماجی طبقات کا بھی تصور ہے جو گولڈ مین کی نظر میں اس لیے اہم ہے کہ یوں ادیب کسی مخصوص سماجی طبقے میں رہتے ہوئے جو کچھ بھی لکھتا ہے وہ ہمیشہ ایک بڑی معاشرتی اور سیاسی تبدیلی کی خبر دیتا ہے۔

گولڈ مین نے اپنے اس تصور کی تشریح یوں کی ہے کہ محقق حادثاتی طور پر لازمی نکات سے علیحدہ ہوتا ہے اور کلی طور پر متن کے متعلقات کو ہدف بناتا ہے اور یہی امتیاز ''عظیم'' اور ''کم تر'' لکھنے والے کے فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ عظیم لکھنے والے کا عمل باطنی مطابقت کو پروان چڑھاتا ہے جس میں مفاہیم اور معنویت کل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، جس کا باطنی معیار (Criteria) تو ہوتا ہے لیکن خارجی عنصر کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ گولڈ مین کا کہنا ہے کہ ادبی عمل میں باطنی مطابقت ہی ''تصور کائنات'' کو دریافت کرتی ہے۔ یوں محقق مکمل طور پر مطابقت کے ساختیے کو اپنی گرفت میں لے پاتا ہے اس سے یہ مراد نہیں لی جانی چاہیے کہ گولڈ مین اپنی تنقیدی آزادی کو روایتی تنقید پر حاوی کردینا چاہتا ہے۔ ان کا ''تصور کائنات'' کا تصور جمالیاتی اصناف کے اسلوب، پیکریت اور نحو کا ضمیمہ نہیں بلکہ اس تصور کا بنیادی مقصد بنیادی طریقہ کار کے وہ پیمانے ہیں جن سے کلی طور پر متن کو سمجھا جاسکتا ہے۔

''تصور کائنات'' کا تصور ہی متن کے باطنی ساختیے کا تعین کرتا ہے یہی باطنی مطابقت ''تصور کائنات'' کو بیان کرتی ہے جو گولڈ مین کے تنقیدی ادبی نکات کو روایتی تنقید اور مثبتیت (Positivism) سے قریب ترین کردیتا ہے۔ گولڈ مین کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عمرانیاتی فلسفیانہ ادب کو اپنے مطالعے کا محور بنایا ہے جو ''تصور کائنات'' کے متن کو بیان کرتا ہے جس کی بنیاد انسانی صورت حال کی واجب الترک آگہی ہے جو کہ بنیادی معاشرتی وصف سے جڑی ہوئی ہے۔ گولڈ مین کے خیال میں کلاسیکل ناولوں میں فرد کے رشتے سے اشیا کے لب و لہجہ کو دریافت کیا جاتا ہے لیکن ژاں پال سارتر، کافکا اور روب گرے لٹ (Robbe-Grillet) کے ناولوں میں اشیا کی دنیا فرد کو ہٹانے کے بعد اپنا مکالمہ کرتی ہے۔

گولڈ مین کا تحقیقی نظریہ ''مطلق'' نوعیت کا ہے۔ انھوں نے اپنے اس نظریے کی عملی مثال جینیاتی ساختیات (Genetic Structuralism) کی اصطلاح کی صورت میں بیان کیا، جس کے حوالے سے سب سے پہلے متن کی کئی ساختوں کی نشاندہی کی گئی پھر انھوں نے تاریخ اور انسانی صورت حال کو معاشرتی گروہوں اور طبقات کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہوئے اس امر پر نظر دوڑائی کہ ''تصور کائنات'' کا اثر طبقات پر ہو کر مصنف کی تحریروں پر کس طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں متن اس بات پر زور دیتا ہے کہ تاریخ ایک طرح کا طریقہ عمل ہے۔ اس کی اس اسلوبیاتی رسائی سے معاشرتی گروہوں اور متن میں تجریدیت کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ طریقہ کار کا جوہر متن اور معاشرتی ساختیے (سماجی گروہ اور طبقات) سے عبارت ہے جو کسی طور پر مارکسی تجریدیت کے ''مطلق کل'' سے متاثر بھی ہے۔

گولڈ مین کا خیال ہے کہ ادب میں معاشرتی کلیت کا عنصر سب سے اہم ہوتا ہے جو آدمی کی فطانت سے کئی گنا بڑا ہوتا ہے۔ انھوں نے ثبوت کے لیے گوئٹے، بالزاک، فلابیر، کافکا، جوائس اور کامو کی مثالیں دی ہیں۔ خاص کر انھوں نے مالریکس (Malraux) کے فکشن اور ناول کے مابین تجزیہ کرتے ہوئے ان کی تحریروں میں سماجی طبقات اور گروہوں کی حرکیات کا تجزیہ کیا ہے کیونکہ ''تصور کائنات'' تنقیدی بھائی چارے کی علامت بھی ہے جو ان کی نظر میں کسی حد تک کمیونزم کی معتبر قدر بھی ہے۔ عقائدی نقطۂ نظر سے فکشن کی یہ دنیا غیر مساکی اور غیر معتبر بھی قرار پاتی ہے۔ کیا مالریکس (Malraux) کی کمیونزم سے وابستگی متوسط طبقے کی

صورتحال کو واضح کرنے میں کامیاب ہے؟ یہ سوال ہمیشہ اہم رہا ہے، جس کے بارے میں گولڈ مین کا ذہن صاف نہیں۔ کیونکہ اس سطح پر آئیڈیالوجی کے کئی سوالات سر اٹھاتے ہیں۔ اگر مارکسیت "تصور کائنات" کے حوالے سے انسانی حالت (Man's State) کی باطنی وحدت کا تذکرہ ہوتا ہے تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ اسٹالن کے "امید کے ایام" (Days of Hope) اور ہسپانوی خانہ جنگی کی متنازعہ تکنیک اور عسکری اصطلاحات کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ حکمت عملی اور اقدار کے مسائل نہیں ہیں لیکن مسائلی عنصر کی غیر موجودگی کامل طور پر "تصور کائنات" کو پیش نہیں کرتی لیکن پھر بھی ان میں "نظریہ حیات" (آئیڈیالوجی) کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس طرح کے حوالوں سے اسٹالن ازم میں اسی قسم کے تصورات کا سراغ ملتا ہے لہٰذا نظریہ آتا ہے کہ "تصور کائنات" نظریہ حیات میں تبدیل ہو کر لکھنے والوں کی تحریر کا حصہ بن جاتا ہے۔

گولڈ مین کی ساختیاتی بحث کا محور یہی ہے کہ مارکسیت ہی ساختیات کی اولین شکل ہے۔ مارکسیت کی جدلیات اگر عصری مکالمے کے حوالے سے دیکھا جائے تو دو مختلف صورتحال ابھرتی ہے جن میں پہلی صورت منثبیت کی ہوگی تو دوسری صورت غیر جینیاتی ساختیات کی۔ جس کو حاوی نظریہ بھی کہا جاسکتا ہے جو لسانی بنیادوں پر بعد ازاں نفسیاتی، تاریخی اور سائنسی حیثیت سے جانی جائے گی۔

گولڈ مین نے جہاں اپنی تحریروں میں ہیگل اور مارکس کی جدلیات سے بحث کی ہے وہیں پر انھوں نے اس تعلق سے ساختیے کے نکات کو بھی خلاصے کے طور پر بیان کردیا ہے۔

(۱) یہ ممکن بھی نہیں کہ بغیر معنویت اور وظائف کے ساختیہ کی تفہیم ممکن ہو

(۲) ساختیے وظائفی ہوتے ہیں اور وہ کائناتی نوعیت کے نہیں ہوتے آخرکار وہ انسانی زندگی سے متعلق ہو جاتے ہیں۔

(۳) ہیگل اور مارکس کے ساختیاتی تصور میں (الف) ماورائیت (ب) تکونیت (Genesis) کے دو نوعیاتی موضوعات سامنے آتے ہیں۔

التھیوزر (Althusser) نے مارکسی ساختیات کو اپنے نظریات سے مالا مال کیا، خاص کر انھوں نے لیوی اسٹروس اور دیگر ساختیاتی لکھنے والوں سے شدید اختلاف بھی کیا لیکن التھیوزر

کا بنیادی ساختیاتی نظریہ "سائنٹفک" روابط کا نظریہ ہے جس کو وہ "کثیر المعنویت" کہتے ہیں جو کہ تاریخی جدلیات کے تصور سے ہی پھوٹتا ہے۔ التھیوزر فرانسیسی فکر میں اس وقت ابھرے جب دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا تجربہ انسان کو ہو چکا تھا اور انسان نئے معاشرتی ڈھانچوں کے نظریاتی اور فکری پہلوؤں پر اپنے طور پر سوالات اٹھاتا رہا۔ انھوں نے مارکسی حوالے سے ساختیات کی فکر کے مادی عناصر کو نظریاتی فریم ورک میں پرکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی شخصیت پر لگی ہوئی ساختیات کی مہر کے منکر ہیں کیونکہ ساختیات ان کی نظر میں فرانسیسی اختصاصیت ہے لیکن مکمل طور پر کوئی فلسفہ نہیں ہے مگر التھیوزر کی فکر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے مارکسی اور ساختیاتی فکر کے درمیان "رابطے" کی ایک روش نکالی جس سے فکر کے کئی نئے سوتے پھوٹتے ہیں کیونکہ انھوں نے مارکس اور اینگلس کے نظریات کی تفہیم نو متن کی قرات کے ساختیاتی طریقہ کار کی روشنی میں کی۔ التھیوزر نے مارکسی نظریات کا سائنسی تجزیہ کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ مسائل کا جائزہ لیا پھر علم اور ادراک کو کام میں لاتے ہوئے مارکسی نظریات کی نئی تعبیرات پیش کیں جو کہ بعد میں تجربی مطالعوں میں بھی استعمال ہوتی رہی اور یہ تصور بھی کہ نظریہ حیات اور سائنس دو جداگانہ مظہر ہیں۔

مارکسی فکر میں علم اور ادراک کے نفوذ کا اثر التھیوزر پر اس طور پر ہوا کہ انھوں نے "ذاتی تنقید" کی راہ اپنائی۔ انھوں نے فلسفے کو اس قدر اہمیت دی کہ وہ اسے تاحیات انسانی امید کی آخری دوا تصور کرتے رہے، جس میں معاشرتی کشمکش کا نظریہ ان کی فکر کا بنیادی نکتہ قرار پایا۔ نظریاتی عملیات عموماً مخصوص قسم کا ساختیاتی عمل ہوتا ہے جو اپنے موضوع کو اپنے جبر اور مخصوص فکری فریم ورک میں رکھ کر پرکھتا ہے۔ لیکن یہ سپر ساختیے سے مکمل طور پر علیحدہ ہو کر ہی اپنی حرکیات کو جنم دیتا ہے کیونکہ سپر ساختیے کے مسائل اس کے کلیدی مسائل نہیں ہوتے لہٰذا ساختیات لسانی ضابطہ بن کر ابھرتا ہے اور اس کا اعلیٰ وظائفی استحقاق اشیا کو ایک ترتیب سے ہمکنار کرتا ہے۔ اگر سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اسٹالن کی ساختیاتی دشمنی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اسٹالن کے ایک روسی نقاد مرر (Marr) نے لسانیات کو نہایت ہی آسانی کے ساتھ سپر ساختیے کے ساتھ جوڑ دیا اور اسٹالن کی لسانی منطق اور لسانیات کے فطری مشاہدے کی سائنس کو انھوں نے ایک آزاد فلسفیانہ روش قرار دیا۔ گولڈنر (Goldner) نے

لکھا ہے کہ مر اور اسٹالن کے درمیان لسانی مغالطے غیر ضروری ہیں کیونکہ اصل میں یہ تمام مباحث ضوتی نوعیت کی تفہیمات ہیں جو کہ کلاسیکل مارکسیت کی طرف جاتی ہیں۔

التھیوز کی نظریاتی عملیات اصل میں سائنسی عملیاتی فلسفے (جدلیاتی مادّیت کا نظریہ) اور سائنسی آگہی کے درمیان کا نظریہ ہے لیکن پھر بھی ان کے یہاں اوراکی ضویت کا تصور ملتا ہے، پیداواری آگہی کو وہ آگہی سے علیٰحدہ کر کے اپنی جداگانہ شناخت بناتے ہیں۔ یہ عمل "اختتام" اور ابتدا کے مراحل کے بغیر ہوتا ہے۔ التھیوز نے معروض اور موضوع کے روایتی اختلاف پر بھی نظر ڈالی ہے اور تمام ان اوراکی مباحث کو رد کیا جس کی رو سے معروض اور موضوع کا تفاعل تجربی، عملیاتی، اراوی، عینیت پسندی اور مشابہتی نوعیت کے خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ بقول آلتھیوز اس صورحال میں موضوع کے طریقہ کار کی تجرید معروض کے جوہر میں تبدیل ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے مزاج میں خالصتاً نظریاتی ہوتی ہے۔ عینیت پسندی کے حوالے سے خارج اور باطن کی تفریق نظریے میں مسائل کھڑے کرتی ہے لیکن آگہی کی تفہیم معروض کی ذات میں اصل معروض ہوتی ہے اور تناقضی نقطہ نظر سے یہ ادراک کی حقیقت پسندی سے قریب تر ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے پر معروض کی عملیات کے جوہر کو تصور کرنے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے، وہ انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نطقہ نظر سے اہم ہوں، اصل چیز پیداوار سے آگہی ہوتی ہے جو معروض ہونے کے ساتھ ساتھ سائنسی طریقہ کار سے بھی متعلق ہوتی ہے۔

سامر نے "نشان" کا جو تصور دیا وہ اصل میں معروض و موضوع کی ضویت کے مسئلے کی حساسیت کو کم کرنے کا عندیہ تھا اور معروض سے قریب رہتے ہوئے "تصور نما" اور "معنی نما" کی اصطلاحات کو جنم دیا۔ قریب قریب انھیں راہوں کو اپناتے ہوئے التھیوز نے معروض و موضوع کی وحدت کا ایک وسیع نظریاتی عملیاتی چھتری کے نیچے آکر تجزیہ کیا۔ اس فکری بغاوت نے ان پر عینیت پسند کی مہر بھی چسپاں کر دی۔ معاشرتی سائنس کا وصف بذات خود وجودیاتی جبر اور تاریخی ارتقا کا سبب ہوتا ہے لیکن اس کو مسائلی نہیں کہا جاسکتا زبان کا تاریخی تصور نظام کے رشتوں سے ترتیب پاتا ہے جس میں معاشرتی اور تاریخی ترجیحات سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں جو زبان کی سرگرمیوں کو عروج تک پہنچاتی ہیں لیکن

التھیوز نے نہ جانے کیوں کبھی کبھار ادراک شکنی کرتے ہوئے اسے اپنی فکری عملیات میں جگہ دینے کی کوشش کی لہٰذا ان کے یہاں عملیات اور انحراف حقیقی منطقی توجیہات بن جاتی ہیں جو فکری عملیات میں مغالطوں کے تصور کی نشاندہی کرتے ہوئے غیر محسوس طور پر معروض کے حقیقی، تاریخی تصور کو ابھارتے ہیں (کیونکہ ان کے نزدیک موضوعی تصور سائنسی تصور کو دھندلا دیتا ہے) جبکہ معروضی تصور آزاد ہونے کی علاوہ سپر اسٹرکچر کو تشکیل دیتا ہے۔ حقیقتاً یہ تصور کلی طور پر مارکسی نہیں ہے۔ خاص طور پر انسانی شہوانیت اور مشتبہ انقلابی سرگرمیاں — لیکن اداروں کی ہیئت اور ان کی پیداواری سرگرمیاں مارکسی تصور کا قریب ترین فکری نکتہ ضرور ہے۔

التھیوز کے یہاں معروض کی آگہی کا تصور ساختیاتی فکر سے جنم لیتا ہے اور ان کے بقول سائنسی تصور عمومیت کی سطح سے جنم لیتا ہے۔ ان کی نظر میں سائنسی آگہی نظریہ حیات کے دائرے سے باہر ہوتی ہے۔ نظریہ حیات موضوعیت سے عبارت ہوتا ہے جبکہ سائنس کا موضوعی اور باطنی عوامل سے کوئی سروکار نہیں، بہرحال سائنس کی آگہی تصورات سے ہی تشکیل پاتی ہے۔ تصورات اور نظریہ حیات سے مدلل بیان کو بنیادیں فراہم ہوتی ہیں جو اصل میں موضوع شکنی ہوتی ہے جو اس قابل ہوتی ہے کہ نظریہ حیات پر بھی ناقدانہ مکالمہ کر سکے جس کا معاشرتی تعاملیت کے تجربی نمونوں کے حوالے سے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ افراد اور گروہوں کے آپسی تفاعل سے بحث کرتے ہیں جو کہ انسانی آبادیات کی تقسیم اور انسانی اجتماعیت سے متعلق ہوتی ہے لیکن ساختیے کے مزاج کو سمجھنے کے لیے کہ ساخت کی معنویت پر تخلیقی اور فکری سطح پر گہری گرفت ہو جس کی مدد سے قبل سائنسی عہد اور نظریاتی مواد کا تجزیہ نظریاتی عملیات کے حوالے سے کر سکتے ہیں اور ہمارے فکری تصورات یوں سائنسی تصورات میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ہیگل کی کلیت اصل اور ابتدائی جوہر ان مبالغوں اور دروغ گوئی سے پردہ کشائی کرتے تھے جو معروضی تاریخ کے پس منظر سے ہیں اور ساختیہ اپنی جگہ مرکز پر ہی ساکت رہتا ہے مگر ہیگل اور مارکس کی کلیت میں زمین آسمان کا فرق ہے، کلیت کا یہ تصور خاصا پیچیدہ بھی ہے وہ "کلی" سطح پر آکر اپنا تصور ادا کر دیتا ہے لیکن کلیت میں جو دیگر نظام اور اس کے کئی حصے شناخت کیے جا سکتے ہیں اس کو یہ تصور بیان کرنے

سے قاصر ہے خاص طور پر ہیگل کی "کلیت" کے تصور میں جوہر کے پس منظر میں کئی مظاہر پوشیدہ ہیں جبکہ مارکس کی "کلیت" میں لامرکزیت کے ساختیے کا گہرا اثر ہے۔ پھر بھی اس عالمانہ بحث میں (اگر یہ عقائدی نہ ہو!) مارکس کی کلیت ساختیاتی ہے تو ہیگل کی فکر تاثراتی نوعیت کی ہے۔

التھیوز کے یہاں "کثیر المعنویت" جن مسائل سے جنم لیتا ہے اس کے پس منظر کی وظائفی نوعیت کے ساختیاتی نکات بھی دریافت کئے جاسکتے ہیں۔ گوڈالیر (Godelier) نے لکھا ہے کہ "اداروں کو ابتدائی ساختیے اور اعلیٰ ساختیے کی بنیاد پر ممیز نہیں کیا جاسکتا، ان دونوں تصورات میں وظائفی نوعیت کا تفاوت ہے۔

التھیوز نے فکری سطح پر اس بات میں بھی پہل کی کہ ہیگل اور مارکس کی جدلیاتی فکر میں ان دونوں کی شراکت (حصے) کو متعین کیا جائے اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تصورات کی تاریخ میں داخلی مغالطے ہی اصل محرک ہوتے ہیں لیکن ہیگل کی تاریخ کے فلسفے میں یہ ردِ عمل داخلی سطح پر بہت ہی منفرد طور پر نمایاں ہوتا ہے جبکہ مارکس کے یہاں تاریخ کا تصور کسی روحانی جوہر کا اظہار نہیں کرتا، پھر بھی مارکس کے تصور جدلیات میں اقتصادیات، سیاسیات، آئیڈیالوجیز ہر سو نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں مارکسی تصور کا میدان "معاشرتی کلیت" کی صداقت سے عبارت ہے جس میں کئی وراثتی واہمے کے موضوعات ابھرتے ہیں اور ان کا غالب ساختیہ جنم لیتا ہے یہ مارکس کی جدلیات میں معکوسی طور پر سفر کرتے ہوئے ہیگل کی جدلیات سے جدا ہو جاتا ہے اور یوں انسانی جزیں معاشی احوال میں مقید ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ فکری سطح پر مارکسی خیالات کے خلاف کوئی سخت گیر قسم کا فکری ردِ عمل نہیں تھا بلکہ وہ ہیگل کی جدلیات کے معروضی تناظر کو تبدیل کرنا چاہتے تھے یہی معروضی ردِ عمل ان کی فطرت کی تبدیلی کا خواب بھی تھا لیکن التھیوز کے یہاں ہیگل شکنی کچھ زیادہ ہے۔ انھوں نے مارکسی فلسفے کے حصار میں رہ کر ہیگل کی فکر کو رد کر دیا اور تاحیات اس بات پر بحث کرتے رہے کہ مارکس کا اصل کارنامہ ہیگل کو رد کرنا ہی ہے۔ انھوں نے ہیگل کی کلیت اور اس سے منسلک فکری نکات کو بھی تشکیک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے مارکسی نظریات میں ہیگل کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش پر بھی شدید برہمی کا اظہار کیا۔

التھیوز کے کئی نظریات کے باطن میں آئیڈیالوجی کی کئی پیچیدگیاں موجود ہیں جن کا قریبی ارتباط کا تناظر عمومی طور پر معاشی نظام میں اور بالخصوص سرمایہ دارانہ نظام میں نظر آتا ہے۔ اس کے بنیادی جوہر اور بنیادی وظائف اشیا میں التباس کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ التھیوز کے نزدیک آئیڈیالوجی ذات کی سحر انگیزی کا طریقہ عمل ہے جو ایک سطح پر آکر "اجتماعی شعور" یا مخصوص قسم کی فکر کو ابھارتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ التباس کا عمل یہاں نمایاں ہو کر ابھرے لیکن یہ ضرور تصور کیا گیا ہے کہ التباس نظام کی عملیات کو اپنے طور پر پیش کرتا ہے لہٰذا ان کے یہاں نظریات کی حرکیات اور ضروریات انسان کی اصل صورتحال اور وجود میں کسی قسم کا رابطہ نہیں کرپاتیں لیکن پھر بھی انسانی حوالے سے "صورتحال" اور "وجود" کا تصور خاصا واضح ہو جاتا ہے لہٰذا نظریہ حیات شروع سے ہی باطنی شعور سے قریب رہتے ہوئے بھی اپنے طور پر سچائی کو بیان کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہنری لوفے (Henri Lefebvre) بھی بنیادی طور پر ادبی نقاد نہیں ہیں۔ انھوں نے ساختیات کے شروع کے دنوں میں ہی لیوی اسٹروس اور التھیوز پر شدید قسم کے اعتراضات کئے۔ انھوں نے مارکس کے ایام جوانی کے فلسفیانہ ذہن سے اپنے فکری نظام کو ترتیب دیا، وہ مارکس کے تاریخی تناظر اور وجودیت کے موضوعی تصور سے خاصے متاثر بھی ہیں۔ اس نے خاص کر مارکسی نظریہ مغائرت کو "فردِ کل" تسلیم کر کے اسے مرکزی حیثیت دے کر اس بات کو باور کرانے کی کوشش کی کہ مارکسی تصورات نظریاتی اور عملیاتی وحدت ہیں۔ فرانسیسی مارکسی فکر میں لوفے دیگر اہلِ فہم سے خاصے مختلف اس طور پر دکھائی دیتے ہیں کہ انھوں نے مارکسیت کی جو بھی توجیہات پیش کیں وہ نہایت ہی متوازن ہیں۔ لوفے نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۵۸ء تک فرانسیسی مارکسیت کی گوناگوں حالت اور فکری سطح پر اہلِ فکر کی ناقابلِ فہم جدلیات میں نیا فکری رنگ بھرنے کی کوشش کی اور لینن کے عروج و زوال پر نظر ڈالی اور وہ "طفیلیت" بھی کہلائے، باوجود کٹر مارکسسٹ ہونے کے بھی ان کی کلاسیکل ادب، جرمن زبان، عمرانیات، سیاسیات اور تنقید پر گہری نظر ہے۔ انھیں مارکس سے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا لیوی اسٹروس مارکس کو پسند کرنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیوی اسٹروس نے لسانیات کو اپنی ساختیاتی فکر میں اہم جگہ دی جبکہ لوفے نے اس کے سیاسی متعلقات سے بحث کرتے ہوئے اپنے فکری

ڈسکورس (مدلل بیان / مخاطبے) میں زبان کی ایسی حالت کی جانب اشارہ کیا جہاں زبان ''فیصلے'' کی زبان بن جاتی ہے جس سے نتیجتاً غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ سیاسی اور نظریاتی آگہی کا ارتباط مارکسی۔ لیفی وحدت ہے جو باطنی اور علامتی معنویت سے بھرپور ہوتی ہے لیکن جب پارٹی کے اہلکار ریاست کا نسق و ضبط چلاتے ہیں تو ان کی زبان کا ذخیرہ الفاظ سائنسی نوعیت کا ہو جاتا ہے جس کا اثر اعصاب اور بدیعیات پر بھی ہوتا ہے جسے وہ سرمایہ دارانہ پروپیگنڈہ کہتے ہیں جو ان کی نظر میں سوشلزم سے بے وفائی ہے۔ ان کا یہ ردّ عمل غالباً اس بات کی توسیع ہے کہ ساختیاتی لسانیات کا نظریہ نئی معنویت کا ڈسکورس ہے۔ اگر ساختیات کی درجہ بندی کے بعد کوئی نظریہ مقام پاتا ہے تو وہ مارکسزم ہے، وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ مارکسیت کی اعلیٰ قدریں کاملاً ساختیاتی ہیں۔

لوفے نے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ کارل مارکس کے طبع زاد تصوراتی پیمانے (Tools) طرز نوع کا ایسا انعکاس ہے جو کہ تنقید کے عمل سے ترتیب پاتا ہے۔ مارکس ارسطو کے نظریہ فکر سے خاصے متاثر تھے لہٰذا انھوں نے ارسطو کی طرح حرف عطف کو طعن رمز کی مدد سے بیان کرنا چاہا حالانکہ انھیں خود یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا شہر کس جانب جا رہا ہے پھر بھی انھوں نے معاشرتی اور سیاسی عملیات کو اپنی تحریروں میں متعارف کروایا۔ ارسطو کی تحریروں میں طعن رمز ہی ان کی فکر کو ڈھانچا فراہم کرتا ہے۔ لوفے نے لکھا ہے کہ ارسطو کے افکار اس لئے ردّ ہوتے رہے کہ وہ سچائی سے مالا مال تھے اور اہل اقتدار ان کی صداقت سے خوفزدہ رہتے تھے، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی جماعت (پارٹی) سے متعلق نہ تھے لہٰذا لوفے نے ارسطویائی فکر کے حوالے سے فرانس کو نوعیت پسندانہ ارسطویائی اتھینز کی صورت میں دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اپنے اس سیاسی خواب کی تعبیر نہ پاسکے جو انھیں اشتراکیت کی صورت میں نظر آتے تھے۔ کیونکہ بقول ان کے ''معاشرہ سیاست دانوں کی داعیہ ہے'' جن کی عنان سیاستدان اور فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں میں ہے۔

ان کا سومیاتی فلسفہ پھیل کر فکری ساختیاتی سرحدوں میں داخل ہوتا ہے اور ساختیاتی فکر کی یہ فضا ترتیب وارانہ انداز میں پھیلتے ہوئے ''آزاد تلازمے'' میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انھوں نے ساختیاتی افکار کو قبول کیا لیکن اس کے طریقہ کار سے اختلاف کرتے ہوئے یکدم

ہیگل کی طربیات اور مذہبی طعن رمز کو بیان کرتے ہوئے اسٹالن کے سیاسی عقائد کی شدت سے اصطلاحات، فرہنگ اور قواعد کی جو اشاعت ہوئی اس نے الفاظ سے جذبات چھین کر کئی اصولوں، مسائل اور عملیات کو جنم دیا۔ یوں اصل ابلاغ پنپ نہ سکا ان کے خیالات پر باختن کے تصورات کا ہلکا سا عکس بھی پایا جاتا ہے۔

لوفے ہیگل کے افکار کی عدم آگہی کے سبب ساختیاتی وصف کی آگہی نہ ہو سکی اور نہ وہ ساختیاتی رنگ کو سمجھ پائے۔ انھوں نے ساختیات پر جس قسم کے اعتراضات کئے وہ بنیادی طور پر ساختیاتی فکر کا قدامت پسندانہ رنگ ہے۔ انھوں نے ساختیے کے کامل نظریے سے اپنی بحث کا آغاز کیا اور کئی سوالات اٹھاتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ لسانیات کس طرح عہد عصر کے افکار، فلسفہ، ادب، معاشرتی علوم اور فنون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سارتر اور میرلیو پونٹی کی بحث کو بھی حوالہ بنایا اور بتایا کہ ساسر زبان کو ''نشان'' تصور کرتے ہوئے اس بات کا تاثر بھی دیتے ہیں کہ ہیگل کی فکری نفی ہی وجود کا حصہ بنتی ہے جبکہ سا سر کے نظریات سے وہ کاملاً متفق نہ ہوتے ہوئے ان کے افکار کی تصدیق کر دیتے ہیں لیکن تحریر و زبان کی مبادلیات کے مثبت عناصر اور پہلوؤں کو تسلیم کرتے ہوئے نطشے کے اس خیال کی تصدیق بھی کر دیتے ہیں کہ فرد اقدار میں مادّی اشیا کو داخل کر دیتا ہے جیسے لسانی اصطلاح میں خواہ مخواہ ''تصور نما'' اور ''معنی نما'' کا تصور وضع کر دیا گیا جو مارکس کی نظر میں قول محال ہے۔

لوفے نے مارکس کے ''سرمایہ'' سے یہ ہمیشہ اخذ کیا ہے کہ ''معنی نما'' اور ''تصور نما'' کا ایک مقامِ اتصال ہے جو حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے حقیقی تعلق کا بھی حامل ہوتا ہے۔ جدلیاتی معنوں میں یہ حقیقی وظیفہ ''مطلق منطق'' (وساطت کے معنوں میں) جب حتمی طور پر اور ''وثوق'' سے کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس میں ابہام در آتا ہے اور درمیان میں آ جانے والا تصور (مطلق منطق صوری نوعیت کے عنصر کو اُبھارتا ہے لہٰذا یہی وجہ ہے کہ بوڈریلارڈ (Baudrillard) اور دیگر ہیگلین عمرانیات دان لوفے کے جدلیاتی تصور کو ردّ کرتے ہیں کیونکہ یہی الجھا طبقاتی کشمکش میں تصادم کی نوعیت کو اصل اور صوری ڈھانچہ فراہم کر دیتے ہیں جن میں طبقاتی کشمکش جلد یا بدیر انقلاب کے سرخرو ہونے کا یقین دلاتی

ہے۔ بوڈریلارڈ یہ چاہتے ہیں کہ جوہر اور ہیئت کے اختلاف کو برقرار رکھا جائے اور یہ دلیل دی کہ ہیئت کی ماتحتی جوہر کے بغیر مرکز سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاتی ہے لہٰذا انھوں نے لوفے کی جدلیاتی منطق پر اعتراض کرتے ہوئے اسے "بے قوت" اور "ناقص" قرار دیا کیونکہ یہ علامتی سمتوں کو اپنی بحث میں شامل نہ کر سکیں کیونکہ سمتیں اور جہات ہیئت کے اختتام تک وظائفیت سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔

لوفے نے جواز کی تمام جہتوں سے اختلاف کیا جن میں ساختیات سرفہرست ہے۔ ان کے خیال میں ساختیات مارکسی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے انھوں نے ساختیات کو عہد حاضر کی فکری پیداوار قرار دیتے ہوئے اسے سپر اسٹرکچر کا حصہ بتایا جو کہ بورژوائی ثقافت کی پیداوار ہے۔ انھوں نے زبان و لسان کے ان تناقصات کی نشاندہی کی جو کہ فلسفیانہ حوالے سے جدید افکار میں شامل ہوئے لیکن انھوں نے لیوی اسٹروس کے نظریات کو محدود معنویت میں، تجزیہ کیا کیونکہ ان کے بقول اسٹروس کے لسانی مرکبات اور معاشرتی صداقت کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ لوفے ساختیات کی نئی زمانی سمتوں کے سلسلے میں خاصے فکرمند ہیں، خاص کر ماضی اور حال کے درمیان ایک تیسری انجانی سمت کو وہ دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ وہ مارکس، ساسر، ہوسرل کے برعکس جیکب سن اور اسٹروس کی لسانیات اور نشانیات میں تخفیف کر دیتے ہیں اور وہ حقیقتاً معاشرتی اور سائنسی لسانیات کو ایک دوسرے سے ممیّز نہ کر سکے۔ زبان کے زمانی تاریخی تصور کو وہ اختلاف کا اتصال کہتے ہیں۔ انھوں نے اختلاف کیا کہ شعور اور افکار کم درجے کی چیزیں ہیں جو کہ تخفیف سے مشابہ ہیں جیسا کہ ہاریو ہندی (Jiraro Indian) (ہسپانوی میں J کو H پڑھتے ہیں) قبائل کا شعور بیسویں صدی کے شعور سے کسی طور پر کم نہیں۔ یہاں یہ بات انھوں نے خاصے وثوق سے کہی ہے۔ پھر بھی ایک چھوٹا سا قدم جو تخفیف کی سائنس سے جنم لیتا ہے اسے لغت اور بکوان کی صوتیات کے حوالے سے سمجھا جاتا ہے۔ لیوی اسٹروس نے بررورو (برازیل کا ہندی قبیلہ) پر جو تحقیق کی ہے اس سے نہ تو قبیلے کو کوئی اعزاز بخشا گیا اور نہ ہی اس کی ہتک کی گئی ہے اور نہ انھوں نے اپنے اس تجزیے میں تاریخی جہتیں لگائی ہیں۔ لیکن احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ سائنسی تصورات کی ہیئت اور وظائف اور ساختیے کو فراموش کر گئے کیونکہ وظائف

کی مشابہت مختلف ساختوں سے متعین ہوتی ہیں۔ بہت سی ہیئتیں مختلف وظائف کے تجزیے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔

ساختیے کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس کی حدود متعین ہوتی ہیں جبکہ ساختیات کے ساتھ ایسا ممکن نہیں۔ اندرے مارینٹ (Andre Marinet) نے جیکب سن کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ آفاقی دوہریت کا صوتیاتی اختلاف اپنی جگہ مسلّم ہے مگر یہ ذہن کا تناظر ہوتا ہے۔ لوفے نے سب سے زیادہ اعتراض ساختیات کی تین سمتوں پر کیا جہاں وقت چوتھی سمت ہو سکتی ہے جو بارتھ کے یہاں سفید مکان (White Space) کا تصور بھی ہے۔ بارتھ کے اس خیال کو لوفے نے محدود کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اصل قسم کا سفید یا عین سفید کیوں نہیں؟! انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ معاشرتی حقیقت یا اصلیت کی کبھی بھی زبان کی وساطت سے تشریح نہیں کی جا سکتی اور لیوی اسٹروس علامتیت اور علامتی کائنات اور منظم علامتی نظام کو نظر انداز کر گئے جو فرد کی ثقافتی تصوریت اور پیکریت سے عبارت ہوتا ہے۔ انھوں نے علامتی نظام کو تین سمتوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) عمودی جہت (Paradigamic)

(۲) علامتی (Symbolic)

(۳) نحوی (Syntagmtic)

یوں انھوں نے ایک زاویے سے لیوی اسٹروس کے لسانی نظریات کو کشادگی دینے کی کوشش کی تو دوسری جانب وہ لیوی اسٹروس کے ساختیے کے تصور کو کلی طور پر رد کرتے ہیں اور قریب قریب اسی طرح بارتھ پر تنقید کرتے ہوئے ان کے ادبی ساختیاتی تصور کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ ان کا بارتھ پر سب سے بڑا اعتراض زبان کے مسئلے پر تھا۔

لوفے کے بقول ادیب اور فنکار زبان کے تعلق سے تقسیم ہو جاتے ہیں یا ان کی درجہ بندی کر دی جاتی ہے اور یوں ڈسکورس کا التباس اُبھرتا ہے یا مصنوعی بدیعیات میں اسے تلاش کیا جاتا ہے اور ڈسکورس کے محدود پن کا احساس شدید ردعمل کی صورت میں اُبھرتا ہے جو کلی طور پر فنون کے بطن سے پھوٹتا ہے جس میں زبان، موسیقی اور پلاسٹک آرٹ بھی شامل ہیں۔ یوں نئی اساطیر اور علامتیں وجود میں آتی ہیں جو ان کی نظر میں یہ ڈسکورس صفر ڈگری

(Zero Degree) کا لفظ ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات قارئین کو تذبذب کا شکار کر دیتی ہے کہ وہ یہاں احتجاج کر رہے ہیں یا نظریاتی علیحدگی کا عندیہ دے کر ان دونوں تصورات کے درمیان خط امتیاز وضع کر رہے ہیں۔

وہ لوسین گولڈ مین کے نظریات سے خاصی حد تک متاثر ہیں۔ پاسکل کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے وہ عیسائیت کا نشانہ بنے۔ ژان ژن ازم، بورژوائی اور شاہانہ طبقے کے بھی شکار ہوئے۔ وہ بارتھ کی ''تفریحی لسانیات'' پر ماتم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ان کی فیشن ایبل مارکسی علامتیں ادب اور معاشرتی تنقید کو کسی حد تک پسند کرتی ہیں۔ وہ فوکو کی تاریخی آگہی کی تحریر نو کو یکسر رد کرتے ہوئے ان کے تاریخی نظریات کو ناقابل فہم قرار دیتے ہیں کیونکہ اس میں وہ ''تصادم'' کے تصور کو فراموش کر گئے۔ انھوں نے فوکو کے لاشعوری ساختیے اور لاکان کے نظریات پر نظر ڈالی ہے لیکن وہ اس سچائی کو نظر انداز کر گئے کہ معاشی مادیت ہی فکر کو کنٹرول کرتی ہے یعنی لاشعور کا ذہنی ساختیہ معاشی بنیادوں پر استوار نہیں ہوتا۔ یوں انھوں نے مارکس کے سپر اسٹرکچرل تصور کے برعکس موضوعی تجزیے کو اہمیت دی۔ اس روایت پسندانہ ذہن کی وجہ سے ان کے انقلاب کے درمیان بہت سی رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں۔

الین ٹورین (Alain Tourain) بحیثیت ایک سوشلسٹ کے معروف ہیں لیکن انھوں نے فرانس میں ساختیاتی مکالمے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ساختیات کے اہم مسائل پر اپنی مخصوص رائے دی۔ وہ بنیادی طور پر صنعتی عمرانیات داں ہیں۔ ٹورین نے فرانس کے صنعتی محنت کشوں کی صورت حال پر تجربی نوعیت کی تحقیق کی۔ فرانس میں ۱۹۶۸ء کی طلبا اور محنت کشوں کی فکری بغاوت سے کچھ دن قبل انھوں نے معاشرتی تحریک کے ایک مطالعاتی مرکز کی بھی بنیاد رکھی۔ وہ اس ادارے میں پروفیسر ہوئے اور یہاں ان کے حسی شعور نے ان پر یہ بات منکشف کی کہ عمرانیات وہ واحد معاشرتی سائنس ہے جو ساختیات کو مسترد کر سکتی ہے۔ ان کے خیال میں ساختیات کی مروج ہیئت اپنے مخصوص ماحول میں رہتے ہوئے یکسانیت کا شکار ہو گئی ہے جس سے اس کی ''عمرانیات'' کو کسی حد تک نقصان ہونے کا خدشہ نہیں۔ جب تک حکمران طبقہ اور اس کے حاوی نظریات اعتدال پسندانہ روش اختیار نہیں کرتے، یہ اس وقت ہی ممکن ہے جب انسان کے اندر کا دیوتا نہیں مر جاتا یا عمرانیات کا اس وقت تک کوئی وجود

نہیں جب تک اس کا معاشرے میں سراغ نہ لگا لیا جائے اور اس کے نظام میں اندرونی سطح پر تاریخ کی پیمائش نہ کر لی جائے۔ اس قسم کی اہلیت عمرانیات اپنے آپ خود پیدا کر لیتی ہے جو آخر کار ٹورین کے یہاں تاریخیت اور عمل کے فکری مسائل اٹھاتی ہے جو معاشرتی زندگی سے متعلق ہیں وہ اس کی نئی عملیات کو مخصوص ثقافت میں روبہ عمل دیکھنا چاہتے ہیں جو کہ اس کے طبقاتی رشتوں سے جڑی ہوئی بھی ہو۔ وہ فوکو کی طرح آگہی کے عمل کو توڑنا چاہتے ہیں مگر فیصلے کے مزاج کی تہہ میں اتر کر پیداواری اقسام سے اپنا بچاؤ بھی کرتے ہیں لہٰذا انھوں نے رکیوع کے مابعد فلسفہ اور معاشرتی مسائل کے خیالات کو رد کر دیا کیونکہ معاشرتی مسائل ''معنوں'' کے تصور پر بھی تنقید کی کہ پیداوار تو کا حاوی نظام اور معاشرتی تعارض کے تخلیقی پہلو سے نظریں چراتا ہے حالانکہ وہ لیوی اسٹراس کے ثناخواں ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اسٹراس کا ''اسطوری'' نظریہ غیر استدلالی اور غیر عقلی ساختیات ہے جو ٹورین کے ساختیات تصور یا بند قسم کی معاشرتی آگہی کا نظام ہے جس کو ماہر عمرانیات مشاہدہ کرتا ہے اور یوں جس میں مارکسیت، ساختیات اور وظائفیت اور بہت سے نفسیاتی نظریات شامل ہو جاتے ہیں۔

ٹورین کے یہاں وجودیت (انسانی) اور امریکی عقل پسندی (جس میں انسان کا اصل معاشرتی وجود ممکن ہے) کیا عمل کیمیائی بہت نمایاں ہے لیکن ان کے یہ خیالات ان کے مسائل اور ان کے منصوبوں کی شکل میں اُبھرتے ہیں جو استدلالیت اور تجربی عمرانیات کے ساتھ عینیت پسندی اور منطقی فلسفے کو تجریدیت کی نئی سطح پر لے آتے ہیں، جسے بہت کم لوگ سمجھ پائے ہیں اور تصور کی اسی عمل کیمیائی میں وہ ماہر عمرانیات کے روپ میں سامنے آتے ہیں اور نظام کی تشکیل نو کرتے ہوئے معاشرتی عمل کی ممکنہ طور پر غیر معین تعریف بھی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ان پر ٹالکورٹ پارسنز کا بہت ہلکا سا اثر ہے۔ خاص طور پر ان کے سماجی عمل اور ساختیاتی وظائفیت کے تصورات کا ٹورین نے تھوڑا سا اثر ضرور قبول کیا جو اصل میں لیوی اسٹراس کی درجہ بندی کا تصور ہے جس میں رشتوں کا وجود صورت حال کے پس منظر میں روبہ عمل ہوتا ہے جو اپنا اختتام عمرانیات پر آ کر کرتا ہے۔ ان میں طبقاتی اثرات، مراتبیات کے رشتے سب سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ وہ فوکو کی رسائی کے متوازن بھی چلتے ہیں۔

فریڈرک جیمسن شمالی امریکہ کا سب سے اہم مارکسی نقاد اور ادبی نظریہ داں ہے۔ اس کی

تحریریں اس صدی کی پانچویں دہائی کے آخر میں منظرِ عام پر آنا شروع ہوئیں اور ساتویں اور آٹھویں دہائی میں ان کی نظریاتی و تنقیدی تحریروں نے دنیا میں دھوم ہی نہیں مچائی بلکہ وہ اپنے عہد کے سب سے اہم مارکسی نقاد اور نظریہ دان کے طور پر بھی معروف ہوئے۔ جیمس امریکی فضا میں اس وقت نمودار ہوئے جب وہاں مارکسیت کی فکری قوت نئے مطالبات کے ساتھ اُبھر کر نظریاتی اصول کے مظاہر کو امریکی حسیت سے متعارف کروا رہی تھی۔ انھوں نے امریکہ کی تبدیل ہوتی فکری فضا میں نئی مارکسی حسیت کو اعتبار ہی نہیں بخشا بلکہ یورپی تصورات بالخصوص ساختیات اور مارکسیت کو مارکسی حوالے سے مضبوط فکری تناظر عطا کرتے ہوئے کئی متوازن مبارزت کی۔ اور کئی متبادل فکری رسائی کو امریکی فکر سے روشناس کرایا۔ خاص کر ۱۹۶۰ء کے بعد سے انھوں نے کئی روایتی فکری نظام ہائے فکر کا مطالعہ کرنے کے علاوہ تدریس آگہی اور علم و فراست کی مدد سے کئی ثقافتی اور سیاسی مباحث کو چھیڑا۔ انھوں نے ژاں پال سارتر، ٹی ڈبلیو آڈرنو (Adorno)، والٹر بینجمن (Benjamin)، ارنسٹ بلاچ (Bloch) اور جارج لوکاش (Lucas) کے جدید نظریات پر بحث کی بعد ازاں وہ فرانسیسی ساختیات کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے ساختیاتی طریقہ کار کو اپنے مطالعوں میں جگہ دی جو کہ مارکسی تفہیمات کے دائرے میں مقید تھی لیکن انھوں نے تاریخی استدلال کو وظائف کے ساتھ مطالعہ کرتے ہوئے ثقافت کے "جدید پن" کی تفہیم کی جس کو آج ہم "پس جدیدیت" کے نام سے جانتے ہیں۔ کیونکہ معاشرتی مظہر کی آگہی نظریے (تھیوریز) کی فنکارانہ عملیات ہیں۔ جیمسن کی نظریاتی کائنات بہت پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی مارکسی فکر کا سفر ہیگل کے "مغربی تصورات" سے کیا جو بلاشبہ سابقہ سوویت یونین کی نفی کرتا تھا۔ انھوں نے لوکاش کے نظریات کا مطالعہ کیا اور فرینکفرٹ مکتب، لوفے کے علاوہ ژاں پال سارتر سے بھی خاصے متاثر رہے۔

یہ ان کے تاریخی مادیت کے تصور کا پس منظر تھا جو بعد میں تاریخیت کی اصطلاح سے بھی موسوم ہوا۔ کیونکہ تاریخ سے ہی ماضی اور مستقبل کو سمجھا جا سکتا ہے جس میں بہرحال یوطوفائیت کے تصورات بھی در آتے ہیں۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ انسانی وجود فاعلی (موضوع) معروضی ساختیے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو مطلقاً انسانی تجربے میں ساختیے کا انکشاف کرکے تمدن

اور بالائی ساختیے (Super Structure) کے تصورات کو جنم دیتے ہیں جن میں معاشی بنیادوں کا اثر کم ہی نظر آتا ہے۔ اعلیٰ ساختیے کا تصور مارکسی فلسفے کا سب سے کلیدی ستون رہا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اعلیٰ ساختیے کی فکر کو روایتی مارکسی فلسفے سے خارج کر دیا جائے تو مارکسی فلسفے کی بنیادیں گرتی محسوس ہوتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ جیمسن کا بالائی ساختیے کا تصور روسی نقاد پلخانوف سے متاثر ہے۔ سپر اسٹرکچر پر جیمسن نے اس طور پر نظر ڈالی ہے۔ جس سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے مارکس کے معاشرتی اور معاشی احوال سے ٹھوس قسم کی نظریاتی بنیادیں فراہم کرتے ہوئے اعلیٰ ساختیے کے تصور کی نئی تاویلات پیش کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پیداواری مزاج کا جو تصور مارکس کے وظائفی نظریے میں ملتا ہے وہ تاریخ کے ارتقاء کو صحیح طور پر بیان نہیں کر پاتا لیکن آگہی کا ایک خاکہ ضرور پیش کرتا ہے اور یہیں سے ادبی ہیئت کی آگہی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی جاتی ہے جو اصل میں کاؤتسکی (Kautsky) اور پلخانوف کے معاشی جبر کے ہم معنی تصور ہے۔ بالائی ساختیے کا مارکسی تصور میں ثقافت اور معاشرے کا گہرائی سے تجزیہ کیا جاتا ہے لیکن بالائی ساختیے کی فکریات میں قانون، سیاست، مذہب اور فلسفے کی مباحث بھی شامل ہیں۔ جیمسن کے یہاں پیداواری مزاج کی جو بھی فکر ملتی ہے وہ افراد کے معاشرتی رشتوں سے جنم لیتی ہے جہاں وہ مارکسی تفہیمات کی دبے لفظوں میں پیشین گوئی بھی کر دیتے ہیں اور وہ تشبیہات نظریے کی آگہی کے ساتھ ساتھ اسے تشریح بھی کرتے ہیں۔ ان کا تفہیماتی طرزِ فکر دو صورتوں میں سامنے آتا ہے جیسا کہ مارکس نے مذہب کو پایا جس میں نہ صرف باطل قسم کا کوئی شعور ملتا ہے مگر مقتدر قسم کی جبر انگیز نوحہ گری ضرور ملتی ہے تو اسے دوسری طرف نظر انداز کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو پال ریکوئر کی تفہیمات تشکیک پر نیا مکالمہ شروع کیا اور سریت مخالف (Demystifi) منطقیت کے التباس سے نظریں چرانے کی بھی کوشش کی گئی اور دوسری طرف انھوں نے تفہیماتی نظریے کو مثبت انداز میں بھی برتا۔ جس کے لئے Kerysma کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جیمسن نے مذہبی اور مارکس کے یوٹوپیائی تصورات کو دور بھی رکھا، جن پر لوکاش، بلاچ، آڈرنو اور بینجمن نے خاصی عرق ریزی کی تھی۔ جیمسن کا بنیادی تصور یہ ہے کہ معاشرتی جبر کی وجہ سے ثقافت "چلاتی" ہے جبکہ بینجمن کا کہنا ہے کہ ثقافت وحشیانہ پن کی دستاویز ہے اور قبل از سرمایہ دارانہ دور سے ثقافت اور زبان لاصوریت

کی شکل میں نظر آتی ہے (اگر اسے تفہیماتی سطح پر انصاف کی کسوٹی تصور کر لیا جائے) انھوں نے جب فکری طریقہ کار اختیار کیا وہ کسی طور پر نظریے سے کم نہیں نہ ہی اسے ہم ہیئت پسندی سے خالی کہیں گے اور نہ ہی دقیق قسم کے کسی مساوی فلسفیانہ نظام سے منتفی کر دیں گے۔ ان کی فکریات کو غیر ترجیحی بھی کہا گیا لیکن ان کا پورا کا پورا فلسفیانہ نظام فکر اس بات کا احساس دلواتا ہے کہ وہ اپنے مزاج میں کٹھن ہے قاری ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد صریحانہ طور پر فکر کی نقشہ بندی کرتا ہے، حدود متعین کرتا ہے یا ثقافتی نظام میں رواں دواں رموزی خود کاریت کا سراغ لگاتا ہے۔ انھوں نے اے۔ جے۔ گریما کے "بیانیہ" کا نشانیاتی تجزیہ کیا جو ہمیں ایک ماڈل بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ تخصیص کا نظریہ ہے لیکن نشانیاتی عمل میں نشان بذات خود کسی متن کے ظہور کا عندیہ نہیں دیتا یہ اس وقت متن کو گرفت میں لاتا ہے جب وہ تاریخ کے جبر کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں گریما اور جیمسن دونوں ہی تاریخانہ عمل (Historicizing) کو بیان کرتے ہیں کیونکہ دونوں کی نظروں میں متن میں جو بات کہی جاری ہوتی ہے وہ اصل میں تاریخ کا جبر ہوتا ہے۔ جیمسن کے ساتھ ہی انسانی رشتوں کے تانے بانوں میں سے بھی وہ باتیں نکال لاتے ہیں جو تاریخ نے ہماری نظروں سے بڑی صفائی سے اوجھل کر دی ہیں۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ بیانیہ کی صورت صرف ہیئت پسندانہ نہیں بلکہ یہ علم کی درجہ بندی ہوتی ہے۔

جیمسن کا معرکۃ الآرا مقالہ مابعد تفسیر (Meta Commentary) ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ مقالے کا نفس مضمون یہ تھا کہ تنقید اپنی صورتحال کے امکانات کو ظاہر کرتی ہے جو کہ عصری تنقید میں کم ہی نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں تصور کا نکتہ نظر (Point of View) ناول میں پوشیدہ ہوتا ہے جیسے کہ انیسویں صدی کے آخر میں ناولوں میں ہمیں متوسط طبقے کی موضوعیت سے کنارہ کشی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے جس کو ابھی تک نقاد کسی مخصوص وقت (زمان) کی درجہ بندی میں مقید بھی نہیں کر سکے۔ "مابعد تفسیر" بذات خود تنقید کا عمل ہے جو اس بنیادی سوال کو اٹھاتا ہے کہ ادب کو کیسے سوچا اور لکھا جائے۔ چاہے ادب کے وظیفے کا ثقافتی تفاعل کو "کل" ہی کیوں نہ تصور کر لیا جائے۔ جیمسن کے اس اہم مقالے میں ادبی متن کی تاریخی بحالی کا عمل مکمل ہوتا نظر آتا ہے جس میں کلیدی نکتہ عملیات کی مطلق حرکیات سے

متعلق ہے۔ متن انسانی سرگرمیوں کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہوتا ہے جو کہ فرائڈ کے یہاں ظاہری اور پوشیدہ متن کی صورت میں ملتا ہے جو عمومی طور پر ہر متن میں اور کبھی کبھار اس کو فرائڈ کے خوابوں میں بھی دریافت کیا جاتا ہے جس میں ایک مخصوص وظیفے کا عمل دخل ہوتا ہے جو اپنی فطرت میں پابندی کے باعث قریب قریب تمام متنوں کو متاثر کرتا ہے لہٰذا نقاد کا یہ کام ہے کہ وہ اس بنیادی صورتی طریقہ کار سے پردہ کشائی کرے۔ جیمسن اس مقالے میں تفسیر، تنقید اور تشریح کے عملی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادبی رسائی ہمیشہ اسلوب اور طریقہ کار کے سوالات اٹھاتی ہیں جس کی بنیاد نکتہ دانی پر ہوتی ہے۔

۱۹۷۲ء میں جیمسن کی کتاب "The Prison House of Language" چھپی جس کا موضوع ادبی نظریہ سازی اور ہیئت پسندی ہے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب رابرٹ شلز اور جاناتھن کلر ترجمانی طریقہ کو ساختیاتی تنقید سے روشناس کروا رہے تھے۔ یہ کتاب دیکھنے میں ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے وہ کسی موضوع کو متعارف کروا رہی ہے لیکن اصل میں انھوں نے نہایت ہی فکری دیانت داری سے ان افکار سے پردہ کشائی کی جو ابھی تک تنقید کے فکری منظر نامے پر نہ آسکے تھے۔ انھوں نے کتاب کا موضوع نطشے سے اخذ کرتے ہوئے بتایا کہ تنقید تو ایک طرف تشریح ہوتی ہے جو غیر جدلیاتی ماڈل کو تشکیل دیتی ہے۔ ہیگل کے حوالے سے یہ اصل اسلوب ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طور پر AB-Extra کی شکل میں نہیں ابھرتا۔ انھوں نے التھیو اور گریما کے نظریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ ساختیات اس مرحلے پر دوسری جانب سے تنقید میں داخل ہوتی ہے جو تفصیل کی کم توانائی کے حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے تاریخی رشتوں کو دریافت کر لیتی ہے جس کی تشریح کے لیے وہ فلسفی کولنگ وڈ (R.G. Colling Wood) کی اصطلاح Absolute Pre Supposition کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیمسن ساختیاتی شعریات کو تفہیماتی اور تجزیاتی رنگ دینے سے بھی پرہیز کرتے ہیں جیسا کہ جاناتھن کلر نے ساختیات کی شعریات کو نئے قیاسی اصول سے پرکھا۔ پھر بھی وہ کامل مابعد الطبعیات کی بند جدلیات پر نظر دوڑاتے ہوئے گریما کی نحویات کو ان کی اپنی نحویات کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ جبکہ اس کا طریقہ عمل خاصا معتبر ہے جو کہ اپنے مادی مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔ جیمسن نے طربیہ انداز میں لسانی ماڈل کا بھی تجزیہ کیا کیونکہ وہ نحوی سانچے

کے متوازن مزاج کی توسیع کا سبب ہوتی ہے جو اصل میں ایک اتفاقی ضرورت کے سبب عارضی نوعیت کی حامل ہوتی ہے جس کی دوہریت کے ردعمل کے طور پر انیسویں صدی میں تاریخیت کو فروغ ہوا۔ اس کتاب میں قول محال کی بھرمار ہے۔ بقول جیمسن متن کے ساختیاتی تجزیے میں نو مخصوص قسم کے اتصال کو سامنے لاتا ہے جس کا سیاق کلی طور پر تاریخی ہوتا ہے جو کہ مخصوص قسم کے پیداواری مزاج کو روشناس کرواتا ہے۔ یہاں کئی ابہامات سر اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے نظریے میں کامل رموز (Master Codes) کا اطلاق کرتے ہیں جو اصل میں ہیگل کے تاریخی رموز کا چربہ ہے۔

جیمسن کی ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والی کتاب "سیاسی لاشعور" (The Political Unconscious) مصنف کے گہرے سیاسی شعور کی غمازی کرتی ہے تو دوسری طرف انھوں نے جدید تنقید کی جدلیات کو افقی اور عمودی سمتیں فراہم کیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہونے والی کتاب Marxism and Form کا اختتامی حصہ ہے جہاں ان کی تنقید کی جدلیات کی مباحث کا اختتام ہوتا نظر آتا ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب جیمسن کی ایک ایسی تصنیف ہے جو ان کی رسومیاتی اور آرزومندانہ خواب کی تعبیر کہی جا سکتی ہے۔ جس میں انھوں نے گرانڈ تھیوری کے اتصال کی نفی کی ہے تو دوسری جانب خوردیاتی (Micrological) مشاہدے کی میکانیت کو بھی کسی حد تک رد کر دیا۔ یہ تصورات اصل میں ولیم سی ڈوولنگ (William C. Dowling) کے خیالات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں سارا زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ فرائڈ کے تحلیل نفسی کے تصورات کو سیاسی تجزیے کے لیے استعمال کیا جائے کیونکہ اس کے یہاں لاشعور شدید قسم کے اجتماعی جبر کے تاریخی تضادات کے تلے دبا ہوا ہے جو کہ انسانی معاشرے سے ہی منسلک ہے۔ جس سطح پر جیمسن کا یہ نقطہ نظر تاریخیانے (Historicizing) کی اس نہج کو دریافت کرتا ہے جو فرائڈ کے نظریے میں سیاسی لاشعور ہے لیکن فرائڈ سے نظریاتی متعلقات سے جوڑ کر التباسی درجہ بندی کا سحر باندھ دیتے ہیں جس کو وہ ذاتی شناخت کا نام دے دیتے ہیں جو انفرادی سائیکی ہے اور وہ نظریاتی طور پر اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ تسخیریت کے متعلقات کی بازیافت کرے لہٰذا فرائڈ کے نظریات کے جھوٹ کا سچ یہ ہے کہ انھوں نے جبر کی بابت مکر سے کام لیا کیونکہ ہیئت کا جو باقاعدہ وظیفہ صرف جبر کو بیان کر سکتا ہے وہ نظر انداز

کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بے قاعدہ تفاعل بھی ہے جو اصل میں پس فرائڈین نظریات سے مزاج کی تشریح کر دیتا ہے۔

ایک جانب تو انھوں نے جدلیاتی روایت کو ایک سرے سے زندہ کیا تو دوسری جانب انھوں نے لسانی زمرے میں فکری تاریخیانہ مزاج سے بھی بحث کی۔ جیمسن نے لاکان کے تصورات میں بھی خاصی دلچسپی لی کیونکہ وہ معاشی خدشات کو تمدنی حصار میں پرکھتے ہیں۔ لاکان نے آلتھیو کے نظریات کی تشریح بھی کی اور مارکس اور فرائڈ کے مابین رموزی پیچیدگیوں کو بھی حل کرنے کی کوشش کی۔

جیمسن کی حسیت مشاہدے کی آگہی سے جنم لیتی ہے جو اپنا مخصوص اسلوب تشکیل دے کر نقد کے نظریات سے جنم لیتی ہے۔ ان کے فکر و نظریات مارکسی ہیں جو وابستگی (Commitment) پر زور دیتے ہوئے ہمیشہ غیر متوقع فکری مسائل کو بھی اٹھاتے ہیں جس سے نئی صورت کے مسائل جنم لیتے ہیں جو نئے مظاہر کی دھنک ترتیب دیتے ہیں جس میں نئے فکری خوابوں کی تعبیر کسی حد تک نظر آ جاتی ہے۔ ان کا اپنا اسلوب ہی ان کے فکری نظام کو مخصوص فلسفے کی صورت میں ابھارتا ہے جو آگہی کی ذات ہے اور دنیا کی زندگی کی تاریخ کا پھیلا ہوا کینوس بھی، جس پر ان کی فکر الجھتی ہے جو ضد کی ضد ہونے کے باوجود اپنے اختتام پر ضد کی رضا بن جاتی ہے۔

ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton) انگلستان کے ادبی نقاد اور نظریہ داں ہیں۔ انھوں نے تنقید کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے، رسائل کے مدیر رہے لیکن ان کی اصل شہرت مارکسی تنقید کے حوالے سے ہی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں ریمنڈ ولیم کی وفات کے بعد انھیں انگریزی زبان کا سب سے اہم ادبی مارکسی نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی تنقید میں مارکسی نقطہ نظر سے فکریات (آئیڈیالوجی) کے رشتوں کو تاریخ، سیاسیات اور معاشرتی صورت حال میں بانٹ کر مارکسی جدلیات کی نئی فکری روش کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ "متن کی سائنس" کا معتبر جواز سامنے لایا جائے کیونکہ ان کے خیال میں ماورائی صورت حال اور غلط فہمیوں نے ادبی تنقید کی مختلف رسائیوں پر منفی اثر ڈالا ہے۔ ایگلٹن متنازعہ نقاد ہیں۔ لیکن انھوں نے تنقید کے جمالیاتی پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے تنقیدی

اختصاص کی راہیں ہموار کیں۔ انھوں نے پس جدیدیت کے بین المتنی تصور کے ماضی کو تخفیف کرتے ہوئے ناسٹلجیا میں تبدیل کر دیا جس میں آئیڈیالوجیکل ڈسکورس کی تصویر دھندلی نظر آتی ہے۔

"Marxism and Literary Criticism" میں ایگلٹن نے مارکسیت کے کلیدی عناصر کو چار مختلف مقالات کی صورت میں پیش کیا ہے، جن میں متوازن راہ نکالتے ہوئے مصنف کو تخلیق کار کی صورت میں کم اور پیش کار کے طور پر زیادہ پیش کرتے ہوئے ادب اور تاریخ کے رشتوں کو سیاق اور ادیب کی معاشرتی وابستگی سے منتج کرتے ہوئے خاص تجریدی فکر کو بھی اُبھارا ہے۔ انھوں نے مارکسیت کے متوازن استحقاق کے اسلوبیاتی طریقہ کار کے عقیدے سے فرار حاصل کرتے ہوئے، نظریاتی، انسانی، تجربی اور جمالیاتی نہج کو بھی اپنانے کا عندیہ دیا کیونکہ ان کے بقول فکری قوتیں ہی متن کو تشکیل دیتی ہیں جو کسی حد تک بیماریت کے نقادوں کے علاوہ قدامت پسند نقادوں کو بھی خاصا ناراض و پریشان کر دیتی ہیں۔ لیکن بعد میں ایگلٹن نے اپنے ان نظریات پر نظر ثانی بھی کی۔ انھوں نے اس بات کا بھی جائزہ لیا کہ مارکسی جمالیات میں قوتوں کی حدود کیا ہیں؟ مارکس اور انجلس کے مضامین اور خطوط میں ان حدود کو بیان کیا گیا ہے جو ۱۹۶۰ء میں نئی مارکسی فکریات میں دستاویز کی صورت میں سامنے آئے۔ ان کے خیال میں پس التھیوز عہد تک ایک بڑے انحطاط کا شکار ہوئی اس سلسلے میں انھوں نے اسٹالن اور زیڈے ناف (Zhdanov) کے علاوہ ۱۹۳۰ء کے عشرے کے برطانوی مارکسسٹ کرسٹوفر کارڈویل (Christopher Gaudwell) اور آرنلڈ کیٹل (Arnold Kettle) پر بھی سخت تنقید کرتے ہوئے لوکاش کے تاریخی تناظر کو سراہا کیونکہ یہ معاشرتی جبر کو اُبھارتی تھی۔ یوں بھی انسان کے ارادے اور تاریخی جبر کے مابین تشکیک، گنجلک بہت حد تک واضح ہے اور لوکاش نے اس کی صحیح نشاندہی اور درجہ بندی کی ہے جبکہ کرسٹوفر کارڈویل نے اپنی کتابوں Illusion of Reality اور Study of Deaing Culture میں یک طرفہ مطمح نظر اپنایا تھا جو ان کے بعد آنے والے مارکسی تنقید نگاروں کو بھی سخت اور گرفت گیر محسوس ہوتا تھا حتیٰ کہ پس اسٹالن روس کے گنے چنے نقاد بھی اس رویے سے کترانے لگے تھے۔

۱۹۷۶ء میں ان کی کتاب "تنقید اور آئیڈیالوجی" شائع ہوئی جو پس التھیوز مارکسی

نظریات کو ترجیح پیش کرتی ہے لیکن اصل میں ان کی یہ خواہش رہی کہ مارکسی حوالے سے ادبی تنقید اور فکر میں عملیاتی توجیہات پیش کی جائیں۔ انھوں نے ایک طرف تو کسی حد تک ریمنڈ ولیم (Raymnod Williams) سے اپنی فکری راہیں الگ بنانے کی کوشش کی کیونکہ زمانے میں انھیں ریمنڈ ولیم کا "چیلہ"، "وفادار" اور "مبتدی" کے القاب سے پکارا جاتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے Left Leaviste معاشرتی تنقید سے لوسین گولڈمین کی جینیاتی ساختیات میں اپنا فکری تزکیہ تشکیل ہوتا پایا۔

ایگلٹن کے نظریات خاصے عمیق ہیں۔ جن میں اعلیٰ حوصلے کے ساتھ فکر و تنقید کی جانچ کرنے کی اہلیت تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب قاری اور لکھنے والے اس میں اس بات کا احساس دلایا کہ مارکسی تنقیدی عمل میں صرف پیداواری مزاج کی پیداواریت کلیدی کردار ادا کرتی ہے، جس میں "عام فکر" اور "جمالیاتی فکر" "مقتدر فکر" بن کے اُبھرتی ہے جو ادیب کے متعارضی آئیڈیالوجی کے ماخذات کو تلاش کرتے ہوئے بتایا کہ آلتھیوز کے "سماجی شعور" کا فکری ڈھانچہ لوکاش کے نظریات سے عبارت ہے۔ جمالیاتی عمل پیداوار کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے جو کسی طور پر قارئین کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اس صورت حال میں فنکار معاشرتی تناظر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انقلابی اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ ایگلٹن کا ماڈل تقریباً ان کے پہلے آنے والے نقادوں سے زیادہ مختلف نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میتھو آرنلڈ سے لے کر جیمس جوائس تک جو بھی تنقید لکھی گئی اس میں نقاد کی آئیڈیالوجی شامل ہوتی تھی جس کو نامیات کی تاریخ کہا جاتا ہے لیکن جان کیسی (John Casey) کی تنقید تک اس نظریے میں سائنٹفک عنصر شامل نہیں ہوتا تھا۔ "ٹائمز" کے ادبی ضمیمے میں لکھا ہے کہ "ایگلٹن کی یہ کتاب جمالیاتی نقطۂ نظر کے سلسلے میں خاصی ناتجربے کار ہے جو کانٹ سے لے کر کولن ووڈ تک احاطہ کرتی ہے اور انسانی معاملات کے دلکش احوال کو بیان کرنے میں ناکام رہی ہے جو کہ روایتی جمالیاتی نظریے کا مرکزی خیال ہوتی ہے۔ ایگلٹن نے جارج ایلیٹ کے ناول اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری کو بھی نظریے کا معروض سمجھا لیکن وہ اس مطالعے میں نظریاتی معروض کے نمونے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ انھوں نے ای۔ ای۔ رچرڈ، لوئیس اور کئی امریکی نقادوں کے علاوہ ایملی ڈکنس، ایل۔ سی۔ نائٹ، جان کرا ورینس وغیرہ کے تاریخی

شعور کو کسی نہ کسی صورت میں موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ایگلٹن نے اس کتاب کے تیسرے باب میں مظہریات، تفہیمات اور نظریہ قبولیت پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوسرل، ہیڈیگر کی مظہریات خارجی دنیا کی بے معنویت کی تنہائی ہے اور ہوسرل کے اسی تصور کا عکس جنیوا کے دبستان کے ہم نواؤں جارج پولٹ، ژاں اسٹروبنسکی (Strobinski)، ایمل اسٹیجز (Emilstaiges) کے علاوہ ای۔ ایم۔ جونیر کے یہاں بھی ملتا ہے۔

ایگلٹن نے ساختیات اور نشانیات کو قریب قریب رد ہی کردیا۔ ان کے خیال میں عینیت پسندی کا فلسفہ غیر تاریخی ہوتا ہے کیونکہ ذہن میں ترتیب دیے ہوئے قوانین اسے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس میں متوازیت اور اختلافات کی کئی سمتیں اُبھرتی ہیں۔ عمومیت کی ایک سطح پر آکر انسانی تاریخ مطلق افتراق کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ اہم نہیں کہ متن کی ساختیات یک زمانی سے زیادہ مطالعہ کریں تو گہری معنویت کو انکشاف کرپائیں گے۔ کیونکہ معاشرتی قوتیں تاریخی طریقہ عمل کو تسلیم کرتی ہیں۔ یہ تمام الزامات پرانے ہیں جنھیں ایگلٹن نے دوہرادیا ہے۔ انھوں نے نشانیات پر بحث کرتے ہوئے سی۔ ایس۔ پرس اور یوری لوٹمین کے علاوہ جے۔ ایل۔ آسٹن کے کلام کے عملی نظریے (Speech Act Theory) اور باختن کے مارکسی فلسفہ لسان پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ باختن کا مارکسی لسانی نظریہ شعور کا مادی نظریہ ہے، لیکن ایگلٹن اس کے اطلاقی پہلوؤں سے نظر چراتے ہیں کیونکہ باختن نے مونولوجیکل ناول میں ایک ہی معروض میں کئی آوازیں دریافت کی ہیں، جو ناول نگار کا شعور بھی ہوتا ہے جبکہ آئیڈیالوجیکل ناول کے سلسلے میں باختن کا کہنا ہے کہ دوستوفسکی کے ناولز میں واقعات کی وحدت کثیر المعنی ہوتے ہوئے بھی مساوی شعور کے حامل ہوتے ہیں لیکن ایگلٹن نے باختن کی آگہی کو مفید قرار دیا جو باختن کے حوالے سے ناکافی ہے جیسے جولیا کرسٹیوا نے (1969) Semiotke میں خاصی حد تک نئی وسعت سے ہم کنار کیا۔

ایگلٹن نے بارتھ، دریدا و ڈی۔ مین کی ساختیاتی اور پس ساختیاتی تحریروں پر بھی اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اس کو ایسی تحریریں قرار دیا جس میں دل نہیں ہے۔ اس کے خیال میں ردِ تشکیل کا نظریہ ایک ایسی بندوق ہے جس میں گولی / بارود (Ammunition) نہیں

ہے۔ ردِ تشکیل ادب کے حوالے سے لسانیات کی غیر ممکنات کی شہادتیں فراہم کرتا ہے مگر کبھی بھی اپنی ناکامیوں سے پردہ نہیں اٹھاتا۔ دریدا کے ردِ تشکیل کا تمام کا تمام عمل نہایت غیر تاریخی اور سیاسی طور پر حیلہ بازی کے ساتھ کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ زبان ایک نمایاں ڈسکورس فراہم کرتی ہے جو کہ فکری اساس تشکیل نہیں دے پاتی لیکن یہ جدلیات سے متعلق ضرور ہوتی ہے جو لفظی حسیات پر بھرپور طنز کرتی ہے لیکن پھر بھی ایگلٹن متن کی لٹے شدہ معنویت کو متن سے باہر نکال دینے کے حق میں ہیں، ساتھ ہی وہ ردِ تشکیل سے اختلاف اس لئے کرتے ہیں کہ اس میں معروضیت کا رنگ معدوم ہے۔ اسی طرح ولیم وارنر (William Warner) نے بھی ردِ تشکیل کی قرأت صحیح معنوں میں نہیں کی اور لسانیات کو ان لفظوں میں بیان نہیں کیا جن کے معنی خالصتاً ادبی نوعیت کے تھے۔

''تنقید اور آئیڈیالوجی'' میں ایگلٹن نے پیر ماشرے کی تنقیدی نظریہ سازی کو فکری وسعت دی۔ خاص طور پر انھوں نے ماشرے کی طرح تشریحی نقد سے شدید اختلاف کرتے ہوئے کہا ہے کہ تشریحی تنقید اپنی عماریت کے لحاظ سے کئی تضادات کو ابھارتی ہے کیونکہ تشریحی تنقید متن میں اس کی اپنی مخصوص زبان کو دریافت کرکے اصل معنویت کی بازیافت کرتی ہے جبکہ بقول ایگلٹن مارکسی تنقید متن میں سے وہ معنویت تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جس کی توقع کی جا رہی ہوتی۔ ایگلٹن متن میں جمالیاتی رنگ کے بارے میں تذبذب کا شکار ہیں کیونکہ جمالیاتی رنگ عموماً معروضیت کی نفی کرتا ہے لیکن وہ ہیئت کو جس قدر پالینے کی کوشش کرتے ہیں وہ ان کی تنقید میں دراڑیں پیدا کردیتی ہے اور یہی فکری اور تنقیدی صورت حال تقریباً تمام مارکسی فکر میں نظر آتی ہے۔ اس گومگو فکر کا احساس اس وقت ہوتا ہے جو ایگلٹن مخصوص تاریخیت کے حوالے سے جمالیاتی اثرات کو پالینے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرانسیسی فکر ہمیشہ سے ہی مارکسی ساختیات کے لئے بہت کشادہ رہی کیونکہ مارکس کے بعد ہر زمانے میں اس فکری عمل میں نت نئے سوالات اٹھائے گئے بلکہ ان سابقہ افکار کی صحت بھی کی گئی جو سائنسی اعتبار سے غیر معتبر تصور کیے گئے۔ چھٹی دہائی کے وسط میں فرانسیسی نظرداں پیئر ماشرے (Pierre Macherey) نے فن اور آئیڈیالوجی کے تصور کو کئی نئے

معنوں سے روشناس کرایا۔ بنیادی طور پر وہ التھیوزر کے ساختیاتی ماڈل سے اپنے تصور کو خاصی حد تک سنوارتے بھی ہیں کیونکہ ان کا فکر وفن کا نظریاتی ڈھانچہ التھیوزر کے فکری ڈھانچے سے زیادہ مختلف نہیں۔ ماشرے نے التھیوزر کے مباحث کو توسیع دیتے ہوئے فن اور فکریات کے نئے سوالات اٹھاتے ہوئے متن کی تخلیق کاری اور موضوع صناعیت کو کم اہمیت دی ہے لیکن وہ متن کو پیداوار قرار دیتے ہیں اور اس بات سے اختلاف کرتے ہیں کہ متن کوئی تخلیقی وظیفہ نہیں ہوتا اور نہ اپنے طور پر اپنی خود کفالت کا عندیہ دیتا ہے مگر پیداواری رشتوں کے سبب متن میں موجود مختلف عناصر کی شکل تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ تمام کا تمام عمل غیر شعوری طور پر ہوتا ہے کیونکہ خود کفالت کا عمل متن میں نہ ہونے کے برابر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لہٰذا متن سے یہ امید نہیں رکھنی چاہیے کہ کسی تخلیقی عمل (متن) میں کوئی شعوری وحدت ابھر کے سامنے آئے گی۔ متن انجانے طور پر لاشعور سے ابتدا کر کے جب شعور کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو وہ فکریات کو جنم دیتا ہے۔ یوں متن کی ہیئت نئی صورت میں نمودار ہو کر نئی معنویت کو دریافت کرتی ہے لیکن جب یہی عمل فکریات میں داخل ہوتا ہے تو اس کی خود کاریت مختلف ہو جاتی ہے کیونکہ فکریات کو عموماً حقیقت کی وحدت کا سرچشمہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ جب فکریات فن میں اپنا نفوذ کرتی ہے تو تضادات سر اٹھاتے ہیں جن سے فکری اور ہیئتی سطح پر کئی مقام پر "خلاق" پیدا ہو جاتا ہے۔ ادب اپنے طور پر اس خلا کو پاٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اصل میں فکریات ہی افتراق کا سبب بنتی ہیں۔ یہ صورتحال اس سبب سے پیدا ہوتی ہے کہ فن پارے کے سامنے آتی ہیں جس سے نظریں چرانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ماشرے نے مثبت انداز میں متن کے ان مسائل کی طرف توجہ دلائی جو ان کے پیش رو بیان کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ ماشرے نے ادبی نقاد کے عملی وظیفے پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ ادبی نقاد کا کام فن پارے کی وحدت کو مربوط کرنا نہیں اور نہ ہی ان تضادات پر بحث کرنا ان کا کام ہے جو متن میں در آتے ہیں۔ ادبی نقاد کا وظیفہ یہی ہوتا ہے کہ وہ متن کے لاشعور کو دریافت کر کے اس امر پر زور دیتے ہیں کہ متن میں وہ کون سے نکات تھے جن کو دیکھنے والے نے قاری کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا اور جو باتیں متن میں شامل ہونا چاہیے تھیں وہ کیوں شامل نہیں کی گئیں۔ ماشرے کو ادبی عمل پر تشکیک ہے کہ مصنف خاصی حد

تک وہ نہیں کہتا جو اسے کہنا چاہیے۔ یوں مصنف خود ہی شکوک کی زد میں آ کر اپنا مقام کھو بیٹھتا ہے۔ معاشرے کی متن شکنی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ متن میں موجود بیانیہ تضادات کو ضروری تصور کرتے ہوئے حقیقت پسندانہ متن کی بنیاد کو چیستانی بنا دیتے ہیں۔ عموماً متن کی شروعات میں کئی باتیں چھپائی جاتی ہیں اور قاری کو یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ان باتوں کو آگے چل کر بے نقاب کیا جائے گا اور اختتامیے میں راز کھل جانے کے بعد کہانی اپنا عمل پورا کرتی ہے۔ ماشرے کے بقول ادبی متن میں کئی محرکات اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ ساختیاتی سطح پر ادبی پیداوار ادبی ہیئت کو متعین کرتی ہے جہاں متن کسی نہ کسی طور پر اپنے کسی میکانی رشتے کو ظاہر نہیں کر پاتا لیکن مصنف کا تخلیقی منصوبہ فارم کو متعین کرتے ہوئے بعض دفعہ متن کی مخصوص حدود سے تجاوز بھی کر جاتا ہے۔ اصل میں متن پر اثر انداز ہونے والے محرکات و متغیرات ہوتے ہیں جو کسی تسلسل کے بغیر وارد ہوتے ہیں جن کو کنٹرول کرنا مصنف کی بس کی بات نہیں ہوتی۔

متن میں افتراق کی صورتحال آئیڈیالوجی اور لسان کے درمیان کسی قسم کا ارتباط پیدا کرنے میں ناکام رہتی ہے مگر جب ادبی ہیئت میں ڈسکورس سے متاثر عناصر شامل ہو جاتے ہیں تو متن میں جگہ جگہ "خلا" در آتا ہے جس سے متن تقسیم در تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے یہاں یہ بات خاطر نشان رہے کہ متن کا یہ شعور مصنف کا شعور نہیں ہوتا بلکہ خالصتاً متن کا شعور ہوتا ہے۔ یہ شعور اس وقت ہی ابھرتا ہے جب متن ادبی ہیئت کی صورت میں سامنے آتی ہے جو کہ فکری منصوبے اور ادبی ہیئت کے درمیان سے ابھرتا ہے جس میں انسانی فاعل کی عدم وحدت آشکارا ہوتی ہے۔ یہی مشابہت متن میں بھی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ ادبی نقاد متن کی وحدت کو تلاش نہیں کرتا بلکہ متوقع معنویت کی جستجو میں سرگرم عمل رہتا ہے اور جو باتیں کہنے سے رہ جاتی ہیں ان کی نشاندہی کرنا ادبی نقاد کا کام ہے۔ متغیرات کے تصادم سے نقد ذات کے عمل کو تحریک ہوتی ہے اور فکری احتساب کا عمل شروع ہو کر اپنے اقدار و معمولات کو نئے سرے سے کھنگالا جاتا ہے جس سے قاری خود معنویت کی نئی سمتیں دریافت کر کے متن کی فکریاتی حدود متعین کرتا ہے اور متن کے "چپ" کا تالا کھول کر متن میں چھپی ہوئی فکر کو آزاد کر دیتا ہے۔

پیئر ماشرے کی کتاب A Theory of Literary Productiona (1966) ساختیاتی حوالے سے متن شکنی کی نئی روایت کو جنم دیتی ہے۔ انھوں نے نویساریت کی وساطت سے فن وادب کو نئے عتی مطالعے سے روشناس کرواتے ہوئے روایتی جمالیات کو یکسر رد کر دیا۔ ادب کو وہ واہمہ بھی کہتے ہیں اور مارکسی حوالے سے ادب کی نئی مباحث کو شروع کرنے پر زور دیتے ہیں۔ افہام وتفہیم کے امکانات سے فکری جانبداری کے خلاف اعلان جنگ بھی کرتے ہیں۔

پیئر ماشرے نے اپنی مطالعاتی رسائیوں میں سماج کو بنیاد بناتے ہوئے افتراق کے عنصر پر بحث کرتے ہوئے، تصفیات کی بھی کوشش کی کیونکہ اُنیسویں صدی کے اولین عشرے میں آئیڈیالوجی کی راہیں طبقاتی حرکت پذیری کے لئے اس طور پر کشادہ تھیں کہ یہ کھلے ہاتھوں سے تمام جوہر (All Talents) کو خوش آمدید کہتے تھے کیونکہ اس میں محدود حقائق ہوتے ہوئے بھی استحقاق طبقے میں نفوذ کرنے کی اہلیت ہوتی تھی۔ آئیڈیالوجی ہی حتمی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کا جواز پیدا کرتی تھی جس کی بنیادیں معاشی نظام سے منسلک تھیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ثقافتی افکار کی نوعیت اخلاقی بندشوں میں مقید ہو کر رہ گئی (جیسا کہ چارلس ڈکنس، ایلیٹ، نذیر احمد کی ناولوں میں نظر آتا ہے) اسی طرح بالزاک اور اسٹینڈل کے ناولوں میں عمیق فلسفیانہ متعلقات ترش رو اور ابن وقتی کے سوا کچھ نہیں۔

آئیڈیالوجی کی اصطلاح، عقائد، رجحانات اور عادات کی محسوسات اور معاشرتی بے دھاریت کو مولودی طور پر خودکارانہ طور پر ساختیاتی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ آئیڈیالوجی معاشرتی قوتوں کی غیر موجودگی میں مخصوص ثقافت میں رہتے ہوئے جور جبر کے لئے ڈھال ثابت ہوتی ہے۔ ادب آئیڈیالوجی کو تشکیل دے کر تمثالی روابط کو اصل معاشی احوال سے منتج کر کے نئی صورتحال پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ آئیڈیالوجی میں افتراق کے شگاف بھی ڈال دیتے ہیں کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ آئیڈیالوجی ہر مسئلے کا حل پیش کرتی ہو، مگر یہ کوشش ضرور کرتی ہے کہ مسائل کا حل مل جائے۔ جس طرح قدامت پسند شعرا کیٹس اور ورڈس ورتھ ماورائی معاشرتی طبقوں کے حقائق کو تشہیر فطرت یا فن اور ہیئتی (صوری) نمونوں کی مدد سے اعلیٰ درجے کا علامتی اور استعاراتی روپ دے کر اس کو عینیت

پسندانہ پیکر میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کی اصل قرأت استعاراتی تمثالوں میں چھپی ہوئی ہے۔ جس میں کاشتکار اشرافیہ اور اینگلو آئرش ریاستوں کو خصوصی طور پر معاشرتی افتراقات کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے جو اپنی معنویت کے ساتھ ان کے مسائل کو حل بھی کرتی ہے۔ ماشرے کے خیال میں "شعور" سے ہی آئیڈیالوجی ترتیب پاتی ہے اور متن کی مختلف پرتوں پر آئیڈیالوجی کا سرایت کر جانا ہی متن کے سلسلے میں ایک فطری عمل ہے۔ تمثالیت مخاطبے (ڈسکورس) کے لئے مواد فراہم کرتے ہوئے حقائق کی توجیحات کو ابھارتی ہے۔ جب یہ عمل متن پر حاوی ہو جاتا ہے تو متن کے افتراقات اور اس میں در آنے والا کھوکھلا پن خود بخود اُبھر کر نمایاں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حقیقت پسندانہ ادیب یہ کوشش کرتے ہیں کہ متن کے عناصر کی وحدتوں کو متن میں شعوری طور پر جگہ دیں، جس میں جھول بھی آجاتا ہے۔ یوں متن آئیڈیالوجیکل مخاطبے کی جانب رجوع ہوتا ہے۔

ماشرے کی تحریروں پر آلتھیوزر اور بارتھ کی فکر کا بھی بڑا اثر ہے۔ اس کے علاوہ ایگلٹن، لوسیوکولائی، بیریس، ایڈرسن، رونبلیک، سٹمین جون اور گورن تھروبوں پر ان کی تحریروں کے گہرے اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

ختم کلام

مارکسی ساختیات کی سائنسی اساس نے ہی تجربی عمل وفکر سے گذر کر خالص ساختیات کی راہیں ہموار کیں۔ خاص طور پر معاشرتی اداروں کے مطالعوں کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ کرتو زائیدہ ساختیہ اور اعلیٰ ساختیے میں بہت زیادہ فرق نہیں، صرف انھیں وظائف کی حرکیات کی بنیاد پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ٹالکوٹ پارسز کے حقائق کے فکری دہانے، ساختیاتی افتراق اور معاشرتی نظام کے ارتقا سے مربوط ہیں۔

نیکولس پولینٹیز (Nicos Poulantzas) نے ساختیاتی تعبیرات سے ساختیاتی روایت کو مستحکم بھی بنایا لیکن دونوں نے مارکسی ساختیات کے بنیادی مزاج سے آگہی پا کر مارکسی رسائی کو تجربی بنیادوں پر استوار کیا جس کی دھاریں سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی معاشیات سے جنم لیتے تھے۔ آلتھیوزر کے یہاں مارکسی ساختیات فکری طہارت کی ذاتی تاویلات تھیں جو کہ سائنسی

فکر، فلسفہ اور نظری عملیات کے دائرے میں سفر کرتی ہیں، مگر مارکسی ساختیات میں یہ سہولت نہیں ہے کہ ذاتی آگہی کی تنقید کو جن معنوں میں تنقیدی فکر کی حس جگاتی ہے اس کو بحیثیت "عینیت پسند" رد کر دے۔ عموماً فکری دنیا میں بہت سے تنقیدی تصورات صرف اس وجہ سے رد ہو جاتے ہیں کہ اہل فکر اس تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے یا تجربیت، استدلالیت، ثبوتیت انعکاسی عمل سے زیر بار ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ بورژوا فکر، انسان دوستی، تاریخیت، نتائجی تصورات، ارتقائیت اور فلسفیانہ عینیت پسندی کے پیچیدہ فکری تانے بانے مارکسی ساختیات کو الجھن میں بھی ڈال دیتے ہیں۔ ادبی تنقید نظریاتی نتائجیت کے دائرے میں رہ کر تنقیدی ڈسکورس سے اخذ کی جاتی ہے، نقاد صرف نظریات کی صحت نو کرتا ہے یا پہلے سے بیان کی ہوئی فکر کو نئے عنوانات کے ساتھ پیش کرتا ہے تاکہ ذاتی طور پر مبادلے کے عمل کو تشکیل دیا جا سکے جو بعض دفعہ شعور کو پارہ پارہ بھی کر دیتا ہے۔

مارکسی ساختیات دو انتہا پسند فکری اور ریڈیکل نظاموں کے بطن سے جنم لیتی ہے جو فکری اور نظریاتی سطح پر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں جس میں ایک نظام سرمایہ دارانہ سیاسی معیشت کی آفاقی سطح پر درجہ بندی کرتا ہے اور ان اختلافات کو خوش آمدید کہتا ہے جس کی سیاسی توجیہات ممکن ہیں۔ وہ تاریخی جبر سے گذر کر تشکیلی فکر کو کنٹرول کرنے والے عوامل سے ان سطحوں پر بحث کرتا ہے جہاں ساختیہ اور نظام معدوم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ساختیات صرف نظریہ ہی نہیں ہوتا بلکہ "غیر نظریے" کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے۔

لہٰذا یہ بات عیاں ہے کہ آلتھیوزر کسی حد تک سارتر، لوفے اور لیوی اسٹروس کسی نہ کسی طور پر مارکسی جدلیات سے اپنی فکر کو سنوارتے ہیں۔ بقول سارتر جدلیات، موضوع اور معروض کے درمیانی رابطے کا کام کرتی ہے جبکہ لوفے کا کہنا ہے کہ جدلیات کا مقام صوری منطق اور انسانی منطق کے درمیان ہے۔ جدلیات کے بارے میں لیوی اسٹروس کا کہنا ہے کہ "یہ ثانوی سطح پر فطرت اور ثقافت کے مابین ہوتی ہے۔" لیکن آلتھیوزر نے لکھا ہے کہ "یہ ہیگل کے فکری اتصال کو ادبی ساختیات سے جوڑ دیتا ہے۔ فوکو کی تاریخی آگہی باچلر ارڈین (Bachel Ardain) کے سائنسی اسلوب سے متاثر ہے جس میں اقتدار اور قوت کے مقدس ارتباط کے تانے بانے کو تلاش کیا گیا ہے جو مارکسی فکری تشکیلات میں مفقود ہے جس کو فوکو

نے نوآبادیت کے حوالے سے دریافت کیا۔ بارتھ کے یہاں معاشرتی نظریے کو "نظریے" کے طور پر پیش نہیں کیا گیا، خاص طور پر انھوں نے سیاسیات کے مسائل سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی جبکہ تورین کے یہاں نظام کا نظریہ ان کی فکر کو اجاگر کرتا ہے۔ اتفاق یا یکجہتی کو وہ انقلاب کی اساس بتاتے ہیں جبکہ لاکان نے مارکسیت سے الگ راہ نکالی لیکن ان کی فکری جدلیات مارکسی طرز کی ہی ہے۔ لوفے کی ساختیات تشکیلی ہے۔ انھوں نے آلتھیوزر کی مارکسی ساختیات کو کسی حد تک رد کر دیا۔ ان کی نظر میں لاکان کی تحلیل نفسی اور لیوی اسٹروس کی ساختیات نے مارکسیت کو پامال کر کے رکھ دیا۔

مارکسی ساختیات کے بارے میں لوکاش، ہیگل مارکس اور مارکس کی قدامت پسندانہ تفاسیر یا عقائد میں جبر کے حوالے سے کوئی خاص اہمیت نہیں جبکہ عملی تنقید میں مارکسی جدلیات کی کلیدی حیثیت ضرور ہے جو کہ سائنس اور آئیڈیالوجی میں خط امتیاز کھینچتی ہے اور یہیں مارکس کے نظام فکر (سسٹم تھیوری) کا سائنسی تناظر بھی ابھرتا ہے جو کہ تجربی سطح پر خارجی ساختیات کے قیاسات کو ترتیب دیتا ہے جس سے ساختیات کے تاریخی تناظر میں تاریخیت کا عنصر شامل ہوا۔ اس نے مارکسی ساختیات کے موضوع کو مزید توانا بنا دیا۔ یہ مارکسی ساختیات کا ہی اعجاز ہے کہ اس نے ادب کی عمرانیاتی تنقید اور ساختیات کے درمیان رابطے کا کام کر کے نئی فکری جہات سے کئی نظریاتی مباحث کو جنم دیا۔ یہ ایک سائنسی نظریہ ہے جس نے جدلیات کو نئے رنگ و روپ دیے۔

○○

Refferences

Althusser, Louis, For Marx, New York Vintege, 1970

Althusser, Louis, Essys in Self-Criticism, London New Left Books, 1976

Athusser, Luis, :The Crisis of Marxism" Theoritical Review 7 (September/October) 1-10, 1978.

Athusser, Luis and Etienne Bali Bar, Reading Capital, New York, Pantheon Books, 1970.

Athusser, Luis, Lenin and Philosopy and other Essays, Trans Ben Bruwster, Verso, London, 1971.

Burris, Val. "Structuralism and Marxism" Insurgent Sociologist 9 (1) (Summer-Special Issue on Marxism and Structuralism) 4-17, 1979.

Blue, Peter and Merton, Rbert 9eds.) Continuities in Structural Inquiry Sage. Pbulication, London and Beverly Hills, 1981.

Callinicos, alex. athusser's Marxism, London: Pluto Press, 1976.

Cornforth, Mourice, "Some Comments on Luis Athusser's Reply to John Lewis, Marxism Today, May: 139, 1973.

Graig, David (ed.) Marxism on Literature, Penguin, Harmonds worth, 1975.

Dowling, William, Jameson, Athusser, Marx, Cornell University Press, Etnaca, New York, 1984.

Eagleton, Terry, Criticism and Ideology, New Left Books, London, 1976.

Eagleton, Terry, Literary Theory: An Introduction. Basil Blockwell, oxford, 1983.

Eagleton, Terry "Marxism and the Future of Criticism" 177-180, In Wood, David (ed.) Levians, Emmanvel (Fwd) Allion, David (Tr. of fwd) Writing the Future, London: Routledge, 1990 x 213 pp.

Eagleton, Terry "The Emptying of a Former Self" (London) Time Leterary Supplement, 1989, May 26-June1, V 4495 P 573-574.

Eagleton, Terry "History, Narrative, and Marxism, 272-281 In Phelan, James (ed.) Reading Narrative: Form, Ethics, Ideology", Columbus, Ohio State Up, 1989 xx, 292 pp.

Eagleton, Terry The Function of Criticism of the Spectator to Post Structuralism, Verso, London 1984 133 pp.

Eagleton, Terry "Marxism and Deconstruction" Contemporary Literature, 1981 Fall v 22 94) p 477-488.

Frow, John "Structurlist Marxism" Southern Review: Literary and Interdisci Plinary Essays 1982, July v 15 (2) p 208-217

Goldmann, Lucien, The Hidden God, Routledge & Kegan Paul, London 1964.

Goldmann, Lucien, Towards A Sociology of Novel, Tavistock

Publications, London 1975.

Geras, Norman "Althusser's Marxism, An Assesment, In New Left Review (ed.) Western Marxism, A Critical Reader, London: Verso 1977.

Glucksmann, Andre "A Ventriloquist Structuralism in New Left Review 9eds.) Western Marxism, A Critical Reader, London: Verso 1977.

Jameson, Fredric, Marxism and From: Twentieth Century Dialectical Theories of Literature Princeton University Press, Princeton, NJ 1971.

Jameson, Fredric, The Prison-House of Language, A Critical Account of Structuralism and Russian Fromualism, Prinection University Press, Princeton, NJ and London, 1972.

Jameson, Fredric, The Ideologies of Theory, Vol. 1, Situations of Theory, Vol. 2, The Syntax of History Routledge & Kegan Paul, London 1988.

Jameson Fredic, Post Modernism or the Cultural Logic of Late Capitalism, Verso, London 1991.

Jameson Fredic, "Marxism and Historicism" New Literary History 11, Autumn, 1979: 41-43

Jameson Fredic, "Meta Commentray" PMLA 86 (January 1071) 9-18.

Kimball, Roger "The Contradition of Terry Eagleton" The New Criterian, 1990, Septempber V. 9, (1) p. 17-23.

Levi-Strauss, Claude, The Savage Mind, Chicago: University Press 1966.

Levi-Strauss, Claude, Structural Anthropology, New York: Dubleday Anchor, 1967.

Levise, John "The Althusser Case; Marxism Today, January 23.

Maconell, Diane, The Theories of Discourse: An Introduction, Basil Blackwell Oxford, 1086,

Macherey, Pierre, "In Interview with Piere Macherey" Tr. and eds. Colin Mercer and Jean Radford, Red letter 5, 1977, 3-9.

Macherey, Pierre, A Theory of Literary Production, Trans Wall, London, Pautledge and Kegan, Henley and Boston, 1978.

Mulhern, Fracis, (ed.) Contemporary Marxis Literary Criticism, Longman, London & New York, 1992.

Piccone, paul, "Structuralist Marxism" Radical America, 3 (5) (September) 25, 1969.

Ryan, Michael "The Marxism-Deconstruction Debat in Literary Theory" New Orleans Review: Leterary and Interdisphinary Essagys, Spring V.11 (1) p 29-35, 1984.

Slaughter, Clibb, Marxism, Ideology and Literature Macmillan, London and Basingtoke, 1980.

Stalin J.V. Marxism and the Problem of Liguistics Peking Foreign Languages Press, 1972.

Thompson, E.P., The Poverty of Theory and Other Essays, New York: Monthly Review Press.

Tomich, Dale :The Peculiarities of Structuralism, Radical American 3 (5) (September) 34, 1969

Tucker, Robert, C (ed.) The Marx-Engles Reader, 2nd ed. New York, Norton.

Wade, Jean-Philippe "The Human Of The Senses: Terry Eagleton's Political Journey to the Ideology of the Aesthetic Theoria: A Journal of Studies. In the Arts, Humanities and Social Sciences 1991, May V. 77 p. 39-57.

Zimmermann, Marc "Polarities and Contradition: Theoretical Bases of the Marxist-Structuralist Encounter, New German Critique, 7 (Winter) 69, 1976.

ساتواں باب

تفہیمات کی فکری اساس

تفہیمات کی فکری اساس

ہرمینٹکس (Hermeneutics) جرمن زبان کے لفظ Hermeneuein سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی تشریحات کے ہیں۔ ہرمینٹکس کی اصطلاح کا ماخذ یونانی لفظ ہرمس (Hermes) ہے جو کہ ایک دیوتا اور دیوتاؤں کا پیامبر بھی ہے، جو اصل میں ان کی تعلیمات کی تشریح اور ترسیل کرتے ہیں۔ انگریزی میں ہرمینٹکس کا لفظ سب سے پہلے ۱۷۳۷ء میں استعمال ہوا۔

تفہیمات (Hermeneutics) انجیل کے متن کی تشریح کا سائنسی فن ہے جس میں قواعد و ضوابط اور مخصوص نامیاتی ڈھانچے اور تدبیر سے درجاتی شناخت ممکن ہو پاتی ہے۔ تشریحات کے یہ قوانین اپنی میکانی حرکیات کے سبب سائنسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ تفہیمات کے سائنسی تکنیک کے علاوہ "فن" (Art) بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کی مخصوص تشریحات میں ترسیل کا عمل خاصا لچکدار ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مشکل قسم کے تکنیکی اور اطلاقی اصول ترسیل کی معنویت کو توڑ پھوڑ کر بھی رکھ دیتے ہیں، یہ بھی کہا گیا کہ تفہیمات کے اعلیٰ انجیلی متن کو "ردِ اساطیر" سے روشناس کراتا ہے اور اساطیری مغالطوں اور افسانوی پیکریت سے نجات دلوا کر متن کی طہارت کرتا ہے کیونکہ اساطیری معنویت ادبی متن کے لئے کسی قسم کا پیمانۂ صداقت وضع نہیں کرپاتی۔ تشریحات کے عمل میں تفہیمات اور اطلاقی فن کے اصول دونوں ہی بہتر تصور کئے جاتے ہیں۔ افلاطون کے یہاں یہ اصطلاح الہیاتی تشریحات کے حوالے سے ہے۔

تفہیمات کے نظریے کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) عام تفہیمات میں تشریحاتی اصولوں کی مدد سے انجیلی متن کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان میں

سیاقی، اشتقاقی، نحوی، تاریخی، ثقافتی، الہیات اور فرہنگ کے تجزیات کو شامل کیا گیا ہے۔

(۲) خصوصی تفہیمات میں مخصوص نوعیت کے اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مخصوص اصناف اور حکایات کا تجزیہ اور مطالعہ کیا جاتا ہے۔

الہیاتی سطح پر تفہیمات کی بنیادی حرکیات کے بنیادی قواعد و ضوابط کے تفہیماتی حوالے سے خاکہ بندی یوں کی گئی ہے:
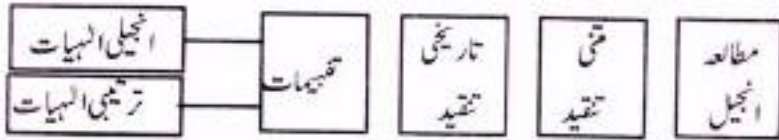
انجیلی تشریحات کا تاریخی پس منظر

(۱) قدیم یہودی شرحیات (Exegesis)

(۲) نئی اور پرانی انجیل سے استفادہ

(۳) Patristic شرحیات (۱۰۰ء تا ۶۰۰ء)

(الف) اسکندریہ عہد (۱۵۰ - ۲۱۵)

(ب) اورجین (۱۸۵ تا ۲۵۴)

(ج) آگسٹن (۳۵۴ - ۴۳۰)

(۴) اینٹی اوچ شامی کتبِ فکر

(۵) قرونِ وسطیٰ کی شرحیات (۴۰۰ سے ۱۵۰۰ء)

(۶) اصلاحی شرحیات (۱۵۰۰ء)

(الف) لوتھر (۱۴۸۳ء سے ۱۵۴۶ء تک)

(ب) کالون (۱۵۰۹ء سے ۱۵۶۴ء تک)

(۷) پس اصلاحی تفہیمات (۱۵۵۰ء - ۱۸۰۰ء)

(۸) جدید تفہیمات (۱۸۰۰ء سے دورِ حاضر تک)

(الف) لبرل ازم

(ب) نئی راسخ الاعتقادی

تفہیمات کو تین بنیادی شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے

(۱) تاریخی ثقافتی اور سیاقی تجزیات

(الف) مصنف اور قاری کی عمومی تاریخی اور ثقافتی ماحولیات کو متعین کرنا

(ب) عام تاریخی احوال کو متعین کرنا

(ج) قاری کو روحانی وابستگی کی درجہ بندی

☆ مصنف کے کتاب لکھنے کا مقصد

(الف) متن کا واضح نہ ہونا، کتاب میں دہرائے جانے والے حصے

(ب) نصیحت آموز نکات کی دریافت

(ج) مرکوز نکات کی مشاہدہ بندی

☆ مختلف متنی حصوں کا سیاق میں مدغم ہو جانا

(الف) واضح حاشیائی حصہ کی شناخت اور ان کی اصل متن سے مطابقت

(ب) متن کے مختلف حصوں کے بہاؤ کا مصنف کے دلائل سے انسلاک

(ج) مصنف کے مظہریاتی اور ترسیلی شعور کا تعین

(د) بیانیہ اور تناظری صداقت کے فرق کو واضح کرنا

(ہ) متن کے مختلف حصوں کی اتفاقی تفصیلات اور تدریسی مرکوزیت کے مابین تفاوت کی نشاندہی

(و) مجوزہ متنی حصوں اور فردیاتی اختصاصی کی درجہ بندی

(۲) فرہنگ اور نحویاتی تجزیہ

(۱) عام ادبی ہیئت کی شناخت

(۲) مصنف نے متن میں جو مرکزی خیال پیش کیا ہے وہ کس قدر سیاق کا حصہ بنا

(۳) متن کے پیراگراف اور فقروں کی فطری شناخت اور تقسیم

(۴) لفظیات کا پیراگرافوں اور فقروں سے انسلاک، جو مصنف کے ارتقائی تصورات کو متعین کرتے ہیں

(۵) انفرادی لفظ کی معنویت کا تعین

(الف) لفظوں کی کثیر المعنویت، زمان اور ثقافت کے دائرے میں لفظ کی شناخت

(ب) متن میں مصنف کے لفظیات سیاق کا تعین

(۶) نحویات کا تجزیہ، جو متن میں کس طور پر تفہیم پذیر ہوتا ہے

(۷) غیر نصابی سطح پر نتائج کا بیان اور مصنف کی بیان کی ہوئی معنویت سے قریب ترین مفہوم کا سراغ

الہیاتی تجزیہ

(۱) موضوعی سطح پر خدا کا فرد سے تعلق

(۲) متن کے اطلاقی پہلوؤں کی دریافت اور حاضر زمانے کے قاری کے لئے آگہی کے حصول میں آسانی

(۳) متن کی معنویت کا اصل متن سے تقابل اور آگہی

(۴) وجدان کی اضافی آگہی کی شناخت اور ترسیل

شلائر ماخر (Schlermacher) (۱۷۶۸-۱۸۳۴ء) نے انیسویں صدی کے شروع میں ہی ولف، ایسٹ (Ast) اور ارنیسٹی (Ernesty) کی لسانی تحقیقی رسائی کے علاوہ انجیلی تشریحات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کیونکہ ان مطالعوں کے اصولوں میں تعارضی متعلقات اور مغالطی نوعیت کے الجھاوے بہت تھے انھوں نے اپنی کتاب "عام تفہیمات" (General Hermeneutics) میں مکالمے کی باہمی تفہیم پر زور دیا۔ ان کے خیال میں تفہیمات وسیع تناظر میں زبانی اور تحریری متن کی تفہیم کا علم ہے جس طرح بچہ کسی نئے معنی کی تفہیم چاہتا ہے جو کہ سیاق کے ماخذ سے جنم لیتے ہیں۔ تفہیمات کے علم میں دلیل و مباحث کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ قاری معنوں کی تفہیم کے لئے قواعدی (لسانی) تکنیکی (نفسیاتی) تشریحات کے پوشیدہ نکات پر سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ شلائر ماخر نے لکھا ہے "مقدس لمحات" کے اندیشوں میں گھر کے فرد انفرادی سطح پر مصنف کے اسلوب سے متعلق بھی ہو جاتا ہے وہ تفہیمات کے

کرے اور روایتی تشریحاتی قوانین کے فریب نظر کا پردہ چاک کرتے ہوئے انجیلی متن کو عام تفہیماتی حدود میں داخل کر کے افہام و تفہیم سے انجیلی متن کو قابل فہم اور آسان بناتا ہے۔

فلسفی ولیلم ڈلتھے (Dilthey)(۱۹۱۰-۱۸۳۳ء) نے تفہیمات کے تفہیماتی فن پر بحث کی ہے۔ انھوں نے انسانی روح کے اثرات کو مسترد کرتے ہوئے اس کے چھوڑے جانے والے نقوش پر سخت اعتراض کیا کیونکہ یہ فن کے دیگر شعبوں قانون، شاعری، تعمیرات، رقص، مقدس متن کی ہیئت میں تو قابل قبول ہو سکتے ہیں جو کہ انسانی روح سے مدغم ہو کر انسانی حس سے رابطہ کرتے ہیں۔ ڈلتھے نے تجربات، تاثرات اور تفہیمات اور نظری سائنسوں کی مدد سے اس کی تفہیم اور افتراق کو واضح کرنا ہی تفہیمات کا اولین وظیفہ قرار دیا لیکن بدقسمتی سے رکلیوع (Recoeur) انسانی اور معاشرتی علوم کے تفہیماتی رابطے کو مثبت تناظر میں نہ دیکھ پائے اور نہ ہی مناجیاتی بنیادوں کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کی جبکہ ڈلتھے نے ان نکات کو سامنے رکھتے ہوئے تفہیمات کا "انسانی نظریہ" خلق کیا جس کا پھیلاؤ اور مختلف فکری اور مناجیاتی دعوے خاصے استدلالی ہونے کے ساتھ ساتھ "علم تفہیم" میں ترتیبی رسائی کو بھی ابھارتے ہیں۔ یوں اس طور پر تفہیمات کی آگہی بہتر طور پر ہو جاتی ہے۔

مارٹن ہیڈیگر (Martin Heidegger)(۱۹۷۶ء-۱۸۸۹ء) کے خیال میں تفہیمات سے اصل لفظ کی تفہیم ہوتی ہے اور انسان کا بنیادی وجود ہی متن کی تشریح کو متعین کرتا ہے۔ تفہیم وجودی سطح پر ذاتی نوعیت کی تفہیمات ہوتی ہیں۔ ہیڈیگر نے تفہیمات کو معروض یا متن کی تشریح کو دنیا کی شروعات سے جوڑ دیا ہے جو کہ تفہیماتی ہیئت کی اصل ہیں۔ ہیڈیگر نے ریڈیکل سطح پر "تفہیماتی دائرے" کے تصور کو سرے سے ہی رد کر دیا جو کہ روایتی طور پر تفہیم کو تشریح کرتی تھی اور انھوں نے مباحث کے ماخذات کو وجودی تشریحات سے ملا دیا۔

ہانس جارج گدامر (Gadamer)(پ ۱۹۰۰) نے فلسفیانہ تفہیمات اور اس کے متعلقات سے بحث کی ہے۔ ان کے خیال میں ہر تفہیم میں تاریخی اور جمالیاتی عنصر بہ آسانی شناخت کیا جا سکتا ہے اور فلسفیانہ سطح پر یہی شعور ادب اور تاریخی متن کی تشریحات میں حصہ لیتا ہے۔ گدامر افلاطونی نظریات سے متاثر ہیں لہٰذا انھوں نے خود کلامیہ تشریحات کو اپنے تفہیمی نظریے میں اہم جگہ دی جبکہ ہیڈیگر کا کہنا تھا کہ تمام تفہیمات "تاریخی" نوعیت کی ہوتی ہیں جبکہ

تاریخی آگہی وجودیاتی نوعیت کی ہوتی ہوئے بھی اس کا تعلق تاریخی نظریات سے روایتی نوعیت کا ہوتا ہے جو تشریحاتی عمل میں عموماً در آتی ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ یہ عمل پورا کا پورا تشریحات کی صورت میں متن پر حاوی ہو کیونکہ وسیع النظر نقاد اور فلسفی ان کو اکثر چیلنج کرتا رہا ہے۔ کیونکہ ہیڈیگر کے بقول زبان "وجود کا گھر" ہوتی ہے۔ گدامر نے اس بات پر زور دیا ہے کہ زبان کا کرداریت قوی ہے لہٰذا تفہیم کے عمل میں زبان ہی زبان کو وثوق کے ساتھ پیش کرتی ہے اور آفاقی اصول زبان ہی کی مدد سے ادراک میں آتے ہیں۔ کیونکہ روحانی عہد کے اثرات تفہیماتی نظریے پر خاصے گہرے تھے جس سے اُنیسویں صدی میں خاصے لوگوں نے اثر قبول کیا ہے اس پرانی اور قابل تعظیم تفہیماتی ہیئت نے جدید شعوریت پر اپنے اثرات ثبت کیے ہیں۔

امریکہ میں ای۔ ڈی۔ ہرچ (E.D. Hirsch) نے گدامر کے نظریات کو منفرد کرتے ہوئے بیٹی (Betti) کے تفہیماتی نظریات کو سراہا اور اس بات کا احاطہ کیا کہ روایتی تفہیماتی مناجیات کو برقرار رکھا جائے جو معروضیت کی بہتر اور کامیاب تشریح کرتا ہے جبکہ اس سلسلے میں جرمنی میں ہیڈیگر اور گدامر اپنے نظریات بولٹ میں (Bultmann)، ایبلنگ (Ebeling) اور فیوچ (Fuchs) اس سلسلے میں تفہیماتی مناجیات کے بنیاد گذار قرار دیے جاتے ہیں کیونکہ ان عالموں نے متن کی تشریحات کے سلسلے میں الہیاتی حوالے سے نئی جہات کا سراغ لگایا اور یوں گدامر کی نظریاتی اور تنقیدی عرق ریزی امریکی الہیات دانوں اور اہل فکر کے لیے نئی فکر و نظر کا سبب بنی۔ لہٰذا رابنسن (Robinson) اور کوب (Cobb) اسے "نئی تفہیماتی الہیات" قرار دیتے ہیں۔

۱۹۴۰ء اور ۱۹۷۰ء کے دوران جرمنی میں ایک ادبی حلقہ بھی اُبھرا جس نے تفہیمات پر ہی نہیں، بلکہ شعریات کے ورک گروپ (Work Group) کو بھی تشکیل دیا، جن میں سزنڈی (Szondi)، جیوس (Jauss) اور اسر (Iser) کے نام سرفہرست ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں سزنڈی نے "تفہیمات ادب کی تاریخ" کے موضوع پر خطبات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور جیوس نے سزنڈی کے نظریات کا کھلم کھلا دفاع بھی کیا، جس کے متعلق یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہ دونوں نظریات لسانی تحقیق کے سلسلے میں ریڈیکل نوعیت کے ہیں جسے "اصلاحی تحریک" بھی کہا گیا اور یہ توقع بھی کی گئی کہ ان نظریات سے ادب اور تاریخ دونوں ہی متاثر ہوں گے۔

گدامر کے بعد فرانسیسی فلسفی اور ماہر الٰہیات رکئیوع (Ricoeur) نے تفہیماتی سلسلے میں کام کیا۔ انھوں نے ہوسرل (Husserl) کی کتاب "آئیڈیاز" (Ideas) کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ رکئیوع نے مظہریات کا تشریحاتی فن پر اطلاق بھی کیا۔ انھوں نے تفہیمات کے سلسلے میں مارکس نطشے، فرائڈ کے نظریات پر اپنی تشکیک کا بھی اظہار کیا اور ساتھ ہی ان میں معنویت کو بھی دریافت کیا، بالکل اسی طرح جس طرح الٰہیات اور لسانی رسائی تشکیل پاتی ہے۔

عموماً مصنوعی شعور متن پر حاوی ہو جاتا ہے لہٰذا متن چیلنج کی صورت میں ابھر کر تشریحات کے عمل میں سے مصنوعی شعور کو بے نقاب کرتی ہے۔ رکئیوع کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تفہیمات، تحلیل فلسفہ اور ساختیات کے مابین رابطے کی راہیں نکالیں اور تکوینی فکری صورتحال سے نئے تفہیماتی نظریے کو روشناس کروایا۔ بعد میں یہی تکون الٰہیات سے تحلیل نفسی میں داخل ہوئی۔ گدامر کے تفہیماتی وصف نے روایت کے مزاج کو محکمہ شکل دینے کی کوشش کی اور نقادوں کے لئے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جو ترسیل کے عمل کو کمزور بناتا ہو جبکہ رکئیوع اس عمل کو راست جانتے رہے اور ہیڈیگر اور گدامر اس طریقہ کار کو نقادوں کے لئے "پس اعصابی" تصور کرتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے خیال میں اس قسم کی تفہیمات صحیح طور پر مناجیاتی ماڈل کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتی۔

۱۹۷۰ء میں گدامر کے سابق شاگرد اور معاشرتی فلسفی جرگن ہبرماس (Habermas) نے گدامر پر لگائے جانے والے تنقیدی الزامات کا جواب دیا اور ان کے "تعصبات" کو درست گردانا کیونکہ ہبرماس کا خیال ہے کو گدامر کی آئیڈیالوجی میں تنقیدی خلا موجود ہے۔ انھوں نے گدامر کے بہت سے خیالات پر شدید تنقیدی اعتراضات بھی کئے اور ایک عرصے تک جرمنی اور جرمنی سے باہر یہ تمام مباحث تفہیماتی فکر کے حوالے سے موضوع بحث بنی رہیں۔ رکئیوع نے نشانیاتی (Semiotic) حوالے سے تفہیمات کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۸۰ء میں دریدا اور فوکو نے پس ساختیاتی رویے کے زیر اثر رہ کر متن کی نئی سمتوں کو متعین کیا اور نطشے کے ریڈیکل تشریحاتی نقطہ نظر سے اسے جوڑ دیا جو کہ تناظری، پس معروضی اور ممیّز نہ کی جانے والی قوتوں کی دلچسپی کے سبب ثقافت کا حصہ بن جاتی ہیں جو صرف "نسلی" تشریحات کے زمرے میں آتی ہیں۔ فوکو نے مظہریات کو سرے سے ہی رد کر دیا کیونکہ یہ نسل، آثار

قدیمہ، جبری دلچسپیوں اور طاقتور ساخت کے سبب آگہی کے عمل کو مسمار کر دیتے ہیں جبکہ دریدا نے ہوسرل کی مظہریات اور ہیڈیگر کی وجودی مظہریات کی موضوعی تنقید کا تجزیہ کیا۔ ہیڈیگر کی رد تشکیل مغرب کے لفظ کی مرکزیت (Logocentrism) کو اجاگر کرتی ہے کیونکہ سوسیور کے خیال میں زبان کے اندر کئی لسانی سانچے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مابعد الطبعیات میں لفظ کی مرکزیت کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے لہٰذا یہی وجہ ہے کہ تفہیماتی نظریے اور اس کی مناجیات میں اصل بنیاد مابعد الطبعیاتی ستونوں پر کھڑی ہے۔ انہی نظریات کو دریدا نے موضوع بحث بنایا ہے اور ییل (Yale) کے نقادوں، پال ڈی مین، بلس ملر اور ہارٹ مین نے ۱۹۸۰ء کے عشرے میں اس پر خاصا لکھا۔

امریکی عملیاتی (Pragmatist) فلسفی رچرڈ روٹری (Richard Rortry) نے تفہیمات کو امریکی فکری فضا میں موضوع بحث بنایا۔ روٹری کے خیال میں تفہیمات اصل میں "بنیاد پرستی" کا نعم البدل ہے جو اصل میں پرانی مابعد الطبعیات اور وجودی تشریحات کا ہی حصہ ہیں اور انھوں نے کرکے گارڈ، جیمس ڈیوی، وٹگنسٹائن، گدامر اور بعد میں ہیڈیگر کو "بنیاد شکن" قرار دیا۔ رچرڈ برسٹائن (Bernstien) نے اس زمانے میں روٹری، گدامر اور ہبرماس سے "نیا مکالمہ" بھی کیا اور استدلال کی نئی جہات کو پالینے کی کوشش کی۔ برسٹائن کا دعویٰ ہے کہ تفہیمات کا نکتہ بذات خود عملیت (Praxis) ہوتا ہے۔

تفہیمات (Hermenutics) کا فلسفہ لکھنے والے کے تصورات کو اس انداز سے تجزیہ کرتا ہے کہ تخلیق سے معاملہ بندی کے دوران یا اس سے قبل لکھاری کن تجربوں اور کربوں سے گذرا؟ اس کی واردات کیا تھی؟ اس نے اپنی فکر کی جو سمتیں کسی تجربے میں بیان کی ہیں، انھیں پڑھنے والا کس قدر متعلق ہو کر ان کی تفہیم کر پاتا ہے۔ ایک اضافی معروض کا عمل کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جو طربیات کی تفہیم بھی ثابت ہوتا ہے، تخلیق کاری کے عمل میں متن کے حوادث اور تجربی نوعیت کے پہلوؤں سے تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے لیکن متن کی تفہیم کے لئے ماحولیاتی سائیکی کو مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ متن اپنے جزیاکل میں حتمی طور پر کوئی صداقت یا حقیقت نہیں ہوتی لہٰذا جہاں عملی اور فکری شرائط متن میں موجود واقعات اور تصورات کی توسیع کا سبب بنتے ہیں وہاں معنویت اور مفہوم کا انتشار بھی ہوتا ہے لیکن پھر

بھی اصل ہرمنیاتی نکتہ یہی ہوتا ہے کہ متن کی معنویت کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور تشریح و تفہیم کی نوعیات سے بھی بحث کی جائے۔ یہی ہرمنیات کا صدیوں پرانا روایتی تصور ہے لیکن اسے ہرمنیات کو تشریح جان لینا بھی نہیں کیونکہ ہرمنیات تشریح کا "کل" نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک جز ہوتی ہے جس میں معنویت کی تشریح ہی سب کچھ ہوتی ہے بلکہ ابلاغ کی ممکنات سے بھی بحث کی جاتی ہے جو رموزی اور اشارتی ہونے کے علاوہ اپنی لسانی ساختیوں کی صوتی اور سیاقی تنظر سے بھی تفہیمیت کا احاطہ کرتے ہیں لیکن ہرمنیات بہر حال اپنے مزاج میں تشریحی رنگ لئے ہوتی ہے کیونکہ تفہیم کے عمل سے گذر کر ہی تشریح ممکن ہو پاتی ہے جو کہ وجودیاتی مظہریاتی ہونے کے ساتھ ساتھ طریق کار کی سائنس بھی ہے۔ ہرمنیات کا تصور بہر حال تفہیم سے شروع ہو کر ہی تشریحات کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔ تفہیم اپنے طور پر موضوعی بھی ہوسکتی ہے مگر تشریح کلیتاً عمرانیاتی نوعیت کی ہوتی ہے جس کا غالب رنگ معروضی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص ذہنی تمدن کو بھی تشکیل کرتا ہے جس میں اہم خلاقانہ مناجیاتی رسائی کے حوالے سے آلاتیاتی نظریے کی جہات کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ بعض دفعہ فکری گرفت کمزور ہو جاتی ہے اور کبھی کبھار ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی ڈرامائی حس جاگ جاتی ہے جو عقل عمومی سے تبدیل ہو کر منطقی انسانی تشریح میں سما جاتی ہے۔ اس مقام پر مزاحمتی رویے متن کی تفہیم میں اس طور داخل ہوتے ہیں کہ تاریخ اور اس کے حقائق اور متن کی ادراکی صداقتیں ایک دوسرے کے لئے مبارزت کا سبب بن جاتی ہیں، ذاتی تعصبات اور نظریۂ حیات کے انتہاپسندانہ رویے ہرمنیاتی تصور کی انا کو سب سے زیادہ مجروح کرتے ہیں۔ ہرمنیات کے نظریے کے بنیاد گذاروں نے سکہ بند ضابطوں کو ہرمنیاتی علم پر نہیں تھوپا۔ لہٰذا اس کو مناجیاتی نظریہ / علم بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ہرمنیات تشریح کی تکنیک سے بحث نہیں کرتی بلکہ یہ معنویت کی اصل کو پا لینے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ فلسفہ اصول شکن ہوتے ہوئے بھی فکر کے نئے سانچوں کو اپنانے میں کسی قسم کا پس و پیش نہیں کرتا۔ اگر کوئی فرد متن کی جتنی بھی موضوعی تفہیم کرنا چاہے یہ اس کے بس میں نہیں ہوتا کیونکہ بعض متن اس قدر معروضی ہوتے ہیں کہ جب بھی اس کی موضوعی تفہیم کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ تفہیم کم اور ذات کا سانحہ زیادہ بن جاتی ہے۔ جیسا متن ہو ویسی ہی تفہیم ہونی چاہیے،

کیونکہ کسی بھی متن کے باطن میں اس کے تفہیمی اور تشریحی حوالے موجود ہوتے ہیں ان حوالوں کی بازیافت اسی وقت ہو پاتی ہے جب متن کے تاریخی تناظر عمرانیاتی سائیکی، تخلیقی مزاج اور اس کے برتاؤ کے نامیاتی پیکروں کی نشاندہی نہ کر دی جائے لیکن جب پہلے سے بنے بنائے مخصوص ذہن سے کسی متن کی تفہیم کی جاتی ہے تو اسے متن کی میکانیت سے کسی قسم کا سروکار نہیں ہوتا بلکہ ایک مخصوص مزاج اور رویوں کے تحت ایک کمزور مجرد تفہیم سامنے آتی ہے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تفہیم کرنے والا تفہیم و تشریح کرنے میں تو کامیاب نظر آتا ہے لیکن وہ متن میں پوشیدہ کیفیت کے اظہار سے محروم ہوتا ہے۔

ہرمنیات کو لسان کے تجزیے کا علم بھی کہا گیا جو اپنے طور پر گمنام ہے لیکن اس تصور کی قدرے اختصاصی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ تفہیم لسانی دائروں میں رہتے ہوئے کسی تخلیقی پارے کی فنکارانہ تفہیم ہے جس میں مرکزی نکتہ بہر حال تشریح پر جا کر ہی اپنا اختتام کرتا ہے جو ادبی یا فکری عمل کی تخلیقی ماہیت، اس کے عناصر، ساختیہ مرکزی خیال اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو زیر بحث لاتا ہے۔

ہرمنیات کی اصطلاح اصل میں انجیل کی تفہیم اور تشریح سے شروع ہوتی ہے جس میں انجیل کی قرأت اور متن پر زور دیا جاتا تھا۔ انجیل کی کنتشری اور قرأت کے حساس مسائل سے بحث کی جاتی تھی لیکن بیسویں صدی میں تشریح کا تصور ہرمنیات سے تبدیل ہو کر نئی سائنسی روش اختیار کر گیا جہاں تحریری متن، قانونی تاویلات اور بالخصوص انجیل کے متن کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جو کبھی کبھار تمدن شکن ہو کر انحراف کی تخلیق کاری بن جاتا تھا۔

جرمن ماہر الہیات فریدرخ شلائرماخر (Friedrich Schlermacher) نے ۱۸۱۹ء میں سب سے پہلے اس موضوع پر خطبات دیے اور ہرمنیات کا عمومی نظریہ پیش کیا جو کہ کسی طور پر ادبی متن کی تفہیم کا فنکارانہ نظریہ بھی تھا۔ شلائرماخر کا ہرمنیاتی نظریہ افقی اور عمودی، دونوں ہی نوعیتوں کا ہے۔ وہ تاریخی آگہی، لسانی متعلقات کو اس طور پر اہمیت دیتے ہیں کہ وہ تفہیم کے عمل کو ایک خالص عمرانیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور کسی مخصوص متن کا کسی دوسرے متن سے تقابل اور روابط پر بھی زور دیتے ہیں ان کے یہاں متن کا ایک وسیع پس منظر اور تناظر ہوتا ہے پھر بھی وہ متن کے تاریخی تناظر میں اتر کر بھی متن کی مکمل تشریح و تفہیم

کا دعویٰ نہیں کرتے کیونکہ تفہیم کا عمل لا محدود ہوتا ہے اور کوئی بھی تفہیم اپنے اصل معنوں میں کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی جبکہ وہ کسی بھی متن کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے ہوئے اس بات کا احساس دلواتے ہیں کہ متن کی تفہیم میں تاریخ، قواعدیات اور زبان کا تقابل نئی سمتوں کا انکشاف کرتے ہوئے نئی معنویات کی راہیں کھولتا ہے۔ اس کثیر الجہات کے پس منظر میں شلائر ماخر کے قدیم صحیفوں اور ان کے متون کی آگہی کے عمل اور ان کے تفاسیر کے طریقہ کار سے ہلکی سی بے چینی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے کیونکہ وہ قدیم متنیات کو بنیادی طور پر آگہی یا گیان کا عمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اسے تفہیم کا عمل کہتے تھے۔ انھوں نے ہرمنیات کے عمل اور اس کے تصور کو مزید کشادگی دیتے ہوئے ہرمنیات کو قدیم صحائف اور پرانے متنوں کے تجزیے اور تشریح کرنے کے روایتی تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے ہرمنیات کے دروازے ہر قسم کے متن کی تفہیم کے لئے کھول دیے ان کے ہرمنیاتی تصور کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تاریخ، قواعدیات، معاشرتی احوال اور اس کے تقابل کے بعد ہی ہم معنویت کے ادراک کا انکشاف کرتے ہیں۔

ہرمنیات تنقیدی اور ادبی حوالے سے نہ تفہیم و اظہار کا اسلوب ہے اور نہ ہی اسے کوئی نظریے کا ترتیب وار نظام کہا جاسکتا ہے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ہومر کے تمثیلیوں کی تفہیم کی کوشش کی گئی۔ ہرمنیات کی تاریخ میں یہ پہلا باضابطہ ہرمنیاتی مطالعہ تھا۔ مسیحی ہرمنیات کی جدید شروعات اس صدی کے اولین دور میں فلو جیوڈس (Fhilo Judaeus) سے ہوئی جنھوں نے ہرمنیات کے اسلوب کی حدود متعین کرتے ہوئے اس علم کو سائنسی تنقید سے قریب تر کردیا، جس نے اُورجین (Origen) کی تحریروں پر بھی اثر ڈالا۔ آگسٹین (Augustine) اور بہت سے ولیلم ڈلتھے (Dilthey شلائر ماخر کا شاگرد اور سوانح نگار)، اسپینز، اپیل (Apel)، بیٹی (Betti)، پال رکئیوع (Paul Ricoeur) کے نام قابل ذکر ہیں، جن کے ہرمنیاتی اسلوب کو بیسویں صدی کے نصف میں نارتھرپ فرائی نے بھی اپنایا۔ فرائی نے اپنے انتقادی نظریے میں معنویت کی جو چار پرتیں بیان کی ہیں۔ اس کی اصل فضا پہلی صدی عیسوی سے متعلق ہے، جو کہ فلو جیوڈس کی تشریحی تحریروں اور درجاتی ہرمنیات میں دکھائی دیتی ہیں جس کو جدید مسیحی تفہیم میں آج بھی اہم مقام حاصل ہے۔ ہرمنیات کی بین موضوعی تنقید کے حوالے

سے جارجین پولٹ نے بھی راہیں ہموار کیں۔

یہودی فکر میں ہرمنیات کا پتہ ایک فلسفیانہ مقالے ہرمیٹک (Hermetic) سے ملتا ہے جو روایتی طور پر ہرمن ٹرس میگو سٹوس (Hermes Trismgistos) سے متعلق تھی۔ ہرمینکا کی تکوین منطق، اخلاقیات اور Exchatologica نوعیت کے تصورات سے باہم ہوکر تشکیل پاتی ہے جس میں بنیادی تصور روح کے انبساط سے شروع ہوکر روح کے تزکیے پر اپنا اختتام کرتا ہے، عرفان کی کیفیت ہی اس عمل میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جس میں افلاطونی فکر اور مشرقی مذہبی تصورات کو شناخت اور ایک دوسرے سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ ہرمیکا ایک قدیم تصور ہے جو مصری فرد سے شروع ہوکر یونانی کلام (Speech) اور ثقافت پر آکر ختم ہوتا ہے، جس کا ایک حصہ لاطینی زبان میں قلم بند ہوا۔ اس پر یہودی فکر کا گہرا اثر رہا جس میں روح کا جوہر مقدس مقام پاتا ہے۔ مجذوبی Merkabah میں کئی ادبی اشارے ملتے ہیں۔ ایک کتاب Poimanders کی جلد سوئم میں ادبیات کے کئی تصورات سے آگہی ہوتی ہے جس میں پرہیزگاری کے تصورات بھرے پڑے ہیں۔ متوکل قسم کے تکوینیات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ نشاۃ کی کیفیت جلد ہی تخلیق سے سائنسی صورت اختیار کرجاتی ہے جو دو جنسوں کو تخلیق کرتا ہے جس میں مرد اور عورت کے افتراق سے بھی تخلیقیت کا عمل ترتیب پاتا ہے اور درمیان میں خدا گفتگو کرتا ہے جس میں تخلیقی برتاؤ کی جہات ابھرتی ہیں۔ ہر تخلیقی دیوتا اپنی الگ جنت بساتا ہے۔ Poimanders میں یہودی عقائد کے ہوتے ہوئے بھی قدیم یونانی اور ثقافت کے خصائص کو بیان کیا گیا ہے جو کہ فلو مکتب (Philo School) کی تعلیمات سے قریب ترین ہے۔ ہرمینکا میں لوگوس، آنتھروپوس کے تصورات جگہ جگہ ملتے ہیں۔ ہرمینکا میں انتھروپوس آدم کی فنی تخلیق سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے جو آباؤ اجداد کی انسانی نسل بھی ہے، جو ماورائے وجود ہونے کے ساتھ ساتھ انسانیت کا تمثیلی عکس بھی فراہم کرتا ہے، جو اصل میں افلاطون کا انسانی تصور ہے جو کہ معطیات کے اتصال کے بعد تخلیقی عمل میں واضح ہوتا ہے۔

ہرمنیات کی بحث باضابطہ متن کی تشریح کے بعد زیادہ موثر انداز میں ابھر کر سامنے آئی جس کی ابتدا ہرمیونک رزمیات کی تشریح سے ہوئی لیکن اس کا اصل مقصد حقائق اور سچائی کی تلاش تھا۔ یہ عمرانیاتی، جمالیاتی، الٰہیاتی اور تاریخی مطالعوں کے پس پشت اور خاص طور پر

قانون اور انسانی سائنسوں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ صوتی فلسفے نے اس کے گیان اور آگہی کے منصب کو مزید تقویت دی اور یوں ہرمنیات فطری سائنسوں میں بھی جگہ پاگئی۔ اس علم کا یہی پھیلاؤ تھا کہ ہانس گیورگ گدامر (Hans Georg Gadamer) نے اس علم کی وسعت کو عالمگیر قرار دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس علم کی وسعت و حدود میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ کائنات کے مزاج میں تبدیلی علم کی ماہیت اور اس کی آگہی پر بھی اثر انداز ہوئی۔

ہرمنیات آگہی کا فن ہے جو اپنی پوری آب و تاب کے باوجود اپنے مکمل وجود کے مکمل اظہار سے قاصر ہے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ کسی تحریر کا متن اپنے اندر تفہیم کی کشادگی سے بھی بھرپور ہوتا ہے، ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ متن کے مخصوص فکری سانچے کو قاری کس طور پر سمجھ رہا ہے۔ اگر فکری عمل کسی مخصوص متن کے فکری ڈھب کو جان جائے تو وہ تفہیم کی کنجی پالیتا ہے۔ جس میں لکھنے والے کی وجودی کیفیت اور ثقافتی حدود میں رہ کر اور کبھی اس سے انحراف کر کے معنویت اور متن کی تشریح ممکن ہوپاتی ہے۔ یہ ممکنات اس وقت انکشاف پاتے ہیں جب وجودی ساختیہ کسی مخصوص فکری سانچے کے اوصاف کو ظاہر کرے اور دیگر وجودیاتی ساختوں سے ایک دوسرے سے ممیز بھی کرے اس کے بعد یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ کس حد تک وجودیاتی سانچے اور فکری سانچے کا سراغ لگالیا گیا ہے مگر تجس اور تشکیک کا مزاج اس عمل میں سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ جو پہلے سے بنائے ہوئے یا تشکیل دیے ہوئے مفروضات کے یکسر مخالف پایا جاتا ہے اور تصور میں کئی فکری دائرے بناتا ہے ساتھ ہی واضح طور پر جواز کے الزامات سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ متن کی تفہیم میں ایک دائراتی تصور سامنے آتا ہے جس کو "ساختیاتی دائراتی نظام" بھی کہا جاتا ہے جو وجودیاتی تشریح فطری یا انسانی سائنسوں کی معروضی کیفیات سے بحث کرتا ہے لیکن ہیڈگر ان تمام باتوں کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ہرمنیات انسانی عدم کے لئے بہترین طریقہ کار تشکیل دیتی ہے۔ ان کے یہاں علم مسئلہ نہیں بلکہ تمام کا تمام ہرمنیاتی ڈھانچہ وجودی نوعیت کا ہے کیونکہ آگہی کا عمل وجودیت کے راستے سے ہی ہو کر جاتا ہے جو ہرمنیات کے علم میں سائنس سے بھی زیادہ اثرانداز ہوتا ہے۔ تشریح کے تمام مباحث کا پس منظر پہلے انعکاس کے عمل سے گذر چکا ہوتا ہے جو کہ نہ معروضی ہوتا ہے اور نہ ہی اس کو موضوعی کہا جاسکتا ہے۔ گدامر کے یہاں تفہیم

میں خارج و باطن کی جنگ سے قطع نظر یہ کھیلے جانے والا ناٹک ہے کیونکہ قاری ہو یا نقاد، تفہیم کے سلسلے میں اپنے کردار کو ناٹک سے جدا نہیں کر سکتا۔ (مراد یہ کہ تشریح و تفہیم کے سلسلے میں جو بھی فرد اس سے متعلق ہوتا ہے اس کا اپنا کردار اس تفہیمی ناٹک میں شامل ہوتا ہے) گدامر متن کو ایک وسیع ڈرامائی کینوس سے جوڑ دیتے ہیں جہاں پر قاری متن کا ایک کردار بن جاتا ہے۔ پڑھنے والا متن کی فضا اور احوال کی اس وقت تک تفہیم نہیں کرپائے گا جب تک وہ تفہیم کے ماحول میں پوری طرح رچا بسا نہ ہو۔ اس کی نظر میں تاریخ کی آگہی اور اس کی تفہیم ہمیشہ گہرائی میں جاکر سمجھ میں آتی ہے کیونکہ زندگی کے ناٹک میں ہر آدمی اپنے طور پر حصہ لیتا ہے۔ فرد تاریخ میں سانس لیتا ہے جس سے اس کے پس کربیہ (نوسٹلجیا) کا تصور سامنے آتا ہے کہ وہ مذہبی صحائف میں اساطیر کے رموز کو اچھوتے انداز میں برتے ہوئے ان حوالوں میں نئی تفہیمی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے ہرمنیات کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہوئے معروضیت، موضوعیت، مثنائیت اور ردِ مثنائیت، ماضی پرستی (پسندی!) متن کی مقتدریت اور حاضر زمانے میں جو عوامل قاری کے مزاج اور تفہیمی برتاؤ میں کشیدگی کا سبب بنتے ہیں اور عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں انھیں کم کرنے کی بھی سعی کی۔ اس نے تاریخی عمل میں عمرانیاتی طریق کار کے تصور کو اپناتے ہوئے تاریخی تعارض کے موضوع پر بحث کی ہی جو اصل میں شعور کے تصادم سے جنم لیتا ہے جو تکمیل کے عمل سے قبل ہی بکھر جاتا ہے جس کا متن اور حاضر لمحات کے درمیان کشمکش کی صورت میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ شعوری نقطۂ نظر سے ہرمنیات کا تمام کا تمام ڈھانچہ غیر تاریخی ہوتا ہے جبکہ ہرمنیات اصل معنی میں کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی ہم علمی سطح پر گدامر، ہابرماس (Habermas)، چامسکی، ژاں پی ژے کی ہرمنیاتی لسانیات کے حوالے سے تشریحی پہلوؤں کو چاہے جتنا بھی معتبر خیال کریں یا اس کے ترتیب وار فلسفے سے جتنی بھی مدد لیں لیکن اصل میں لسانیات محض تفہیم کا نام نہیں ہے لہٰذا اس لئے رکلیوع (Ricœur) کی ہرمنیات کو ہمیشہ تشکیک کی نظر سے دیکھا گیا کیونکہ ان کی نظر میں ہرمنیات "نصف سچائی" ہوتی ہے۔ رکلیوع کے خیال میں ہیگل، ہیڈیگر، بلٹ مین (Bultmann) اور گدامر کے عقائد پس معروضیت کی آگہی سے متعلق ہیں جو طبقے کی مخصوص حدود میں پائے جانے والی معروضی آگہی ہے۔ گدامر نے تفہیمی حدود میں رہتے ہوئے تشبیہات اور مکالمے کے تصور

کو پگھلا سا دیا اور اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا کہ ہر تحریری متن کو ہر شخص اپنے تعصبات اور فاصلے سے نئے اُفق فراہم کرتا تھا، جس میں موضوع اہم نہ ہوتا تھا بلکہ خود مختار معروض میں "میں" کی نہیں بلکہ "تو" کو اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ ایک مشترکہ لسانی حس اور وراثت کو مد نظر رکھتے ہوئے متن کے مواد پر ہی فکری توانائی صرف کی جاتی تھی۔ وہی مکالمہ مد نظر ہوتا تھا جو مصنف اور قاری کے درمیان کئی قسم کے سوالات اٹھاتے ہوئے پیغام کی ترسیل کا سبب بنتا ہو۔ جو کہ کسی متن کی طے شدہ معنویت اور اس کی قدیم اُفق کو پگھلا کر نئی معنویت سے متن کو روشناس کراتا ہو، جس میں قاری متن سے بہت سے فکری نکات اخذ کرتا تھا اور متن قاری سے بہت کچھ حاصل کر کے متوقع اور غیر متوقع امکانات کی توسیع میں مددگار بھی ثابت ہوتا تھا۔

گدامر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہرمنیات یہ کوشش نہیں کرتا اور نہ ہی ان معمولات کا تعین کرنا اس کا کام ہے کہ کسی بھی ادبی یا عملی تحریری تشریح کس طرح صحیح طور پر کی جاسکتی ہے لیکن یہ کوشش ضرور کرتا ہے کہ کس طرح آسانی کے ساتھ متن سمجھا جاسکتا ہے۔ اور اس عمل میں سرخرو ہوا جاسکتا ہے۔ یہ ایک عملی قسم کا نظریہ ہے جو قرات کے نتائج سے متعلق ہوتے ہوئے بھی متن کی معنویت کو متعین کرتا ہے جس کے باطن میں امید کی زمانی حرکیات پوشیدہ ہوتی ہیں، خاص طور پر متن کی معنویت رموزی حدود کا بھی انکشاف کرتی ہیں اور قاری ایک ذاتی اُفق پر قیام کر کے ایک مخصوص احساساتی فاصلے کو محسوس کرتا ہے جو کلی طور پر صحیح تشریح نہیں ہوتی جو کہ متن کی معنویت کو مکمل طور پر اجاگر کر سکے لیکن معنویت کی توسیع کے امکانات کی توقع ضرور ہوتی ہے۔ گدامر نے اپنے نظریہ ہرمنیات میں اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ جہاں متن کی معنویت نہیں ہوتی، وہاں بھی معنویت تلاش کرلی جاتی ہے۔ یوں قاری نئی معنویت کو دریافت کر لیتا ہے کیونکہ عموماً پڑھا جانے والا متن کے مزاج اور اس کی ماہیت سے آگاہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ وہ متن کی تفہیم میں نئے آسمان تسخیر کر کے جس میں تاریخی آگہی، متن کے شعور کو سابقہ اور متوقع آگہی سے دوچار کرتی ہے۔ روشن خیالات کا یہی احساس گدامر کے ہرمنیاتی نظریے کی اساس ہے، لیکن اس کو قدامت پسندانہ نظریہ بھی کہا گیا کیونکہ معاشرتی قیاسات کے پس منظر میں فنکار کی غیر مطمئن روح کسی نہ کسی بچی روایت کو ترتیب دینے میں سرگرم ہوتی ہے۔

یہی اُفق نقد کی جرأت ثابت ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طور پر تاریخ کا ایک ایسا معتبر عمل ہوتا ہے جو ثقافت پر اثر انداز ہو کر متن کو نئی وسعتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ متن کی تفہیم کی نوعیات بھی بدل جاتی ہیں لیکن تاریخی شعور، تہذیبی تسلسل تشریح متن میں آگہی کی نئی راہیں کھولتا ہے کیونکہ عہد گذشتہ کا انعکاس نئی توانائیوں کو جنم دے کر زمانے کی مظہریت اور اس کی اہمیت کا احساس دلواتے ہوئے قاری اور ادیب کے درمیان راہیں متعین کرتا ہے کیونکہ بذات خود ہرمنیات کسی سانچے کے انعکاسی افکار ہوتے ہیں۔ امیلو بیٹی نے گدامر کے متعلق لکھا ہے کہ "انھیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ کامیاب تشریح کیا ہوتی ہے اور نہ انھیں اس بات سے سروکار ہے کہ کامیاب تشریح کا کیا مزاج ہوتا ہے؟"

گدامر نے معنویت کے تاریخی اور ذاتی تناظر میں بات کی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ تفہیم لسانی تشکیل نو کرتے ہوئے ادب اور ادیب کی ثقافت کا بھی تعین کرتی ہے اور ماضی کی گم گشتہ تحریر میں اور اس کی معنویت اور غیر تغیر پذیر زمانی معنویت کو بھی ابھار کر اس کے اصل ماخذوں کا سراغ لگاتی ہے۔ گدامر کے بقول یہ درست ہے کہ "متن اور معنویت کے درمیان ایسا خلا موجود ہوتا ہے جو کہ پل تعمیر کر کے بھی ختم نہیں کی جاسکتی اور یہی خلیج معنویت میں بھی در آتی ہے اور قاری کے وصف کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ قاری کے ذاتی اور عمرانیاتی پس منظر میں متن کی زبانی معنویت کو متعین اور واضح کر دیتے ہیں۔"

ہرمنیات کے روایتی نقاد اس امر پر خاموش ہیں کہ متن کی تشریح کو کس حد تک تشریح کرنا چاہیے جو مصنف کی معنویت کے قریب ترین ہو۔ ہرچ (Hirch) اس سلسلے میں اپنی توجہات کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ "نئے نقادوں کے نزدیک بلاشبہ متن کی معنویت ادیب کی معنویت ہوتی ہے لیکن مسئلہ اپنی جگہ افہام وتفہیم کے مرحلے پر پہنچ کر بھی ادراک کے مغالطے کی نذر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں کئی کمزور تصورات بھی ابھر کر اپنی موجودگی کا احساس دلواتے ہیں کیونکہ متن کی تشریح مصنف کی مخصوص قسم کی لسانی شعوریت کے مظہر سے داخلی اور خارجی نوعیت کی تکنیکی حقیقتوں کو دریافت کرتی ہے جو بذات خود زبان کی معنویت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ لسانیات سے متعلق فلسفہ سے لے کر عام لسانیات تک سے واقفیت کے سبب عام فرد بھی لکھنے والے کے ادراک اور شعور کی گہرائیوں میں آسانی کے ساتھ

اتر جاتا ہے جس میں کسی مخصوص ثقافتی حوالے سے ایک عموی زبان سے روایت کا ترسیلی عمل سماجیانے کا عمل رواں دواں نظر آتا ہے جو ایک مخصوص عمرانیاتی تناظر میں معاشرتی بین العمل کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے جس میں عقائد کے تعصبات سے رکلیوع کے اس فکری اور طریقیات کے ڈھانچے سے ایڈمنڈ ہوسرل (Edmunt Hussert) کے خیالات کی بو آتی ہے۔ ان کی الہیاتی فکر نے جدید عقلیت، ہرمینیاتی اخلاق کے تصورات کو پگھلانے کی بھی کوشش کرتے ہوئے مذہبی علائم اور رموز کو غیر اساطیری ثابت کرنے کی بھی سعی کی جن میں حقیقی گناہ جو آدم وحوا سے اپنی بحث کا آغاز کرتے ہوئے، قرون وسطی، مشرق وسطی، اسرائیل اور یونانی اسطور پر اپنے مخصوص قسم کے الہیاتی تصورات کی مدد سے انھیں تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے لیوی اسٹروس کے اسطوری تصورات کو بیان کرتے ہوئے غیر شفاف کا جواز اور اس کی توجیحات کو بیان کرتے ہوئے غیر شفاف رمزیات کی شیرازہ بندی کی ہے جن کو "اساطیری مشابہت" کہا جاتا ہے جو کہ لسانی اور ثقافتی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ رکیو کے بقول اس کے باطن میں پوشیدہ ساختیے کی ماہیت سے بھی پردہ کشائی کرتے ہوئے اپنے طور پر علامتوں کی تشریح کرتا ہے۔ انھوں نے فرائڈ کی علامات کی تفہیم کرتے ہوئے فرد کی آزادی اور ثقافت سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی ہرمنیات کا مرکزی نکتہ مختلف فکری نظاموں کے مابین علامتی تشریح کا مسئلہ ہے، جن میں سب سے اہم فرائڈ کے خوابوں کی علامات اور لاشعور کی تشریح وتفہیم ہے لیکن اصل بات اس سے زیادہ گہری ہے جو ان کے ہرمنیات کی جدلیاتی جنگ میں واضح لحاتی تفاعل سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے جن کی یہ تین صورتیں ہیں۔

(۱) مظہریاتی ہرمنیات (۲) غیر مظہریاتی ہرمنیات (۳) محرکات کا انکشاف۔

یہ لحاتی کیفیات ہیگل کی علامتوں اور موضوع پر ان کے ریڈیکل خیالات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ رکیوئر پر یہ ردعمل اس لئے بھی ہوا کہ ان کے خیال میں فرائڈ کی تفہیم تشکیکی ہے جو ماورائی التباس کو اپنے زیر اثر رکھتی ہے جس کو وہ "عقیدے کی ہرمنیات" کہتے ہیں۔ انھوں نے مخصوص حدود میں رہتے ہوئے ہرمنیات سے تشریحات کی تعریف لسانی حوالے سے کی جو بعد میں تشریح متن کا بھی احاطہ کرنے لگی جو کسی نہ کسی طور پر لسانی مسائل سے متعلق ہوتی تھی لیکن علامتی اسطور کے ساختیے کی منکر تھی۔

تفہیمی مطالعے اصل میں عملی نوعیت کے ہوتے ہیں جو ذاتی شعور کے نظریاتی یا تصوری طریقہ کار کا عندیہ دیتے ہیں جس میں مرکزی حوالہ متن کی تشریح کا ہی قرار پاتا ہے۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے جب قاری متن کی تشریح اپنے طور پر کرتا ہے تو اس کے یہاں فکری بحران پیدا ہو جاتا ہے لیکن عمومی حس ایسی رعونت کے عمل سے گذرتی ہے کہ قاری کو ادیب تیسرے درجے یا اس سے بھی کم درجے کا لکھنے والا نظر آتا ہے۔ تفہیم اور اس کے بعد تشریح کے عمل میں دو رویے عموماً در آتے ہیں جن میں ایک صورتحال تو خدوخال کی ہوتی ہے تو دوسری سیاق کی صورت میں ابھرتی ہے (کئی سیاقیات بھی سامنے آسکتے ہیں) جو آپس میں کئی غیر متوقع تفاعل کو جنم دیتے ہیں۔ ساتھ ہی مشابہتوں کی میکانیت اس شدت کے ساتھ ابھرتی ہے کہ اس کی متحرکیت کو روکنے کے لئے کسی قسم کی ضمانت نہیں دی جاسکتی اور ساتھ ہی یکسانیت کے پردے میں تمثیلیت، تصورات اور سچائی کی کئی صورتیں نمودار ہو کر دیگر مشابہتوں کا انکشاف کرتی ہیں۔ ان مشابہتوں سے کئی مشابہتیں جنم لیتی ہیں جن کا لامتناہی سلسلہ فکر وخلاق کی نئی تعبیرات کو تخلیق کرتا ہے۔ کائناتی اثر پذیری پر منطقی یکسانیت چھا کر عقائد کی تشکیک کو ابھارتی ہے جہاں علامتوں کی معنویت اس بات کا احساس دلواتی ہیں کہ علامتیں مزید معنویت کا انکشاف کریں گی، لسانی رموز کی نئے جہات کا امکان ممکن ہوگا۔

عقائد اور نظریات کی شدت متن کی تفہیم میں یک طرفہ نقطہ نظر کو بیان کرتی ہیں اور بعض دفعہ شدت جنونیت کی شکل اختیار کر جاتی ہیں جس میں روشن خیالی رجعت پسندی میں تبدیل ہو کر اصل متن کی روح کو مجروح کر دیتی ہے لہٰذا روایت اور قدامت پسند معاشرے میں عموماً روشن خیال نقاد عقائدی نظریات اور نظریاتی تحریروں سے دور رہتے ہیں (کیونکہ مسئلہ انا کی جنونیت کا ہونے کے علاوہ سیاسی بھی ہو جاتا ہے) کیونکہ عمرانیاتی ماحول کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ ہر چیز "قابل ضبطی" ہو جاتی ہے جو مسئلہ علمی یا فکری ہوتا ہے وہ اجتماع کی "انا" کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جہاں نئی معنویت کو پالینے کی امید ہوتی ہے وہاں فکری وسعت کو جکڑ کر سیاہ خانے میں ڈال دیا جاتا ہے لہٰذا تفہیم بھی اسی معاشرے اور علمی ماحول میں پروان چڑھتی ہے جہاں لوگ کھلے ذہن ودماغ کے ساتھ سوچ بچار کرتے ہوں اور وسیع القلب بھی ہوں۔

ہرمنیات کے حلقے میں "ہرمنیاتی دائرے" کے ذیلی تصور کی اہمیت اس وجہ سے بھی

ہے کہ یہ ہرمنیات کی سالم نامیات سے بحث کرتی ہے جو متن کی سالمیت اور اس کی معروضیت سے مکالمہ کرتی ہے جس میں اپنا مخصوص چلن اور تخلیقی برتاؤ کا تمدن پوشیدہ ہوتا ہے جو کسی متن کے اجزاء سے مختلف ہوتے ہیں کیونکہ کسی متن کی تفہیم میں اجزاء کی قرأت کسی ادب پارے کی مکمل قرأت سے مختلف ہوتی ہیں۔ کسی بھی متن کی تفہیم اور اس کا ادراک مکمل طور پر اثر پذیر نہیں ہوتا بلکہ یہ زینہ بہ زینہ اپنے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ "ہرمنیاتی دائرے" کا تصور یہ ہے کہ کسی بھی متن یا اس کے مفہوم کو اجزا یا ایک دو حصوں کی قرات کے بعد سمجھا نہیں جاسکتا اس کے لئے صرف تب ہے کہ تخلیق کا مکمل مطالعہ کیا جائے۔ کچھ عرصے قبل رسالہ "شاعر" میں سریندر پرکاش کے ناول "قسان" کے کچھ حصے شائع ہوئے۔ قارئین نے ہر قسط کو ناول کی مکمل فضا تصور کرلیا۔ مسئلہ جذباتی اس لئے بھی ہوگیا کہ عقائدی نظریات، علاقائی عصبیت اور ایک مخصوص ماحولیاتی تمدن کی سائیکی کو دیگر علاقے کے قارئین نہ سمجھ پائے اور یہ آپ بیتی / جگ بیتی مزاج کے ناول کی کئی اقساط غلط تفہیم کی وجہ سے رسالے میں مزید شائع نہ ہوسکیں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ قاری کی تاریخی تناظر کی عدم آگہی نے ناول کے چہرے کو بگاڑ دیا کیونکہ ناول میں پیش کئے جانے والا انسانی تجربہ بہت کم قاری کے ادراک میں تھا۔

عقائدی تعصبات متن کی تفہیم میں سب سے زیادہ منفی کردار ادا کرتے ہیں۔ کچھ ادبی تخلیقات ایسی ہوتی ہیں جن کو مخصوص قاری اپنے عقائد اور تزکیے کے لئے پڑھتے ہیں۔ اس قسم کے مخصوص متن کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ انسان اپنے ہاتھوں میں آری لئے اپنے ہی وجود کو دو حصوں میں کاٹ رہا ہے، جس میں عقیدے اور نفرت انتہائی سروں پر دیکھی جاسکتی ہے، جہاں انسان کا جوہر غیر انسانی ہوجاتا ہے اور ایک لحاتی سطحی پن ان تحریروں میں نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی واضح مثال ایم۔ اسلم اور رامانند ساگر کے ناول ہیں جن کی قرأت کرکے منفی یا مثبت تطہیر ہوتی ہے۔ پھر ہرمنیاتی رموز اپنا جلوہ اس طور پر دکھاتے ہیں کہ بعض دفعہ تفہیم محض فکر کا انتشار ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ ادب پارے کا کلیدی متن شناخت اور درجہ بندی کی بدنظمی کا شکار ہوکر متن کے بنیادی ڈھانچے میں پائے جانے والی داخلی اور خارجی متغیرات اور میکانی وظائف کے ساختیاتی مزاج کو سمجھ نہیں پاتے کیونکہ نصف اور پہلے سے تشکیل شدہ ذہنی رویے تعصباتی تفہیم کو پروان چڑھاتے ہیں۔ کسی متن کا فکری اختتامی اور فیصلہ کن نتیجہ عموماً

بغیر کسی تفتیش (انکوائری) کے کردیا جاتا ہے۔ اس قسم کے یک طرفہ رویے اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ متن کی شروعات سے قبل اس کے موضوع کو دیکھ کر اس کی تشریحات ذہن میں آنے لگتی ہیں اور یہی روایت تعصبات کو جنم دیتی ہیں۔ اصل تشریحات کبھی بھی اپنے "کل" میں حقیقی نہیں ہوتیں اور نہ ہی انھیں "صداقت" پر مبنی کہا جاسکتا ہے۔ شعور کے وظائف اور دیگر متغیرات سے تفاعل کے "صحیح" اور "غلط" کا ادراک ابھرتا ہے، جو متن سے ہی پھوٹتے ہیں مگر قریب قریب متن کی تمام تشریحات تعصبات کے اُفق سے ہی جنم لیتی ہیں جو ابھری اُفق کی تشریحات سے کم نہیں ہوتیں جس کو گدامر "ذاتی تمثالیتی لغت" کے طریقہ کار کا نام دے کر اس تشریحاتی اُفق کو "تخلیق" کردیتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر ان کی تمام کی تمام تشریحات کی جدلیات کا اُفق دم توڑ دیتا ہے۔ یہاں آکر مکالمہ لکھنے اور پڑھنے والے کے درمیان مخصوص تشریحی لسان کو تخلیق کرتا ہے جو کہ قاری اور مصنف کی لسانی رسائیوں سے ممیز کیا جاسکتا ہے لیکن مشترکہ لسانی تجزیہ ہی متن کی واضح طور پر تفہیم کرپاتا ہے۔ یہاں زبان کی معروضی سیاق خیال کی جاتی ہے۔ اس معروضیت سے قطع نظر انسانی وجود ہی زبان کی تفہیم کرتا ہے جو کہ ذہنی سطح پر ہرمنیاتی وسعت کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ گدامر کے خیال میں کائناتی سطح پر ہرمنیات کی وسعت روایت میں نہیں ہے اور نہ ہی وہ روایت پر تنقید کرتی ہے اور نہ ہی لکھنے والے کے بارے میں جھوٹے الزامات اور نہ ہی کسی قسم کی رائے زنی کرتی ہے۔ لیکن متن میں جو مکالمہ ہوتا ہے اس پس منظر میں وہ ایک مخصوص حسی دائرے میں رہتے ہوئے سوالات اٹھاتی ہے مگر گدامر روایت کے مشترکہ میدان کو مساوی درجہ دیتے ہیں جس میں سچائی کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی ہے جو کہ غیر تحریری دستاویز کو نظر انداز کرتے ہوئے ہیبرماس کے اس مکالماتی تناؤ کی روایت پرستی کے عنصر کا سبب بھی بنتی ہے جس کو گدامر نے بہت ہی سطحی طور پر لیا ہے جبکہ ہابرماس مکالمے کو حقیقی تصور کرتے ہیں، لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کرجاتے ہیں کہ یہ تمام کا تمام عمل "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر چلتا ہے جو شعوری طور پر ایک موضوعی ابلاغ کو ابھارتے ہیں اور یوں مکالمہ تیز فہمی کے التباس کا روپ دھار لیتا ہے۔ گدامر نے جدید لسانیات اور فلسفے سے نہ ہونے کے برابر دلچسپی لی جبکہ ہیبرماس نے اپنے معنیاتی تصورات کی تزئین کرنے کے لئے جدید صوتیات اور

جا سکی، ژاں پی ژے کے تصورات سے مدد لینے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ پھر بھی کسی زبان میں انضمام کی کیفیت کسی متن کی تشریح اس کا کلام اور اس کی بصارت سے قدرے قریب ہو کر بھی اپنی آزادی کا تصور فراہم کر دیتا ہے جو کہ زبان کے ترتیب وار وظائف کا تجزیہ کرتی ہے۔ "معروضیت" زبان میں اپنے ہونے کا احساس دلواتی ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ بات کہہ دی جائے کہ "لسانیات ہرمنیات نہیں ہے۔"

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سا سر کے لسانی تصورات شعریات کی تشریح کے لئے ایک عرصے سے استعمال کئے جا رہے ہیں جس نے ساختیاتی شعریات کی ساخت کو ادب کی تنقید میں روشناس کروایا جس کا نتیجہ صرف نتائج کی نظراندازی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کے خلاف ایک مثبت وظیفہ بھی ثابت ہوا۔

○○

REFFERENCES

Atkins, G. Douglas and Morrow, Laura. Contemporary Literary Theory, The University of Massachuseths Press, Amherst, 1989.

Baumann, J.H. Hermeneutics and Social Science: Approaches to Understanding, London: Hutchinson, 1971.

Betti, Emilio, General Theory of Interpretation, Translated by Susan Noakes, Forthcoming.

Bleicher, Josef, Ed. Contemporary Hermeneutics: Hermeneutics as Method Philosophy and Critique, London, Routlege and Kegan Paul, 1980.

Bultmann, Radolf. Faith and Understanding Translated by P.L. Smith, London: CSM Press, 1991.

Dilthery, Wilhelm Poetry and Experience, Edited by Rudolf A Makkreal and Frithj of Roadi. In Selected Works, Vol. 5, Princetion. N.J. Princeton University Press.

Dilthey Wilhelm, Selected Writings, Translated and Edited by H.P. Richkman, Cambridge, Chambridge University Press, 1976.

Gadamer, Hans-Geor, Philosophical Hermeneutic, Translated by David E. Linge, Berkeley, University of California Press, 1976.

Gadamer, Hans-George, Truth and Method, Edited by Garnett Barden

and John Cumming. New York, Seabl Press, 1975.

Habermas, Jurgen. "The Hermeneutic Claim to Universality" In Bleicher, Contemporary Hemeneutics pp. 181-212.

Habermas, Jurgen, Knowledge and Human Interest, Translated by Jeremy Shairo, Boston Beacon Press, 1971.

Hirsch, ED, Jr. The Aim of Interpretation, Chicago: University of Chicago Press, 1976.

Hirsch, ED, Jr. Validity in Interpretation, New Haven Yale University Press, 1976.

Hoy, David. The Critical Circle: Literature, and Philosophical Hermeneutics, Berkeley: University of California Press, 1978.

Kurzweil, Edith, The Age of Structuralism, New York: Columbia University Press, 1980.

Ricoeur, Paul. The Conflic of Interpretation: ESSO in Hermeneutics. Translated and Edited by Don Ihd Evanston, Ill: North Wesern University Press, 1974.

Ricoeur, Paul, Freud and Philosophy: An Essay on Interpretation. Translated by Denis Savage, New Haven: Yale University Press, 1970.

Ricoeur, Paul, Hermeneutics and Social Science Essays on Language, Action and Interpretation. Translated and Edited by John B. Thomson. Cambridge: Cambridge University Press, 1981.

Ricoeur, Paul. "The Hermeneutical Function of Distanciation", Philosophy Today (1973) 17 (2-4) 129-41.

Schleiermacher, Friedrich. Hermeneutics: The Hand Written Manuscript. Translated by Terrence N. Tice Atlanta: John Knox Press, 1966.

Schleiermacher, Friedrich. "The Hermenuetics: Outlook of the 1891 Lectures." Translated by Jon Wojci and Roland Haas, New Literary History 10 (1978) 1-2.

Weinsheimer, Joel. Gadame's Hermeneutics: A Reading of Truth and Method", New Haven: Hale University Press, 1985.

Wolff, Jonet. Hermeneutic Philosophy and Sociology of Art. London: Routlege and Kegan Paul, 1975.

آٹھواں باب

ترجمے کا ساختیاتی نظریہ

ترجمے کا ساختیاتی نظریہ

ترجمہ لسانی وقتی "میٹافورسیس" (Metamosphosts) ہے جو ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اپنے نفوذ کا عمل مکمل کرتا ہے۔ اس عمل میں تخلیق یا تحریر اپنی مخصوص ماحولیاتی قیود سے باہر نکل کر جہاں ایک طرف نئے معاشرتی گروہ کو فکر کی دعوت دیتا ہے تو دوسری جانب اس حوالے سے اس کی فکری گہرائی اور گیرائی کو صحیح طور پر پرکھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یوں ترجمے کا فن تقابل اور افتراق کے عمل سے گذر کر اپنا مجموعی اور دیانت دارانہ انکشاف کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ترجمہ جذبات، احساسات اور اظہار کی مشابہت کا فن بھی ہے جس کے پس منظر میں اصل متن کی زبان کی آگہی اور دوسری زبان (جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے) میں مہارت اور اظہار پر قدرت ہونا ضروری تصور کیا گیا ہے کیونکہ تخلیق کی اصل زبان کو نئی زبان میں منتقل کردیا جاتا ہے تو ذخیرۂ الفاظ میں ہی وسعت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ذہنی اور لسانی ساختیہ بھی ترجمہ ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی ساختیاتی منتقلی مشاہدے میں آنے والا منطقی مظہر بھی ترجمہ ہو جاتا ہے جو دو زبانوں کے درمیان کو وحدت کے دائرے کو مکمل کرنے میں بھی سرگرم نظر آتا ہے جس سے ارتباط کا شعور ساختیے کے بنیادی ماخذات، میکانیت، فکری یگانگت اور ماحولیاتی جبر کے تصورات ترجمہ کرنے والے کے فنی تجربے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

لسانی رِشتے اور معنویت کی بازیافت

اردو میں ترجمے کی تھیوری پر بہت کم لکھا گیا ہے جو تھوڑی بہت تحریریں سامنے آئی

ہیں وہ قدرے موضوعی اور تاثراتی نوعیت کی ہیں۔ گو ان میں سے چند تحریریں فکر انگیز بھی ہیں لیکن ابھی تک اس موضوع پر اس طور پر پیش رفت نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ اردو کی تاریخ میں ترجمے کا بیش بہا خزانہ موجود ہے اور یوں بھی اردو کی نشو و نما بھی تراجم کے حوالے سے ہوئی اور لسانی نفوذ کا وسیع ساختیہ ہی ایک ایسا عامل ہے جس نے ترجمے کے ذریعے اردو زبان و ادب کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ خاص طور پر عربی، فارسی اور ہندی نے اردو کے ساتھ جو تراجم کے روابط قائم رکھے اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ عربی قواعد، فارسی زبان کی شیرینی اور ہندی زبان کی فطری معصومیت اردو زبان کے مزاج کا حصہ بنی جو ترجمے کے بعد ترجمے کی تفہیمیت کے مزاج میں بھی مددگار ثابت ہوئی، جس نے لسانی ماہیت کے کئی سوالات اٹھاتے ہوئے عقل عمومی کے کئی روایتی تصورات سے مبارزت کی، اور ساتھ ہی بنیادی لسانی حصار سے باہر نکل کر ان مسائل کو اٹھایا جو اس سے قبل عملی اور ادبی چلن کا حصہ تصور نہیں کئے جاتے تھے یا پھر دانستہ طور پر ان مسائل کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ اس کی مثال محمد حسین آزاد کی ترجمہ کی ہوئی تھامس مور کی نظم "بہار کا آخری پھول"، ضامن کنتوری کے انگریزی نظموں کے تراجم کے مجموعے "ارمغان فرنگ" (۱۹۵۱ء) سے دی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ولیم کاوپر کی نظمیں "پرندہ اور جگنو"، "پرندے کی فریاد"، "ماں کی تصویر دیکھ کر"، تلوک چند محروم نے بائرن کی نظم "یونان کے جزیرے" کو ترجمہ کر کے نئے شعری ساختیے پر غور و فکر کی دعوت دی۔ میراجی نے "مشرق و مغرب کے نغمے" مرتب کر کے اردو شاعری میں نئے فکری دروازے کھولے جبکہ متعدد مترجمین نے ای ای کمنگس اور ایلن گنز برگ کی شاعری کو اردو کے قالب میں ڈھال کر اردو شعریات کو نئے تجربات اور نئے فکری رویوں سے آشنا کیا۔

ترجمے میں صرف معنویت و متن ہی کی اہمیت نہیں ہوتی بلکہ انسانی ذہن کے اس "وژن" کو بھی دریافت کیا جاتا ہے جو اشیاء اور معروض کے اثرات سے معنویت کا یقین کرتے ہوئے قاری کے برتاؤ متن خوانی، ثقافتی اثرات اور مصنف، قاری اور مترجم کی اہلیت اور اس جیسے کئی اہم سوالات اٹھاتی ہے۔ ترجمہ عقل عمومی سے نظریں بچا کر اس بات سے سروکار رکھتا ہے کہ مصنف نے جو بات متن میں بیان کی ہے، وہی قاری تک پہنچائی جائے

کیونکہ معروضی حقیقت اصل کتاب یا مسودے کی ہوتی ہے۔ لسان اور الفاظ کو ویسے ہی ترجمہ کی ہوئی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے جو کہ اس کی اصل یا قریب ترین معنویت ہوتی ہے لیکن اصل میں صرف زبان ہی معنویت کا سبب نہیں ہوتی کیونکہ زبان کی نوعیت ایک ساکت مجسمے کی سی ہوتی ہے جس کو مترجم اٹھا کے نئی زبان میں منتقل کر دیتا ہے جبکہ ترجمے کا مزاج متن کے اصل مسودے کا مزاج ہوتا ہے۔ اگر کوئی برقیات کی کسی کتاب کا ترجمہ کرے گا تو اسے ویسی ہی زبان استعمال کرنا ہوگی جو عموماً برقیات کے موضوع کے لئے ہوگی۔ اگر اس موضوع پر ترجمہ کرنے والا شاعرانہ زبان اور الفاظ کا استعمال کرے گا تو یہ ترجمہ کتاب کی اصل فطرت سے مختلف ہی نہ ہوگا بلکہ موضوع کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی۔ کسی تحریر کا ماحول ہی زبان کے اس مخصوص ساختیے کو تشکیل دیتا ہے جو ترجمہ ہو کر بھی اسی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، مترجم کا اظہار ذاتی نہیں بلکہ مبادلیاتی ہوتا ہے جو وہ اصل مسودے سے اخذ کرتا ہے۔ یہی ترجمے کی ساختیاتی حقیقت ہوتی ہے۔ اگر مترجم کے ذہن کی نظریاتی آمیزش اور اس کے تجربات و مشاہدات ترجمے میں در آئیں تو وہ ترجمہ نہیں رہتا بلکہ "ماخوذ" بن جاتا ہے۔ ترجمے میں لسانی مشابہتوں کے علاوہ لسانی نشست و برخاست میں اس بات کو مد نظر رکھا جاتا ہے کہ جو جملہ ترجمے کی زد میں آیا ہے اس کے رد عمل کے طور پر قاری کیا معنی اخذ کرے گا اور اگر ذو معنی ترجمہ ہوا ہو تو اس سے اصل تحریر کے ادراک میں تشکیک پیدا ہو جائے گی۔ ترجمہ کی جانے والی تحریر میں لسانی رشتوں کا جال پھیلا ہوا ہوتا ہے اور یہی تانے بانے ہی معنویت کو دریافت کرتے ہیں۔ مترجم کے لئے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ وہ ان میں بین لسانی باریکیوں کو سمجھنے کا تردد کرے بلکہ اس کی گہرائیوں میں بھی اتر کر تحریر کی اصل روح کو پا لینے کی بھی کوشش کرے انہی لسانی رشتوں کی مدد سے ہم علامات، رمزیات، تمثالی پیکروں کی تشکیل کر پاتے ہیں۔ یہی رشتے جو کسی صورت میں ہوں۔ "سچائی" کو پا لینے میں مددگار ہی نہیں بلکہ حقیقت کے ادراک کے انکشاف میں بھی مدد و معاون ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک چیز کو مشاہدہ کر کے رد و قبول کے مراحل سے گذرتا ہے یہی کچھ مترجم کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ وہ کسی کتاب کو پڑھ کر اپنے طور پر کئی قیاسات ترتیب دیتا ہے اور اس کے آگے کی طرف سوچتا ہے۔ یہ اس کا فکری حق تو بنتا ہے لیکن ترجمہ اس حق کو تسلیم نہیں کرتا

کیونکہ وہ اصل تحریر کو اصل معنویت اور مفاہیم کے ساتھ منتقل کرنے پر زور دیتا ہے۔ قواعدیات کی لسانی تفاوت کے سبب کئی تکنیکی مسائل در آتے ہیں جو "مکمل" ترجمے کے تصور کو دھندلا کر دیتے ہیں۔ محاورات و تشبیہات اور استعاروں کے تمثالی پیکر اردو ترجمے میں بعض دفعہ مسائل کا سبب بنتے ہیں۔ بہت سے عربی اور ہسپانوی محاورے اردو کے روپ میں براہ راست منتقل نہیں کئے جاسکتے۔ اردو میں زیادہ تر ترجمے انگریزی کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ براہ راست ترجمے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر انگریزی اور ہسپانوی قواعدیات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہسپانوی قواعدیات کے اصول انگریزی قواعدیات کے اصولوں سے زیادہ آسان اور عام فہم ہیں۔

ترجمہ اور آفاقی عناصر

ترجمہ جدید لسانی حوالے سے زبان کے امکانات سے بحث نہیں کرتا اور نہ ہی اس میں اس بات کی اہلیت ہوتی ہے کہ وہ کلی طور پر کسی تحریر کی پوری فضا کو ایک زبان سے دوسری زبان کی فضا میں ویسے ہی تبدیل کر لے جو کسی ترجمہ کی جانے والی اصل تخلیق کی فضا ہوتی ہے، مترجم کسی آفاقی قواعد کو تشکیل دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ مترجم تو اپنے ہی رائج قواعداتی نظام سے جمالیاتی اظہار اور ترسیل کی تکنیک اخذ کر کے ترجمے کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ترجمے میں کئی اصول آفاقی نوعیت کے ہوتے ہیں جو اصل میں انسانی سائیکی یا مخصوص اساطیر کے شعور سے متاثر ہوتے ہیں لیکن مترجم کو ترجمہ کرتے ہوئے یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ترجمے کے اصولوں کو بیان نہیں کر رہا بلکہ اصل متن سے ترجمہ ہونے والے متن میں ساختیاتی ارتقا کی کرن کو پھوٹتا محسوس کر رہا ہے لیکن یہ ترجمے کے باطن میں موجود تخیلاتی مظہریت ہیں، جن میں تخیلاتی، مظہریاتی اور معاشرتی وظائف (تفاعل) شامل ہیں، جو معنویت کی ساختیاتی خود کاریت تجریدی نظام میں خود احتسابی کے عمل میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

ذہن اور حقیقت کے مابین ساختیات وحدت

بعض دفعہ فقروں کی ساخت، یا کمل جملوں کی قرأت کے بعد یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس

کے معنی کیا تھے؟ مصنف کا اصل منشا کیا تھا؟ پھر بھی مترجم اس حقیقت کو پالینے کے لئے ادراک کی گہرائیوں میں اترتا ہے۔ وہ ذہن اور حقیقت کے مابین رشتوں کی پیچیدگیوں میں ساختیے کی وحدت تلاش کرتا ہے کیونکہ ثقافتی اور معاشرتی بین العمل کی کیفیت میں "نشان" کی اہمیت ہے جو ترجمے کے مظہر کی اصل ہوتی ہے۔ "نشان" یعنی رموز اور علامات کا نظام تمام معاشرتی رشتوں کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اس کا ادراک ہی معنویت کے ابلاغ میں اپنی حرکیات کے سبب شناخت کیا جاسکتا ہے۔ ہر تخلیقی عمل میں کسی نہ کسی طور پر کوئی نہ کوئی نظریات حیات پوشیدہ ہوتا ہے کہیں نظریہ حیات کی شدت گہری ہوتی ہے کہیں یہ تہذیبی جبر کی صورت میں ابھرتا ہے جو خاص تخلیقی فکر نہیں ہوتی بلکہ نسل در نسل منتقل ہونے والی وہ ثقافت ہوتی ہے جو ساختیات کے علامتی بین العمل اور لسانی رموز اور اشاروں کی مدد سے نسل در نسل سفر کرتے ہیں۔ نئے ثقافتی نفوذ اور لسانی آمیزش سے اس کو کئی رنگ عطا کرتے ہیں۔ نظریہ حیات مدلل بیان کو لسانی حوالے سے بھی ترجمہ کرتا ہے لیکن اصل مسئلہ "خیال" ہی ہوتا ہے بغیر خیال کے لسان تشکیل نہیں پاتی اور بغیر لسان کے ترجمہ ناممکن ہے، پھر بھی لسانی ترجیحات کا جبر ترجمے کے عمیق اور سطحی لسانی ساختیے میں انسانی تجربے اور مشاہدے کے اس تفاوت سے بھی دوچار ہوتا ہے جو کہ مصنف اور مترجم کے مابین عدم ذہنی روابط کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو کہ تمدنی احوال سے عدم آگاہی، لسانی عدم آگاہی سے زیادہ پریشان کن ہوتی ہے کیونکہ لغت خوانی کے بعد کسی طور پر زبان کی معنویت کو حاصل کر لینے میں کامیابی تو ہوتی ہے لیکن ثقافتی و معاشرتی حرکیات کو عموماً اس وقت ہی ترجمہ کیا جاسکتا ہے جب مترجم اس کے اصل تجربے سے دوچار ہوا ہو اور ایک ایسی حقیقت کا انکشاف متناش لسان میں کرے، بلکہ بصیرت اور سچائی کی ترسیل کے عمل میں اصل جوہر کو تلاش کرنے کی سعی کرے۔ ترجمہ در اصل صداقت کی توسیع میں حصہ لیتے ہوئے ان باتوں کو بھی بین السطور میں شامل کر دیتا ہے کہ ہم جیسے ایک عرصے سے نظریہ حیات کا حصہ بنائے ہوئے ہوتے ہیں جن کا اصل میں کوئی منطقی اور انسانی جواز نہیں ہوتا یعنی ہم جس شعور یا معاشرتی لاشعور کو عمومی اور اجتماعی شکل میں استدلالی تصور کرتے ہیں وہ اصل میں استدلالی نہیں ہوتے۔ ترجمہ حقیقت پسند ساختیے سے حقیقت پسند ساختیے میں تبدیل ہو کر کسی تخلیق کی فکری دھاریں بدل دیتا ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا

ہے کہ ترجمہ ہو کر کسی تخلیق میں سچائیوں کی نئی پرتوں کا انکشاف ہوتا ہے جس کا اصل کتاب کو پڑھ کر ادراک نہیں ہوتا تو دوسری طرف قاری ترجمے کو قرأت کرتے ہوئے کئی مسائلی ساختوں سے دوچار ہوتا ہے لیکن جب یہ ساختیاتی محرک رد تشکیل میں تبدیل ہو جاتا ہے تو یہ جذباتی / جنسی اور بعض دفعہ ادراک کے نت نئے مسائل چھیڑتا ہے۔

ذہنی اور فکری ساختیے میں تفاوت

ترجمہ فکر کے مختلف ہائے نظام کو ایک دوسرے میں مدغم کرنے کا وظیفہ مکمل طور پر انجام نہیں دیتا لیکن کسی حد تک فکری روابط کی صورتیں ضرور پیدا ہوا کرتا ہے مگر ذہنی ساختیہ فکری ساختیے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہوتا ہے۔ ذہنی رد و قبول کے مراحل سے گذر کر ایک حتمی فکری ساختیہ ترتیب دیتا ہے بہر حال ساختیاتی عناصر کے شدید قسم کے اثرات اپنے تجریدی رشتوں سے ترجمے کی معنویت کو ممکن بناتے ہیں لیکن لسانی عوامل ترجمے میں پابند مظہریاتی حرکیات کو جنم دیتے ہیں۔ لسانی زندان کے حصار میں ترجمے کا عمل جاری ساری رہتا ہے لہٰذا مترجم اپنے محدود لسانی استحقاق کے دائرے میں رہ کر اپنی لسانی اور اظہار کی ترجیحات کی درجہ بندی کرتا ہے۔ اشاریت، رموز و علائم کی ترجمانی درجہ بندی کرتے ہیں مترجم بیان کے سیاق و سباق کے تناظر کو اپنے تصور میں تشکیل دیتا ہے۔ یہ قیاسی قواعدیات کی بہ نسبت زیادہ اہمیت کا حاصل ہوتا ہے جو اشاروں اور بیان کے مابین کئی رشتوں کو سامنے لاتا ہے، یہ رشتے خاصے عمیق نوعیت کے ہوتے ہیں کیونکہ اس عمل میں مصنف اور مترجم ایک دوسرے سے ابلاغ کرتے ہیں یوں ان دونوں اشخاص کے درمیان مشترکہ میدان (Common Ground) دریافت ہونے کی توسیع کی جاسکتی ہے، یوں دیئے ہوئے معروض کی معنویت میں ارتباط کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اس عمل میں میدان (اصل) معروض کی حرکیات کا امتیازی تصور پیش کرتا ہے جو "نشان" کی خود مختاری سے پردہ اٹھاتے ہوئے "نشان" کو مخصوص معروض کی صورت میں تبدیل کر دینے کے بعد معروض حرکیات "نشان" کا محرک بنتی ہے اور ذہنی جبر، خیال اور موضوعی حوالے سے اپنے چہرے کی تزئین کرتی ہے جس کی مدد سے ہی مترجم معنویت کے احساس کو "فتح" کرتے ہوئے تخلیق کے

بنیادی مفروضات کو دریافت کرتا ہے۔

ترجمے کے عمل میں میدان معنویت اور بیان کی مفہومیت

اس عمل میں ایک قباحت یہ بھی در آتی ہے کہ سکہ بند معنویت فطری طور پر صحیح زبان میں منتقل ہو جاتی ہے لہٰذا کتاب کا واضح ڈھانچہ صوری معروض میں تبدیل ہو کر معنیاتی رسائی کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور مترجم کے ذہن میں کئی زاویہ نگاہ ابھرتے ہیں۔ "میدان"، "معنویت" اور "بیان" ترجمے میں ایک ہی چیز کے تین مختلف نام ہیں لہٰذا ان میں سے ایک لفظ کو بیان کرنے کے لئے دوسرے اور تیسرے لفظ کو بھی بیان کرنا پڑتا ہے، لفظ سے لفظ کی معنویت کا مبادلہ کیا جاتا ہے تاکہ معروضی حرکیات اور معنیات کا نظام اپنے طور پر رواں دواں رہے۔ معنیاتی حوالے سے ترجمے میں معروضی حرکیات کی تفہیمیت کمپوزیشن کے افق پر ساختیاتی عملیات سے منسلک ہوتی ہیں، جس میں اصل تجربہ متوقع معروض کے مطلق تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔
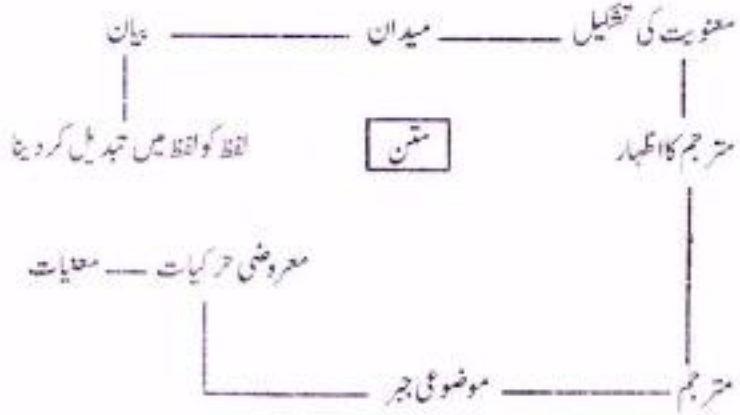
وجودی نقطۂ نظر سے ترجمے کا متوقع معروض "معروض مطلق" کا ہی حصہ ہوتا ہے جو لسانی تغیر کے ایک مخصوص نظام کو ترتیب دیتا ہے جس کو متنی ساختیہ کہا جاتا ہے۔ لسانی درجہ بندی ایک نئے متنی نظم (Order) کا پتا دیتے ہوئے افتراق کے عمل سے گذر کر معنویت کی مباحث کی ابتدا کرتی ہے کہ کس طرح ترجمے کے عمل میں تبدیلی کا عنصر اپنا تا رہا ہے۔ کی

وابستگی غالب عنصر کی صورت میں اُبھر کر تفہیمیت کے تغیراتی نظریے کو تشکیل دیتی ہے جس کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے، تبدیلی کا یہی تصور وظائف کے باطنی مزاج پر بھی اثرانداز ہوتا ہے جس کو ترجمے کا محرک عنصر کہا جاتا ہے لیکن جب ترجمے کا وظیفہ مکمل ہو جاتا ہے تو مترجم یہ محسوس کرتا ہے کہ جو تغیراتی عوامل ترجمے کے عمل میں در آئے ہیں اس میں تعارض کی صورت بھی اُبھر کے سامنے آرہی ہے لیکن یہ کوئی منفی وظیفہ نہیں ہوتا کیونکہ تعارض کی یہی صورت حال ترجماتی نظام کے ارتباط کا کلیدی وظیفہ ثابت ہو کر وظائف کی عمومیت میں آلات (Instruments) کی صورت اختیار کر جاتی ہیں لیکن ایک مسئلہ نہایت ہی شدت کے ساتھ اُبھرتا ہے کہ عام لسانی و عمرانیاتی معمولات ادراک کے نظام میں مغایرت کے عنصر کو شامل کر دیتے ہیں۔ یہ مغایرت بعض دفعہ تصور اور عملیات کے درمیان تصادم کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے کیونکہ مترجم کی "خواہش" اور "شدت اظہار" (قوت) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو جاتی ہے جہاں مترجم اپنے طور پر ترجیحات اور متبادل راہوں کو تشکیل دیتا ہے۔ ارتباط کے مثبت رویوں سے قطع نظر ادراک ترجمے کے تناظر کو ایک بڑے عملی اور تخلیقی حوالے سے بیان نہیں کر پاتا لیکن اصل موضوع ترجمے کے ارتباط میں پائے جانے والے عناصر کی کسی نہ کسی طور پر نفی کرتے ہیں لیکن پھر بھی ترجمے کے عمل میں تبدیلی کا عنصر نظم (Order) کے تصور کو وظائفی انتشار کے باعث نظرانداز کرتے ہوئے لسانی کمزوریاں اور اظہار کی مختلف تکنیک سے بھی نظریں چراتی دکھائی دیتی ہیں۔ بیانیہ کا ڈھانچہ عموماً پیچیدہ ہوتا ہے لیکن ترجمے کے عمل میں بیانیہ ایک ایسا قوی مظہر ہوتا ہے جو تحریر کی معنویت اور ظہور سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتا ہے۔

شعور سے متن کی معنویت کی وابستگی

فطری ترجیحات اور توجیہات کا مزاج اپنے طور پر اُبھر کر ادراک کی پیمانہ تہہ میں بیٹھ جاتا ہے لیکن نشان کی معنیات ایک معروض کی صورت میں زندہ رہتے ہوئے اختتامی وظیفہ ثابت ہوتی ہے۔ عملیاتی تصور قیاسی بلاغت کا چراغ روشن کرتے ہوئے ترجمے کی تفہیمیت کو ممکن سے ممکن تر بناتا ہے۔ معروض کی معنویت آزادانہ طور پر نشان کے اندر چھپے ہوئے

افکار سے پردہ اٹھاتی ہے جو الفاظ اشیاء کی فطرت سے اخذ کئے جاتے ہیں اور لسانی معروض چہرہ نمائی کر کے کسی بھی شے کا تصور خلق کرتے ہیں لہٰذا مترجم کے یہاں زبان تصور کے پردے سے غائب ہو کر معنی اور مفاہیم سے رابطہ قائم کرتی ہے یوں زبان پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ زبان معنویت کی صداقت کو متعارف کروا کر مترجم کی مڈ بھیڑ کی تکرار عناصر سے کرا دیتی ہے اس مقام پر متن کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جبکہ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ الفاظ کے درمیان مترجم جس قسم کی حقیقت تلاش کر رہا ہوتا ہے وہ ابہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ مترجم کے یہاں متن کی معنویت شعور سے وابستہ ہوتی ہے لیکن مفاہیم کی آگاہی کے بغیر ترجمہ ممکن نہیں ہوتا کیونکہ یہی ترجمے کی ساخت کی بھی تزئین کرتے ہیں۔

نئی ترجماتی ساخت کا ظہور

اصل مسودے کا مواد اور بنیادی ساخت اپنے تخلیقی یا تنقیدی متن کے تصور کو ظاہر کر دیتا ہے اس کی شناخت کے لئے مترجم کو زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑتا کیونکہ اصل مسودے کے بنیادی مقالے کا خلاصہ وہ ایک دو قرأت کے بعد پالیتا ہے۔ جب متن ترجمہ ہو جاتا ہے تو ایک نئی ترجماتی ساخت کا ظہور ہوتا ہے وہ اصل تحریر سے نہ زیادہ دور ہوتی ہے اور نہ ہی زیادہ قریب، لیکن پھر بھی متن کا "اصل خیال" کامیاب ترجمے میں خاصی حد تک اپنی اصل صورت میں منتقل ہو جاتا ہے جو در حقیقت متن کے ساختیاتی نظام کے باطن میں پوشیدہ وہ رشتے ہوتے ہیں جو آپس میں ارتباط کے عمل سے گذر کر معنویت کو واضح کرتے ہیں۔ اس مقام پر آکر کئی بار اس قسم کے مواقع آتے ہیں کہ مترجم کو متن میں کئی ایسی قوتیں نظر آنے لگتی ہیں جو متن کو رد کر رہی ہوتی ہیں، وہ خاصا بے بس بھی ہو جاتا ہے اس کو متن کی تشریح کرنے یا اس میں اضافہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ عمل مترجم کے لئے بے معنی صورت حال پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ معنی کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے اصل تحریر میں پوشیدہ تمدنی، عمرانیاتی اور فکری نظام کی حیثیت محض معروضات سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ترجمے کا کلیدی عمل کسی مخصوص نظام کا محتاج نہیں ہوتا، مترجم متن کے اصل مقدمے کو تبدیل نہیں کرتا۔ قاری ترجمے کی قرأت کے بعد تجزیہ کرتا ہے یا دلائل یا واردات کے سلسلے میں اثبات یا

عدم اثبات کی باریکیوں میں اترتا ہے تو اس کا رابطہ مترجم سے نہیں بلکہ اصل لکھنے والے سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل تحریر کا متن ابہام کے پردے میں پوشیدہ ہوتا ہے یہاں تک کہ بعض تصانیف چیستان بن جاتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ لسانی عوامل مصنف پر ہی نہیں بلکہ مترجم کے عمل میں بھی جبر کی صورت میں اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ لسانی جبر مصنف یا مترجم کو آہنی حصار میں گرفتار کر دیتا ہے لہٰذا مترجم کو متن کے بہاؤ کو مد نظر رکھتے ہوئے متن کی درجہ بندی کر کے جزوی نمونے تشکیل دینے پڑتے ہیں تاکہ متن کی شناخت ممکن ہو لیکن مترجم متن میں مقید معنویت کو پالینے کے بعد اس حالت میں نہیں ہوتا کہ اسے رد کرے یا وکالت کرے، کیونکہ عموماً متن کی لسانی بدیعیات ترجمے کی معنویت کی بساط پلٹنا چاہتی ہے۔ مترجم کو ترجمہ کرتے ہوئے جگہ جگہ خیال آتا ہے کہ اصل متن اس طور پر ترجمہ نہیں ہو رہا جیسے ہونا چاہئے، یہ اس سبب ہوتا ہے کہ اسے "خیال دیگر" کی فضا اپنے اطراف کھڑی ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ مصنف اپنی تحریر کو لکھنے کے بعد "نرگسیت" کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ اس قسم کی "نرگسیت" مترجم کو نہیں ہوتی، مترجم نرگسیت شکن ہوتا ہے لیکن وہ مصنف کی نرگسیت کو اس کی حد تک ہی محدود رکھتا ہے اور متن کے اصل جوہر کو بہتر طور پر اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔۔

ترجمے کے لسانی ساختیے کی پیچیدہ صورتحال

لسانی ساختیہ ترجمے کے عمل میں انتشار کا باعث ہوتا ہے کیونکہ زبان کی فطرت ایک طرف پیچیدہ ہوتی ہے تو دوسری طرف زبان کا مزاج کئی ذیلی پوشیدہ صورتوں میں اپنی معنویت اور مفہوم مختلف ہوتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے کو بھی تشکیل دیتی ہے یہ مخصوص لہجہ ایک زبان کی مختلف مقامی شاخوں میں مغائرت کے سبب کو کمزور بناتی ہے لہٰذا مترجم ان ساختیاتی و خاصی لسانی رشتوں کے تانے بانے سے واقفیت رکھتے ہوئے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جو ذیلی شاخوں کی زبانوں کو جاننے والا بھی سمجھ سکے اور ترجمے سے محظوظ ہو سکے۔

قاری اور ترجمہ شدہ متن

مترجم کو دو تمدنی دنیاؤں کے درمیان خود کو معلق کر کے ترجمے کے عمل کو پایۂ تکمیل تک

پہنچانا ہوتا ہے، اس کو کئی جبروں کو خوش آمدید کہنا پڑتا ہے اور کئی کڑوی گولیوں کو ہضم کر کے اپنے قاری تک اظہار کی کوئی ایسی راہ نکالنی پڑتی ہے جو ان کٹھن مراحل سے گذر کر قاری کو ترجمہ کی ہوئی تحریر پڑھنے پر آسانی ہے بلکہ اس کی معنویت میں قاری خود شامل ہو کر اپنے شعور کی مدد سے کئی اہم نکات کا انکشاف کرتا ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ مصنف کی جس بات کو مترجم بیان کر رہا ہے وہی بات صحیح ہو، فکری وسعت کا یہی نکتہ مترجم قاری کو منتقل کرنے کے بعد عموماً منظر سے غائب ہو جاتا ہے، اب قاری پر منحصر ہے کہ وہ کس انداز سے ترجمے کی قرأت کر رہا ہے اور اس کی اپنی فکر اور حسیت کے حوالے سے کتنے گہرائی سے قرأت کے عمل میں سے گذر رہا ہے۔ متن کے معروضی تجربے سے کئی موضوعی نکات ابھرتے ہیں، معروض اور موضوع کے اس سنگم پر ایک خام قسم کا تخلیقی عنصر ابھرتا ہے جو مزید غور و فکر کے بعد کسی اہم تنقیدی یا تخلیقی جہت کی نشاندہی کرتا ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہوتا ہے جب قاری ترجمہ شدہ متن کو سنجیدگی سے پڑھے اس لئے کہ قاری کا کردار ہی متن کی معنویت کو وسعت دینے کا سبب بنتا ہے۔ قاری کا عنصر کسی ترجمے کے متن کو روشن کرتے ہوئے اپنے طور پر مفاہیم و معنویت سے رجوع کرتا ہے جس کا خاص کر اس کے ذہن میں پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے لیکن یہاں بھی لسانی تضادات کا پیچیدہ اور اذیت ناک عمل سر اٹھاتا ہے خاص طور پر انگریزی، جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی، پرتگالی زبانوں کے کئی الفاظ اس وجہ سے اردو میں منتقل نہیں ہو پاتے اور ان کے مترادفات اردو زبان کی لغت یا عام بول چال میں نہیں مل پاتے۔ لہٰذا اکثر و بیشتر مترجمین کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ تخلیق کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کر دیا جائے۔ مترجم سوچتا ہے کہ اس کو سلیس یا عام فہم بنانا اس کا کام نہیں چونکہ اردو کا ذخیرۂ الفاظ محدود ہے لہٰذا متن کو لغوی سطح پر ادھر اُدھر کر دیا جاتا ہے جس میں قاری کو بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ ترجمہ چیستان بن کے رہ جاتا ہے۔ کچھ مترجم یہ کرتے ہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیتے ہیں۔ لیکن بہت سے متنازعہ مفاہیم کو حاشیہ دے کر بیان کر دیتے ہیں یہ خلوص نیتی اچھی چیز ہے لیکن اس سے قرأت کی روانی کو جھٹکے لگتے ہیں، سوچ کے تسلسل کا عمل بار بار ٹوٹ کر انتشار کا شکار ہو جاتا ہے، حاشیہ بندی اور اصل متن کے درمیان فکر کے رشتے آپس میں جڑ نہیں پاتے۔ اس قسم کے تراجم میں مترجم اپنے طور پر محض رابطے کا کام کرتا ہے اور

اس کی کوشش ہوتی ہے کہ قاری مصنف سے براہ راست تعلق قائم کرلے۔ اس تکنیک سے ذرا ہٹ کر بعض مترجم یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح متن کا مفہوم قاری تک پہنچ جائے۔ الفاظ کے اجتماعی ترجے وہ آزادی کے ساتھ لفظیات سے انحراف کرتے ہوئے مفہومیت کی اساس بناتے ہیں اور دلکش پیراؤں میں بیان کرتے ہیں جس کی مثال ٹامس مور کی نظم The Night of other Days جس کو اسی انداز میں نادر کاکوروی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہی کچھ مسئلہ نظم طباطبائی کے معروف ترجمے "گور غریباں" کے ساتھ بھی ہے۔ جہاں تک شاعری کے ترجمے کا تعلق ہے یہ بہت ہی نازک ہوتا ہے۔ سموئیل جانسن نے لکھا ہے کہ "شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔" لیکن شعر کو ترجمہ کرتے ہوئے بہت سے مترجم اسی شعری تکنیک کو اپناتے ہیں۔ یعنی شعر کا شعر میں ترجمہ کردیتے ہیں (اس کی بہترین مثال میراجی کے ترجمے ہیں) زمانے کے ساتھ ساتھ کئی مترجمین اس تکنیک کو خیر باد کر چکے ہیں۔ ان ترجموں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ طریقہ کار پرانا ہو چکا ہے لہٰذا شاعری کو شاعری میں ترجمہ کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی شاعری کے ترجمے میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اس میں مترجم کی ذات شامل ہو جاتی ہے، ہر مترجم ایک ہی نظم کو مختلف طریقوں سے ترجمہ کرتا ہے۔ لارڈ لٹن کی ایک نظم کا ترجمہ "ساز مغرب" کی دوسری جلد میں موجود ہے، جن کی ایک نظم "نابینا پھول والی کا گیت" کو پانچ مختلف مترجمین نے مختلف طور پر ترجمہ کیا ہے جس میں نظم کا سراپا، تخیلات، آہنگ، بحر اور جمالیات کے عناصر خاصے مختلف ہیں لیکن فضا قریب قریب یکساں ہے۔ ترجمے میں اظہار کی ترسیل تو ہو جاتی ہے لیکن درجہ بندی کے اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کس ترجمے کو فوقیت دی جائے۔ نظم کے پہلے شعر کے پانچ مختلف تراجم دیکھیں:

لوگو میرے پھول خریدو
کہتی ہوں عجز سے پھول خریدو
(محمد حسین آزاد)

لوگو چلو مرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو
(سرور جہاں آبادی)

خریدو پھول میرے لینے والو
ذرا ان بہاروں کا مزا لو
(آشک بلند شہری)

میں پھول بیچنے لائی ہوں لو، پری زادو
بن آنکھ والی سے ان کو نجات دلوادو
(سید محمد ابراہیم اشک)

گو وہی مالن کے ٹوٹے ہوئے ڈالی کے پھول
لو خریدارو یہ اندھی بیچنے والی کے پھول
(احسن لکھنوی)

ان تراجم کو دیکھ کر یہ سوال اٹھتا ہے کہ انگریزی زبان کی استعداد اور تربیت ان مترجمین کو کس حد تک ہے؟ آزاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صرف واجبی سی انگریزی جانتے تھے جبکہ دیگر مترجمین کے متعلق بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان سب کی بھی انگریزی کی استعداد نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے ہر مترجم نے اپنے مزاج کے تحت نظم کو ترجمہ کرڈالا۔ مختلف اجزاء کو وحدت کی شکل دے کر ترجمے کے سانچے کو دریافت کرلیا گیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے زبان کئی تضادات کو نظرانداز کرتے ہوئے وہی الفاظ اختیار کرتی ہے جس سے مفاہیم کی تفہیم ہو جائے لہٰذا مترجم کا ذہن شعری ترجمے کے سانچے کو تشکیل دیتا ہے۔ اوپر دیئے ہوئے پانچوں ترجموں میں شعر کا مفہوم کا ابلاغ ہو جاتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک "اندھی مالن پھول فروخت کرنا چاہتی ہے۔" اس سے قطع نظر کہ تمام مترجمین کا شعری ذوق اعلیٰ درجے کا ہے، شعر کے مزاج سے تو وہ سب واقف ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ انگریزی کے لسانی ڈھانچے اور اس کی قواعدیاتی باریکیوں سے مترجمین کو واقفیت نہیں لہٰذا اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

لسانی ساختیاتی نفوذ سے انحراف

اپنی زبان میں کسی متن کو ڈھالنے کا فن بہت کم مترجمین کو آتا ہے۔ اس مجبوری اور کمزوری کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مترجمین لسانی سانچے کی باطنی حرکیات سے واقف نہیں ہوتے

کہ وہ جس زبان سے ترجمہ کر رہے ہوتے ہیں اس زبان کے اندر کئی لہجے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ مفہوم اور متوقع تفہیم زبان میں موجود الفاظ اپنی معنویت کے خود حامل ہوتے ہیں کیونکہ الفاظ کا باہمی رشتہ ہی ترجمے کے نظام کو مستحکم بناتے ہیں۔ یہ تمام کا تمام عمل صرف اور صرف کسی حد تک پیچیدہ لسانی نظام کی وجہ سے سامنے آتا ہے اور مترجم شعوری یا لاشعوری طور پر الفاظ کے پیچھے چھپی ہوئی معنویت کو بھی باہر نکال کر قاری کو بھی اپنی قرأت میں شامل کر لیتا ہے۔ مترجم کو اس سلسلے میں وسیع القلب ہونا چاہئے کہ ترجمہ کی جانے والی زبان کو قاری ویسی ہی دلچسپی سے پڑھے جیسے وہ اپنی زبان پڑھتا ہے، ورنہ مغائرت کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور ترجمہ ہونے والی زبان کا جبر مترجم پر حاوی ہو کر کمزور قسم کے ترجمے کا سبب بنتا ہے جس کو "ترجماتی خودکشی" کہا جاتا ہے۔ لسانی ساختیاتی نفوذ سے انحراف اور محض خارجی کج دھج سے متاثر ہو کر مترجم کبھی بھی کامیاب ترجمہ نہیں کر پاتا۔

متن کی تمدنی فضا سے مترجم کی آگہی

بسا اوقات مترجم کی ذاتی پسند ہی ترجمے کا سبب بنتی ہے۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیقی اور تنقیدی میدان میں ناکام انسان ترجمے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ وہ جو ایک عرصے سے کہا جا رہا ہے کہ بگڑا ہوا افسانہ نگار نقاد بن جاتا ہے۔ یہ بات تو اب ضرب المثل بن چکی ہے۔ اب تک یہ بات اس سے بھی آگے تک چلی گئی ہے کہ بگڑا ہوا نقاد مترجم بن جاتا ہے۔ خیر یہ تو تفریح کی بات ہے اصل میں ترجمے کے لئے یہ تصور کیا گیا ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر دسترس حاصل ہو۔ یہی نہیں بلکہ متن کی اصل تمدنی فضا سے بھی وہ کسی حد تک آگاہ ہو۔ یہی خرابی اردو تراجم میں بعض دفعہ شدید قسم کے مغالطے پیدا کرتی ہے۔ اردو تراجم میں تو یہاں تک ہوتا آیا ہے کہ مصنفین کے ناموں کا تلفظ بھی غلط ہوتا ہے یا دانشور قسم کے مترجم ناموں کے تلفظ کے گورکھ دھندے میں پڑ کر بہت کچھ کھو دیتے ہیں اور صلاحیتوں کو غلط سمت پر ڈال کر خود تو پریشان ہوتے ہی ہیں، قاری کو بھی الجھا دیتے ہیں۔ مثلاً اردو والے انگریزی کے حوالے سے مصنفین کے نام اردو میں منتقل کر دیتے ہیں جبکہ کوئی شخص جو تھوڑی بہت بھی جرمن، فرانسیسی یا ہسپانوی یا کوئی اور زبان جانتا ہے فوراً انگوار لے کر

کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس کو ایسا لکھا جائے۔ ابھی تک ہم یہ طے نہیں کر پائے کہ سارتر کو سارتر، کامیو کو کامو، ہرل کو ہوسرل، جاسپر کو یاسپر، ریکو کو ریکوع، بریخت کو بریشت لکھیں کہ نہیں۔ یا کونسا نام اردو میں لکھا جائے۔ اس بات کا شکوہ منیر الدین احمد نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ انھوں نے ایک مترجم سے شکایت کی ہے کہ وہ نظمیں نہیں سمجھ پا رہا۔ اور جرمن زبان سے مترجم کو شدبد نہیں ہے۔ انھوں نے جرمن زبان کی شاعرہ انگے باخ من کی ایک نظم کا اصل متن سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مترجم نسیم شاہد نے شاعرہ کا نام انگ بورگ بشمین لکھا ہے جس کا تلفظ غلط ہے۔ منیر الدین احمد نے اردو مترجم کے تراجم کا موازنہ پیش کیا ہے جس میں نظم کے عنوان تک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نسیم شاہد نے نظم کے ترجمے میں اپنی طرف سے بہت کچھ ردّ و بدل کر دیا۔

"سایہ"

ہم گلابوں کے طوفان میں گھر جاتے ہیں
لو کانٹے
رات کی تاریکی کو مزید گہرا کر دیتے ہیں
ان ٹہنیوں پر خاموش رہنے والے پتے
ہماری ایڑیوں تلے آکر
آسمان کو سر پر اٹھا لیتے ہیں (ترجمہ: نسیم شاہد)

"گلابوں کی بارش"

گلابوں کی جھری میں ہم جس طرح بھی رُخ پھیرتے ہیں
رات کو کانٹوں سے منور کر رکھا ہے اور پتوں کی
گھن گرج، جو جھاڑیوں میں اتنی مدھم تھی
اب ہمارے تعاقب میں ہے۔ (ترجمہ: منیر الدین احمد)

(ادب لطیف، لاہور، دسمبر ۹۰ء، ص ۱۲۳-۱۲۵)

اردو میں زیادہ تر ترجمے انگریزی کی وساطت سے ہوئے ہیں، بہت کم تراجم ایسے ملیں گے جو براہ راست کئے گئے ہوں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اردو کے عالمی فکر

کااسلوب کے سلسلے میں جو بھی حوالہ بنتا ہے وہ تو آبادیاتی نوعیت کا ہے۔ اردو کے بعد لوگوں کی قریب ترین جو زبان ہے وہ انگریزی ہے اور مبادلے کا لسانی سیاق بھی انگریزی زدہ ہے۔ مثال کے طور پر جب ٹیگور کو ادبیات کا نوبیل انعام ملا تو "گیتانجلی" کے مشمولہ گیتوں کے تراجم ہندوستانی زبانوں میں کئے گئے۔ اس زمانے میں گیتوں کے درجنوں تراجم بنگالی سے ہندی میں ہوئے جبکہ اردو میں زیادہ تر تراجم بنگالی سے نہیں بلکہ انگریزی کی وساطت سے ہوئے، جو برصغیر کے کئی اردو رسائل کے علاوہ مرحوم رسالوں "مست قلندر"، "لطف شباب" اور "مستانہ جوگی" (یہ تینوں رسالے لاہور سے شائع ہوتے تھے) میں شائع ہوتے رہے (مزید مطالعہ کے لئے ملاحظہ کریں "آنند، ستیہ پال، ساؤتھ جرنل اسٹڈیز آف لٹریری اسٹڈی تھرڈ کوارٹر ۱۹۷۹ء، ص ۱۲۲ تا ۱۲۳)

ترجمہ شدہ متن کی ساخت میں اصل کے حوالے سے تھوڑا بہت فرق ضرور آجاتا ہے لیکن جب ترجمہ در ترجمہ ہو تو مسئلہ کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے مترجمین متن کے بنیادی مفہوم کو سمجھے بغیر صرف ترجمہ کر دیتے ہیں جو کہ سراسر علمی اور ادبی بددیانتی ہے۔ ترجمہ کرنے سے پہلے متن کے اصل مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ متن کی فضا سمجھ میں آجانے کے بعد اچھے مترجم اس فضا کو اردو میں منتقل کر دیتے ہیں۔

مترجم کا تمام کا تمام عمل ھوتیت کے رویوں کی نفی کرتا ہے کیونکہ ترجمانی عمل میں مترجم کا عمل دخل بحیثیت فرد کے مصنف سے مغائرت کی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن مترجم کا تخلیق سے اصل تعلق ہوتا ہے کیونکہ اس کا واسطہ ترجمے کے متنی ساختیے کے علاوہ تخلیق کی نامیاتی ساختیاتی فضا سے بھی ہوتا ہے۔ اس دوہرے ساختیاتی عمل میں مترجم اور مصنف کا بین العمل "حقیقی" کم اور علامتی بین العمل نوعیت کا زیادہ ہو جاتا ہے۔ ترجمے کے انتہاطی یا روایتی اصول تجریدی ہیں اور دوسری جانب ساختیاتی ھوتیت کا تمام کا تمام ڈھانچہ لسانی ثقافتی افتراق اور لسانی رموز، دو نامیاتی وحدتوں یا دو افراد کے درمیان ابہام اور مغالطوں کا سبب بنتا ہے۔ ترجمے کی ساختیات متن کی لسانی میکانیت کی تفہیم کا بھی فن ہے، جو ساختیے کی علامتی و رموزی فضا میں رچ کر سماجیانے، ساختیانے اور ترجمیانے کی تکون تشکیل دیتے ہوئے کسی نئی تخلیق (ترجمے) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

پس منظر اور ماخذات

احمد فخری "دو تراجم" رسالہ اردو، انجمن ترقی اردو (دکن) اکتوبر ۱۹۲۹ء، ص ۵۹۳ تا ۶۰۹

ظ۔ انصاری "ترجمے کے بنیادی مسائل" ادب لطیف، لاہور، اگست ۱۹۶۳ء، ص ۹ تا ۱۱

منیر الدین احمد "ترجمے کے آداب" ادب لطیف، لاہور، دسمبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۹

محمد حسن عسکری "اگر ترجمہ سے فائدہ اٹھانے حال ہے" ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۳ء

صلاح الدین احمد (مولانا) "میراجی کے چند منظوم تراجم" ادبی دنیا، لاہور، ۱۹۵۵ء

○○

REFFERNECES

Alisson, David b., "The Difference of Translation", 177-190 In Silverman, Hugh J. (Ed.) Aylesworth, Gary E. (Ed.) The Textural Sublime: Deconstruction and its Differences. Albany: State University of New York Press, 1990 274 pp.

Anand, Satya Pal, "Translation in Translingual Context: A study of Togore's GEETANJLI in multiple Hindi and Urdu versions" South Asian Journal of Literature Studies, Bombay, 3rd Quarterly 1979. vIII (3) pp 112-123.

Bassnett, Susan, "Beyond Translation", New Comparision: A Journal of Comparative and General Literary Studies, 1989 Autumn V8 p. 1098.

Fischer, Michael M.J., Abedi, Mehdi "Translating Quar'anic Dialogues: Islamic Poetics and Politiex for Muslims and for us." Trnaslation Perspective 1990 V5 p. 111-129.

Gaun, Hexin, "Cultural Difference and Untranslatibility", Waiguoyu, 1990 DEc. V (70) p. 66-69.

Jordan, Albert, "Translation and Intercultural Understanding", Bulletin de l'ACLA/Bulletin of the CAAL fall VII (2) 1990.

Li, Miqling, "Styles of Translation", Waiguoyu 1990, Apr. V2 (66) p. 51-42, 62.

Lash, Scott, Post Structuralism and Post Modernist Sociology, An Elgar Reference Collection, Brookfield, Vermonth 05036, U.S.A.

Nida, Eugene A., "Theories of Translation", Waiguoyu, 1980, Dec. V6 (64) P. 2-B,

Niran Jana, Tejaswini, Sitting Translation: History, Post Structuralism and Colonial Context, University of California Press 1992.

Rabassa, Gregory, (Introduction), "The World of Translation, PEN American Centre.

Ross, Stephen David "Translation As Transgression", Translation Perspective, 1990 V5P. 25-42.

Schmidt, Denis J., "Hermeneutics and Literature Three", The Literary Critertion 1990 V25 (3) P. 1, 12.

نواں باب

''گل بہ صنوبر چہ کرد'' اور ساختیات

"گُل بہ صنوبر چہ کرد" اور ساختیات

اردو کے ابتدائی دور کے ڈراموں میں "گل بہ صنوبر چہ کرد" کو معرکے کا ڈرامہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس پر بہت کم محققین اور نقادوں نے توجہ دی۔ صرف امتیاز علی تاج، عبدالحلیم نامی اور اسلم قریشی نے اس بارے میں بڑی سنجیدگی سے محققانہ کام بھی کیا۔ ان محققین کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے یہ ڈرامہ پہلے اسٹیج ہوا پھر چار ماہ رجب المرجب ۱۳۰۷ ہجری مطابق ۲۴ر فروری ۱۸۹۰ء کو شائع ہوا۔ ڈرامے کے سرورق پر مصنف کا نام نہیں لکھا گیا، صرف المشتہر حسینی میاں ظریف تحریر ہے۔ امتیاز علی تاج نے "گل بہ صنوبر چہ کرد" کو مرتب کرتے ہوئے سرورق پر "تصنیف نروان جی مہرواں جی خانصاب آرام" کا اضافہ کیا ہے۔ تاج کا خیال ہے کہ ڈرامے کے مکمل متن کو پڑھنے کے بعد بھی مصنف کے نام کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا۔ انھوں نے بھی نامی کی تحقیق کو تسلیم کرتے ہوئے اس ڈرامے کو آرام کا ڈرامہ ہی قرار دیا ہے لیکن یہاں نامی کو یہ بھی شک ہے کہ یہ ڈرامہ منشی رونق کا بھی لکھا ہوا ہو سکتا ہے لہٰذا امتیاز علی تاج کا خیال ہے کہ چونکہ رونق دکنی محاورے بے تکلفی سے لکھتے تھے وہ آرام کے ہی ہم عصر ہیں، آرام ہی کے نہیں بلکہ اس زمانے کے کئی دوسرے مصنفین کے چند ایک ڈرامے ان ہی سے دوبارہ لکھوائے گئے تھے۔ اس وجہ سے غالباً نامی کو یہ خیال ہوا کہ آرام کے "گل بہ صنوبر چہ کرد" جو بمبئی سے شائع ہوا تھا اسے دوبارہ رونق نے ہی لکھا۔ یہ ڈرامہ چار ابواب پر مشتمل ہے اور جو ڈرامہ کا نام ہے وہ ایک قصے سے لیا گیا ہے۔ اس قسم کے قصے ہمیں عربی اور فارسی کے قدیم قصے کہانیوں کے علاوہ مغرب کے کئی جادوئی اور اساطیری قصوں میں ملتے ہیں لہٰذا یہ کہا نہیں جاسکتا کہ مصنف نے اس ڈرامے کا خیال بالخصوص کس زبان کے

قصے سے لیا۔ بہر حال یہ ڈرامہ طبع زاد نہیں لیکن اس ڈرامے کی زبان دکن اور جنوبی ہندوستان (بالخصوص مدراس) کے مسلمانوں کی زبان سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے۔ عبدالحلیم نامی نے "اردو تھیٹر" جلد نمبر ۲ صفحے پر لکھا ہے کہ:

> "آرام نے یہ ڈرامہ گرہے وکٹوریہ ناٹک (منڈلی) کے واسطے لکھا تھا جو یکم اگست ۱۸۸۳ء کو بمبئی میں اسٹیج ہوا۔ خیال ہے کہ یہ منشی رونق کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ نامی صاحب خود بھی مکمل طور پر کوئی ایسا ٹھوس ثبوت فراہم نہ کر سکے جو ان کے اس بیان کو ثابت کر سکے۔ "گل بہ صنوبر چہ کرد" منشی رونق بنارسی کا لکھا ہوا ڈرامہ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ رونق بنارسی شروع میں دی پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں بحیثیت ایک اداکار کے بھرتی ہوئے۔ اس منڈلی کے مالکان میں دادا بھائی رتن جی ٹھونٹی بھی تھے۔ نامی صاحب نے ان کے ایک بیٹے آروشیر دار بھائی ٹھونٹی سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران آروشیر دار نے نامی صاحب کو بتایا کہ "منشی رونق نے ہماری اور دوسری کمپنیوں کے ڈرامے از سرِ نو لکھ کر اپنے نام سے چھپوائے تھے۔" — لیکن اس کے باوجود زیر نظر ڈرامے "گل بہ صنوبر چہ کرد" پر رونق کا نام کہیں لکھا ہوا نہیں ملتا۔ نامی نے لکھا ہے کہ البتہ زیر غور نسخے کے سرورق پر "المشتہر حسینی میاں ظریف" درج ہے۔ ظریف کے متعلق نامی کا خیال ہے کہ وہ ڈرامہ نویس سے زیادہ نقل نویس تھے۔ وہ (ظریف) مہتا جمنا داس بھگوان داس کتب فروش بمبئی کے یہاں ملازم تھے اور پرانے ڈرامے از سرِ نو لکھتے تھے۔ ان کے ابتدائی ڈراموں میں نہ ان کا نام ہے اور نہ کسی مطبع کا۔ کیونکہ ان کو اور پریس والوں کو کاپی رائٹ کا خطرہ ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا۔ چونکہ ظریف ایک کتب فروش کے لیے پرانے ڈراموں کو نئے الفاظ کا جامہ پہناتے تھے۔ اس لیے دنیائے اردو ڈرامہ ان کے نام سے واقف تھی۔ دادا بھائی رتن ٹھونٹی فرماتے تھے، ظریف بھگوان داس کے یہاں ملازم تھا۔ تین روپیہ تنخواہ پاتا تھا۔ ہماری کمپنی کے ڈرامے چرا چرا کر لکھتا اور بیچتا تھا۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو لیکن ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس نے کسی تھیٹریکل کمپنی کے لیے کوئی ڈرامہ لکھا ہو یا اس کا کوئی ڈرامہ اسٹیج ہوا ہو۔

(اردو تھیٹر نمبر ۲، ص ۱۱۸)

لیکن تحقیق اور مطالعہ کے بعد یہ بات خاصی حد تک ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ ڈرامہ کوئی طبعزاد کھیل نہیں اور نہ ہی اس کو ظریف نے لکھا۔ یہ بات کسی حد تک تسلیم کی جا سکتی ہے کہ حسینی میاں ظریف نے "گل بہ صنوبر چہ کرد" دوبارہ لکھا تاکہ وہ قابل اشاعت ہو سکے۔ اسلم قریشی نے اپنی کتاب "برصغیر کا ڈرامہ" میں لکھا ہے۔ ظریف نے زیر نظر ڈرامہ —— گل بہ صنوبر چہ کرد —— خود تصنیف نہیں کیا بلکہ صرف اس کو دوبارہ اشاعت کے لیے مرتب کیا۔ البتہ یہاں سوال غور طلب یہ ہے کہ آیا ظریف نے اسے دوبارہ تحریر کرتے وقت اس کی زبان میں کوئی تبدیلی یا پلاٹ میں کوئی تغیر و تبدل کیا ہے یا نہیں؟! اس کا تسلی بخش جواب دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی ثبوت نہیں۔ (ص ۳۰۴) جبکہ امتیاز علی تاج اس ڈرامے کی زبان کو رواں قرار دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "گل بہ صنوبر چہ کرد" میں دکنی محاورے بھی ملتے ہیں، جو اصل میں ایدل جی کھوری نے لکھا ہے جس کو آرام نے آسان اردو میں منتقل کیا۔ (آرام کے ڈرامے، ص ا، ص ۱۹۲)

کہا جاتا ہے کہ اس ڈرامے کا پلاٹ "حاتم طائی" سے لیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں ڈراموں میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ تقریباً یکساں ہیں اور زبان و بیان کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان دونوں ڈراموں کی زبان کاسموپولیٹن بمبئی کی زبان ہے۔ بعض محاورات، الفاظ وغیرہ گجراتی انداز کے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں ڈراموں کو لکھنے والا ایک ہی شخص ہو سکتا ہے یعنی شروان جی مہروان جی خاں صاحب آرام۔ یہ قیاس بھی کیا جاتا ہے کہ دادا بھائی رتن جی ٹھونٹی نے کئی منشیوں سے یہ ڈرامہ لکھوایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس ڈرامے کے مختلف حصوں کو مختلف لوگوں نے لکھا ہو جسے بعد میں ٹھونٹی نے اسٹیج کے کاروباری تقاضوں کے تحت کاٹ چھانٹ کر کے اسٹیج پر پیش کیا۔

ڈرامے کی کہانی

چین کے بادشاہ قیموس کی بیٹی شہزادی مہر انگیز، یہ خواہش ظاہر کرتی ہے کہ جو شخص اس کے سوالات کا جواب صحیح صحیح دے گا وہ اس سے شادی کر لے گی ورنہ جواب نہ دینے والے شخص کا سر اس کے جسم سے جدا کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد شہزادی سے شادی کرنے

کی خواہش کے لیے کئی ملکوں کے شہزادے آتے ہیں لیکن ناکام ہو کر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ان بدنصیب لوگوں میں خراسان کا شہزادہ جہماس بھی شامل ہے جو شہزادی کے سوالات کے جوابات نہ دینے کے باعث اپنی زندگی گنوا بیٹھتا ہے۔ شہزادہ جہماس کا بھائی شہزادہ الماس اپنے بھائی کی موت پر افسردہ ہو جاتا ہے اور شہزادی مہر انگیز کو حاصل کرنے کے لیے تدبیر کرنے لگتا ہے۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد وہ بہادر کے ساتھ مہر انگیز کے محل کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے۔ بہادر محل کے محافظ کو باتوں میں لگا دیتا ہے۔ اسی دوران شہزادہ الماس آنکھ بچا کر نہر میں کود جاتا ہے جو اسے محل تک لے جاتی ہے۔ ڈرامے کے دوسرے باب میں شہزادہ الماس، شہزادی مہر انگیز کے محل میں چہل قدمی کرتا ہے۔ مہر انگیز کی سہیلیاں دل آرام اور سوسن نہر میں الماس کا عکس دیکھ کر پریشان و حیران رہ جاتی ہیں۔ الماس کی موجودگی کی اطلاع شہزادی مہر انگیز کو پہنچا دی جاتی ہے۔ پکڑے جانے پر الماس پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ مہر انگیز اور اس کی دونوں سہیلیوں کے سوالات کے بے معنی جوابات دیتا ہے اور اپنے آپ کو پاگل ظاہر کرتا ہے۔ مہر انگیز اور اس کی سہیلی دل آرام شہزادہ الماس کے عشق میں گرفتار ہو کر اسے وہیں تنہا چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ بعد ازاں دل آرام شہزادہ الماس کی محبت میں بے قرار ہو کر فراق اور اضطراب کے ہاتھوں پریشان ہو کر شہزادے سے ملنے کے لیے آتی ہے۔ الماس اس سے شادی کا وعدہ اس شرط پر کرتا ہے کہ وہ مہر انگیز کے سوالات اسے بتا دے، دل آرام اسے بتاتی ہے کہ شہزادی کا سوال "گل بہ صنوبر چہ کرد؟" ہے —— اسے ایک آدمی نے بتایا ہے کہ جو کوہ قاف کے ایک شہر و قاف سے فرار ہو کر آیا ہے اور مہر انگیز کے تخت کے نیچے چھپا بیٹھا ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے دل آرام الماس کو شہر کوہ قاف روانہ کرتی ہے۔ ادھر مہر انگیز شہزادہ الماس کی جدائی میں بے قرار ہے۔ ادھر شہزادہ الماس جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔ وہ خدا سے گڑگڑا کر اپنی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہے۔ وہاں شہزادے کی ایک بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے۔ شہزادے کی کہانی سننے کے بعد یہ بزرگ اس سے واپس لوٹ جانے کو کہتے ہیں۔ لیکن شہزادہ الماس اپنی ضد پر اڑ جاتا ہے تو بزرگ اسے کوہ قاف کا راستہ بتاتے ہیں۔ جب وہ کوہ قاف کی طرف روانہ ہوتا ہے تو راستے میں ایک سیمرغ کے بچوں کو ایک اژدہے کے پنجے سے نجات

دلواتا ہے۔ اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے سیمرغ الماس کو تحفے کے طور پر ایک انڈا دیتا ہے اور اسے اپنے اوپر سوار کر کے فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ یوں شہزادہ الماس کوہ قاف پر پہنچ جاتا ہے۔

جب الماس صنوبر شاہ کے محل میں داخل ہوتا ہے تو وہ پریوں کے ناچ گانوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے۔ جب صنوبر شاہ کو کسی انسان کے پرستان میں داخل ہونے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔ شہزادہ الماس سوداگر کا بھیس بدل کر صنوبر شاہ کے دربار میں آتا ہے اور صنوبر شاہ کو ایک قیمتی موتی تحفتاً پیش کرتا ہے۔ صنوبر شاہ خوش ہو کر حضرت سلیمان کی قسم کھاتا ہے کہ وہ اس کے ہر سوال کا جواب دے گا۔ صنوبر شاہ اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے اس کے سوال ''گل بہ صنوبر چہ کرد؟'' کا جواب اس شرط پر دینا منظور کرتا ہے کہ جب الماس واقعہ سن چکے گا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ الماس یہ شرط قبول کر لیتا ہے۔ صنوبر شاہ اپنی رانی گل، کتے اور طشت پر رکھے ہوئے سر کو طلب کرتا ہے۔ الماس ان کا حال دریافت کرتا ہے، صنوبر شاہ اپنی بیوی کا ایک سیاہ فام سے معاشقہ، اس حبشی کا صنوبر کو جان سے مار دینے کا ارادہ اور کتے کی وفاداری کا قصہ بیان کرتا ہے۔ اس موقع پر گواہ زنگی مرد کے متعلق سوال کرتا ہے تو صنوبر شاہ جواب نہیں دے پاتا۔ لہٰذا وہ اپنی لاعلمی کی بنا پر الماس کی جان بخش دیتا ہے۔ الماس اس زنگی کو صنوبر شاہ کے حوالے کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ صنوبر شاہ الماس کو ایک خنجر تھماتے ہوئے بتاتا ہے کہ جب وہ اس خنجر کو نیام سے باہر نکالے گا تو ایک دیو حاضر ہوگا جو زنگی کو صنوبر شاہ تک پہنچا دے گا۔

ڈرامے کے آخری منظر میں شہزادی مہر انگیز شہزادہ الماس کے فراق میں گا نا گاتی ہے۔ دل آرام اسے الماس کے آنے کی خبر سناتی ہے۔ مگر شہزادی مہر انگیز کو یقین نہیں آتا۔ اسی دوران مہر انگیز کے والد اور الماس کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ الماس مہر انگیز کے جوابات دینے سے قبل موقع کے گواہوں کو طلب کرتا ہے۔ مہر انگیز انھیں جب پیش کرنے سے پس و پیش کرتی ہے تو الماس تالی بجاتا ہے اور ایک قوی ہیکل دیو حاضر ہوتا ہے۔ وہ زنگی مرد کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ادھر بہادر قاضی کے لباس میں اسٹیج پر آتا ہے۔ اس کا باپ دلاور حکیم کی عورت کو جو اصل میں بہادر کی معاشقہ ہے لیے ہوئے اسٹیج پر آتا ہے۔ دہقانی اور لعلہ بھی

آتے ہیں۔ بہادر قاضی بنا ہوا مہر انگیز کی شادی شہزادہ الماس کے ساتھ کرا دیتا ہے۔ ادھر بہادر کا عشق بھی کامیابی حاصل کرتا ہے اور اس کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔

''گل بہ صنوبر چہ کرد'' کے لیے عموماً کہا گیا کہ یہ ایک تفریحی ڈرامہ ہے۔ یہ تفریحی چاشنی تو لیے ہوئے ہے مگر جب اس ڈرامے کے مختلف اجزاء کو سمیٹا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈرامہ فرد کے ذہنی اور عمرانیاتی سانچے سے بھرا ہوا ہے۔ مراد یہ کہ انسانی فطرت کے باطنی سانچے سے لے کر معاشرتی سطح پر فرد کی منفی اور مثبت سرگرمیوں اور اس سے تشکیل پانے والے معاشرتی سانچے کا وسیع تناظر ڈرامے میں باآسانی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زیر بحث ڈرامے میں جو چھوٹے بڑے سانچے سامنے آتے ہیں وہ سب کے سب ایک ایسے فکری اور عمرانیاتی نمونوں (پیٹرن) کا ساختیہ ہے جو زمان و مکان کی حرکیات سے اپنی صورت تو بدل لیتا ہے لیکن نئے جذباتی یا معاشرتی رشتے ایک ساختیاتی حصار میں مقید رہتے ہیں۔ اگر یہ رشتے اس حصار سے (جو ممکن نہیں) اتفاق سے باہر نکل بھی جائیں تو ڈرامے کا پلاٹ، وحدت تاثر (وحدت مکان، وحدت زمان، وحدت عمل) رحم و خوف، سفاکی، تشدد پسندی، تدبیر کاری اور رومانیت، نفرت، تناؤ، تحیر و استعجاب اور رعب و جلال وغیرہ ایک سیکنڈ میں مٹی میں مل کر خاک ہو جائیں گے۔ ''گل بہ صنوبر چہ کرد'' بنیادی طور پر دو مختلف کہانیوں کا ایک کھیل ہے۔ یعنی ایک طرف تو یہ روایتی نوعیت کا رومانی ڈرامہ ہے، جس میں عشق و محبت اور انسانی کمینگی کے جذبات کو پیش کرتے ہوئے تجسس کی ایک ایسی فضا باندھ دی جاتی ہے جو ڈرامے کی کہانی کو طول دیتی ہے اور ڈراما دیکھنے والا یا پڑھنے والا اس میں مزید دلچسپی لیتا ہے۔ ہیئتی سطح پر ڈرامے میں ایک طربیہ کہانی ہے تو دوسرے حصے میں المیہ کہانی جو ڈرامے کو ہیئتی اور تفریحی سطح پر مستحکم کرتی ہے۔ ہر حصے کی اپنی ساخت ہے اور اس میں انسانی رشتوں میں سے نئے رشتے ابھرتے ہیں اور یہی رشتے ڈرامے کا تانا بانا بنتے ہیں۔ انسانی ذہن کا ساختیہ تضادات سے معروض کی اشیاء سے اپنا ماحولیاتی رشتہ قائم کرتا ہے، کبھی وہ سفید رنگ کو پسند کرتا ہے کبھی سیاہ رنگ کو، کبھی اس کے لیے ثواب ذریعہ نجات بن جاتا ہے تو کبھی گناہ کی لذت سے اس پر نئے ساختیاتی نمونوں (رشتوں) کا انکشاف ہوتا ہے۔ مثلاً ڈرامے میں صنوبر شاہ اپنی بیوی کا حبشی غلام سے عشق کی آگہی کے بعد اسے قتل کرنے کا قصد کرتا ہے۔ یعنی صنوبر شاہ

کا اپنے حبشی غلام سے آقا و غلام کا رشتہ تھا جو ایک معاشرتی رشتہ بھی ہے جو کہ معاشرتی سطح پر تبدیل ہو جانے کے بعد سفاکانہ ساختیے کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسانی ساختیہ معاشرتی احوال سے ترتیب پا کر ایک ساختیاتی نمونے میں سے کئی چھوٹے بڑے معاشرتی یا انفرادی ساختیاتی نمونوں کو جنم دیتا ہے۔ ڈرامے میں فردیاتی یا معاشرتی ساختیے کی صورت داخلی بھی ہے اور اسے معروضی حوالوں سے بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے کرداروں کی نظر میں تقریباً اس ڈرامے کے ہر کردار کا باطن معدوم ہے۔ انسانی چہروں کے اس پراسرار عمل نے ڈرامہ میں تجریدی فضا قائم کر دی ہے کیونکہ کرداروں کا معروضی مکالمہ اس کے باطنی مکالمے سے متصادم ہے۔ تصادم کی یہی کیفیت ڈرامائی عمل کو ایک طرف تو چار چاند لگاتی ہے تو دوسری طرف یہ عمل انسانی رشتوں کے مختلف ساختیے کو بھی تشکیل دیتی ہے۔ کیونکہ اس عملی تضاد سے ڈرامے کا کردار اپنی کامیابی کا متوقع خواب بھی دیکھتا ہے۔ کردار اپنی معروضی شخصیت کو تبدیل کر کے اپنی شخصیت کا نیا ساختیہ بھی بناتا ہے تاکہ اپنے ہدف کو حاصل کر سکے۔ ڈرامے میں جب صنوبر شاہ کو پرستان میں ایک انسان (الماس ڈرامے کا ہیرو) کی آنے کی خبر ملتی ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے، لیکن شہزادہ الماس اس کے سامنے ایک سوداگر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ الماس کی شخصیت کا یہ عارضی اور مصنوعی ساختیہ معروضی مظہر ہے، جس سے دیگر رشتے جنم لیتے ہیں۔ الماس کا سوداگر کا روپ دھارنا ہی اس کے ارادوں میں کامیابی کا سبب بھی بنتے ہیں لیکن ڈرامے میں جتنے بھی انفرادی، معاشرتی یا معروضی نمونے ہیں وہ سب کے سب ایک مخصوص ماحولیاتی نظام کی ساختیے میں مقید ہیں۔

”گل بصنوبر چہ کرد“ کے ڈرامائی اور بیانیہ واقعات ایک دوسرے سے اس قدر جڑے ہوئے ہیں کہ کئی فکری ساختیے ڈرامے کی کہانی کو بڑھاتے ہیں۔ جہاں فکر و معنویت اور تجسس کی گرہیں جتنی کھولی جاتی ہیں تو اس سے ڈرامے میں دلچسپی مزید بڑھ جاتی ہے۔

”گل بصنوبر چہ کرد“ چار ابواب پر مشتمل ہے جس میں اکیس مناظر ہیں جن میں بارہ مناظر سنجیدہ نوعیت کے ہیں بقیہ نو مناظر مزاحیہ اور تفریحی ہیں۔ ڈرامے میں کئی ساختیے ملتے ہیں:

المیاتی ساختیہ:

(۱) خراسان کے شہزادے جہماس کا مارے جانا

(۲) صنوبر شاہ کا حبشی غلام کو قتل کرنے کا ارادہ

(۳) الماس کا اپنے بھائی کی موت پر رنجیدہ ہو جانا

(۴) شہر قاضی کا فوت ہو جانا

طربیہ ساختیہ:

(۱) قرض خواہوں کا مقروض کی تلاش میں نکلنا

(۲) مقروض کا چھپتے پھرنا

(۳) بہادر کا ایک شربت کو پی کر بے ہوش ہو جانا

(۴) محبوبہ کا اس کو اٹھوا کر صندوق میں بند کر دینا

(۵) قرض خواہوں کا صندوق اٹھائے آنا اور اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ جانا

(۶) لعلہ سے عشق و محبت کی باتیں کرنا

(۷) دیہاتی کو ناچ نچانا

(۸) بہادر کی اپنے باپ دلاور سے مزاح آمیز جھڑپیں

تجریدی ساختیہ:

(۱) مہر انگیز کا حسن اور ذہانت (تجریدی ساختیہ)

(۲) مہر انگیز ایک لڑکی ہے (عمومی نوعیت کا ٹھوس تجریدی ساختیہ)

(۳) مہر انگیز چین کے بادشاہ کی بیٹی ہے (خصوصی نوعیت کا ٹھوس تجریدی ساختیہ)

”گل بصنوبر چہ کرد“ میں جس قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے، اس کا لسانی مطالعہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا تعلق ڈرامائی فن کی جمالیاتی سے ذرا کم ہی میل کھاتا ہے لیکن اس کو ساختیاتی لسانیات کے اصولوں پر جب بھی پرکھا جاتا ہے تو مسئلہ ساختیات کی لسانیات کا کم اور اسلوبیات کا زیادہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ساختیات کا اسلوبیات سے کوئی خاص تعلق نہیں اور کوئی اس ڈرامے کی زبان کو ساختیاتی بنیادوں پر تجزیہ کرے گا تو اسلوبیات کی جمالیاتی اقدار اس

ڈرامے کی باطنی کیفیت کا کسی طور پر بھی انکشاف نہیں کرتیں۔ "گل بہ صنوبر چہ کرد" کا تمام کا تمام لسانی اسلوب ڈرامائی فن کے تقاضوں کے تحت تشکیل پاتا ہے اور مکالموں کی صورت میں اداکار کی زبان سے جس اظہار کی تکنیک کو استعمال کیا جاتا ہے اس میں ایسے رموز کو استعمال کیا جاتا ہے کہ اداکار اس کے معنوں سے واقف ہوں کہ نہ ہوں لیکن ناظرین اس کی معنویت کو سمجھ لیں۔ یعنی لسان کی صارفیت پسند ساختیات کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جو بھی پیغام ناظرین تک پہنچایا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی مخصوص تناظر کے پس منظر میں ہوتا ہے۔ یہی پیغام ڈرامائی بیانیہ (کہانی) سے ناظرین کا رابطہ بن جاتا ہے۔ بشریاتی اور عمرانیاتی ساختیے کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ڈرامہ افراد کو ان کے نام، مرتبے اور شخصیت کے دیگر افراد کے آپسی تعلقات اور رشتہ داری اور ان کے مثبت و منفی روابط کو بھی مدنظر رکھے ہوئے ہے، مکالمات میں تشریح بھی ہے جو تزئین کلام بھی ہے۔ اسلم قریشی نے لکھا ہے۔ "ان ڈراموں کی نثر اور اسلوب میں ایک ڈرامائی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جوشیلے اور جذبے کے فشار کے مواقع پر حروف ربط کو اکثر حذف کر دیا جاتا ہے۔ یہ طرز کلام ڈرامائی اثر پیدا کرنے کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوتا ہے۔" (برصغیر کا ڈراما، ص ۳۰۸)

ڈرامے میں مختلف معاشرتی طبقوں کے افراد کے لسانی تجربے کا بھی اظہار ہے۔ مثال کے طور پر اس ڈرامے میں سود خور پٹھان نورالدین اپنے خاص انداز میں فارسی کی آمیزش سے اردو میں مکالمے بولتا ہے جبکہ رام چند بنیا مراٹھی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے۔ ڈرامے میں بمبئی کی شہری زبان استعمال کی گئی ہے جہاں کے باشندے تقریباً تمام علاقائی اور معاشرتی طبقوں کی زبانوں کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں جو کہ ڈرامے میں مزاحیہ ساختیے کو بھی تشکیل دیتے ہیں۔ ڈرامے میں انسان کے ذہن کو کسی طور پر تمام معاشرتی یا ماحولیاتی فعلیات کا ماخذ قرار نہیں دیا گیا۔ ڈرامہ کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس شدت سے ہوتا ہے کہ اصل معنی ساختیہ کے باطنی معاملات (عشق، فراق، شادی) اساطیری واقعات (پیر مرد کا ظاہر ہونا، الماس کو ارادے سے باز رکھنا۔ سیمرغ کے بچوں کو اژدہے کے پنجے سے نجات دلوانا۔ اس احسان کے بدلے سیمرغ کا الماس کو اپنے اوپر سوار کر کے اڑ جانا، خنجر کا نیام سے نکالتے ہی دیو کا حاضر ہو جانا وغیرہ) ثقافتی ساختیہ (بمبئی کی عام فہم زبان کا استعمال، مختلف ثقافتی

طبقوں سے کرداروں کا انتخاب وغیرہ) یہ وہ اہم تین فکری ساختیے جو ڈرامے کی معنویت کو تشکیل دیتے ہیں جہاں ناظر کا ذہن معنویت کو شناخت کرنے کا وسیلہ بن جاتا ہے جو اصل میں خود کسی قسم کے معنویت کو جنم نہیں دیتے۔ انسانی جذبوں کی درجہ بندی ناممکن ہے، انسانی ذہن کا یہ ساختیاتی خاصہ ہے کہ وہ معروضی انفعال، حرکات و سکنات سے کسی عمل کے حوالے سے معنویت کی تخلیق کرتا ہے۔ ڈرامے میں اداکار جس فکری یا تفریحی پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں وہ سب کے سب کسی باطنی یا معروضی فعلیات یا تجربے کی بنیاد بنا کر اس وقت حقیقت کا روپ دھارتے ہیں جب ناظرین ان عوامل سے اپنا رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ اصل میں ڈرامے میں حقیقت اس وقت ہی ابھر کے سامنے آتی ہے جب ناظرین کو اس کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اپنے اس ادراک کے تجربے کے حوالے سے ہی ڈرامے کی بنیادی ساخت کو ایک جذباتی یا فکری رشتے کے ساتھ انکشاف کرتا ہے۔ بقول بارتھ کہ "معنویت کی وحدت اسطور ہوتی ہے" اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ انھوں نے جن پانچ رموز کی نشاندہی کی ہے وہ "گل بہ صنوبر چہ کرد" میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

تشریحی:

(۱) "گل بہ صنوبر چہ کرد" کا معمہ کیسے حل ہوگا؟ (یعنی اس سوال کا جواب کیسے مل پائے گا؟)

(۲) صنوبر شاہ کے محل میں الماس کے داخل ہونے کے بعد صنوبر کا پرستاروں میں کسی انسان کی آمد پر حیرت کا اظہار۔

(۳) سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے مختلف صورتحال سے الماس کا نبرد آزما ہونا۔

(۴) الماس کو شہزادی مہرانگیز کو حاصل کرنے کے لیے ہر الجھن، مصائب و پریشانی، امداد غیبی کا سہارا حاصل کرنا۔

معنیاتی:

(۱) زہرہ اپنی دایا کی مدد سے بہادر کو لکڑی کے صندوق میں بند کر دیتی ہے۔ مغل اور بھٹ جی مال و دولت کے لالچ میں جب صندوق کا ڈھکنا کھولتے ہیں تو اندر سے بہادر کی آواز آتی ہے، وہ لاش کو بھوت پریت سمجھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

(۲) صنوبر شاہ کا گواہ زنگی مرد کے متعلق جواب نہ دینے کے سبب الماس کی جان بخشی کر دینا۔

(۳) شہزادی مہر انگیز کی الماس کی جدائی اور فراق میں بے تاب ہو کر گانا گانا۔

علامتی:

(۱) شہزادہ الماس کے بھائی جہماس کا قتل کر دیا جانا۔

(۲) جب شہزادہ الماس جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھان چھان کر تھک جاتا ہے اور گریہ زاری اور دعا کرتا ہے، تو ایک بزرگ کا نمودار ہونا اور الماس کو کوہ قاف کے شہر کا پتا بتانا۔

(۳) بہادر کا اتفاقاً شہر کا قاضی بن جانا۔

(۴) حکیم کی موت کے بعد بہادر کی اس کی بیوی زہرا سے شادی۔

عملی (ردِ عمل)

(۱) صنوبر شاہ کا اپنی بیوی کا حبشی غلام سے معاشقے کا انکشاف۔

(۲) شہر کا دستور ہوتا ہے کہ شہر کے قاضی کی موت کے بعد جو شخص صبح سب سے پہلے شہر کے دروازے تک پہنچ جائے وہ شہر کا قاضی بن جائے گا۔

(۳) قرض خواہ مغل اور بھٹ کا بہادر کے باپ (دلاور) سے ملاقات کرنا اور وہ باپ سے بیٹے کے قرض کی واپسی کو کہتے ہیں۔

(۴) بہادر کا دربان کو باتوں میں لگانا اور الماس کا نظر بچا کر محل میں جانے والی نہر کے ذریعے شہزادی کے محل تک پہنچ جانا۔

ثقافتی (حوالہ جاتی):

(۱) پٹھان کا سود کا کاروبار کرنا۔

(۲) صنوبر شاہ کا پریوں کے گانے سے لطف اندوز ہونا۔

(۳) بہادر کا زہرا سے روپے بٹورنا۔

(۴) باغ میں الماس (غیر مرد) کی موجودگی پر دل آرام اور سوسن کا حیرت زدہ رہ جانا۔

(۵) الماس کا سیمرغ کے بچوں کی جان بچانا اور سیمرغ کی مدد سے اپنے ارادوں کی تکمیل پانا۔

ڈرامے میں واقعاتی مظاہر کے پس پردہ معنویت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ مختلف نوع کے تہہ نشین نظاموں کی ساختیاتی سطحوں کا بھی انکشاف کرتا ہے جس کے پس منظر میں عشق و

محبت، ہجر و فراق، لسانی محرومی، تقدیر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محرومی یا انبساط کی کیفیت، معاشرتی طبقات کی نشاندہی، سود خور آدمی کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال، فرد کی بے راہ روی، زر پرستی، لالچ اور حریص کردار، قتل و غارت گری، ضعیف اعتقادی، ایثار و قربانی، انسانی تکالیف اور مصائب کا ذکر، مقصد حاصل کرنے کے لیے مصائب و آلام برداشت کرنا، سبق آموزی وغیرہ یہ سب باتیں معاشرتی تعلقات کی بنا پر جنم لیتی ہیں معاشرتی ساختیہ ہی فکری ساخت کو جنم دیتا ہے اور پھر معروضی دنیا کی تشریح کے لیے الفاظ جمع کر کے جملے بنائے جاتے ہیں تاکہ فکر، مصائب، محرومیوں یا انبساط کا اظہار ہو سکے یا اس کے ابلاغ کی کوئی صورت ابھر کے سامنے آئے۔ لیکن یہ کہنا کہ لسانی ساختیہ نے اس ڈرامے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ کچھ بہتر معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ڈرامہ دراصل انسانی تعلقات سے پیدا ہونے والی انسانی صورت حال کا اظہار ہے جو خالصتاً انسانی سیاق میں ہے۔ ڈرامے کی زبان معروض کے ادراک سے تشکیل پاتی ہے اور ڈرامائی تقاضوں کے تحت زیر نظر ڈرامہ میں حروف ربط یا اجزائے فعل کو حذف کر دینا روز مرّہ کے کلام میں اکثر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح پریشانی، بے قراری اور اضطراب کے موقعوں پر منفرد لفظوں اور جدا جدا ترکیبوں اور مختصر جملوں حروف ربط سے محروم فقروں کو کام میں لایا گیا ہے۔ "اس سے ایک فائدہ یہ پہنچتا ہے کہ ایکٹر کو موزوں مقامات پر سانس لینے کے وقفے مل جاتے ہیں اور جملے کی وحدت بھی برقرار رہتی ہے۔ دوسرے اس سے اظہار جذبات کے لیے موزوں حرکات اور حسب ضرورت آواز اٹھانے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔" (اسلم قریشی، برصغیر کا ڈرامہ، ص ۳۰۸)

ڈرامے کا ہر مکالمہ اپنا ابلاغ ناظرین سے اس لیے بہتر طور پر کرتا ہے کہ اس کے طے شدہ معنی پہلے سے انسانی گفتگو کے تجربے میں شامل رہے ہیں۔ مکالمے کی ادائیگی بھی ایک قسم کی قرات ہے جو کسی نظام کے تحت اپنے وجود کا احساس دلواتی ہے۔ اداکاروں نے مکالموں کے ذریعے متن تو ادا کر دیا لیکن متن کے سیاق میں ڈوب کر ناظرین اپنے طور پر جمالیاتی یا خلاقانہ تزکیہ اور نئے مفاہیم کو ترتیب دے کر لذت محسوس کرتے ہیں۔

ناظرین اداکاروں کے مکالموں اور حرکات و سکنات میں پوری طرح شامل ہوتے ہیں اور ان باتوں کو بھی کچھ دیر کے لیے قبول کر لیتے ہیں جو ہماری باطنی یا ظاہری دنیا کے

مظاہرین ہیں۔ یہ سب باتیں ہماری عام زندگی کے تجربات میں نہیں۔ مثال کے طور پر ڈرامے میں الماس کا سیمرغ پر سوار ہو کر شہر کوہ قاف پہنچنا۔ خنجر کا نیام سے باہر نکالتے ہی ایک دیو کا حاضر ہونا انسانی زمین کے سحرانگیز ساختیے کے روپ میں ابھرتا ہے مگر طے شدہ منطقی معنویت سے اپنی ذاتی معنویت کا ادراک کرتا ہے۔ ''صنوبر گل چہ کرد'' کی کوئی شرح ابھی تک نہیں لکھی گئی لہٰذا معنویت کا جبر کوئی واضح فکری یا لسانی ساختیہ کو ابھی تک تشکیل نہیں دے پایا۔ لہٰذا ڈرامے کی کہانی کے طے شدہ معنی ڈرامے کے معنوں کو منجمد نہ کر سکے، کیونکہ قرات کا عمل تو آسان ہے مگر اس کی تفہیم مشکل کام ہے۔ یہ ڈرامہ بمبئی کی شہری زبان میں لکھا گیا، جہاں کئی لسانی طبقے آباد ہیں، شہری لسانیات کا یہ خاصہ ہے کہ انفرادی تکلم چاہے جتنا اصل ہو لیکن جب وہ اجتماعی تکلم میں تبدیل ہوتا ہے تو وہ مصنوعی ہو جاتا ہے۔ اجتماعی تکلم کو قواعدیاتی کسوٹی پر ناپ تول کر پرکھا نہیں جا سکتا۔ ڈرامے میں جس قسم کے معاشرتی طبقات کے لسانی گروہوں کا قصہ ملتا ہے وہی ڈرامے کی کہانی میں رنگا رنگی بکھیرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نورالدین مغل غلط سلط فارسی آمیز زبان بولتا تھا جبکہ بھٹ جی بنیا مراٹھی بولنے کی کوشش کرتا ہے جس سے ڈرامے میں مزاح کا عنصر مزید گہرا ہو جاتا ہے یعنی زبان کے تجربے (محرومی) سے مزاح پیدا ہو جاتا ہے جو کسی دوسری زبان کی ماحولیاتی مکالماتی ساختیے کے حوالے سے نئے رویوں کو جنم دیتی ہے۔ اور اس بات کا بھی سراغ لگتا ہے کہ اگر انسانی رشتے معدوم ہو جائیں تو زبان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی جب انسانی رشتوں کو موت آجاتی ہے، لسانی تکلم، تحریر، قرات سب اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ عمرانیاتی نظام جس قسم کا ساختیہ تشکیل دیتا ہے وہ فرد کے شعور سے شروع ہو کر لسانی رجائیت یا قنوطیت پر اپنا خاتمہ کرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ فرد کے عمرانیاتی افعال ہی فرد کی کلی ساختیے کی توجیہہ و توصیف کرتے ہیں، جو زمانی بھی ہو سکتا ہے اور اسے مکانی عمل کے تحت بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ڈرامے کے تمام تانے بانے انسانی رشتوں کے شعوری اور غیر شعوری محرکات سے شروع ہوتے ہیں۔ یہی محرکات واقعات کو جنم دیتے ہیں اور کئی واقعات مل کر ایک وحدت تشکیل دیتے ہیں جس کا نام ''صنوبر گل چہ کرد'' ہے جس میں نو کلاسیکی ڈرامے کی خصوصیات ابھر کر جلوہ نمائی کرتی ہیں، جو کھیل کو المیہ اور طربیہ حصوں میں جداگانہ طور پر تقسیم کر دیتی

ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ ڈرامے کے سنجیدہ حصے میں حقیقت سے گریز کیا گیا ہے جب کہ مزاحیہ حصے میں معاشرے کی تلخ حقیقتوں اور انسانی سفاکی سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو بہت ہی اذیت ناک ہے۔ معروف جدید اصطلاح میں ''صنوبر گل چہ کرد'' ایک ''ٹکٹ میں دو مزے'' والا ڈرامہ ہے جس کو المیہ اور طربیہ نامیاتی ساختیے میں تقسیم کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے لہٰذا اس کو ''جڑواں ڈرامہ'' بھی کہا جا سکتا ہے گو اس کو کلی طور پر نامیاتی کھیل نہیں کہا جا سکتا۔ المیہ اور طربیہ پلاٹ مل کر ڈرامے میں بہت زیادہ پیچیدگیاں پیدا نہیں کرتے کیونکہ انسانی رشتوں (کرداروں کے) کا ادراک اور ان کی شناخت ناظرین کو باآسانی ہو جاتی ہے۔ وحدت عمل کا ساختیہ اور پلاٹ کا ساختیاتی اُلجھاؤ دو متضاد اور متناقض باتیں نہیں ہیں۔ وحدت عمل سے مراد واحد عمل نہیں بلکہ اس سے مراد نامیاتی وحدت کا ساختیہ ہے جو ڈرامے کے مختلف اجزا کے کل کے ساتھ فطری اور خلقی ربط و تعلق کو قائم کرتے ہیں۔ ڈرامے میں ساختیاتی زبان کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے کیونکہ مکالمے کی شکل میں کردار جس قسم کی گفتگو کرتے ہیں وہی زبان کی تشکیل کرتی ہے جو مختلف انسانی رویوں سے متعلق ہے جس کو عام آدمی تو کیا کوئی ماہر لسانیات بھی مکمل طور پر اس کی تشریح نہیں کر پائے گا۔ تھوڑا بہت اس ڈرامے کی زبان کا مطالعہ تو کھینچ تان کر کر لیا جاتا ہے لیکن اسے کسی طور پر حتمی مطالعہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ''گل بہ صنوبر چہ کرد'' میں جو اساطیری اور پیچیدہ شہری زندگی کی زبان استعمال کی گئی ہے وہ لسان و زبان کے متضاد رویے ہیں۔ لہٰذا ڈرامے کے لسانی پہلو کا مطالعہ کرنے کے لیے اساطیری آگہی اور معاشرے کے عمرانیاتی نظام کے پیچھے جو روایت، رسم و رواج، لوک ریت، تہذیب و تمدن، اقدار اور جمالیات کا نہ ختم ہونے والا فکری سلسلہ ہے، اس کی گہرائی سے کھوج لگانا خاصا کٹھن مسئلہ ہے۔ ڈرامے میں زبان کا تاریخی شعور بھی ملتا ہے اور نئی علامتیں، نشان، رموز کی ماہیت قطعی طور پر واضح تو نہیں ہوتی، مگر لسانی تغیر کا عمل رواں دواں ضرور نظر آتا ہے۔ جہاں تمام استعارے ہیئت کے نظام میں تبدیل ہو جاتے ہیں جہاں افراد اور اشیا کے نام ''نشان'' محض ہیں جو پڑھنے یا ڈرامہ دیکھنے والے کو ڈرامے کی معنویت سے قریب تر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری طرف ڈرامے میں اسطوری ماحولیات کے توسط سے جو شاعرانہ زبان استعمال کی گئی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے اور جس قسم کی شاعرانہ زبان استعمال کی گئی ہے

وہ ڈرامے کی اساطیری فضا سے متصادم نہیں ہے۔ ڈرامے کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ ڈرامے کی شعریات نے زبان کی قدر و قیمت کا تعین کر دیا ہے۔ ڈرامے کی زبان میں ساختیاتی تمثال اُبھرتی ہیں جس کی تمام تر اثر پذیری ساختیاتی پیکروں سے مشروط ہے۔ زبان اظہار کی وہ جذباتی پیکر تراشی ہے کہ وہ بذات خود ساختیاتی پیکر کا روپ دھار لیتی ہے۔ اسطور کی رومانوی فضا میں کردار کا لاشعوری عمل محض نفسیات کا شہوانی شعور ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ یہ پیکر لاشعور کا وظیفہ بن جاتے ہیں اور زبان ہی ناظرین یا قارئین کے ذہن میں لاشعوری طور پر ساختیے پر مبنی معنویت اور مفاہیم کی درجہ بندی کرتی ہے۔ لہٰذا "گل بہ صنوبر چہ کرد" میں رومانی مکالمے ناظرین کے دل و دماغ پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں جہاں ناظرین کبھی کبھار اپنے باطنی جذبوں کی تطہیر بھی کر لیتا ہے۔ گویہ مکالمے روایتی رومانوی نوعیت کے ہیں جن میں شکوہ و شکایت ہے، عشق و محبت کی پسپائی اور ریاست کی اجارہ داری کی فضا ملتی ہے۔ مثلاً چند مکالمے ملاحظہ ہوں:

"کیا یہ میری محبت کا عوض۔"

"یہی میرے پیار کا بدلہ۔"

اس کے علاوہ بہادر اور زہرہ کے کئی مکالمے ایسے ہیں جو مزاح کا عنصر تو لئے ہوئے ہیں لیکن ساتھ ساتھ عشق و محبت کے ان رویوں پر سے پردہ بھی اٹھاتے ہیں جو معاشرے کے کم تر درجے کے لوگوں کی سائیکی کا ذہنی ساختیہ ہے، جو حرکات و سکنات (اداکاری) کی مدد سے سنجیدہ بھی ہو جاتا ہے اور غیر سنجیدہ بھی —— ڈرامے میں لکھنے والے یا پیش کار (ہدایت کار) کے مقصد اور معنی کو دریافت نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض دفعہ ناظرین یا قارئین ڈرامے کی اساطیری یا شہری فضا کا اپنے معاشرتی احوال سے موازنہ کرتا ہے اور ایک انجانی سی تشکیک کا شکار ہو کر خود سے یہ سوال کر بیٹھتا ہے کہ کیا میں بھی اسی صورت حال سے تو دوچار نہیں ہوں؟ اور ڈرامائی فضا کی ہر ناظر اپنے اپنے طور پر مختلف تشریحات کرتا ہے، کبھی تو وہ کسی بات کو قبول کرتا ہے اور کسی بات سے متفق نہیں ہوتا۔ کبھی وہ تاثر لے کر بھول جاتا ہے اور محض اس کو تفریح کی حد تک ہی محدود رکھتا ہے اور بعض ناظر ڈرامے کے اختتام کے ساتھ ہی آخری مضمون کو بھی پا لیتے ہیں، کیونکہ یہ ڈرامہ مختلف تمدنی ڈھانچوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لہٰذا اس تہذیبی پیڑ سے لاتعداد معنویت اور افکار کی ساختیاتی

شاخیں پھوٹتی ہیں۔ معنویت کے اظہار کو مختلف سمتوں سے بیان کیا گیا ہے۔ قرأت (مکالمے کی ادائیگی) ڈرامے کے متن اور اس کی معنویت میں کسی قسم کے مغالطوں کو نہیں اُبھارتے۔ اساطیری واقعات رومانی دلکشی اور تجسس کا سبب بنتے ہیں۔ ہر معنویت پر مکالمے کے ساتھ اپنے جمالیاتی پیکر کو نہ ختم ہونے والے متفرق اور ڈرامے کے مرکزی خیال کو چست رکھتے ہیں تاکہ وحدت اختتام تک تجسس کی فضا قائم رہے۔ "گل بہ صنوبر چہ کرد" کی ساختیاتی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مکالموں یا الفاظ کے اوپر نیچے کر دینے سے ڈرامے کا مرکزی خیال مجروح نہیں ہوتا۔ مکالمہ معنی کی معنویت کی تشریح کرتا ہے۔ مکالمے اور معنی کا ملاپ ڈرامے کے ناظرین پر مختلف ہائے خیال کی جمالیاتی کیفیات کا انکشاف کرتی ہے۔ ڈرامہ دیکھتے ہوئے یا پڑھتے ہوئے اداکار کے مکالموں کی ادائیگی کے دوران ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس میں کم و بیش بھی کرتا ہے۔ یوں تفہیم اور تشریح کی نئی ساختیات جنم لیتی ہے جو اپنے طور پر تخلیق کا ساختیاتی واہمہ ہوتا ہے اور معنویت کا انتشار فکری معنویت کے کئی ساختیاتی اجزاء کو تشکیل دیتے ہیں۔ مثلاً ڈرامے میں شہزادی کو حاصل کرنے کے لیے کئی اساطیری سحر انگیز واقعات، کشت و خون، بھائی کی موت سے غمزدہ شہزادہ کئی فکری اور روپ بہروپ کے ساتھیوں کو اپنے طور پر بناتا ہے اور ان سے اپنے مقصد کو پا لینا چاہتا ہے۔

عموماً ہوتا یہ آیا ہے کہ اساطیری واقعات اور خصوصاً من گھڑت واقعات کو ناظرین عام طور پر تفریح کی حد تک لیتے ہیں۔ یہ حکایتوں کی صورت میں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ڈرامے میں غیر حقیقی واقعات کی ترئین فرد اپنی اساطیری روایت کے حوالے سے کرتا ہے جس میں کسی قسم کی علت و معلول کا کوئی سلسلہ نہیں ہوتا۔ سحر انگیز فضا فرد کی شروع سے ہی جمالیاتی تطہیر کرتی رہی ہے اور اساطیری واقعات اور کرداروں کو انسان زندہ پیکر کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے اور اس سے جو پیکر تشکیل پاتا ہے وہ حتمی طور پر نامیاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ مثلاً ڈرامے میں دیو کا تالی بجاتے ہی حاضر ہو جانا اور زنگی مرد کو اٹھا کر لے جانے والا منظر اصل میں نامیاتی ساختیات کے فنکارانہ روپ کا ایسا اظہار ہے جو الفاظ کا نہیں بلکہ رموز (تالی کا بجانا) سے بھی متعلق ہے۔ رموز کا پہلے سے طے شدہ ہونا ضروری ہوتا ہے ورنہ رموز بے معنی ہو جاتے ہیں۔ تصور نما رموز کا روپ جب ہی اختیار کرتے ہیں جب اس کا

انسانی تفاعل یا اس کی تربیت فردِ دیگر کو دی جا چکی ہو اور یوں نامیاتی ساختیات کئی مجرد ہیتوں میں بکھر جاتے ہیں۔ ڈرامے کے متن میں تفہیم روایتی کہانی کے اختتام کے ساتھ ہو جاتی ہے کہ سب اپنے اپنے مقاصد حاصل کر کے ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے ہیں۔ ڈرامے کا نظام رموز تمام کا تمام اختیاطی علامات سے بھرا پڑا ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی تخلیق میں پائے جانے والے رموز متن کو تبدیل کر دیتے ہیں لیکن زیر نظر ڈرامے میں شاید ہی کوئی ایسا رمز ہو جو ڈرامے کی حتمی معنویت کو بدل دے۔ گو منطقی روابط اور ان کا لب لباب ڈرامے کی فضا پر کوئی خاص اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ بدیعیات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ڈرامے کی بنیادی ساخت اس لیے دل کو بھلی لگتی ہے کہ ڈرامہ دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کو پہلے ضبط تحریر میں لایا گیا ہے پھر اس کو اداکاروں کے ایکشن کے بعد اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے۔ لگتا ہے جیسے اداکار جو کچھ بول رہا ہے وہ سب اس کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ پس منظر میں ڈرامے کا مسودہ نہیں، ڈرامے کے مکالموں میں خود اپنی معنویت چھپی ہوئی ہے اور انھیں سمجھنے کے لیے کسی اساطیر یا حکایت کا بہت زیادہ سہارا نہیں لینا پڑتا۔ اگر ڈرامے کے ہیرو الماس کے کردار کا تجزیہ یا تقابل کرنا مقصود ہو تو یہ تقابل اس کے بھائی تہماس سے کرنا چاہیے یا مہرانگیز کی شخصیت کو جاننے کی خواہش ہو تو دل آرام کے کردار کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ مراد یہ ہے "گل بہ صنوبر چہ کرد" کے متن سے باہر اس کی معنویت کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ گو یہ ساختیات کا مقفل نظامِ فکر ہے اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کیونکہ ڈرامے کی بعض باتیں متن سے باہر نکل کر ہی سمجھ میں آتی ہیں۔

مثال کے طور پر ڈرامہ دیکھتے یا پڑھتے ہوئے کئی بار ذہن میں ڈرامہ حاتم طائی کا خیال آتا ہے کیونکہ "گل بہ صنوبر چہ کرد" اور حاتم طائی کا مرکزی خیال یکساں ہے۔ ان دونوں ڈراموں کی ہیروئن اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہے جو اس کے سوال کا جواب ڈھونڈھ نکالے اور یہی "سوال" کئی سوالات کو جنم دے کر کئی ضمنی اور ذیلی واقعات جنم دیتا ہے اور یہی واقعات ڈرامے کو دلچسپ بناتے ہوئے مزید توسیع دیتے ہیں۔ متن کے باہر کی دنیا سے معنویت تلاش کرنے سے تخلیقی اور جمالیاتی ساختیہ مزید کشادہ ہو جاتا ہے۔ یوں کبھی قاری (ناظر) مصنف اور کبھی مصنف قاری (ناظر) کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس ڈرامے

میں تہذیبی فاصلے طویل نہیں ہیں۔ قاری (ناظر) مصنف اور اداکار ایک ہی ثقافت کے نمائندے ہیں، جہاں ناظرین کو معنی نما کے ذریعے ڈرامے کے متن کو سمجھنے کی کلی طور پر آزادی حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی ذہنی فطانت سے معنویت کی تشکیل کرتا ہے۔ یوں ایک تجریدی ساختیہ ابھرتا ہے جس میں معنویت اور آگہی کی ساخت اختیاطی ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں بعض دفعہ ناظر اور مصنف کے درمیان مغالطوں کی خلیج بھی حائل ہو جاتی ہے کیونکہ مصنف جو بات بیان کرنا چاہتا ہے وہ ناظر صحیح طور پر نہیں سمجھ رہا ہوتا یا اس کا اظہار کچھ اس طرح کر رہا ہوتا ہے جیسا کہ مصنف نہیں چاہتا۔ اس فکری بے سمتی کا سبب معاشرتی یا لسانی رموز بھی ہو سکتے ہیں، یا تصور نما کا کمزور تناظر بھی ڈرامے کی معنویت اور اس کے ساختیے کو بعض دفعہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ ڈرامے سے ناظرین کا محظوظ ہونا بھی ڈرامہ کی کامیابی کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ ڈرامہ نگار کی ہر بات یا اس کے ہر تصور سے ناظر اختلاف کرے لیکن ان اختلافات کے باوجود ناظر کسی نہ کسی طور پر اپنے تفریحی مزاج کی کہیں نہ کہیں تطہیر ضرور کرتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ناظر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ڈرامے کی گہرائی میں تہہ در تہہ اتر کر اس کے اصل فکری گوہر کو تلاش کرے بلکہ لفظی اور معروضی مظاہر کو مشاہدہ کر کے اس سے اگر وہ تفریحی یا جذباتی لطف حاصل کر لے تو یہ بھی ڈرامے کی کامیابی کی ضمانت قرار دیا جا سکتا ہے۔ "گل بہ صنوبر چہ کرد" میں ڈرامہ نگار نے کوئی ایسی بات لکھ کر قارئین یا ناظرین کو گمراہ نہیں کیا کہ فرد اخلاقی رسّی کو تھام کر دنیا کو جنت بنا سکتا ہے۔

طے شدہ معنویت کا نہ ہونا، ڈرامے کو مزید دلچسپ بناتا ہے۔ زبان سے لاشعور کا اظہار تو کیا جا سکتا ہے لیکن ڈرامے کا لایعنی ساختیہ مکالموں یا لسان کے مصنوعی دائرے تک محدود نہیں۔ حرکات و سکنات، رموز اور اشارے ذات اور ذہن کا خاموش مکالمہ ہیں۔ چہرے کے تاثرات لاشعور کے اظہار کو زبان سے زیادہ موثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یوں ناظر ڈرامے میں طے شدہ معنویت کے جبر کا شکار نہیں ہوتا اور آزادانہ طور پر ڈرامے میں اپنی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔ ڈرامے کا ہر مظہر با آسانی دریافت کیا جا سکتا ہے مگر ڈرامے کی تخلیقی جمالیات کی ساخت حسی اور لفظی خمیر سے بنی ہے۔ لفظی (مکالمہ) اظہار موضوعی اور

معروضی سطح پر ڈرامے کے جمالیاتی اور ساختیاتی شعور کو اُبھارتے ہیں جو ایک مخصوص نوعیت کی حسی فضا باندھ دیتے ہیں۔ ڈرامائی واقعات و محرکات لفظی سے زیادہ حسی ہو جاتے ہیں اور زماں و مکاں پر حاوی ہو کر مکانی ساختیے کی آگہی کی تفہیم میں مسائل کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ڈرامے میں سب سے زیادہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ فرد (ناظر) کے باطن میں روپوش ان جذبات، محرومیوں، وحشت، سانحوں، خلاقانہ اور جمالیاتی رویوں کا انکشاف کیا جائے جو کسی مخصوص نفسیاتی، بشریاتی، لسانی یا عمرانیاتی لایعنیت کے سبب پیرائے اظہار میں نہیں آرہے ہوتے۔ یقیناً متن کے سیاقی تناظر میں جب بھی "گل بہ صنوبر چہ کرد" کے رموز اور اس کی اساطیری معنویت سے پردہ اٹھایا جاتا ہے تو حسی ساختیے کے کئی تخلیقی اجزاء کا انکشاف ہوتا ہے اور پھر یوں تفہیم ور تفہیم کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ پھر اُبھی ہوئی معنویت اور متن سیاق کی نئی حدود کا یقین کرتا ہے۔ کرداروں کی عمرانیاتی ساختیکی نے علامتی تفاعل کی ساختیات کو نیا فنکارانہ رنگ عطا کیا ہے اور ساختیے کے اجزائے ترکیبی ان اَن دیکھی قوتوں کے تخلیقی تفاعل کے ہدف سے قریب ہیں جو یقیناً لکھنے والے کے ذہن میں ہوگی ازیر نظر ڈرامے کے کرداروں کا بین العمل، نرم و گرم گفتگو، تصادم اور شخصی فطرت کے مابین پائے جانے والے مثبت اور منفی رجحانات نے موضوع کے ساختیاتی نمونوں اور ڈرامائی تمثالیت کے حرکی اظہار کو تجریدی ساختیے میں تبدیل کرتے ہوئے بھی ایک انجانی جمالیاتی کیفیت سے دوچار رکھے ہوئے ہے۔ ڈرامے کی ہیئتی ساخت سے اس کی فکری ساختیت کو جوڑا نہیں جاسکتا کیونکہ فکری ساختیت ہیئتی ساخت کو جنم دیتی ہے۔ روایتی طور پر ڈرامہ لفظی اظہار سے زیادہ بصری فن بھی ہے، بعض دفعہ جب مکالمہ بے جان اور بے معنی ہو جاتا ہے تو حرکات و سکنات یا معروضی تمثالوں کے ذریعے تخلیق (ڈرامے) کی تفہیم کی جاتی ہے اور بیانیہ سانچے تخیل کی نئی وسعتوں کو پاتے ہیں یعنی بیانیہ اظہار کی مدد سے لاشعوری طور پر یہ تصور لے کر یہ "لسانی موسیقیت" مکمل طور پر ناسیابی ساختیہ ہے، ڈرامے کا شاید ہی کوئی لسانی ساختیہ ایسا ہو جو عمرانیاتی مظہر کے سبب تشکیل نہ پاتا ہو کیونکہ عمرانیاتی مظاہر ڈرامے کی بنیادی ساخت اور ڈرامائی نظام کی تکمیل ہی نہیں کرتے بلکہ زبان اور مکالموں کی مدد سے ڈرامے کے بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک فنکارانہ اور جمالیاتی لڑی میں پرو دیتے ہیں جہاں کسی قسم کا نظریاتی یا کسی قسم کی عقلی و منطقی انا

مجروح ہو کر بھی مجروح نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ڈرامائی شعریات غیر تاریخی یا غیر زمانی ہوتے ہوئے بھی قواعدیاتی اغلاط کا ازالہ یوں کر دیتی ہیں کہ علامتی تفاعل اور حرکات و سکنات سے جو فنکارانہ ساختیہ ترتیب پاتا ہے وہ ڈرامے کے بہت سے کمزور پہلوؤں کو چھپا لیتا ہے۔ کئی دفعہ الفاظ بدل جاتے ہیں لیکن بات وہی کہی جا رہی ہوتی ہے۔ متن کو سامنے رکھتے ہوئے جب ایک ہی فکر یا ایک ہی احساس کی دو مختلف اکائیوں میں مشابہت تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو ایک ہی مکالمے یا جملے میں کئی کئی مزاج (موڈ) در آتے ہیں اور حتمی طور پر کوئی معنویت سامنے نہیں آپاتی جس کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہو کہ قاری یا ناظر کے ذہن اور دل پر تفہیم اور تطہیر کا عمل مکمل ہوا۔ فکری مشابہتیں کئی ساختیاتی مسائل جنم دیتی ہیں جیسے "گل بہ صنوبر چہ کرد" اور "حاتم طائی" کی بنیادی فکری مشابہت ایک جیسی ہیں۔ غیر تاریخی عناصر کے علاوہ تاریخی احوال میں مشابہتیں تلاش کرنے میں بھی ساختیاتی حوالے سے کئی مشابہتوں کے جبری مراحل سے گذرنا پڑتا ہے جو یقیناً متن میں نئی معنویت کو جنم دیتے ہیں تو دوسری طرف طے شدہ معنویت کو مجروح بھی کرتے ہیں۔ ڈرامے کے دو مختلف مزاج (طربیہ اور المیہ) ساختیاتی وحدت کے دو مختلف مزاجوں کو بھی ابھارتی ہیں جو طے شدہ حتمی معنویت اور ڈرامے کے مرکزی خیال کے وظائف سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا ڈرامے کی حتمی قدر ڈرامے کے مرکزی خیال سے بہت کم ہی میل کھاتی ہے۔ جو کہ ڈرامے کے متن کو آگے چل کر آزاد بھی کر دیتا ہے اور یہی اس ڈرامے کا ایسا فکری ساختیہ ہے جو اپنے فعلیاتی وظائف سے یہ بات از خود ثابت کر دیتا ہے۔ ڈرامے کا متن کوئی محدود تصور نہیں بلکہ اس کا تصور لا محدود ہے جو کہ اپنے ناظرین کو آزادی سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور متن سے باہر نکل کر معاشرے کے مختلف النوع حقائق کی مدد سے نئی حتمی معنویت کو تلاش کرتا ہے۔ اس نظریے کو "بین المعتیت" بھی کہا جاتا ہے یوں بعض دفعہ معنویت کی تلاش کا تمام کا تمام بوجھ ناظرین کے کندھوں پر پڑھ جاتا ہے لیکن زیادہ پریشانی اس لیے نہیں ہوتی کہ مصنف اور ناظرین ایک ہی ثقافت کے لوگ ہیں لہٰذا معنویت اور متن کی تشریح میں کوئی زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ اور ڈرامہ دیکھتے ہوئے جب ناظرین اپنے شعور سے متن کی نئی معنویت کو ترتیب دے رہا ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ کوئی نئی تخلیق جنم لے رہی ہے۔

ڈرامے کی سطحی اور عمیق ساختیاتی درجہ بندی
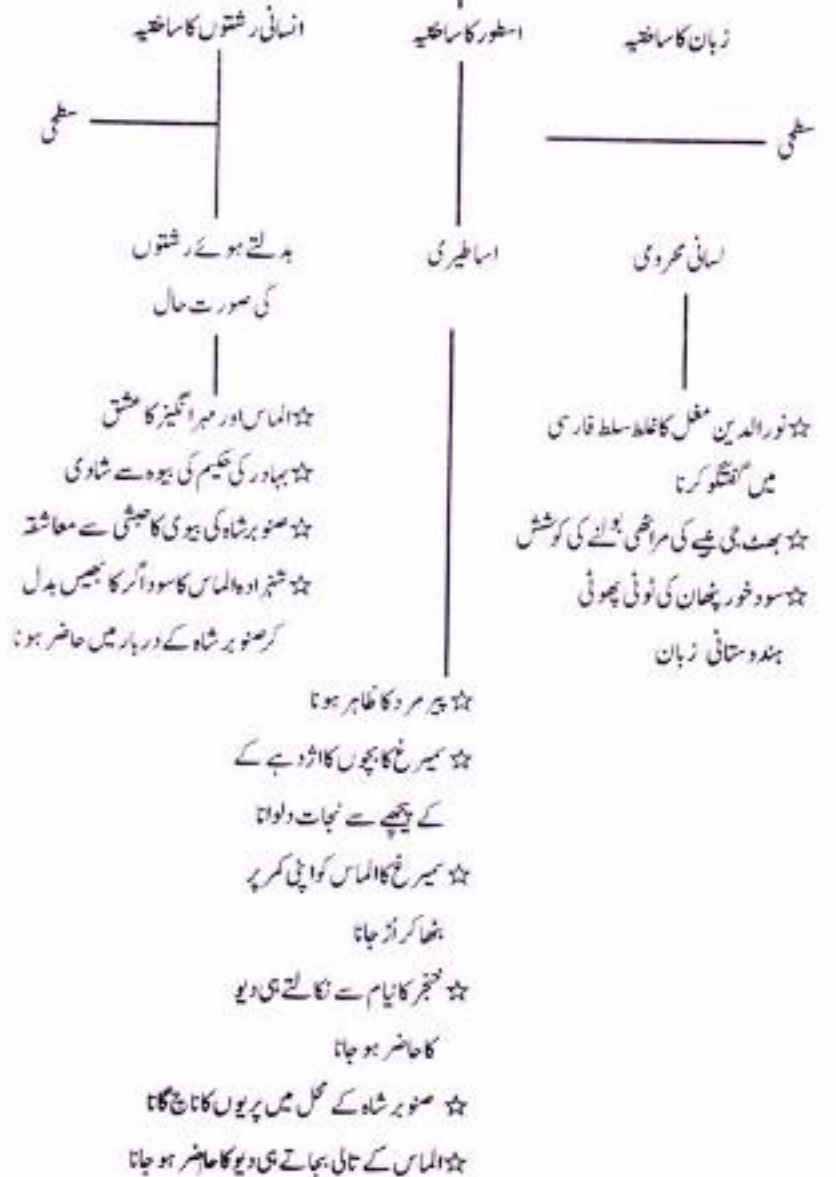
ڈرامے کے ساختیاتی ڈھانچے میں بنیادی عناصر

متن	مظاہر	عملیاتی (کسی حد تک ظاہری)
بصری	اکائیاں	ارتقا
نوری	رشتے	تغیر پذیری
علامتی	ترتیب (نظام)	فکری نفوذ
مغنیاتی	طبقات	یادداشت
کرداری	مبادیات	ادراک
ثقافتی		تقلید
اساطیری		محرکات
تجریدی		حسن و عشق
		مہم جوئی

"گل بہ صنوبر چہ کرد" کے ساختیاتی مطالعے کے بعد اسے تجربی تجزیے کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ راقم السطور نے ڈرامے میں پائے جانے والے تین عناصر یعنی متنی، مظاہری اور عملیاتی عناصر کو تین واضح تجزیاتی حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد ڈرامے میں پائے جانے والے عنصر کو متغیرہ تصور کرتے ہوئے انھیں تجزیاتی طور پر مطالعہ کیا۔ متنی عنصر کے تحت آٹھ متغیرات، مظاہر کے تحت پانچ اور عملیاتی عنصر کے تحت نو متغیرات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس تجزیے میں آسان ریاضی کا کلیہ استعمال کرتے ہوئے تینوں عناصر کی ساختیاتی حوالے سے متنی مظاہری اور عملیاتی قدر کا اندازہ کیا گیا۔

۱۔ **متنی متغیرات**

کل متغیرات ۳۶= ۸/۲۲ (انفرادی وسطانیہ ۳ ہے)

۲۔ <u>مظاہری متغیرات</u>

کل متغیرات ۹/۲۲ = ۲۲ (انفرادی وسطانیہ ۲،۵ ہے)

۳۔ <u>عملیاتی متغیرات</u>

کل متغیرات ۹/۴۲ = ۴۲ (انفرادی وسطانیہ ۴،۵ ہے)

اس مختصر تجربی تجزیے میں اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ڈرامے میں سب سے کم ساختیاتی متغیرات مظاہری (۲۲) پھر متنی (۳۶) اور سب سے زیادہ متغیرات عملیاتی / وظائفی (۴۲) نوعیت کے ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ "گل بہ صنوبر چہ کرد" بنیادی طور پر عملیاتی یا وظائفی ڈرامہ ہے، جس میں ذیلی متغیرات متنی اور مظاہری ہیں جن کو مددگار یا معاون متغیرات بھی کہہ سکتے ہیں۔ ڈرامے کی تخلیقی و فنکارانہ درجہ بندی کرنے کے لئے سائنسی (تجربی، شماریاتی تکنیک وغیرہ) تنقیدی اور تحقیقی اوزان کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ فرد اور گروہ کا ذہن و دماغ تخلیقی کائنات سے مشابہ ہے اور یہ ڈرامہ یوں بھی ثقافتی، رموزیاتی، مظاہری اور اساطیری وخلاقیت کا کھیل ہے۔

درخاتمہ

ڈرامے کی ساختیاتی اقسامیت بہت واضح ہے جو بنیادی تاثر یہ چھوڑتی ہے کہ ڈرامے کا تخلیقی اور فنکارانہ عمل جو معاشرتی جبر، میکانی حرکیات آزاد خواہشات کی ارتقائی صورت کا پتہ دیتی ہے، جو اصل میں مائکرو واسکوپک تخفیف کا بھی مسئلہ ہے جہاں پر بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر شے فطری ساختیے میں مفید ہے۔ معاشرہ ہزارہا عوامل کو ضبط میں لائے مگر انسانی احتیاجات اور حیاتیاتی مطالبات معاشرے کے عمرانیاتی عمل میں اس طور پر دخل اندازی کرتے ہیں کہ ارتقا کا مصنوعی وظیفہ جنم لیتا ہے جو معروضی سطح پر کسی مخصوص نظام (سسٹم) کا مظہر بن کر ایک عرصے تک انسان کے عمرانیاتی ماحول میں رچا بسا رہتا ہے اور غلطی سے سینے سے لگائے بیٹھے رہتا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ یہی معاشرہ اور اس کی اکائیاں فکری ارتقا

اور نئے انکشافات کے بعد اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ کسی بھی حوالے سے جس ساختیے کو انھوں نے ایک عرصے تک معتبر جانا وہ فاسد ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فطری مظہر مکمل طور پر باطل یا غیر کامل ہو۔ لیکن کچھ آفاقی اقدار ایسی ہوتی ہیں جن کے زمانی یا مکانی ساختیے کے بدلے جانے سے ظاہری شکل تو تبدیل ہو جاتی ہے لیکن اس میں دل ایک سا ہی دھڑکتا ہے۔

اصل میں یہی نکتہ جو "گل بہ صنوبر چہ کرد" کے باطن میں چھپا ہوا ہے۔ ڈرامے کا فطری اور ترتیب وار ساختیہ باطنی و معروضی کے درمیان ہونے والی روایتی کشمکش کو اُجاگر کر کے انسانی فطرت اور معاشرتی فطرت کے مابین خط امتیاز کھینچتا ہے۔ جہاں ساختیاتی حرکیات اور ساختیات سکونیات کے دو نئے دروازے کھلتے ہیں جو ڈرامے کے کئی تخلیقی مظاہر کا انکشاف کرتے ہیں۔

○○

کتابیات

محمد اسلم قریشی "ڈرامہ نگاری کا تاریخی و تنقیدی پس منظر" مجلس ترقی اردو لاہور، ۱۹۷۱ء

محمد اسلم قریشی "برصغیر کا ڈرامہ" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور بہ اشتراک مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

عبدالحلیم نامی "اردو تھیٹر" جلد دوم، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۲ء

عبدالحلیم نامی "اردو ڈرامہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۷۵ء تک" اردو ادب علی گڑھ، جون ۱۹۵۵ء

دسواں باب

ساختیات کے بارے میں نظریاتی، تنقیدی و تحریکی ادوار

ساختیات کے بارے میں نظریاتی، تنقیدی و تحریکی ادوار

ساختیات سے متعلقہ نظریاتی، تنقیدی اور تحریکی ادوار

۱۹۲۰ء-۱۹۲۹ء	روسی ہیئت پسندی۔ لسانی تنقید۔ نامیاتی ساختیات۔ فیو جنو تنقیدی
۱۹۳۵ء-۱۹۳۹ء	آرکی ٹائپ تنقید۔ وظائفی ساختیات
۱۹۴۰ء-۱۹۳۹ء	نئی تنقید۔ مظہریات (ادب پر اطلاق کیا گیا) طرز نگار تنقید۔ اصناف کی تنقیدی۔ ٹروپ /ٹروپولوجی۔ سیاقی تنقید
۱۹۵۰ء-۱۹۵۹ء	بشریاتی ساختیات۔ پس نو آبادیاتی تنقید۔ زبانی شبیہ کاری
۱۹۶۰ء-۱۹۶۹ء	ساختیاتی تنقید۔ جدید تانیثی تنقید" گے "اور لزبن تنقید۔ جنیاتی (جنسی) ساختیات۔ جدید تحسیماتی تنقید۔ نیو کلیائی ادبی تنقید۔ قاری کی اساس (ردِ عمل) تنقیدی
۱۹۷۰ء-۱۹۷۹ء	اعصابی تنقید۔ قاری کی اساس (ردِ عمل) تنقید۔ نظریۂ قبولیت۔ ردِ تشکیل۔ مخاطباتی (ڈسکورس) تنقید۔ تاریخ کار تنقید۔
۱۹۸۰ء-۱۹۸۹ء	مکالماتی تنقید۔ نئی تاریخیت۔ ثقافتی مطالعے۔ تنقید ساختیانہ۔ بالائی ساختیاتی۔ اقلیتی مخاطبہ
۱۹۹۰ء	نئی نئی تاریخیت۔ نو ساختیات۔ پس ردِ تشکیل۔ پس تانیثی تنقید۔ نظریۂ قبل متن۔ کوئر نظریہ۔ سابقہ نو آبادیاتی نیو کلیائی مخاطبہ (ڈسکورس) ردِ نو آبادیاتی تنقید۔ ردِ تانیثی تنقید۔ نئی تانیثی تنقید۔ ردِ "گے "اور لزبن تنقید۔ ایانک تنقید۔ پس بالائی ساختیات

ایبانک تنقید (Ebonic Criticism)

لسانی اور ثقافتی تنقید کی شاخ ہے جو کہ امریکی سیاہ فاموں کی زبان و ثقافت سے متعلق ہے۔ ایبانک امریکی سیاہ فام لوگوں کی انگریزی کو کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے نسل پرست معاشرے میں ایبانک زبان کا قضیہ بیسویں صدی کے آواخر میں شروع ہوا۔ امریکہ کے گورے معاشرے میں امریکی نیگروز کی زبان کو ایبانک قرار دینے کا مسئلہ بنیادی طور پر کالی اور گوری ثقافت کے تضادات کو ابھارنے والے "گوری چمڑی" کے احساس برتری کو ابھارنا ہے۔ جبکہ اصل میں ایبانک کالوں کی زبان نہیں بلکہ گلی کوچوں بازاروں کی عامیانہ اور لچر زبان ہے جس کو تقریباً سب ہی بولتے ہیں۔ جو درسگاہوں، گھروں، تجارتی و سرکاری اداروں میں نہیں بولی جاتی۔ خیال کیا جارہا ہے کہ امریکہ کے اشرافیائی لسانی طبقے کو اپنے اقتداری (پیوری ٹن) ہونے کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے کہ انگریزی صرف پیوری ٹن کی زبان ہے اور کالوں کی زبان کو حقارت سے دیکھتے ہوئے اسے افریقی سائیکی کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ یہ اصل امریکی ثقافت کا حصہ نہیں یہی ثقافتی اور لسانی استعماریت امریکہ میں دو ثقافتوں کی جنگ کا سبب ہے جس کو ایک عرصے سے یورپی اور افریقی آگہی میں منقسم کیا جارہا ہے۔ ایبانک غلام لوگوں کی زبان ہے۔ یہ اس لئے کہا جارہا ہے کہ یورپی انگریزی اور کالوں کی انگریزی کا پس منظر ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔

لہٰذا امریکہ میں کالے باشندوں کے لئے الگ تدریسی نصاب اور قواعد ترتیب دیئے جانے کے متعلق مباحث ہو رہی ہیں تاکہ ان کی الگ لسانی شناخت ممکن ہو۔ یہی مغربی تہذیب کا نابینا پن ہے جس نے ایک عرصے سے فکر و دانش پر مغربی برتری کو تھوپا۔

ایبانک تنقید کو جدید نو آبادیاتی طرز کی تنقید بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس تنقید میں بنیادی خدوخال وہی ہیں جو پس نو آبادیاتی تنقید میں نظر آتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ نو آبادیاتی تنقید میں "فرد" "غلام" ہے جبکہ ایبانک تنقید میں فرد "آزاد" ہے لیکن نسلی جبر سے کچلا ہوا ہے اور اس کی گم گشتہ تہذیب کو دانستہ طور پر معدوم کرنے کا کرب اس تنقید میں جھلکتا ہے۔

بالائی ساختیات (Super Structuralism)

بالائی ساختیات میکروازم (Macroism) کا تصور ہے اس تصور کو اُفقی ساختیات سے بھی مماثل قرار دیا جاتا رہا ہے لیکن اس مماثلت سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ بالائی ساختیات کا تصور مارکسی ساختیات کا سب سے اہم موضوع رہا ہے لیکن پھر بھی اس تصور سے زبان، مخاطبے (ڈسکورس) اور قرات کو نئی معنویت سے ہم کنار کرواتا ہے۔ یہ تصور انفرادی موضوعیت سے باہر رہ کر زبان کو بطور ایک "ادارہ" کے زیر مطالعہ رکھتا ہے۔ ساسر (Saussure) نے لسان کے نمونوں کا ثقافتی تناظر میں مطالعہ کرتے ہوئے زبان کو ایسا مظہر قرار دیا جو کہ انفرادی طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ زبان میں حقیقت مصنوعی درجات میں تبدیل ہو کر لفظ کی معنویت کو تشکیل دیتی ہے۔ یہ مصنوعی درجہ بندی اپنے حق کو پانے میں بھی ناکام رہتی ہے۔ مارکسی تنقید میں یہ روایتی مارکسیت ہی اعلیٰ ساختیات کو متعارف کرواتی ہے۔ کرسٹوفر کاڈویل (Christopher Caudwell) کا کہنا ہے کہ ادبی اصناف معاشی نظام کا ردِ عمل ہوتا ہے اور اقتصادی عناصر ہی ادب کو تخلیق کرتے ہیں۔ لوسین گولڈ مین (Goldmann) نے اس سلسلے میں مماثلتی (Homologous) کی اصطلاح بیان کی جس کے تحت معیشت اور ثقافت کے اتصال کو معاشرتی سطح پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جیمسن (Jameson) کا کہنا ہے کہ پیداوار کا مزاج مارکسی نظریے کا مزاج ہے لیکن تفہیماتی سطح پر تاریخی ارتقا کا کوئی ماڈل نہیں ہے۔ جیمسن نے روایتی مارکسی وساطت سے خام معاشی جبر کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ معاصر مارکسی نظریے میں اندرونی تنقید پر اظہار خیال کرتے ہوئے روسی کمیونزم اور اسٹالن ازم پر بحث کی جو کہ اصل میں آلتھیوزر کی فکری روش تھی۔ آلتھیوزر کے مفید اور عمیق نظریات نے بہت سے مارکسی ماڈلز کو سپر اسٹرکچرازم سے منسلک کر دیا تھا۔ انہی نظریات سے متاثر ہو کر جیمسن نے روایتی مارکسی حوالے سے علت و معلول کے رشتوں کو دریافت کرتے ہوئے بالائی ساختیے کا نقشہ ترتیب دیا:

بالائی ساختیہ پر محیط معاشی رشتے Infrastructure (ثقافت = آئیڈیالوجی)

سپر اسٹرکچرازم اور اس کے فریم ورک پر یورپی ساختیات، پس ساختیات، نشانیات، آلتھیوزر اور لاکان کے نظریات میں خاصا تفاوت اور اختلاف نظر آتا ہے جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ

سا سر کے لسانی تصورات دو یردا کے یہاں سپر اسٹرکچر کا مرکزی تصور بن جاتا ہے۔ سپر اسٹرکچر جب بھی زبان سے بحث کرتی ہے تو وہ نحویات میں الجھ جاتی ہے اور نور جن گھوڑے کی طرح عالموں اور دانشوروں کو ہی نہیں قاری کو بھی مغالطوں میں ڈال دیتی ہے۔

بالائی ساخت کاماڈل زمین پر اس طور پر نمودار ہوتا ہے۔

بدیعیاتی تنقید (Rhetorical Criticism)

روایتی طور پر بدیعیات زبان، تحریر و بیان کے وہ اصل و ضوابط ہیں جس سے اظہار اور ابلاغ کو متاثر کن بنایا جاتا ہے لہٰذا اسے فصاحت کا تنقیدی نظریہ بھی کہا گیا۔ بدیعیاتی تنقید کو کہیں کہیں ڈسکورس نظریے سے بھی موسوم کیا گیا جو کہ متن کے مظہر اور میکانیت کو بیان کرتے ہوئے متن کے دیگر ابلاغی مزاجوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ تنقید کا بدیعیاتی نظریہ قدیم یونانی روایت سے شروع ہوتا ہے جو زمانے کے ساتھ ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے اور تغیر پذیری کے ساتھ اس کی معنویت بھی دیگر فلسفیانہ اور نظریوں کی طرح ردّ و قبول کے مراحل سے گذری لیکن جدید علوم خاص کر عمرانیاتی اور ابلاغی مطالعوں میں بدیعیاتی تنقید نے تحقیقی اور تفتیشی حسیت کو اپناتے ہوئے کئی نئی فکری اور تنقیدی بساطیں بچھائیں۔ خاص طور پر وین بوتھ (Wayne Booth) سے لے کر ڈی مین (Deman) کی ردّ تشکیل کی مباحث تک، سبھی میں ساختیے کا بیانیہ تصور ملتا ہے جس میں معنویت کو پالینے کا کوئی حتمی استدلال نہیں ملتا۔ اس پر باقاعدہ سوچ بچار بھی کیا گیا۔ اس سلسلے میں کینتھ برک (Kenneth Burke) نے ۱۹۶۱ء میں "The Retorical of Fiction" لکھی۔ ردّ تشکیل کے حوالے سے پال ڈی مین نے ۱۹۷۱ء میں "Blindness and Insight" نامی مقالہ لکھا۔ اس کے بعد بدیعیاتی تنقید کا مطالعہ ادبی

تنقید کے ایک مضبوط ستون کے طور پر کیا گیا۔ خاص طور پر زیرک نقاد فرینک لینٹریشیا (Frank Lentricchia) نے ۱۹۸۴ء میں Criticism of Social Change لکھی جس میں انھوں نے کینتھ برک اور ہیرالڈ بروم کے نظریات کی دوبارہ تشخیص کا مطالبہ کیا کیونکہ ان دونوں کا خیال تھا کہ بدیعیات کی بحث کو ریلپ والڈ ایمرسن (Emerson) نے شروع کیا۔ ۱۹۷۵ء میں بلوم نے "Map of Misreading" میں یہ بات وثوق کے ساتھ لکھی کہ ردّ تشکیل کے حصے بخرے کرنے کے بعد Reorient کی تھیوری تحریر کے نظریے میں تبدیل ہو جاتی ہے جو امریکی مزاج کی تشریحات کو ابھارتی ہیں جیسا کہ ہم ویٹمن، پرس سے لے کر اسٹیون اور کینتھ برک کی تحریروں میں دیکھتے ہیں جسے ایمرسن نے بڑی جرأت اور فصاحت سے بیان کیا اور تحریر کیا ہے جس پر حکمرانی کرنے والی آوازوں کا سراغ لگایا۔ ٹیری ایگلٹن کے خیال میں نشانیاتی نظام کا ڈسکورس، فلم، ٹیلی ویژن، فکشن، فطری سائنس، شعور زبان اور لاشعور کی ہیئت ترتیب دیتا ہے جو کہ مروجہ نظام کی قوت سے قریبی طور پر منسلک ہوتا ہے جو اس کی تراش خراش کے علاوہ مبادلیات سے بھی بحث کرتا ہے جس کا قریبی تعلق انسان کی معنویت سے ہوتا ہے۔

پس نو آبادیاتی تنقید (Post Colonialism Criticism)

یہ پس ساختیاتی تنقید کی سب سے ریڈیکل تنقید ہے جس میں نو آبادیاتی ڈسکورس کے تناظر میں پس نو آبادیاتی تنقید کی اصطلاح کو وضع کیا جاتا ہے۔ اس تنقید کے تحت نو آبادیات اور استعماریت کے ثقافتی خدوخال کو وضع کرتے ہوئے ان رجحانات کو دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے سبب نو آبادیاتی نظام کے خلاف افراد جدوجہد کرتے ہیں۔ خاص طور پر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی برطانیہ سے آزادی کے بعد دانشوروں، فنکاروں، ادیبوں اور عالموں میں میٹروپولیٹن شعور جاگا۔ خاص طور پر ۱۹۵۰ء کے بعد بائیں بازو کی تنقید میں "تیسری دنیا" کا تصور اُبھرا جس میں ژاں پال سارتر کی فکریات کو بھی بڑا عمل دخل تھا۔

فرانز فینن (Frantz Fanan) نے اس رجحان پر "The Wrethed of the Earth" (1961) لکھی۔ پس نو آبادیاتی تنقید نے آئیڈیالوجی کی سطح پر دولت مشترکہ کے ادب کی بھی

نئے سرے سے درجہ بندی کی اور ۱۹۸۰ء تک یہ تنقیدی رویہ ردِ تشکیل اور پس ردِ تشکیل کی تنقید میں بھی نفوذ کر گیا۔ اس کو جدیدیت کی تحریک سے بھی ملا دیا گیا حالانکہ جدیدیت نے نوآبادیاتی تنقید کو خاصا نظر انداز بھی کیا۔ اس میں مغرب اور تیسری دنیا کے درمیان قوت کے عدمِ توازن کے شعور کو بھی ابھارا گیا اور خیال کیا گیا کہ جدیدیت کی تحریک مغربی اقدار اور عصبیت کا احساس جرم ہے اور خاص کر جدیدیت کی تحریک فکر (فلسفے) پر ارسطو، افلاطون، ہیگل، ریکارٹ، روسو، کانٹ، کارل مارکس، برگسان، نطشے، شوپنہار، فرائڈ اور برٹینڈ رسل وغیرہ اور ادب پر ہومر، دانتے، فلوبیئر، بالزاک، شیکسپیئر، ورس ورتھ، کولرج، بائرن، ایلیٹ، ایزرا پاؤنڈ وغیرہ کے حاوی اثرات ہیں۔ غیر مغربی فلسفہ، ادب کی ثقافتی رنگا رنگی، تجربات اور ہیئت، مغرب پسندانہ جدیدیت میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ دویردا نے سب سے پہلے اس بات کا احساس دلوایا کہ مغربی مابعد الطبعیات گوری اساطیر ہے جو گورے آدمی کی ثقافت کا انعکاس ہے۔

پس نوآبادیاتی نقاد نے اس ردِ تشکیل کے رویے سے گہرا اثر قبول کیا۔ باختن کے یک مکالماتی، گریماز کی Hegemony، فوکو کے "قوت اور آگہی" پس نوآبادیات شکن تصورات ہیں۔ لیوٹرڈ (Lyotard) کا کہنا ہے کہ جدیدیت کے نقاد تاریخی بیانیہ کو آفاقی رنگ دیتے ہوئے اسے مغرب کی عقلیت میں تبدیل کر دیتے ہیں جن کے تمام حوالے مغرب کی "دانش مندانہ" روایت سے منسلک ہیں جو کہ اصل میں مغربی آون گارد کا اندھا تصور ہے۔

پس جدیدیت، پس ساختیات کے انسانی متعلقات ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں۔

پس نوآبادیات تنقید کے تمام موضوعات استعاری نوعیت کے ہیں جن میں مغائرتی موضوعیت سے انکار کیا جاتا ہے لیکن اس کی وابستگی غیر مغربی ثقافت سے ہوتی ہے۔ فلسطینی نژاد امریکی ادبی نظریے داں اور نقاد ایڈورڈ سعید کے پس نوآبادیاتی تنقید کے بنیادی اصولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے "Orientalism" لکھی۔ یہ کتاب سیاسی وابستگی سے منسلک ہے جو کہ فلسطینی کاز سے جڑی ہوئی ہے۔ ایڈورسعید کے ڈسکورس نے نطشے کو اصل معاشرتی اور سیاسی جدوجہد سے جوڑتے ہوئے اسے مغربی ڈسکورس کا چیلنج بتایا۔ انھوں نے فوکو کی منطق کو اپناتے ہوئے بتایا کہ ڈسکورس ہمیشہ متعین نہیں ہوتا اور علت و معلول اس پر اثر انداز ہوتے

ہوئے اختلاف کا سبب بنتے ہیں۔

پس بالائی ساختیات (Beyond Super Structuralism)

اعلیٰ ساختیات کا بنیادی نظریہ اینگلو سیکسن کی فلسفیانہ روایت، تجربیت (Empiricism) پر استوار ہے۔ اس نظریے میں یورپی روایت کی "میں" (I) کو خاصا عمل دخل حاصل ہے۔ اس میں یورپ کی روایتی مابعد الطبعیات کا خمیر بھی شامل ہے۔ پس اعلیٰ ساختیات نے اس قدر سے وسیع تناظر کو ممکنہ طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے مطالعہ کیا۔ اس نئی فکری کاوش سے ادبی اور لسانی نظریے میں کئی دلچسپ اور سنجیدہ مباحث کو فروغ حاصل ہوا۔ اصل میں اعلیٰ ساختیات کی نئی توسیع (پس اعلیٰ ساختیات) کے پس منظر میں بیکن (Beacon)، لاک (Locke)، بارکلے (Berkeley) اور ہیوم (Hume) وغیرہ کے فلسفیانہ ذہن کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے جبکہ "میں" (I) کی موشگافیوں میں دیکارت (Descartes)، کانٹ (Kant) اور مظہریات داں ہوسرل (Husserl) اور قریب قریب سب ہی فلسفی اس بحث میں شامل کیے جا سکتے ہیں جبکہ مابعد الطبعیات فلسفہ افلاطون، اسپنوزا (Spinoza) اور ہیگل (Hegel) کے فلسفیانہ خیال کے تحت "حسی معطیات" (Sense-Data) تشریح ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ساختیات اور مابعد الطبعیاتی فلسفہ ایک دوسرے سے خاصا فاصلہ رکھے ہوئے ہیں لیکن تحلیلی اور تجربی فلسفہ قریب قریب ایک دوسرے میں مدغم ہیں جس کو اعلیٰ ساختیات بھی بھرپور طور پر نہ دیکھ پائی۔ جس طرح آلتھیوزر نے ہیگل، دویردا نے افلاطون اور ہیگل پر شدید قسم کے علمی اور فکری اعتراضات کیے اور پس ساختیاتی فلسفیوں اور نقادوں نے مغربی مابعد الطبعیات کو پس پشت ڈال دیا۔

پس اعلیٰ ساختیات پر آسٹریلیوی نقاد رچرڈ ہارلینڈ (Rechard Harland) نے "Beyond super Structuralism" (۱۹۹۳ء) لکھی۔ کتاب میں سپر اسٹرکچرازم کی تحدیدات، نحو کے نظریے، نحوی اور لسانی رشتوں، مظہریاتی روابط، منطق اور تحلیلی نظریہ شکنی، ادب کے نحوی اور اُفقی مطالعے، نحوی تکنیک اور ردِ تشکیل پر مدلل بحث کی ہے۔

پس ساختیات (Post Structuralism)

پس ساختیات نے ۷۰ کی دہائی میں ساختیات کی مروجہ معنویت سے قدرے الگ راہ نکالتے ہوئے ادب ولسان کے تنقیدی تناظر میں کئی ریڈیکل اضافے کئے۔ جانتھن کلر نے "آن ڈی کنسٹرکشن" (۱۹۸۲ء) میں لکھا ہے کہ "کل کے ماہر ساختیات آج کے پس ماہر ساختیات ہیں۔" کلر کے بقول ساختیات کی اصطلاح کی سب سے اچھی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں لسانیات بطور ایک ماڈل کے مطالعہ کیا جاتا ہے اور قواعدیات / تحریرات کی تشکیل کی سعی کی جاتی ہے اور اتصال کے ممکنات میں ایک نظام کے تحت مختلف عناصر کی فہرستیں ترتیب دی جاتی ہیں جو ادبی عمل سے اخذ ہو کر معنویت اخذ کرتی ہیں جبکہ پس ساختیات تفتیش کے بعد اس ماڈل کو تہہ وبالا کرتے ہوئے متن کو اپنے طور پر مطالعہ کرتا ہے۔ ساختیات کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ آگہی کی غیر ممکنات سے بحث کی جائے، جن میں تاریخی اور تصورانہ تعریفات کی بھرمار بھی نظر آتی ہے۔ پس ساختیات کی ابتدا دریدا کے جان ہاپکنز یونیورسٹی (امریکہ) میں پڑھے ہوئے ایک پرچے "Structure Sigh and Play in the Discourse of the Human Science" (1966) سے ہوئی۔ اس مقالے میں دریدا نے ساختیات کی ظاہری سائنسی مباحث پر سخت تنقید کی جو کہ ساسر سے شروع ہو کر لیوی اسٹراوس تک بکھری ہوئی تھی جس میں ترتیب وار ساختیے پر زور دیا گیا تھا جس کے پس منظر میں یہ نکات اہم تھے۔

(۱) افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے تھیوری میں شعر وادب کا ڈسکورس ہوتا رہا ہے۔ اس لحاظ سے روایتی معنوں میں تھیوری حس کی تصورانہ اسکیم ہے جس کے اپنے اصول، امتیازات اور درجہ بندی ہوتی ہے جو تنقیدی عمل میں ارتقائی اور تحلیلی نوعیت کی درجہ بندی کرتی ہے جس کو پس ساختیات میں نظریہ (تھیوری) کہتے ہیں جو بعد ازاں اس مخصوص تنقیدی فکر میں حاوی محرک بن جاتا ہے جو بعد میں فکر کو تھیورائز (Theorize) کرتے ہوئے نقاد کی حیثیت اور عملیات کو متعین کرتے ہیں جس میں کئی بندشیں اور مخصوص صورت حال معنویت اور تشریح کے لئے نئے جبروں کو ابھارتے ہیں۔ اس صورت حال کا عموماً زبانی لسان

پر اطلاق نہیں کیا جا سکتا لیکن نفسی جنسی معاملات اور معاشرتی ساختیات میں انسانی علوم سے علیحدہ دریافت کئے جا سکتے ہیں لیکن ان کا مزاج پس ساختیات میں انسانی علوم سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور انسانی شعور کی فطرت اور موضوعیت معاشرتی اور ثقافتی مظہر کا ہیجانہ (صوری) حوالہ بنتا ہے لیکن فرد کا عمومی تجربہ زبان کی تشریح میں کسی نظریے کا سبب نہیں بنتا، یا عموماً نظریہ عارضی طور پر اسے قبول کر لیتا ہے۔ تجربہ التباس کو رد کرتا ہے اور نظریہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ آئیڈیالوجی کی عملیت سے معنویت کے نظام کو تشکیل دے۔ پس ساختیات کا نظریہ تمام سابقہ آگہی، علوم واقدار سے اختلاف کرتے ہوئے ان کو چیلنج کرتا ہے اور ان کی مروجہ معنویت کو تہہ وبالا بھی کر دیتا ہے جس میں اصل نکتہ مغربی تہذیب کے ڈسکورس کے روایتی مزاج سے متعلق ہوتا ہے جو قیاسات کی بنیادوں، تصورات کے طریقہ عمل کے ممکنات کے اطلاق کی راہیں تلاش کرتی ہیں جس میں معاشرتی اداروں سے لے کر سیاسی اقدار اور معاشرتی تنظیموں کا مطالعہ اور تجزیہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

(۲) پس ساختیات موضوع کو "لامرکز" کرتی ہے اور انسان پرستی کے واہمے کا پردہ چاک کرتے ہوئے مصنف کے روایتی تناظر کا انکشاف کرتی ہے جس میں مزید انسانی موضوعات در آتے ہیں، اس خانے سے ادبی ولسانی معنویت اور تحریری اشیاء کا ادراک ممکن ہوتا ہے۔ اس مقام پر "زبان" کی اپنی اہمیت ہوتی ہے لیکن پس ساختیات لسانی سطح پر کنٹرول کئے جانے والے "کوڈز" (Codes) سے علیحدہ کرتی ہے۔ زبان فرد سے شروع ہوتی ہے جو معاشرے میں ابلاغ کا سبب بنتی ہے جو اصل میں "موضوع" سے شروع ہوتی ہے اور ..... "میں ہوں" ..... "میں نے دیکھا" ..... "میں سوچتا ہوں" — اور ذات کی جدلیات سے مباحث کرتے ہوئے مابعد الطبعیاتی مطالعوں کی تاریخ میں بھی اتر جاتی ہے۔ فرد کی رائے، ذاتی خیال ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار معاشرتی سطح پر معروضی نوعیت کا ہو جاتا ہے لیکن متن پر موضوع بری طرح اثر انداز ہوتا ہے جو مزید "مائیکرو" (Micro) صورت میں "بین المتنیت" کی صورت میں تبدیل کر جاتا ہے اور ساختیے کی میکانیت اس کو کنٹرول نہیں کر پاتی مگر ایک وسیع نظام میں دیگر متنوں کا اطلاق روایتی طور پر ہوتا ہے، متن کا تعلق قرات سے جو اس کی تشریح کا سبب بھی ہوتا ہے جو گفتار یا کلام کو رد کرتا ہے۔ متن کی فطرت داخلی ہوتی ہے اور متن ہی متن کو

متعین کرتا ہے۔ یہی پس ساختیات کے ڈسکورس کا تصور ہے۔

پس ساختیات کی تھیوری پر رچرڈ رونی، تودوروف، جیمسن، سائیے، ہاورڈ فلپرن، پیٹر ڈوویو، ہیمن لاوونراؤ، ایم ایچ ابراہام، کے ایم نیوٹن، جان میٹنگون، جاتھن کلر، دریدا، ڈی مین، وائٹ، بلوم، ہارٹ مین، طرو غیرہ نے صراحت سے لکھا ہے۔

ٹروپ / ٹروپولوجی (Trope/Tropology)

ٹروپ کی عموماً یہ تعریف کی جاتی ہے کہ وہ معنی کو مزید معنی دیتی ہے۔ خاص طور پر عام بول چال کے الفاظ جب اس تعریف میں داخل ہوتے ہیں تو "ٹروپ" اصطلاح کے تحت کئی غیر لغوی معنی سامنے آجاتے ہیں اور یہ تاریخ کے تناظر کو کئی نئے اصولوں سے متعارف کراتا ہے۔ اگر کلام کے خدوخال کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدیعیات مطالعوں میں کئی غیر ضروری بندشیں شامل ہیں۔ لہٰذا ٹروپ کی ادبی تنقید روز مرہ کے گفتاری مزاج میں ڈسکورس کی نئی جہتیں تلاش کرتی ہے۔ "ٹروپولوجی" نے ٹروپ کے بدیعیاتی تصور کو وسعت سے ہم کنار کیا جو بعد میں ادب کے تنقیدی نظریے میں اہمیت حاصل کر گیا۔ اس سلسلے میں ارنسٹ رابرٹ کرٹس (Ernest Robert Curtius) کا نام لیا جاتا ہے جنھوں نے ۱۹۴۸ء میں "European Literature and Latian Middle Ages" لکھی۔ اسی کتاب کی روشنی میں ایرچ اورباخ (Erich Auerbache) نے اس تصور کو آگے بڑھایا جس کا اثر عہد حاضر کے تحصیلاتی اور ردتشکیل نظریے پر بھی پڑا۔ "ٹروپ" اس امر کا بھی مطالعہ کرتی ہے کہ باطنی سطح پر حقیقت کس طور پر ایک مخصوص نظام ترتیب دیتی ہے اور اسے تسلیم کراتے ہوئے لسانی معنیات سے بھی بحث کرتی ہے۔ ہیرالڈ بلوم نے "A Map of Misreading" (1975) میں "ٹروپولوجی" کو تنقید لکھا ہے اور اسی تنقیدی مزاج کے سبب دریدا کی White "All Mytology: Metaphor in the Text Philosophy" (1972)، پال مین کی "Creativity of Language" (1973)، پال رکلیوع کی "Egories of Reading" (1979) سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بلوم کے بقول ٹروپ تنقید کے بہت سے تصورات کو گمراہ قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اپنی تشریحات میں بہت سی غلطیاں کرتی ہے اس سے زبان متاثر ہوتی ہے اور

آخر کار خطرناک حد تک متن میں درج ادبی معنویت کا خون ہو جاتا ہے۔ بلوم نے اپنی کتاب میں ٹروپ تنقید کے چار تصورات کی نشاندہی کی ہے۔ (۱) طنز، رمز (۲) استعارہ (Metaphor) (۳) مجاز مرسل (Metonyms) (۴) کل (Synecdoche) — پھر مبالغہ (Hyperbole) اور (Metalepsis) کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ بلوم کا خیال ہے کہ ٹروپ اپنا نظریہ خود بناتا ہے اور اپنے سے پہلے والے نظریات سے الگ راہ نکالتے ہوئے اپنے طور پر قرات کی توجیہات پیش کیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس سے قرات کے ردتشکیل نظریے میں گمراہ کن قرات کا تصور در آیا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ بہت سے روایتی اور غلط قسم کے ادبی نظریات پر نظر ثانی ہوئی اور ٹروپ تنقید نے روایتی تنقید کے اختتام سے اپنا تصور کا آغاز کیا۔

تاریخ کار تنقید (Historiographical Criticism)

پس ساختیات کے بدیعیاتی خمیر سے جنم لیتے ہوئے کئی ساختیاتی ہستیوں میں شناخت کی جا سکتی ہے۔ تاریخ کار تنقید، ڈسکورس تنقید کا ذیلی فکری نظام ہے جو خالصتاً اس کا ردعمل نہیں۔ اسے معروف اصطلاح میں "تاریخ کے نظریے" کا بھی نام دیا گیا۔ ہائیڈن وائٹ (Hyden White) نے ردتشکیل کا ریڈیکل پیانہ اپناتے ہوئے ساختیاتی حوالے سے نئی ردتشکیل کی تاریخی رسائی کو ابھار دیا۔

۱۹۷۸ء میں انھوں نے "Trope of Discourse" لکھی اور اس بات کا احساس دلایا کہ تاریخ دان یہ چاہتا ہے کہ بیانیہ معروضی ہو لیکن ساختیہ ان کے بیانیہ میں حتمی طور پر فرار حاصل نہیں کر پاتا کیونکہ ہمارے ڈسکورس کی معطیات شعور کے ساختیات کے قریب آتے ہوئے پسپا ہو جاتا ہے جس کی گرفت کرنا چاہتے ہیں لہٰذا لسانیات کے نئے معروضات کا ظہور ہوتا ہے اور مطالعے کے نئے میدان تسخیر کیے جاتے ہیں جس کی منطقی استدلالیت کے موضوعات سے زیادہ Prefiguratives کی اہمیت ہوتی ہے جس میں بقول کینتھ برک (Kenneth Burke) کے چار خاموش اطلاقی عناصر ہوتے ہیں۔ (۱) استعارہ (۲) مجاز مرسل (تلازمہ) (۳) Synecdoche (۴) طنز، جس کو کینتھ برک نے "Four Master Tropes" کہا ہے۔ تاریخی فکر "Tropes" کی اصطلاح کو اپنانے سے ہچکچاتی ہے۔ وائٹ کا استدلال ہے کہ پیاژے (Piaget) کا Figurative

شعور عمومی نفسیات کا حصہ ہے۔ انھوں نے فرائڈ، مارکس، تھامس اور کئی دوسرے اہل فکر و نظر کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی "معروضی آگہی" یا مطلق "تاریخی حقیقت پسندی" کو بیان کیا ہے جو کہ "ماسٹر ٹروپ" کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ہائیڈن وائٹ کی تاریخ کار تنقید زبان کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے زبان کے بارے میں عام قیاسات کو جنم دیتی ہے جو اصل میں زبان و لسان کا نظریہ ہونے کے علاوہ تاریخ کا بھی نظریہ ہے۔ رائف کونن اس بارے میں کہتے ہیں کہ "ہم اس بات کو غلط یا صحیح تسلیم کریں لیکن ان جدید لسانی تصورات میں لاتشکیلیت کا کوئی مقام نہیں، یہ بات واضح ہے۔" ہائیڈن وائٹ نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ نئے نظریے کا مقصد یہ تھا کہ جدیدیت بطور موضوع تحقیق اور مطالعے کے لئے مناسب تنقیدی تاریخ، تاریخی شعور، تاریخی مخاطبے (Historical Discourse) اور تاریخی تحریر کی تھیوری ہونا ہوگا۔

تفہیمات (Hermeneutics)

تفہیمات تشریح اور شرح کا حتمی نظریہ ہے جو کہ انجیلی شرحیات اور کسی حد تک لسانی متن کی تشریح سے متعلق قرار دیا جاتا ہے اس کی ابتدا فلسفیانہ سطح پر جرمن روایت میں نظر آتی ہے۔ ولہم ڈھیتی اور فلو جیوڈس (Philojudaeus) نے انجیلی تفاسیر کو مذہبی دستاویزات کی آگہی کے لئے انتخاب کیا۔ تفہیمات کی فکری تاریخ کو تشکیل دینے میں خرماخر، مارٹن ہیڈیگر کے نام بھی اہم ہیں۔ جدید تفہیمات پاوس کی تحریروں سے شروع ہوتی ہے جو جرمن فکر کا اہم جز رہا جبکہ امریکہ میں ای۔ ڈی۔ ہرش نے تفہیمات کے ادبی نظریے اور طریقہ کار سے بحث کی۔ ڈی مین اور فشن نے بھی اس موضوع پر لکھا۔ Herme Neutics کا لفظ یونانی لفظ Hermeneuien سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی تشریح کے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں رچرڈ ہائمنر نے اپنی کتاب Hermeneutics میں لکھا ہے کہ "برسوں سے اس کے معنی 'تشریح'، 'ترجمے' اور 'کہنے' سے لئے گئے جیسا کہ ہیڈیگر کا کہنا ہے کہ لفظ "دیوتا" کے پیامبر "ہرمن" سے تفہیم ہو سکتا ہے۔ تفہیمات کا اصل مقصد ہی پیغام پہنچانا ہے۔ تفہیمات کی تنقید میں تاریخی تنقید کا گہرا اثر ہے تب ہی ان مطالعوں میں ثقافتی، تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اثرات نمایاں ہیں جن کے افق کو

متن ہی بیدار کرتی ہے لہٰذا اسے "چلن کا پگھلاؤ" بھی کہا گیا ہے (یہ اصطلاح گڈامیر نے بیان کی ہے) ہیڈیگر نے Being and Time (1927) میں تفہیماتی طریقہ کار کو بیان کیا ہے۔ ان کے خیال میں بنی نوع کا ابتدائی لازمہ تشریح کے مزاج کے طریقہ عمل کو تشکیل دیتا ہے جس کا وجود حاوی طور پر تفہیماتی مسائل اور واقعات سے عبارت ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ انفعال کی آگہی میں دنیاوی حقائق تاریخ اور ارادہ اہم محرک ہوتے ہیں کیونکہ تفہیمات میں تفہیم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی وہ فطری طور پر اپنے راستے خود بناتی ہے وہ مظہریاتی حوالے سے یہ بھی کہتے ہیں کہ تفہیمات کا مقصد یہ ہے کہ معنویت کس طور پر شعور پر حاوی ہو کر قائم ہوتی ہے جو اپنے انکشاف کے لئے تفہیم پر تکیہ کرتی ہے۔ تفہیمات پر پال رکنیوع، فرائی، چامسکی، ہیبرماس، گیبلر (Gabler)، اسٹوڈلین (Staudlin)، زچارا (Zachara)، کوکی لس (Coccerus)، بینگل (Bengel) وغیرہ نے پر فکر تحریریں چھوڑی ہیں۔

ردِّ تشکیل (Deconstruction)

ردِّ تشکیل کی عصری تنقیدی بساط بچھانے میں فرانسیسی نقاد فلسفی ژاک دریدا (Derrida) پیش پیش رہے جنھوں نے نطشے اور ہیڈیگر کے فکری نظام کے اہم موضوعات "آگہی"، "صداقت" اور "شناخت" کے علاوہ سگمنڈ فرائڈ کے تحلیل نفسی کے علاوہ ہوسرل کے فلسفہ مظہریات سے مدد لے کر ردِّ تشکیل کی فلسفیانہ روش کو روشناس کروایا جو اصل میں جنیوا مکتب سے علیحدگی کا بھی اعلان کرتا تھا جس سے زبان اصناف اور تناظریت کے فکری رجحان کو وسعت ملی۔ دریدا کو ہمیشہ احساس رہا کہ ادب اور متن کی بحث فلسفیانہ نظریے اور ادبی تنقید میں مشترک طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اوسو کے یہاں متن کا وہی تصور ہے جو دریدا کے یہاں ردِّ تشکیل کی صورت میں ابھرا۔ ردِّ تشکیل میں کلام اور تحریری زبان کا لہجہ براہ راست، غیر مشکوک اور صداقت پر مبنی ہوتا ہے۔ دریدا کا خیال ہے کہ کلام و گفتار کی جڑیں تشکیک اور احتیاطی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ردِّ تشکیل کے نقاد یہ بھی کہتے ہیں کہ متن کے متعین معنی نہیں ہوتے کیونکہ کئی موضوعی عناصر متن کی معنویت کو تبدیل بھی کر دیتے ہیں۔ دریدا کا کہنا ہے کہ ردِّ تشکیل ادبی تنقید کا مزاج نہیں ہے بلکہ یہ متن کی قرأت کی راہیں اور ان کی نوعیات ہیں

جو کہ مغربی فلسفے کے سبب مابعد الطبعیات سے وارد ہوئیں جنھیں ردِ تشکیل ضرب لگاتا ہے کیونکہ مابعد الطبعیات ایک بھرم ہے جو سچائی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے، جس کا معاشرتی، بشریاتی یا مذہبی اقدار سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ ادب پاروں کے مطالعے میں لسانی اثرات اور اس کے معنوی اور متنی پہلوؤں سے بحث کرتا ہے کیونکہ دریدا کے بقول ادب فلسفے سے زیادہ بہتر طور پر صداقت سے کلام کرتا ہے کیونکہ زبان کا حوالہ با آسانی کنٹرول نہیں ہو پاتا۔ اسٹیون وائن برگ نے ردِ تشکیل کی فی زمانہ صورتحال کے متعلق لکھا ہے کہ دریدا اور دیگر مابعد جدید اصحاب بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں کہتے جسے بیان کرنے کے لئے کسی خاص تکنیکی زبان کی ضرورت پڑے اور یہ لوگ اپنی بات کہنے کے لئے نہ جانے کیوں کوئی خاص کوشش بھی نہیں کرتے مگر جو اصحاب ایسی تحریروں کو تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، حیرت ہے ان کے لئے رودیدا کے اقتباسات جو شوکیل (Sokal) نے بیان کئے ہیں، شرمندگی کا باعث نہ بنیں۔

ردِ تشکیل کے فکری نکات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) ردِ تشکیل متن کی باطنی گہرائیوں سے اپنے علمی اور فکری جدلیات کا آغاز کرتا ہے۔

(۲) متن کی معنویت وہ نہیں ہوتی جو نظر آتی ہے، معنویت ایک دوسرے کو ردّ کرتی ہے اور "ردّ" معنویت ہی تیسری معنویت کو جنم دیتی ہے۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ متن کی معنویت وہی ہو جو مصنف پیش کر رہا ہے۔

(۴) ردِ تشکیل، متن معنویت اور صداقت کے ادراک کے عناصر کو قولِ محال اور ابہام کے عمل سے گذارتا ہے۔

(۵) متن کی تفہیم نئی معنویت کو معین کرتی ہے جو پرانے معنوں سے اپنی دستبرداری کا اعلان کرتی ہے۔

(۶) ردِ تشکیل کے نظریے میں تمام کائناتی سچائی اور معنویت کا وجود نہیں ہوتا۔

(۷) ردِ تشکیل معنوں میں سچائی کا عنصر دریافت کرتی ہے۔

(۸) ردِ تشکیل قوت اور مقتدریت کے حوالے سے متن کے پراسرار رموز سے پردہ اٹھاتی ہے اور لسانی حوالے سے آگہی کو دریافت کرتی ہے جس کا سلسلہ تفہیمات تک جاتا ہے۔

(۹) قاری اور متن کے درمیان فہم و فکر کے تعارض سے متن میں معنویت دریافت ہوتی ہے، معنی متن میں نہیں ہوتے۔

(۱۰) ردِ تشکیل متن کی قرات میں مبادلیاتی سانچے کو تخلیق کرتی ہے۔

(۱۱) معنویت کا اختلاف آئیڈیالوجی کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔

ردِ تشکیل کی فکری تحریک میں گائتری سپیوک (Spivak)، جیرلڈ گریف (Geral Graff)، ڈی مین (Deman)، باربرا جانسن (Barbra Johnson)، ہلس ملر (Hills Miller)، جیفری ہارٹ مین (Hartman)، جاناتھن کلر (Culler)، رچرڈ روٹی (Rorty)، مائیکل ریان (Ryan)، کرسٹوفر نورس (Norris)، ایگلٹن (Eagleton)، ایم ایچ ابرہام (Abrams)، فرینک ایلس (Frank Ellis)، فرینک کرموڈ (Kermode) جارج رے (Ray)، ڈگلس ایکٹنس (Douglas Actins) وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ردِ نو آبادیاتی تنقید (Decolonial Criticism)

پس نو آبادیاتی تنقید کے علمبرداروں نے مغربی سامراج کے پنجے سے آزاد ہونے والے ممالک کے ادب پر سیر حاصل بحث کی۔ خاص کر ہندوستان کی آزادی کے بعد آنے والی ادبی تنقید کو اس رجحان سے متعارف کرایا۔ ساٹھ کی دہائی میں ایشیا اور افریقہ کے کئی ممالک استعماری قوتوں سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس عالمی سیاسی تناظر کے زیر اثر نو آبادیاتی تنقید نے تیسری دنیا کے مزاحمتی احتجاجی تناظر میں بھی اپنی فکری اور تنقیدی حصہ داری کا احساس دلایا۔ ان رجحانات کے ڈانڈے مابعد جدیدیت اور ردِ تشکیل کے ادبی اور لسانی نظریوں سے بھی ملائے گئے۔ پس نو آبادیاتی تنقید میں یقیناً مشرق اور مغرب کے امتیازات تعصبات، تشدد، سفاکی کی عمیق آگہی موجود تھی، اس میں ماضی کے ستم، انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال کا ادراک اس قدر حاوی تھا کہ اپنی مقامی شناخت کی تلاش میں پسماندہ، ترقی پذیر اور تیسری دنیا کا ادب بھٹک گیا اور ان اقدار کو تلاش کرنے لگا جو مغرب کی اقدار اور روایت کی دین تھیں۔ یہ رویہ سراسر واہماتی عینیت پسندی کے زمرے میں آتا تھا۔ لہٰذا انھیں سابقہ مغربی اور بدیسی آقاؤں کی فکری گرفت سے چھٹکارا نہ مل سکا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ردِّ نو آبادیاتی تنقید نے نسبتاً ایسے وسیع النظر تناظر کو جنم دیا جو پہلے نہیں تھا۔ یہ نظریہ ابھی بھرپور طور پر ابھر کے سامنے نہ آ سکا کیونکہ نئے آزاد ہونے والے ممالک اسی پرانے خول میں بند ہیں۔ نو آبادیاتی نظام سے آزادی کے بعد چاہے وہ ہندوستان ہو یا الجزائر، سوڈان ہو یا انڈونیشیا تقریباً ادب و فن پر سابقہ سامراجی اثرات قائم رہے کیونکہ نو آبادیاتی نظام کی جڑیں مکمل طور پر نہیں کاٹی گئی تھیں۔ لہٰذا ان ممالک کے فکری اُفق پر منافقت، سودے بازی اور نعرے بازی کی قوتیں کچھ ایسی حاوی رہیں کہ نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارا پانا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ فرد ہو یا حکومت ایک طبقہ ہو یا معاشرہ، ہر مقام پر سمجھوتے کئے گئے اور پس نو آبادیاتی ادب و فکر میں التباس کی دھند پھیلی۔ پس نو آبادیاتی تنقید میں انہی پرانے نظریوں اور دانش سے رہنمائی حاصل کی گئی اور کوئی آئیڈیالوجی راسخ نہ ہو سکی۔ تقریباً سبھی چھوٹے بڑے سابقہ غلام ممالک کسی واضح فکری قدر کو نہ اپنا سکے اور نہ ہی کوئی مستحکم نظام ان کے حصے میں آیا۔ وہی دو ممالک جو ایک ہی نو آبادیاتی شکنجے سے آزاد ہوئے ایک دوسرے کے دشمن ٹھہرے جن خوابوں کو پانے کے لئے سامراجی نظام سے ٹکر لی گئی، بعد میں وہ سب ہی منافقت، زبردستی اور اقتدار پسندی کی نذر ہو گئے۔ فرد سے فرد کا قلبی رشتہ کٹ گیا۔ فکری اور عمرانیاتی آدرش بکھر بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گئے تو فرد کو اپنے پھسپھسے اور کھوکھلے نظریات اور رجحانات کا احساس ہوا یہ احساس قرۃ العین کے ناولوں میں جابجا ملتا ہے۔ خاص کر ان کے ناول "چاندنی بیگم" میں ہندوستان کی آزادی کے بعد دو ملکوں کی تہذیبی، سیاسی معاشی پامالی کی نوحہ گری ہے جن میں نو آبادیاتی نظام سے آزادی کے بعد نئے اقتدار کی ترجیحات ایک ارب عوام کی ترجیحات سے مختلف تھیں۔ فرد مجہول اور نفسیاتی مریض بن کے رہ گیا۔ رد نو آبادیاتی تنقید نے نیم جاگیردارانہ نظام، سیاست، قانون، صحافت، نئے سرمایہ دارانہ نظام (چھوٹے) شو بزنس پاپولر ذرائع ابلاغ، سستی اور سطحی تفریحی پروگراموں سے فرد ہی کا نہیں بلکہ معاشرے کی بنیادی اکائی "خاندان" کے سکون کو تباہ و برباد کر دیا۔ نو آبادیاتی نظام کے بطن سے پیدا ہونے والے استحصالی نظام کو خوش آمدید کہنے پر مجبور ہو گیا۔ اسی طرح خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" میں خاندانی اکائی کا تتر بتر ہو جانا اور زریں اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حالات سے معاشی اور معاشرتی مفاہمت کر لینا ظاہر ہوتا

ہے۔ شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" میں ہجرت کے حوالے سے نئی تبدیلی کی اذیت ناکی ملتی ہے جس کے پس منظر میں سامراجی رجحان کا حاوی محرک نمایاں ہے، جہاں فرد کے آدرش ٹوٹ پھوٹ گئے اور کوئی نظریۂ حیات نہ ابھر سکا۔ عبداللہ حسین کے ناول "نادار لوگ" میں پاکستانی حوالے سے فرد کی باطنی سچائی کو اجاگر کرتے ہوئے معاشی منفعت پسندی کو ٹھکرایا گیا۔ ساٹھویں دہائی میں تیسری دنیا کے لئے سابقہ نو آبادیاتی ممالک کی ادبیات میں ردّ نو آبادیاتی تناظر کو محسوس کیا گیا خاص کر اردو کے جدیدیت پسند رجحان میں فرد کی جو ٹوٹ پھوٹ ہوئی اور قنوطی سیاق میں جو کچھ لکھا گیا وہ انحطاط ذات تو تھا ہی، مگر اصل میں اس کے پس منظر میں ردِّ نو آبادیات کا نظریہ لاشعور بھی چھپا ہوا تھا۔

انہدام سوویت روس، انقلاب ایران، سقوط مشرقی پاکستان اور دیگر عالمی تبدیلیوں نے ردِّ نو آبادیاتی تنقید کی راہیں مستحکم کیں۔

ایک جاپانی شاعر کیو کروڈا (Kio-Kuroda) نے کچھ سال قبل ایک نظم "ہنگرین قہقہہ" لکھی۔ اس طویل نظم میں ردِّ نو آبادیاتی رجحانات کو شناخت کیا جا سکتا ہے:

میں کل ضرور لکھوں گا
ہنگری کے متعلق ایک نظم

لوکاشی کون ہے
جسے پھانسی دی گئی

ناگے کہاں ہے
جسے ہم بھلا چکے ہیں

جیسے میں گمشدہ ہوں

ہنگری میں روس کے نو آبادیاتی تسلط کے خلاف بغاوت کے حوالے سے اس نظم کو دیکھیں تو ردِّ نو آبادیاتی رجحان کے عناصر کی کارکردگی کا اس میں صریحاً بیان نظر آتا ہے۔

خاص کر ۱۹۷۰ء کے بعد تیسری دنیا کی فکری بساط پر نو آبادیاتی پس منظر میں نئے تاریخی تناظر اور عقل پسندی کے مہروں کو اپنایا گیا۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہر ادب اپنے مخصوص ماحول کے تناظر میں ایک نو آبادیاتی نظام کو اپنے ذہن کے اصل فکری التباس اور

حقیقی صورتحال کا پتہ چلا کر ایک مصنوعی آئیڈیالوجی، قدامت پسندی اور اقتدار کے رجحان نے علم وادب کا کس صفائی سے استحصال کیا۔ پس نو آبادیاتی فکر میں بغاوت کا شور شرابا بہت تھا جس سے فکر جذباتی اور سطحی ہوگئی اور سیاسی اور گروہی اہداف کو پالینے کے لئے اسے استعمال کیا گیا۔ مثلاً پاکستان میں جب بھی مارشل لا لگا تو ظاہراً تو مزاحمتی شعراء کی ایک نوج اُبھر کے سامنے آئی لیکن چونکہ ان کے پاس نظریاتی قوت کی کمی تھی اس لئے ان کے تمام جذبات و دانش مثل حباب ثابت ہوئے اور ان کی شاعری افادیت پسندی اور شو بزنس سے آگے نہ بڑھ سکی۔

پس نو آبادیاتی تنقید نو آبادیاتی تنقید سے کلی طور پر انحراف کرتی ہے لیکن ردِ نو آبادیاتی تنقید کا مسلک جداگانہ ہے۔ یہ نہ تو پس نو آبادیاتی تنقید کی ضد ہے اور نہ ہی اس کی تائید مزید ہے۔ اپنے حسن کارکردگی میں یہ نو آبادیاتی تنقید کا رد ہوتے ہوئے بھی تعمیری (Constructive) کردار ادا کرتی ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ ردِ نو آبادیاتی تنقید، نو آبادیاتی تنقید کا رد ہے لیکن یہ پس نو آبادیاتی تنقید کی توسیع ہے جو کہ مغربی اور اشتراکی سامراجیت سے اپنی برہمی کا اظہار کرتی ہے اور فرد اور گروہ کو اس کے نو آبادیاتی ماضی کے شعور کو مستحکم منطقی تاویلات کی وساطت سے بیان کرتی ہے۔ ردِ نو آبادیاتی تنقید مخاطبہ (ڈسکورس) کے نئے مسائل اور قاریانہ مزاج کو پس نو آبادیاتی سیاق میں پرکھتے ہوئے سب سے پہلے اقتدار کی عفریت سے نجات دلوانا چاہتی ہے کیونکہ یہی عنصر فکروادب کا کاغذی پیراہن ہوتا ہے۔ اقتدار پسند طبقے کے رویوں اور رجحانات کا عمیق گہرائیوں سے مطالعہ کئے بغیر ردِ نو آبادیاتی تنقید کا جواز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ردِ نو آبادیاتی تنقید خود منفی اقدار کی حامل نہیں۔

ایڈورڈ ولیم سعید نے "کلچر اینڈ امپیریل ازم" میں ردِ نو آبادیات پر لکھا ہے۔ انھوں نے ولیم ییٹس (Yeats) کی شاعری میں ردِ نو آبادیاتی رویوں کو دریافت کیا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے بقول انگریزی زبان پر آئرلینڈ کے اس شاعر کی شعری فطانت کا ادراک نہ ہو سکا۔ کیونکہ آئرلینڈ پر انگریزی ثقافت، ادب اور یورپ کی جدیدیت کی یلغار ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے۔ ییٹس نے آئرلینڈ کے ساحلوں پر برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے تجربات کے حوالے سے سامراج شکن رویوں کو جگہ دیتے ہیں۔ ردِ نو آبادیات کی

وساطت سے ایڈورڈ سعید مصر، ترکی، سیلون، (سری لنکا) انڈونیشیا، چین اور ہندوستان کی مثالیں دے کر ادبی اور ثقافتی حوالوں سے تیسری دنیا کے ان ممالک میں ردِ نو آبادیاتی رجحانات کا سراغ لگاتے ہیں۔

ردِ نو آبادیاتی تنقید، سامراجی قدروں اور نظریات کو ہی نشانہ ہدف نہیں بناتی بلکہ دیگر جمہوری اور معاشرتی اور سیاسی نظاموں میں چھپے ہوئے نو آبادیاتی اور سامراجی عنصر (عزائم) کو بھی شناخت کرلیتی ہے کیونکہ ان نظاموں میں فرد کی آزادی ایک دھوکہ ہے جب یہ نظام ہائے حیات مغرب سے سابقہ نو آبادیاتی علاقوں میں برآمد کئے جاتے ہیں تو زاجیت، فاشسٹ اور آمریت کا روپ دھار لیتے ہیں۔

ردِ نو آبادیاتی تنقید، نو آبادیاتی تنقید کا رد ہے لیکن پس نو آبادیاتی تنقید کی توسیع ہے۔

زبانی شبیہ کاری (Verbal Icon)

زبانی شبیہ کاری کی اصطلاح سب سے پہلے ولیم کے وِمسٹ (Wimaastt) نے اپنی کتاب Verbal Icon میں استعمال کی جو بنیادی طور پر متن کا تنقیدی نظریہ ہے۔ وِمسٹ نے Icon کو ایک ایسا تنقیدی تصور بتایا جو استعاراتی اور علامتی جہات کے اندر کی حقیقتوں کی تشریح کرتا ہے۔ اس تصور سے متاثر تقریباً تمام ناقدین کا یہ خیال ہے کہ ادبی متن "زبانی شبیہ کاری" ہوتی ہے جس کا مکمل طور پر نامیاتی وحدت کے ساتھ کے زبانی رشتوں سے انکشاف کیا جاسکتا ہے۔ "زبانی شبیہ کاری" بنیادی طور پر شاعری کی تشریحی تنقید ہے۔

ڈسکورس تجزیہ (Discourse Analysis)

روایتی ماہر لسانیات و لسانی فلسفی اور اسلوبیات کے طالب علم عموماً زبان کے مظہر سے علیحدہ ہو کر جملے یا مجرد الفاظ تشبیہات، روزمرہ بول چال اور اساطیری خدو خال کے حوالے سے کسی متن کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ڈسکورس تنقید لسانی عمل کی تنقید ہے جو کلام اور تکلم کے وظائف پر مبنی ہے جس میں زبان تکلم سے تحریری متن میں منتقل ہوتی ہے اور قواعدیات بھی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر جانبدارانہ اصطلاح ہے۔ ۱۹۷۰ء میں تجزیاتی مطالعوں کا ادبی

تنقید کے میدان میں تعارف ہوا جو اپنے تجزیات میں بذات خود زبان کے عنصر کو اہمیت دیتی تھی جس میں زبان کے ظاہری ساختیہ کی بہ نسبت جملوں یا فقروں کی ترتیب میں ادیب و قاری مخصوص سیاقی تفاعل کی صورت حال سے بحث کرتے ہیں۔ جدید ڈسکورس کے نظریات کی ابتدا عمل تکلم (Speechact) نظریے کے فلسفی ایچ پی گریس (Grice) سے ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں Illucutionary Forces کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ لب ولہجہ صاف طور پر Illucutionary کے ارادے کی محرومی کو ظاہر کردیتا ہے اور زبان میں ابلاغ کا عمل پہلے سے متعین ہوتا ہے اور جب لب ولہجہ میں ابہام ہوگا تو اس کی تشریح کرنے کے لئے ایسے فقرے اور الفاظ استعمال کئے جائیں گے جن کے معنی پہلے سے ہی سادہ ہوں اور متعین کئے جاچکے ہوں یعنی اجتماعی نوعیت کی فطری ترتیب کے سبب ڈسکورس کا عمل مکمل ہوتا ہے اور لب ولہجے کو معنویت سے قریب ترین کرنے کے لئے ذہانت حسن عموی کا عنصر بھی اہم ہوتا ہے جس کے سبب ڈسکورس کی معنویت مزید مستحکم ہوتی ہے۔ عموماً مصنف اور قاری ایک دوسرے سے غیر لسانی آگہی اور تجربے کا تبادلہ بھی کرتے ہیں جن میں ثقافتی اور مذہبی رسوم اور لوک ریت کے عوامل بھی شامل ہوجاتے ہیں اور ڈسکورس کی نئی تشکیلی صورت حال سامنے آتی ہے جس میں نیا لب ولہجہ گفتار کا حصہ بنتا ہے۔ ڈسکورس تجزیے کا یہ پہلو اسلوبیاتی تحقیق و مطالعے کے مسائل کو ابھارتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک ڈسکورس تجزیے کو محض ناول اور ڈرامے میں موجود مکالماتی عنصر کے تجزیات تک محدود رکھا گیا اور اس بات کو اہمیت دی گئی کہ متن میں موجود کردار کس طرح ادبی کام کو پیش کردیتا ہے اور قاری کس طور پر مصنف کی معنویت کو ڈسکورس کے حوالے سے ایک دوسرے سے مبادلہ کرتے ہوئے نئی معنویت کو جنم دے رہا ہے جس میں بعض دفعہ اصولوں کے طریقہ کار کی ترتیب کی خواہش معنویت کے ڈسکورس میں غیر فطری عناصر کا بھی اضافہ کردیتی ہے جس کو دوبارہ تجزیہ کرنے کے بعد روایتی سوچوں کے ردِّ عمل کے طور پر نیا نکتہ نظر ابھرتا ہے۔

اس حوالے سے میکم کولتھارٹ (Couthart)، گلین براؤن (Brown)، جارج یول (Yule)، وین ڈی جک (Vandijk)، والٹر کینٹش (Kintsch)، وینڈیل ہیرس (Harris) کی تحریریں سامنے آچکی ہیں۔

تانیثی تنقید (Feminist Criticism)

تانیثی تنقید کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ مخصوص جنسی گروہ کے لئے لکھی جاتی ہے جس کے لکھنے والے اور قاری مخصوص جنسی گروہ اور رجحان سے وابستہ ہوتے ہیں کیونکہ جنسی گروہ کا معاشرے میں مخصوص کردار ہوتا ہے لہٰذا یہ تصور بھی عام ہے کہ تانیثی تنقید عمرانیاتی تنقید کا اہم میدان ہے۔ یہ تنقید ۱۹۶۰ء میں ادبی مباحث کا حصہ بنی جس کے پس منظر میں خواتین کے حقوق کی تحریک بھی اہم عنصر کی شکل میں نظر آتی ہے۔ خاص طور پر میری وال اسٹون کرافٹ (Woll Stone Craft) کی کتاب A Vindica Tion of the Rights of Women (۱۷۹۲ء) اور جان اسٹورٹ ملز (Mills) کی کتاب "The Subjection of Women" (۱۸۶۹ء) کے علاوہ امریکہ میں مارگریٹ فولر (Fuller) کی کتاب "Woman in Nineteeth Century" (۱۹۴۵ء) کی تحریروں کے بعد تانیثی ادبی تنقید عورتوں کے معاشرتی، معاشی اور ثقافتی آزادی کے علاوہ مساوات کے مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنی لیکن ستر کی دہائی میں ورجینا ولف کی کتاب "The Room of One's Own" (۱۹۲۹ء) اور سیمون دی بووئیر کی کتاب "Second Sex" (۱۹۴۹ء) تانیثی تنقید کو نئے فکری رجحانات سے روشناس کروایا۔ اس تنقید کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ روایتی مردوں کی تنقید نے خواتین کے اس فکری رویے کو ادبی تنقید میں آنے سے روکے رکھا جو اس کا حق تھا کیونکہ مرد خواتین کے بعض مسائل کے اظہار کے لئے موزوں نہیں لہٰذا تانیثی تنقید نے مرد، عورت، قاری، ادیب اور متن کے مسائل کو نئے زاویوں کے ساتھ اٹھایا جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ خواتین کے ثقافتی کردار (Role) کو حقیقت پسندانہ تناظر میں دیکھتے ہوئے اس کی حساسیت کا اندازہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں بعض دفعہ انتہاپسندانہ رویے بھی ابھرے خاص طور پر سوزن جوہاز (Juhasz)، ساندرا گلبرٹ (Gilbert)، الیسیا اوسٹرائکر (Ostriker) اور سوزن گوبر (Gubar) نے عملیاتی رسائی کو اپناتے ہوئے اس تحریک کا رشتہ صرف شاعری سے ہی نہیں بلکہ قاری سے بھی استوار کیا۔ ان خواتین شعراء نے نئے ثقافتی سیاق میں قاریوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے فکری رجحانات سے متاثر کیا۔ تانیثی تنقید میں مردانہ قلم سے لکھی ہوئی تحریروں کے متن کا

بھی مطالعہ کیا جاتا ہے جو عورتوں سے متعلق ہوتے ہیں جن میں معاشرتی نقطہ نظر سے مختلف ادبی تحریروں میں پیش کئے جانے والے ان تعصبات، معاشرتی اور سیاسی قوانین اور دیگر ضعیف الاعتقادی سے متعلق ہوتے ہیں جو خواتین کی تحریر کا بھی حصہ ہوتی ہیں۔

شاعر اور نقاد اندرین رچ (Adrienne Rich) نے اپنی کتاب "Dream of Acommon Language" میں اس بات کو ابھارا کہ عورتوں اور مردوں کے اظہار کے لئے زبان کو تیار کرنا چاہئے کیونکہ عورتوں کی فنکارانہ زندگی سے فطرت کو جدا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک نسل پہلے میریانا مور (Marriaona Moore) الزبتھ بشپ (Bishop)، مے سوینس (May Swenson) نے عورتوں کے فن کو نئی سمتوں سے روشناس کرایا۔ پھر بھی یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ عورتوں کے فن کے اظہار میں اب بھی کئی پابندیاں حائل ہیں لہٰذا پس ساختیاتی ادیبوں (مرد اور خواتین دونوں ہی) نے نئے آون گارد تصور کے تحت روایتی تصورات کو چیلنج کیا جو ادب کو کنٹرول کئے ہوئے تھے۔ ایلین شوالٹر (Showater) نے Cynocriticism کی اصطلاح استعمال کی جو عورتوں کی تحریروں اور اس کے خلاقانہ محرکات، تجزیے اور تشریح سے متعلق تھیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کی نیگرو ادیباؤں جیسے زوبرہ ہورسٹن (Hwrston) اور لزبن خاتون مختاؤں نے ہم جنس معاشرے میں اسے اپنی شرکت کا احساس دلایا۔

لیلین روبنسن (Lillian Robinson) کے بقول تانیثی تنقید میں خواتین کے خطوط روزنامچے، سوانح عمریاں، زبان، تاریخ اور ذاتی شاعری سب ہی شامل ہے۔

تانیثی تنقید کے حوالے سے جین گیلپ (Gollop) کی کتاب The Daughter's Seduction Feminismond Psycho Analysis (1982)، کے۔ کے۔ روتھ وین (Ruthven) کی Feminist Literary Studies: An Introduction (1985)، الزبتھ فوکز جینویز (Genovese) کی Feminism Without Illusion: A critique of Individualism (1991)، جولیا کرسیٹوا کی Desire in Language (1980) جبکہ امریکہ کی نیگرو تانیثی تنقید میں باربرا کرسچیان کی کتاب Black feminist Criticism (1985)۔ لزبن حوالے سے مانوکیو وٹنگ (Monique Witting) کی کتاب The Lesbian Body (1976) اور توری موئی (Tortlmoi) کی کتاب Sexual/Textul Politics: Feminist Literary (1985) شائع

ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر کئی مضامین کے کتابی مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔

قاری اساس تنقید (Reader Response Criticism)

قاری کی اساس تنقید ادبی کام میں زبان کو اہمیت دیتی ہے اور قاری سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ متن کی معنویت کو اپنے طور پر پالے جس میں بہر طور قاری کے تجربات بھی شامل ہوتے ہیں یوں کئی تنقیدی مزاج در آتے ہیں لیکن متن فرد کے ذہن کا حصہ نہیں ہوتا مگر وہ انفرادی سطح پر متن کی قرات کرتا ہے جس کو بعض نقادوں نے موضوعی تنقید بھی کہا جو معنی کے جوہر پر حاوی ہو جاتی ہے اور مغایاتی ساختیاتی نظریے میں اہم کردار ادا کرتی ہے جس کا تعلق قاری کے تنقیدی ذہن کی سرگرمیوں سے ہوتا ہے۔ بعض دفعہ یہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دوران قرات قاری اپنی فکری اور تنقیدی اہلیت کو وسعت دیتا ہے جو کہ مخصوص ادبی اور ثقافتی رسوز کی صورت میں ابھرتے ہیں جو معنویت کو خلق کرتے ہیں اور موضوعیت کا عنصر قرات اور تشریح کی نئی راہیں دریافت کرتا ہے۔

قاری کی اساس تنقید ۱۹۶۰ء کی دہائی میں شروع ہوئی جس نے ساختیے کے روایتی تصورات سے ایک مخصوص ذہنی میکانیت کو پار کر ابھری اور قرات کے عمل کے امتزاج سے اس نئے تنقیدی نظریے کو فروغ دیا جس کا روایتی نقاد پہلے بیانیہ پلاٹ، کردار، اسلوب اور ساخت کے حوالے سے کسی نہ کسی طور پر مطالعہ کرتے آئے تھے کیونکہ متن انفرادی قاری کو "تخلیقیت" سے روشناس کرواتا ہے۔ مکمل متن میں ہر قاری کے لئے معنویت یکساں اور نہ ہی فنکارانہ اور لسانی حوالے سے ہر بات درست ہو سکتی ہے لیکن یہ تنقیدی عنصر قاری کا ردعمل ہوتا ہے متن کے معروضی ڈھانچے میں موضوعی معنویت اخذ کرتا ہے جس میں غلط قرات کے سبب مغالطے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نئے نقاد بذات خود متن سے کلیہ درہے جو کہ مغایاتی طور پر صوری تصویر پیش کرتا تھا لیکن ان نقادوں کے کردار کی اہمیت کو خارج از بحث قرار دیا۔ قاری اساس تنقید میں قاری کا ردعمل پہلے ہوتا ہے اس کے بعد متن پر تنقید کی گنجائش ہوتی ہے اور ڈسکورس کا تجزیہ ہی اس بات کو متعین کرتا ہے کہ کیا تنقید پر تنقید ممکن ہے کہ نہیں۔

قاری کی اساس تنقید کا آغاز آئی اے رچرڈ کی جذباتی بحث سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۳۶ء

میں ڈی ڈبلیو ہارڈنگ (Harding) اور لوئیس روزن بلیٹ (Rosenblatt) اور ۱۹۵۰ء میں واکر گبسن (Gibson) کے مضمون "Monk Reader" نے قاری کی اساس تنقید پر باضابطہ تنقید کا آغاز کیا جو اس نئے تنقیدی نظریے کے خدوخال کو واضح کرتا ہے۔ قاری کی اساس تنقید پر نارمن ہالینڈ، ڈیوڈ بلاچ، پیٹر روبونووچ (Robinowitz)، جورتھ فیٹرالی (Fetterley) الزبتھ فلائن (Flynn) ہانس یارش سوزن سلومین (Sulleiman) انجنی کراس مین (Crossman) جین ٹام پکنز (Tompking) ریفائٹر، والٹر جے سالٹ آف (slatoff) لوئیس روزن بلٹ (Rosen Blatt) امبرٹو ایکو_(Eco) اسٹینلے فش (Fish) ولف گینگ ایزر (Iser) ریلف ریڈر (Rader) جانتھن کلر (Culeer)، یوژن گڈہارٹ (Goodheart) اور ایم۔ ایچ ابراہام (Abrams) کی تحریریں سامنے آچکی ہیں۔

''لزبن اور گے'' تنقید (Lesbian and Gay Criticism)

''لزبن اور گے'' تنقید ۱۹۶۰ء میں ابھر کے سامنے آئی۔ اس تحریک سے تنقید کا ادبی نظریہ بھی متاثر ہوا جس کے پس منظر میں لازمیت اور لازمیت شکنی اور معاشرتی عمارتوں کی تھیوری کارفرما تھی جس کے ردعمل کے طور پر امرد پرستی کا ادبی نظریہ بھی تشکیل پاتا ہے۔ لازمیت کے تصوراتی حوالے سے اس بات کی کسی طور پر تصدیق کی جاتی رہی ہے کہ ''گے اور لزبن'' صورت حال حیاتیاتی ہوتی ہے اور معاشرتی صورت حال سے ''گے اور لزبن'' جنم نہیں لیتے۔ حیاتیاتی حوالے سے یہ پیدائشی ہوتے ہیں۔ ادبی نظریات میں امرد پرستی کی روایت قدیم یونانی گیتوں ''سپاہو'' (Sappho) میں ملتا ہے جو کہ کمسن بچوں کے ملاپ کی شاعری ہے۔

تانیثی نظریے میں لزبن تنقید نگار اور نظریہ دانوں کی طویل فہرست موجود ہے جن میں سب سے معروف مرے ڈیلے (Mary Daly) کی تنقید ہے ان کی کتاب ۱۹۷۸ء میں "Gyn/Ecology" کے نام سے شائع ہوئی جس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ تاریخ اور ثقافت میں مرد حاوی رہا ہے جس نے عورت پر جنسی حوالے سے تشدد کیا لہٰذا عورت نے یہ محسوس کیا کہ نئی Gynomorphic ذخیرہ الفاظ کے ساتھ مردوں کی جنسی برتری کا دفاع کرتے ہوئے مردانہ ڈسکورس اور اسطور کو رد کیا جائے۔ ۱۹۸۰ء میں لزبن شاعرہ اندرین رچ (Adrienne

Rich) نے لزبن فکر کے حوالے سے ایک مضمون "Compulsory Hetero Sexuality and Lesbian Existence" لکھا جو لزبن تحریک کی نئی توانائی کا سبب بنا، جس میں امرد پسندی اور ''گے'' رویوں کی اہمیت اور باریکیوں سے بحث کرتے ہوئے لزبن عورتوں کے Abnormal ہونے کی نفی کی اور بتایا کہ توانا تاریخ اور ثقافت میں عورت کی روایت کو عورت ہی شناخت کرسکتی ہے۔

''گے اور لزبن'' مطالعوں میں لازمیت شکنی یا سماجی تشکیلِ نو کی صورت حال تاریخ کی ریڈیکل شکل میں زیادہ ابھرتی ہے۔ خاص طور پر پس ساختیاتی تاریخ دان مشل فوکو کے ''جنس اور جنسی شناخت فطری'' نہیں ہوتی بلکہ ان لوگوں کی فطرت میں حیاتیاتی اظہار ابھرا ہوتا ہے برخلاف سماجی تشکیلِ نو کے حوالے سے مقامی سطح پر ان کی جبلتیں مختلف ہوتی ہیں۔ فوکو کا کہنا ہے کہ کثیر الجعیت اور امرد پرستی کی اپنی ایک تاریخ ہے جو انیسویں صدی سے شروع ہوتی ہے لیکن قدیم یونان سے شروع ہونے والی امرد پرستی اور لزبن یا گے ازم کے عدم قدیم ساختیے کی وجہ سے اس کی آگہی میں مشکلات ہوئی ہیں۔ اسے زیادہ تر مفعول سے زیادہ معروضی انتخاب تصور کیا گیا ہے۔ (جیسا کہ مغرب میں دیکھتے ہیں)۔ لازمیت شکنی گے ازم میں ''تاریخ'' بن جاتی ہے اور ان رویوں کو آفاقی قرار دے کر میانہ روی کے رویے سے گذرا جاتا ہے جہاں رد تشکیل کی شناخت سامنے آتی ہے جو ان کی کثیر الجہت شاخوں کو واضح کرتی ہے۔ ان مطالعوں اور انتقادات میں Homophobia کا احساس شدت سے محسوس ہوتا ہے جو Heterocentrism کے نظریے کو تشکیل دیتا ہے۔ یہ سوال بھی اہم رہا ہے کہ ''گے اور لزبن'' ادب کے متن میں امرد پرستی خود شناختی کے عمل سے گذرتی ہے؟ کیا ان تحریروں میں گے اور لزبن موضوعات (Themes) اور کرداروں کو ابھارا جاتا ہے؟ ادیب اپنی سوانحی شہادتیں فراہم کرتا ہے؟ خاص طور پر ''گے اور لزبن'' جمالیات میں جنسی اختلاط کا عمل سب سے اہم ہوتا ہے جو کہ ان کی حرکیات میں واہموں کی جمالیات ترتیب دیتا ہے جس سے عام قاری / فرد (جس کو Straight کہتے ہیں) بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے نقادوں نے گے اور لزبن ''گے اور لزبن'' حوالے سے اٹھائے ہوئے سوالات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئے تناظر کو دریافت کیا اور ''کوئر نظریہ'' (Queer Theory) یا ''کوئر شناخت'' کا تصور عام ہوا جس میں

جنسی افعال کو جنسی شناخت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی۔

The Fugitives

اس صدی کی دوسری دہائی میں وینڈربلٹ (Vanderbilt) یونیورسٹی (امریکہ) کے ادیبوں کے ایک گروپ نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء کے درمیان مشہور ادبی جریدہ "Fugitives" جاری کیا جو کہ عملی طور پر نئی تنقید کو نظری خاکہ فراہم کرتا تھا جس نے امریکی نئی ادبی تنقید پر گہرا اثر چھوڑا۔ اس گروپ کے بنیاد گزاروں میں کلو دجان کرا ور ینسم (Ransom) اور ڈونالڈ ڈیوسن (Davidson) کے نام لیے جاتے ہیں۔ اس نئے تنقیدی رجحان سے متاثر ہو کر ۱۹۲۱ء میں ایلین ٹیٹ (Tate) اور ۱۹۲۳ء میں رابرٹ پین ورن (Warren) اس گروپ میں شامل ہوئے پھر کھلین بروک (Brooks) نے اس حلقے میں شمولیت اختیار کی۔ اس کے بعد رابرٹ پین ران نے لوزیانہ اسٹیٹ یونیورسٹی سے ۱۹۳۵ء میں "Southern Review" جاری کیا اور روسی تنقید کا طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے "نئی تنقید" میں کئی اضافے کیے جبکہ ٹیٹ رینسم، ورن زرعی Agrarians گروپ سے بھی متعلق تھے۔ جنھوں نے امریکہ کے جنوبی زرعی خطے کی اخلاقی اور مذہبی اقدار کی طرف واپسی کا ارادہ کرتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں "I'll Take My Stand" نام سے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا۔

اس فکری اور تنقیدی رجحان نے امریکی معاشرے میں پائے جانے والی اساطیری تاریخ کے خدوخال کو واضح کیا۔ یہ نیا تنقیدی رجحان شعری سیاق میں ابھرا جس کا زرعی مرکز نیشول (Nashville) تھا۔ اس تحریک سے ٹیری ایگلٹن بھی متاثر ہوئے۔ انھوں نے اپنی کتاب Liteary Theory: An Introduction (۱۹۸۳ء) میں "زرعی تنقید" پر لکھا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ایک آئیڈیالوجی ہے جو اپنی فکریات کا دفاع کرتی ہے جسے ادب میں دوبارہ خلق کیا گیا جس کو حقیقت کے تناظر میں نہیں دیکھا گیا۔ شاعری نیا مذہب ہے اور ایک ناسٹلجیائی جنت بھی ہے جو صنعتی سرمایہ داری کی مغائرت سے ابھری۔ اس تناظر کے بالکل برخلاف پال ڈی مین نے نئی تنقیدی شعریات کو منفرد انداز میں مطالعہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ نئی ادبی بدیعیات کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور ساتھ ہی ادبی تنقید "قریبی مطالعے"

کے رجحان کی بھی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ان نقادوں کا کہنا ہے کہ پرانے جنوب (امریکہ) کے برہمنوں سے کوئی زیادہ تیز نہیں۔ یہ لوگ نہ ریڈیکل ہیں نہ ہی انھیں رجعت پسند کہا جاسکتا ہے لیکن یہ اچھے کیتھولک ہیں۔ ان میں آپس میں ہی اختلاف رہے مثلاً رینسم، ٹیٹ کے علامتی رویے سے پریشان رہا اور یہ تحریک سائنس شکن بھی رہی۔ یہ لوگ شہری زندگی، صنعتی ثقافت اور لبرل ازم کے سخت مخالف تھے۔ جس پر علاقائیت کا رجحان حاوی تھا۔

مظہریت (Phenomenology)

مظہریت کا فلسفہ ایڈمن ہوسرل (۱۹۳۸ء-۱۹۵۹ء) کے فکر کا نچوڑ ہے جو اس اصطلاح کے بانی ہیں۔ مظہریت کے معنی اس فلسفے سے لئے جاتے ہیں جو شعور کے جوہر سے تجزیہ کیا جاسکتا ہے جس میں الہامی افق کی شہادت بھی نمایاں طور پر ابھرتی ہے اور مظہر خود سے ہی دریافت کی ہوئی قوتوں سے مختلف نظریہ حیات کو بھی مختلف شاخوں میں تبدیل کردیتا ہے۔ مظہریت بھی ردتشکیل کی طرح تنقیدی نظریے کے میدان میں طریقہ عمل کے سوال اٹھاتا ہے جو موضوعاتی سطح پر نئی مباحث شروع کر کے لسانیات اور ساختیات کے میدان میں بھی کئی نئی ارتقائی جہتوں سے بھی قاری کو متعارف کراتا ہے۔ خاص طور پر میرلیو پونٹی (۱۹۶۱ء-۱۹۰۸ء) نے زندگی کے شعور میں مظہریت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس حوالے سے انھوں نے نئے قیاسات تشکیل دیتے ہوئے سب سے اہم سوال یہ اٹھایا کہ یکساں طور پر دنیا کے خدوخال کو کیسے قبول کیا جائے اور کس طرح معروضی حقیقت کو دریافت کیا جائے جس کے دیگر ممکنات میں یہ بھی شامل ہے کہ معنی کی تشکیل میں کس نوعیت کا طریقہ کار کو انتخاب کیا جائے۔ مظہریات کا قیاس ہے کہ دنیا نے اپنے تجربے سے قبل ہی مکمل معنویت کو تسخیر کرلیا ہے، جو کہ اس کی اپنی زندگی کے بغیر واقعہ ہوا۔ فرد کے داخلی کلام (بیانیہ) کے تفاعل نے افراد اور اشیاء کے مابین پریشان کن صورت حال پیدا کردی جس کی اصل وجہ ٹکنالوجی کا عہد ہے۔ مظہریت نے نئی سائنسی اصالت کے بیانیہ کو دریافت کرلیا۔ جسمانی حرکات، حسیات، تمثالیت کی قوس و قزح نے فرد کو غیر مطمئن اور ناسٹلجیا کی بنا کر رکھ دیا۔ مظہریت شعور کی حرکیات اور اس کے ادراک سے متعلق ہو کر معنویت کی وحدت کو ترتیب

دیتی ہے، جس کے پس منظر میں انسانی زندگی کی عمیق تحقیق ہوتی ہے جو اصناف کی روایتی حس کو جگاتی ہے اس مقام پر قیاس فرد کی زندگی کے تانے بانوں میں سے فرد کی انسانی آگہی کے رموز نکال لاتی ہے کیونکہ معروضی کائنات گمشدہ موضوعی فیصلوں کی طرف آتی ہے جنھیں مظہریاتی حصار سے باہر نکال دیا جاتا ہے لیکن تحقیق، مطالعے اور تجزیے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی "اصل" نہیں، لہٰذا مظہریت کی طرف رجوع ہوتا پڑتا ہے جو کہ مظہر کے جوہر میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

مظہریت کو فکری بنیادیں فراہم کرنے میں ہیڈیگر، سارتر، میرلیو پونٹی، امیونیل لیویانز، ہوسرل اور تفہیماتی میدان میں گڈامیر، جیفو اوبستان —— امریکہ میں ای ڈی ہرچ رد تشکیل کے میدان میں دریدا، ڈی مین، ہلس ملر، ہارٹ مین، جوزریڈل، سوزن سونٹیگ (Sontag)، مرے کریگر (Krieger) نے مظہریاتی فکر سے نئے علمی اور تنقیدی جہتوں کا سراغ لگایا۔

متنی اور تحریری تنقید (Text and Writing (Ecriture) Criticism)

متنی تنقید کا تعلق ادبی عمل میں غلط طباعت، مدیرانہ اغلاط اور غیر تسلی بخش پروف خوانی اور دیگر میکانی مسائل سے ہے۔ طباعتی میکانیت کی ایک غلطی سے متن کی معنویت تبدیل ہو جاتی ہے۔ عہد حاضر میں مدیر کو مصنف کی تحریر میں کم و بیشی کا حق نہیں لیکن پھر بھی مدیر یا ناشر اصل مسودے میں ردو بدل کر دیتا ہے۔ اس کی مثال "یولیسس" (Ulysses) ہے جس میں بے پروائی اور غفلت کے سبب طباعت اور ٹائپ کی سینکڑوں غلطیاں رہ گئی تھیں جو بعد میں متنی مدیر کے اصل مسودے سے تقابل کے بعد درست کی گئیں۔ بعض صورتوں میں یہ کام خاصا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ شیکسپیئر کا ڈراما "کنگ لیئر (King Lear) دو صورتوں میں شائع ہوا۔ ایک کو "کوارٹو" (Quarto) کہا گیا جو صفحے کے سائز میں تھا جو وہ تاثر قائم نہ کر سکا جو فرسٹ فولیو کو پڑھ کر ہوتا تھا۔ پھر ان دونوں متنوں کو ایک سال بعد مشترکہ طور پر شائع کیا گیا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شیکسپیئر کو یہ انداز پسند آیا کہ نہیں۔ کئی سال گزر جانے کے بعد بھی شیکسپیئر کے عالم "کنگ لیئر" کے متوقع متن کو ترتیب دینے میں ناکام رہے۔ اس قسم کی صورت حال متنی تنقید کے لئے پریشان کن ہونے کے علاوہ دلکشی کا سبب بھی ہے متنی ایڈیٹنگ بعض دفعہ

اہم نتائج کا انکشاف کرتی ہے۔ کچھ سال قبل ایک مدیر نے ہارتھان کی "سات جھجوں والا گھر" (House of Seven Crables) کے سلسلے میں ان باتوں کو دریافت کیا۔ اس کے مسودے میں بغیر اجازت کے اضافہ کیا گیا۔ متن کی تنقید کو میکانی تنقید کہا جاتا ہے جو قرات متن اور طباعت سے متعلق ہوتی ہے۔

روایتی سطح پر ادبی نقاد کا تعلق ادبی کام سے ہوتا ہے جو ادیب کی تحریر پر سوچ و چار کے بعد معنی اور اس کے بنیادی خاکے کا انکشاف کرتا ہے۔ خاص طور پر فرانسیسی ماہر لسانیات غیر شخصی طور پر ادبی عمل میں "کام" کو نہیں بلکہ متن کو اہمیت دیتے ہیں۔ تحریر ایک غیر شخصی ادارہ ہے جو پہلے سے بنائے ہوئے لسانی اور ادبی نظام کے اندر سرگرم ہو کر متن کو تشکیل دیتی ہے۔ خاص طور پر مخصوص لسانیاتی تفاعل کی مدد سے باہر کی دنیا کی معنویت کا انکشاف ہوپاتا ہے کیونکہ متن کی قرات کی سرگرمیاں ادبی رسوم اور رموز سے متعلق ہوتی ہیں جو تحریر میں اپنا نفوذ کرتی ہیں جبکہ پس ساختیات کا خیال ہے کہ متن جبر اً معنویت اور لباس کو متعین کرتا ہے جو تحریر کو مختلف سمتوں میں پھیلاتے ہوئے معنویت سے اختلاف کرتا ہے۔ نقاد کا مقصد متن کی تشریح و توضیح ہوتی ہے، اختلاف نسخ کی نشاندہی کی جاتی ہے، مستند اور غیر مستند کا فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔ لسانی اور ادبی رسومیات اور قرات کے عمل میں ادبی متن غیر جانبدارانہ ہوتا ہے جو کہ التباس کو ابھارتے ہوئے حقیقت کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن فن پارے کی جانچ پرکھ نہیں ہوتی اور اس کی قدر و قیمت کا جائزہ بھی نہیں لیا جاتا جو اپنی فطرت میں ثقافتی سطح پر متن کا روایتی مخاطبہ (Discourse) ہوتا ہے۔ قرات کا عمل اصناف کے اختصاص سے بھی متاثر ہوتا ہے یا افسانوی متن کلامی حوالے سے بیانیہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے یا اس کی صناعت، کردار، عمل اور اقدار نظام کی بازیافت میں مصروف ہو جاتا ہے جس کو متن کا "متن زائد" بھی کہا جاتا ہے۔ متن کا اظہار دراصل التباسی فضا میں پروان چڑھتا ہے جس میں رموز اور آئیڈیالوجی کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں جو لیا کرسٹیوا نے بین المتنیت کے تصور کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ دیگر زاویوں سے متن میں کئی عناصر شامل ہو کر التباس کی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں۔ متن کے مطالعے میں زبان اور ادبی قرائن پہلے سے موجود ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس سے متن کا مخاطبہ خلق ہوتا ہے۔ کرسٹیوا کے بقول ہر

متن "بین متن" ہوتا ہے۔ رونالڈ بارتھ نے S/Z (۱۹۷۰ء) میں قابل قرات (Illisible) اور قابل تحریر (Scriptible) میں امتیاز کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "قابل تحریر" غیر قراتی ہوتی ہے۔ "قابل قرات" "متن روایتی یا کلاسیکی ہوتا ہے جیسا کہ حقیقت پسند ناول نگار بالزاک اور انیسویں صدی کے دیگر ناول نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے جس میں رموز، رسوم، ادبی اور معاشرتی نوعیت کے ہوتے ہیں جس کو باآسانی تشریح کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ قرات میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

ساختیات (Sctructuralism)

ارسطو کے زمانے سے ہی "ساختیے" کی بحث اہم رہی ہے جو ادبی عمل میں تجزیاتی عمل سے ساختیاتی تنقید کو جنم دیتی ہے لیکن جدید لسانی اور ادبی تنقید میں اس کی زیادہ اہمیت لسانی حوالے سے ہوئی جس کا لسانی نمونوں اور قرائن کی تلاش، ثقافت، معاشرتی ہیئت اور متنوں کے حوالے سے مطالعہ کیا گیا۔ لیوی اسٹروس کی کتاب "اسٹرکچرل انتھروپولوجی" کے شائع ہونے کے بعد ساختیاتی طریقہ کار کی حدود متعین کرنے کی کوشش کی گئی جس پر ساسر کی کتاب 'کورس آف جنرل لنگوسٹکز' (۱۹۶۱ء) سگمنڈ فرائڈ اور مارکس کی تحریروں کا گہرا اثر تھا۔ اس زمانے میں ساختیات دانوں نے متن کے اصولوں کو منظم ایک ہیئتی ساختیے میں تشکیل دینے کی کوشش کی اور اس بات پر زور دیا کہ متن کی معنویت کو جوہر نہیں کہا جاسکتا اور نہ ساختیہ تمام معنویت کا کامیاب ہوتا ہے اور نہ اس کو متعین کرپاتا ہے لیکن ساختیے کی تسخیر سے ناقد کو معنویت تک رسائی کے لیے رہنمائی ملتی ہے اور صورت حال بعض دفعہ یہ بھی ہو جاتی ہے کہ لفظ اشیا اور ناموں کے درمیان ابہام پیدا ہو جاتا ہے یہی ابہام زبان کی حرکیات میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے جیسا کہ رونالڈ بارتھ نے کہا ہے کہ "قاری اس کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور معنویت لفظ یا اشیاء میں پوشیدہ نہیں ہوتی بلکہ معنی مختلف رشتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔"

لفظ اصل نہیں ہوتے، ساختیاتی مباحث میں ساسر نے زبان کی ثقافتی مظہریت سے بحث کرتے ہوئے لسانی عناصر کی نشاندہی کی اور کہا لسانی نظام میں معروضی حقائق شناخت نہیں کئے جاسکتے۔ ساختیاتی مطالعوں میں "ادب" دوسرے درجے کا نظام تصور کیا گیا ہے

جس میں پہلے درجے کا نظام لسانی حوالے کے طور پر ہے اور اس کا بنیادی ڈھانچہ لسانی ہوتا ہے جو تجزیے کے بعد ابتدا کے لسانی ماڈل کی تھیوری فراہم کرتا ہے اور لسانی حوالے سے ہی ادبی متن کی معنویت کی آگہی ممکن ہو پاتی ہے جس میں صوتیات (Phonemic) اور Morphemic سطح پر اس کو منظم کیا جاتا ہے یا مماثلتی (Paradigmatic) اور نحوی (Syntagmatic) رشتوں میں متن کی معنویت کو تلاش کیا جاتا ہے اور اسی درمیان بعض لسانی ماہر ساختیات ادبی متن کے ماڈل میں نحو اور جملوں کی ساخت کا بھی تجزیہ کر لیتے ہیں۔

(۱) ساختیاتی تناظر ادبی 'کام' "اور متن سے متعلق ہوتا ہے جس میں ادبی قرائن اور رموز کو بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ عناصر بعض دفعہ حقیقت کا التباس بھی کھڑا کر دیتے ہیں لیکن نہ سچائی کی قدر اور نہ حقیقت کے کسی حوالے کے وجود کا بذات خود ادبی عمل کے باہر کوئی وجود ہوتا ہے۔

(۲) انفرادی مصنف یا "موضوع" ارادے کا ارتسام، ذات، لسانی نظام کے اندر تشکیل پاتے ہیں اور مصنف کے ذہن "زمانی" حوالے سے غیر ذاتی ہوتا ہے۔

(۳) ساختیاتی تنقید میں قاری کو "مرکزی" حیثیت حاصل ہوتی ہے اور غیر ذاتی قسم کی قرات میں ان چیزوں کو بھی قرات کر دیا جاتا ہے جس کا متن کی معنویت سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا۔ معاشرتی قرائن، رموز، توقعات، ادبی حس کو ابھارتے ہوئے متن کو ترتیب دیتے ہیں۔

ساختیاتی تنقید کے سلسلے میں ساسر، لیوی اسٹروس، جوتھن کلر، رابرٹ شلر، لوسین گولڈمین، فلپ پیٹی، میرس ہاکس، فریڈک جیمسن، جیراڈ گریف، ہوزے ہاراوی، بارتھ، اسٹیفن ہیتھ، توردوروف، کرسٹائن میلن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

سیاقیت (Contextualism)

امریکہ میں نئی تنقید کے زیر اثر نظریاتی حوالے سے سیاقیت، ہیئت پسندی اور معروضی تحریکوں کو کئی موقعوں پر استعمال کرتے ہوئے شاعرانہ حوالے سے مخاطبہ کو دیگر ہیئتوں سے علیحدہ کر دیا اور شاعری کے خود مختار معروض کے متعلقات کو ابھارا۔ اس رویے کو مرے

کریگر (Krieger) نے اپنی کتاب "The New Apologists For Poetry" (1956) میں واضح کر دیا تھا۔ بروک نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ادبی کام کا زبانی ساختیہ لفظوں کا حوالہ ہوتا ہے جو داخلی سطح پر رشتوں کا جال بن کر نظم کا خود مختارانہ سیاق ترتیب دیتا ہے جو معنویت کو بھی خلق کرتا ہے اور علیحدہ کام کائنات کا بین السانتیاتی عمل ہے جو آزاد رہ کر نظم میں شعریات کی زائد تخاطبہ بندی کرتا ہے جس میں سماجی دباؤ اور تاریخی متعلقات بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ فنکارانہ عمل میں "سیاق" بذات خود ایک "فنکارانہ" عمل ہوتا ہے۔ یہ ثقافتی اظہاریت کے لحاظ کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے لیکن سیاق کی سب سے بہتر تعریف یہ ہے کہ یہ معنویت کی حدود متعین کرتے ہوئے لفظ کی معنویت کی ثقافت کو جنم دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سوانحی نقاد مصنف کی ذاتی زندگی اور تاریخ کے مطالعے کے بغیر سیاق کے جوہر کو نہیں پا سکتا جبکہ قوسیائی نقاد اساطیر کے حوالے سے سیاق کو سمجھنے میں مدد لیتا ہے۔ مارکسی نقاد تاریخی سیاق میں سیاق تلاش کرتا ہے۔ ہیئت پسندوں کے یہاں سیاقی تصورات ارسطو، کانٹ، کالرج اور ای۔ اے۔ رچرڈ کے انتقادات سے متاثر ہیں۔ رچرڈ کے بقول معروضی شعری سیاق، قوسی حوالوں، طنزیات اور قول محال سے کنٹرول ہوتا ہے اور قاری اپنی قوت تخاطبہ سے ان کے معنوی رشتوں کو پاتا ہے۔ مبادلیات کا عنصر انسانی تجربوں کی مدد سے خود مختارانہ سیاق خلق کرتا ہے۔ کریگر کے یہاں شعری تشریح نظم کی صحیح وحدت ہوتی ہے جسے معروض کے زیر اثر نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ معروضی خواہشات کی موضوعی "شے" ہے۔ تمام التباسات شعری لسان سے ہی جنم لیتے ہیں۔ کریگر کے یہاں جدلیاتی تحلیل اصل میں شعری تخاطبے سے استعارے اور مجاز مرسل کا تفاعل ہوتا ہے جو سیاقیت میں شاعرانہ اور عمومی تخاطبہ سے مشابہ ہوتا ہے کیونکہ انسانی تجربات تنقید کی بنیادی قدر بن جاتے ہیں۔

سیاقیت کے نظریے پر پیپر (Pepper)، زبیل (Zabel)، سوٹن (Sutton)، ہائی مین (Hyman)، ہومن (Humann) اور ویلک (Wellek) نے خاصا لکھا ہے۔

نخشمتالی/قوسی/قوسیاتی تنقید (Archetypal Criticism)

"آرکی ٹائپ" یونانی لفظ ہے جو اصل میں دو الفاظ Archein + Typos سے مل کر بنا

ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی میں بشریاتی مطالعے کے بعد "آرکی ٹائپ" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ جیمس جی۔ فریزر (James G. Frazer) کی کتاب (1890-1915) "The Golden Bough" میں ان متنوع ثقافتی نمونوں کا مطالعہ پیش کیا ہے جو اسطور کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں لیکن اس اصطلاح کا اطلاق سب سے پہلے ماہر نفسیات یونگ (۱۹۶۱ء-۱۸۷۵ء) نے کیا جو کہ "نئی تنقید" کا بھی سب سے محبوب موضوع رہا ہے جس کو یونگ "اجتماعی لاشعور" کہتے ہیں جو آباؤ اجداد کی غالب تمثالوں اور دہرائے جانے والے تجربات کے سبب "اجتماعی لاشعور" کو جنم دینے کا سبب بھی بنتے ہیں اور نسل انسانی کو اسطور میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے اور مذہب ذاتی واہمے اور خواب ادب میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادب صرف الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ حقائق اور تجربات کا لازوال خزانہ ہے جس کی وساطت سے قدیم انسان کے باہمی روابط، قرائن، سائیکی روحانی واردات و کیفیات سے رسائی ممکن ہو پاتی ہے جو یونگ کے یہاں "ریڈیکل یادداشت" ہے۔

"آرکی ٹائپ" تنقید کی تاریخ میں بوڈ بوکن (Baudbodkin) کی کتاب "Archetypal Pattern in Poetry" (۱۹۳۴ء) اہم تصور کی جاتی ہے۔ اس کتاب کو پانچویں و چھٹی دہائی میں شہرت ملی۔ قوسیاتی تنقید کے نمونوں اور اس کے عمل کے علاوہ کردار، تمثالوں اور ادبی عمل میں اسطور کا مطالعہ کرتی ہے جس میں معاشرتی بیوہار اور رویوں کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے جو آفاقی نوعیت کے قدیمی اور ذہنی عناصر یا ہیئتی نمونوں کو ادبی کام میں شناخت کر کے قاری کی اساس کو جگاتا ہے لیکن چند نخشمتالی نقادوں نے یونگ کے نظریہ "اجتماعی لاشعور" کو نمونوں کا عمیق حوالہ بتایا ہے۔ خاص طور پر نارتھرپ فرائی کی نظر میں یہ ایک "غیر ضروری مفروضہ" (An Unnecessary Hypothesis) ہے۔ انھوں نے اس کی تفہیم کرتے ہوئے "However They Got There" کا جملہ بھی استعمال کیا جو اپنے زمانے کا عصری قوسیاتی تصور بھی ہے۔ اس تنقیدی رویے کے حوالے سے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے ولسن نائٹ، رابرٹ گریوز، فلپ وہیل رائٹ، رچرڈ چیس اور جوزف کیمبل نے نئے اُفق دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام نقادوں نے اساطیری نمونوں کو ادبی سیاق میں مطالعہ کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ قوسیائی تنقید کے عناصر اساطیر سے قریب ترین ہیں، موت اور آواگون تصور

آرکی ٹائپ تصور ہے یہ استدلال کے دائرے میں انسانی زندگی میں نامیاتی دائرہ ترتیب دیتا ہے کیونکہ تھامس بوئکن کا خیال ہے کہ معنی کا جبر اور تحکم ٹھیک بات نہیں۔ وہ محض اس معنی کو تسلیم کرتے ہیں جو کسی فن کے بطن سے از خود جنم لے کر نشو و نما پاتا ہے اور وہ دن دور نہیں جب قوسیاتی تنقید روایتی تنقید کی جگہ لے لے۔ اس کے لیے نئے فنی مواد کے طور پر آرکی ٹائپ کی آگہی ضروری ہے۔ نفسیاتی تنقید قدیم قرائن اور اساطیری قربانیوں کے واقعات جو دیوتا کی موت کی صورت میں بھی مختلف حوالوں سے ادب میں کسی نہ کسی صورت میں ملتے ہیں، مثال کے طور پر چودھویں صدی کے شروع میں دانتے کی "مقدس طربیہ" (Divini Comedy) اور کولرج کی "Rime of the Ancient Mariner" (۱۷۹۸ء) میں آرکی ٹائپ کے تصورات، تمثالوں اور کرداروں کو محسوس کیا جاسکتا ہے جو ادب میں زیر زمین طور پر کسی نہ کسی طور پر موجود رہا جس میں باپ کی تلاش، جنت اور قبرستان کی تمثالیں، باغی ہیرو، بھینٹ پر چڑھائے جانے والا بکرا، بغیر دیوتا کے زمین اور قاتل عورت کے کردار واقعاتی میکانیت میں آرکی ٹائپ کے مطالعوں کو ابھارتی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں نارتھرپ فرائی کی "The Anatomy of Criticism" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں قوسیاتی تنقید کو نئی ارتقائی وسعتوں سے روشناس کرایا گیا اور قوسیائی قماشات کے خلاقانہ سیاق میں عالمانہ مناظرہ بھی تھا۔ اس کتاب میں انجیل کی آرکی ٹائپ تشریح کرتے ہوئے انگریزی شاعر اور مصور ولیم بلیک (۱۸۲۷ء-۱۷۵۷ء) کی شاعری میں آرکی ٹائپ تصورات کو دریافت کرتے ہوئے ادبی عملی تنقید اور ادبی نظریے کے میدان کے روایتی حوالے میں کئی ریڈیکل نکات کو ابھارا جس سے کئی آفاقی نوعیت کے ذاتی تصورات بھی شامل ہوگئے۔ فرائی کی نظر میں "بیگانہ" اور "ناکامی فطری دنیا" میں انسانی تمثالیت ناکافی ہے جو انسان کی قوسیائی دنیا میں مستقل طور پر "اڑی" ہوئی ہے۔ یہ چار ریڈیکل "Mythoi" (پلاٹ، ہیئت، منظم ساختیاتی آفاقیت) پر مشتمل ہوتی ہے جو چار موسموں کے دائروں کو چار بنیادی اصناف جیسے طربیہ (موسم بہار) رومان (موسم گرما)، المیہ (خزاں) طنز (سرما) میں تقسیم کردیتا ہے۔ اس تنقید میں الہیاتی، تاریخ، قوانین معاشرتی قرائن اور تمام زبانی کلام کے سانچے بھی شامل ہیں لیکن اس قسم کی تنقید میں زیادہ حصہ ثقافت کی سائیکی، خواب اور لاشعور سے متعلق ہوتا ہے۔

قوسیاتی تنقید پر یونگ نے "On the Relation of Analytical Psychology of Poetic Art" (1922)، "Psychology of Literature" (1933) ولسن نائٹ نے "The Starlit Dome" (1941)، رابرٹ گریوز نے "The White Goddess (1933)"، جوزف کیمبل نے "The Hero With a Thousand Faces" (1968) لکھی۔ ایم ایچ ایبرامز، مرے کریگر (Krieger)، رابرٹ ڈینہم (Denham) اور فرینک لینٹھریچا (Lentricchia) نے "After The New Criticism" لکھی۔

نظریہ قبولیت (Reception Theory)

ہانز رابرٹ یاوس (Jauss) نے اپنے مضمون "Literary History as a Challenge to Literary Theory" میں قاری کے اساس نظریے کو بیان کیا۔ مضمون میں قاری کی ذہنی کیفیت سے بحث کی گئی ہے جو اپنے متن کو قبول کرنے کے سلسلے میں پیش آتی ہے کہ کس طرح قاری متن کو قبول کرنے سے قبل اس کی تشریحات اور ارتقائی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے جہاں متن کی معروضی معنویت نہیں ہوتی لیکن بہت سے معروضی خدوخال کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یوں معنویت کے کئی جمالیاتی پہلو نمایاں ہوتے ہیں جس کو قاری اپنے ذہنی اور تجربی افق پر ادراک کرتا ہے یوں رد و قبول، امید اور ناامیدی کی صورت حال بھی پیدا ہو جاتی ہے جو متن کے مستقبل کے لئے چیلنج بھی بن جاتا ہے۔ یاوس نے قبولیت کی جمالیات اقدار کی دوامیت کو دو واضح تصورات میں تقسیم کردیا اور ایک کو آفاقی کہنے پر زور دیا۔ ان کے خیال میں ادبی اقدار کو متن کی تغیر پذیری کے تناظر میں جانچنا چاہیے کیونکہ اس سے قبل لسانی و جمالیاتی محدودیت حصار میں رہ کر اس کو رد یا قبول کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے جو کہ زمانی حصار میں مقید ہوتا ہے لیکن قبولیت کے نظریے میں ارتقائی حوالے سے تاریخی نوعیت کی جانچ کی جاتی ہے جو کہ یک کلامیہ انداز کا حتمی مکالمہ ہوتا ہے جس میں قاری طے شدہ معنویت کو توڑ پھوڑ کر نئے معنی تلاش کرتا ہے کیونکہ متن کبھی بھی حتمی صورت میں نہیں ہوتا۔ یاوس کا نظریہ قبولیت جمالیاتی نوعیت کا ہے لہٰذا وہ قرات کو تاریخی ڈسکورس کہتے ہیں۔ بعض دفعہ نظریہ قبولیت میں انسانی ذہن کے ان جبروں سے بھی بحث کی

جاتی ہے جو قاری کے مخصوص عقائد، لسانی، ثقافتی، نسلی، جغرافیائی (علاقائی) پس منظر کے سبب متن کی تشریح میں در آتے ہیں اور متن قطبین کے انتہاپسندانہ سروں پر اپنے یکسر مختلف معنوں کو ترتیب دیتا ہے۔

یاوس کے علاوہ رابرٹ سی ہولب (Holub) کی کتاب "Reception Theory: A Critical Introduction" (1984) میں نظریہ قبولیت کا تنقیدی نقطۂ نظر سے خاصا وسیع مطالعہ کیا گیا ہے۔

نشانیات (Semiology/Semiotics)

نشانیات کا علم "نشان" کا مطالعہ ہے جو ایک نظام کے تحت ایک مخصوص لسانی تفاعل کی حرکیات کی آگہی کے بعد معنویت کے نظام کا مطالعہ کرتا ہے۔ نشانیات کے بنیادی تصورات ۱۹۵۰ء تک ثقافتی اور ادبی تنقید میں اہم تصور کیے گئے۔ سابر نے نشانیات کو (Semiology) کہا جبکہ انیسویں صدی میں امریکی ماہر لسانیات اور فلسفی چارلس پرس نے اسے Semiotics کا نام دیا۔ جس میں اہم نکتہ یہ تھا کہ یہ ایک ایسی سائنس ہے جو تمام انسانی تجربات کے تمام وظائف میں شامل ہوتی ہے اور نشان صرف ابلاغ کے نظام تک محدود نہیں بلکہ یہ زبان، رموز اور سڑک کے اشارے اور انسانی سرگرمیوں کی پیداوار ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف نوعیتوں کی انسانی سرگرمیوں میں بھی "نشانیات" کے عمل دخل کو محسوس کیا جاسکتا ہے جس میں لباس، خوراک، حرکات و سکنات اور معاشرتی رسوم بھی شامل ہیں لیکن بشریات، مظہریات، تحلیل نفسی، لیوی اسٹروس، لاکان اور دریدا وغیرہ نے نشانیات سے اپنے اپنے فکری اور فلسفیانہ دعووں کو کسی حد تک ترتیب دیا جس کے بعد زبان تجربی معروض کی تحقیق کا موضوع بن گیا۔ خاص طور پر ہیلم سلیو (Hjelmslev) نے ۱۹۴۳ء میں "Prolegomena to a Theory of Language" لکھی جس نے تحقیق کے نئے دروازے کھولے۔ سابر نے نشانیات کے نظام کو تجریدی بتایا ہے۔ لسانیات کا وظیفہ نشانیات کے نظام کی ساخت اور اس کے ڈھانچے کی بازیافت ہے۔ روایتی نشانیات میں معنی کا مرکب "معنی نما" (Signifier) ہے جو مخصوص لفظ یا علامت کو نام دے کر اسے معروض میں تبدیل کر دیتا ہے۔ نشانیاتی امتیازات

زبان (Langue) کے درمیان دیکھے جاسکتے ہیں جو ایک روایتی تصور ہے جس کے تحت لسانی قواعد واصول ترتیب دیے جاتے ہیں اور پھر زبان معاشرے میں اپنا ابلاغی وظیفہ سرانجام دیتی ہے جبکہ تکلم (Parole) زبان کا تجریدی حصہ ہوتا ہے جو کسی بھی گفتگو میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جو زبانی بیوہار سے زبان اور نشانیات کے تانے بانے بنتا ہے اور جس میں زمانی اور تاریخی واقعات آتے جاتے رہتے ہیں۔ نشانیات کی تنقید ہیئت پسندانہ نظریے سے نظریں چراتی ہے جبکہ معاشرتی، سیاسی اور تاریخی حوالے سے بھی یہ کسی قسم کا سروکار نہیں رکھتی۔ پس ساختیات کے نظریے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ ہر تنقیدی نظریے کے پیچھے نشانیات کی "گرج" موجود ہے جو معنویت کا مخاطبہ ہے کیونکہ ادبی متن اول درجے کا نشانیاتی نظام ہوتا ہے جسے نشانیات کا ساختیہ رموز، رسوم اور معاشرتی عناصر سے تشکیل دیتا ہے۔

نشانیاتی تنقید پر سابر، جوتھن کلر، ٹیزس ہاکس، رابرٹ شلز، امبر یکو ریکو، بارتھ، تھامس سی بوک (Sebоek)، لیوی اسٹروس، لاکان، فوکا ماریا کورٹی (Corti)، مائیکل ریفاٹر، ہاربرا اسمتھ نے لکھا ہے۔

نامیاتی تنقید (Organic Criticism)

ادب کی ہر صنف کو بطور "نامیہ" تصور کرتے ہوئے اس کی تشریح وتفہیم ایک مخصوص سراپے کے طور پر کرتے ہوئے ادب کی تنقید میں نامیاتی ساختیات کا تصور ابھرا جو فطری (Naturalistic) اور ترتیب وار (Systemic) نامیاتی سانچے میں تقسیم ہو کر مزید حرکی اور سکونی نوعیات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ادب میں نامیاتی ساختیات، "وحدانیت کی فطرت" سے متاثر ہے جو ادبی کاموں کا گہرائی سے تجزیہ کرتی ہے۔ روسی ہیئت پسندوں نے ادب کے تنقیدی فریم ورک کو نئے انداز میں مرتب کرتے ہوئے ہیئت پسندی کی میکانیت اور اس کی رسائی کو دریافت کیا، جس میں ٹکنالوجی کے حقائق بھی در آئے جبکہ ہیئت پسندوں میں ایک ایسا حلقہ بھی ابھرا جو ادب کو خاصا حیاتیاتی بنیادوں پر پرکھتا تھا۔ نامیاتی سانچے کا ماڈل ادبی اصناف کے نفس مضمون کی گہرائیوں میں اتر کر معنویت کی نئی جہتوں کا انکشاف کرتا ہے۔ ماسکو اسٹیٹ اکادمی کے مطالعہ فنون کے ایک رکن بورس جیر کو (Boris Jarco) نے اس موضوع پر مناجیاتی

مقالہ "The Boundaries of Literary Theory of as a Science" میں ادبی عمل (کلام) اور حیاتیاتی نامیاتی تین مشترکہ مشابہتیں دریافت کیں:

(۱) دونوں پیچیدہ ہوتی ہیں اور مخالف نامطابق کو ترتیب دیتی ہیں
(۲) دنوں کے "کل" "غیر متعین ہیں

(۳) دونوں کے مشترکہ عناصر مراتبیات (درجات) کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، جن میں سے چند وحدت کے "کل" کے لئے ضروری ہوتے ہیں اور دوسرے عناصر کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ نامیاتی ساختیات کے نظریے کا حیاتیاتی نامیات سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔ متن میں انفرادی سانچے کی جو بھی نامیاتی تصویر ابھرتی ہے اس سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ ہیئت پسندوں نے اسے کئی انداز میں پیش کیا۔ آرچ میکنسٹ (Arch-Mechanist) اور شکلووسکی نے ہیئت پسندی کو Morphological School کہا۔ انھوں نے فن اور نامیات کے متوازن چلتے ہوئے تنقیدی نکات کو وضع کیا، ہیئت پسند مطالعہ نمونہ لفظ (Morphology) کو حیاتیاتی معنوں میں لیتے ہیں کیونکہ ان کی نوعیت افزائشی ہوتی ہے۔ تنقید میں ہیئت پسند نقاد زرمونسکی (Zirmunskij) اور اسکاتاموف (Skattmov) نے نامیاتی ماڈل وضع کیے اور ایجی ہام نے استعاروں کو کبھی کبھی استعمال کیا اور ان کے یہاں مطالعہ نمونہ لفظ ہیئتی تشریح میں بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ زموسکی نے ادبی تنقید کے میکانکی ماڈل پر تنقید کرتے ہوئے بتایا کہ کئی اسکالرز غیر وظائفی متعلقات کے عناصر کو اپنی تحریروں میں جگہ دیتے ہیں۔ پروپ ویسلووسکی (Verselovski) اور اسکاتاموف، پیٹروسکی (Petrovski) نے ہیئت پسند حوالے سے نامیاتی ساختیات کی بنیادیں استوار کیں۔ نامیاتی تنقید ادب سے ان باتوں کا تقاضا نہیں کرتی جو متن سے خارج ہیں۔

نامیاتی ساختیات متن کی ترتیب وار میکانی تنقید ہے اس نظریے میں متن کا ہر حصہ ایک دوسرے سے متعلق ہوتا ہے۔ متن اپنی نامیات میں ایک مکمل تصور ہے جس طرح انسان کا سراپا، جسم کے دوسرے حصوں سے مل کر اپنی شناخت مکمل کرتا ہے اور نامیاتی تنقید تخلیق کی بازیافت کرتی ہے۔

نوساختیات (Neo Structuralism)

ساختیات اور پس ساختیات کا تنقیدی نظریہ اب اتنا موضوع بحث نہیں آتا جیسا ساتویں دہائی میں آتا تھا کیونکہ اب مغرب میں تحلیل فلسفے کے اینگلو سیکسن ماڈل میں وہ جان نہیں رہی جو کہ ماضی میں نظر آتی تھی کیونکہ مغربی فلسفہ اور ساختیات نے باہر سے وہ فکر نہ لی جو اس کی فکر کو توسیع دیتی۔ نوساختیات اس صورتحال کے حوالے سے اپنے جواز کا ثبوت پیش کرتی ہے اور مغربی تنقید اور فلسفہ ان امور کی طرف توجہ دلاتی ہے جس سے ساختیات اور پس ساختیات کی تھیوری سمجھائی جاسکتی ہے کیونکہ جب تک فلسفے کے ماورائی نفس مضمون کی بے دخلی کا ثبوت نہ مل جائے۔ نوساختیات کی تھیوری میں تعارض (Conflict) ہی تاریخ کی رد تشکیل کی تشکیل نو کرتا ہے جو تاریخی شعور کا عویدار بھی ہوتا ہے۔ جہاں اشیاء سائنسی اور تفہیماتی حصوں میں منقسم ہو جاتی ہیں لیکن ساختیاتی اور تفہیماتی فکریات اس سطح پر ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما ہو جاتی ہے۔ نوساختیات کے بعد والی صورت حال پر نظر ڈالتی ہے جہاں سے ساختیات کا آغاز ہوتا ہے اس مرحلے پر مظہر کی طہارت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس مقام پر نوساختیات کا تصور واضح نہیں ہو پاتا کیونکہ ساختیات کا بنیادی تصور زبان اور ادبی تنقید، فلسفہ بشریات اور عمرانیات میں مدغم ہو کر اپنی مجرد شناخت سے محروم ہو جاتا ہے۔ نوتھومزم (Neo-Thomism) اور نومارکسیت بھی شانہ بشانہ چلتی ہے لیکن یہ نوساختیات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل میں یہ اپنا سفر، ساسر، بیونٹ، اسٹروس، گریماز، جیرالڈ جینٹ، تردوف اور بارتھ کی فکریات سے شروع کرتی ہے اور ساختیاتی روایت سے اپنے دعوؤں کو سنوارتی ہے لیکن یہ اپنے دبستان ہونے کا دعوٰی نہیں کرتی کیونکہ نوساختیات اپنے ساختیاتی ماخذات کو نظر انداز نہیں کرتی اور انھیں تسلیم کر کے ان فکری جھولوں کو پر کرتی ہے جو ساختیاتی فکر میں مسائل اور مغالطوں کا سبب ہیں۔ تیسرے مرحلے پر نئی ساختیات فلسفیانہ تناظر میں نسل — نسلی ساختیات کو ریڈیکل انداز میں نئے معیارات اور پیمانوں سے روشناس کراتی ہے۔ نئی ساختیات "نئی تنقید" اور "نئی نئی تنقید" میں متنازعہ ہے کیونکہ یہ تنقیدی رویہ نظریہ میں ڈرامائی سانچے نقاد کو طریقہ کار / مناجیاتی چناؤ کی آزادی فراہم

کرتے ہوئے معنویت کی بازیافت میں موضوعی رسائی کو کم اور معروضی (عقلی و منطقی) میکانیت کو زیادہ خوش آمدید کہتی ہے۔ کسی حد تک یہ تنقید رجحان استقرائی یا استخراجی طریقہ کار سے اپنے دعووں کی منطقی تزئین کرتا ہے جو بعض دفعہ تخلیقی عمل کے درجات متعین کرنے کے بعد زبان، ادب، فلسفہ اور ثقافت میں گندھے متن کو موضوعاتی شناخت کے بعد نئے تشخص سے آگاہ بھی کرتا ہے۔ تو ساختیات کی انتقاد اپنے مخصوص فکری نظام کے تحت ادب اور غیر ادب میں تمیز کر کے معروضی مطالعوں اور تجزیے کی نئی وسعتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

ہیئت پسندی (Formalism)

ادبی تنقید میں ہیئت پسندی کا رویہ مختلف انجہت ہے جو تخلیقی عمل میں لکھنے والے کی ذاتی زندگی اور تاریخی متن یا اس کے پس منظر سے دلچسپی نہیں لیتا بلکہ تخلیق یا تحریر کے جوہر کو زیر مطالعہ لاتا ہے اسی سبب ہیئت پسندانہ تنقید متن کی باریکیوں میں اترتی ہے اسی سبب اس رجحان کو "قریبی قرات" (Close Reading) بھی کہا گیا۔ ہیئت پسندی کے ڈانڈے ارسطو کی انتقادی مباحث سے شروع ہوتے ہیں کیونکہ "بوطیقا" میں "المیہ" کے تصور کو عمیق رسائی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے اس طرح انھوں نے اصناف کو نمایاں کرتے ہوئے اس کے دیگر اجزاء، پلاٹ، کردار، اسلوب اور افکار وغیرہ کو ایک دوسرے سے ممیّز بھی کیا اور اس زمانے کی الیاتی تخلیقات کے وظائفی اجزا سے بحث کی اور "المیے" کے نظریے کی بنا ڈالی۔ جس سے کئی تنقیدی سوالات ابھرے۔ جدیدیت پسندانہ تنقید کی ابتدا سیموئیل ٹیلر کولرج (Colenidge) کی انتقادات کے بعد شروع ہوئی جب انھوں نے ورس ورتھ کی شاعری کا عمیق اور متنی مطالعہ کیا جس سے ورس ورتھ کے شعری نظریے کی بازیافت ہوئی۔ کولرج کے خیال میں ہیئت پسندی "Shaped from within not imposed from without" ہے۔

مکالماتی تنقید (Dialogic Criticism)

۸۰ء تک مغربی اور ایشیائی ادب میں مکالماتی تنقید کا ذکر نہ ہونے کے برابر ملتا ہے حالانکہ روسی نقاد میخائل باختن نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان اپنی تحریروں میں اس

تنقیدی رجحان کی ابتدا کر دی تھی لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد انگریزی تراجم نے ان کے نظریات کو یورپ اور امریکہ میں مقبول کیا۔ باختن کی ادبی تنقید متن میں معنی کی پیداوار کا عندیہ دیتی ہے جو لا شخصی سطح پر لسان، معیشت اور ثقافتی قوتوں کی نفی کرتا ہے (جو پس ساختیات نظریات کا اہم موضوع ہے) لیکن متن کا مکالماتی تفاعل کئی آوازوں کو تخلیق کرتا ہے جس میں مخاطبہ (ڈسکورس) کے نئے نظام ابھر کے سامنے آتے ہیں جو سب کے سب مکالماتی نہیں ہوتے لیکن ان کا معاشرتی مظہر معاشرے میں موجود معاشرتی طبقے کا جبر ابھارتا ہے اور خطیب کا لہجہ سامعین / قاری کے لئے متوقع ہوتا ہے جو کہ مخصوص معاشرتی حصار میں گفتگو اور تشریح کیا جاتا ہے۔ باختن نے دوستفسکی کے شعریات کے مسائل (۱۹۲۹ء) میں مانولاجیک ناول کے تضادات پر نظر ڈالتے ہوئے ٹالسٹائی کے ناولوں کو مقتدر مخاطبہ اور قاری کے کنٹرول کئے جانے والے عناصر سے بحث کی جو مکالماتی ہیئت (Polyphonic Form) کی صورت میں دوستفسکی کی ناولز میں ملتی ہے جو قطعی طور پر آزاد ہوتی ہیں جن کی آوازیں شعور سے بھی متعلق نہیں ہوتیں اور خالص مکالمات کا اصل "اصلی" آوازیں ہوتا ہے۔ ناول ہمیشہ مانولوجیک نہیں ہوتا جب تک بیان کرنے والا لہجہ اور کردار کو دوہری آوازوں میں پیش نہ کرے۔ مصنف کرداروں کو اپنی انفرادیت بتانے اور شناخت کو نمایاں کرنے کے لئے آزادی مہیا کرتا ہے۔ (ترجمہ ۱۹۸۴ء) "Rabelais And His World" میں لکھا ہے کہ ادبی مزاج اقتدار کے تسلط اور معاشرتی مراتبیات کے بین بین چلتا ہے کیونکہ اقتدار سے انھیں اظہار کی اجازت چاہیے ہوتی ہے۔ بامعنی آوازیں معاشرتی سطحوں سے ابھرتی ہیں اور جنسی اور تخریبی اقتدار سے آزاد ہو کر معاشرتی تحریمیات کے تحت اظہار کے مزاج کو جنم دیتی ہیں لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ دوستفسکی کے ناولوں میں بہت سی تخریبی آوازیں شناخت کی جاسکتی ہیں۔ ۳۵-۱۹۳۴ء کے دوران باختن نے ایک مضمون بعنوان "ڈسکورس ان دی ناول" لکھا۔ انھوں نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ ناول کی ادبی ہیئت کثرت کے ساتھ مغالطے اور بحث و مباحثے کو ابھارتے ہیں جس کے پس منظر میں معاشرتی آوازیں معنی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو کہ مکالماتی تفاعل کے سبب ممکن ہوتا ہے جس میں بیان کرنے والے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں، ساتھ ہی باختن نے ارسطو کی بوطیقا سے اختلاف بھی کیا جو کہ بیانیہ ہیئت

کا ابتدائی مرکب کا پلاٹ ہوتا ہے جس میں شروع سے آخر تک پیچیدگیوں کے حل کے متعلق ہی خیال لگا رہتا ہے۔ باختن کے نزدیک ایک مکالماتی تنقید میں معاشرتی آوازیں اور ثقافت کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ مانولاجیک سچائی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ اختلاف سے ہی باہمی تعریفات جنم لیتی ہیں۔ مکالماتی تنقید میں پوشیدہ تمام آوازیں نمایاں طور پر ثقافتی ہوتی ہیں۔

نیوکلیائی ادبی تنقید (Nuclear Literary Criticism)

ادب کی نیوکلیائی تنقید اپنی معنویت میں مثبت اور کبھی کبھار منفی تصورات کو ابھارتی ہے۔ اس تنقیدی رویے میں وہ رجحانات شامل ہوتے ہیں جو تنقیدی حصار سے باہر ظہور پذیر ہو چکے ہوتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ معاصر تنقید میں ان کی توجہ کے بغیر اسے تنقیدی نظریے سے خارج کر دیا جائے تو تنقیدی نظریہ کمزور ہو جائے گا کیونکہ ادب کی نیوکلیائی تنقید لوگوں کے نیوکلیائی مباحث کو مزید مستحکم بناتی ہے۔ تنقید کا یہ میدان، قرات اور معتبر متنوں کی گرہیں ہی نہیں کھولے گا بلکہ ان نظر انداز کئے ہوئے نظریات اور رجحانات کو نئے تنقیدی اور ادبی قیاسات کے ساتھ نئے فکری نظام میں منتقل کر کے فکر کے نئے مباحث کا آغاز بھی کرے گا اور ہیئت کے کئی پوشیدہ میدانوں کو تحقیق و ساطت سے درجہ بندی کے بعد دریافت کر پائے گا۔

اب جبکہ اکیسویں صدی کی شروعات ہو چاہتی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ ادبی قوت کی اہمیت اپنے طور پر کم ہو جائے گی اور الٰہیات یا Eschatology کے مسائل نیوکلیائی متعلقات سے زیر کئے جائیں گے اور یہی صورت حال انسانی ثقافت پر حاوی ہو جائے گی۔ معاشرتی تاریخ میں Eschatology پیچیدہ فکری وظیفہ بن کر حتمی روایات اپنے اثرات ثبت کرتے ہوئے منطق کو دوبارہ بازیافت کر پائے گا۔ یہی نئی فکری قدر تنقیدی عمل میں ابھرے گی۔

دنیا کی بساط پر بڑی نیوکلیائی قوتوں کی کشمکش نے جدلیاتی نقالی کو نئی صورت دی جس نے فکری فطرت اور ماحولیات کو ایک نئے عملی کیمیا سے دوچار کیا جس نے تکرار اور اختلاف کے مسائل اور آپسی افہام و تفہیم کے نظریے کو فروغ دیا۔

جدید عہد کی نیوکلیائی ہلاکتوں نے دہشت کو اپنے مخصوص معروض کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے قوت کے سرچشموں کی بھی تفہیم کی ہے۔ نیوکلیائی تنقیدی نظرے نے ثقافت کے ماخذات کو بھی تجزیاتی عمل سے گذارا ہے کیونکہ خطرناک نیوکلیائی رویے انسان کے تکنیکی ذہن سے برآمد ہوتے ہیں۔ اور تکنیکی پروگرام سے ہی نیوکلیائی ماخذات اور جوہری اشیا بر آمد ہوتی ہیں اور یہی جوہری پیمانے اور نظریات فطرت کو نشانہ بنانے کی خواہش لئے ہوتے ہیں۔ "قدر" کی "قدریں" ہی نظریے اور عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ تکنیک اصل میں ثقافت کے حوالے سے فلسفیانہ طور پر اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

نیوکلیائی تخاطبہ (ڈسکورس) بدیعیاتی پیانوں سے مدد لے کر بعض دفعہ اظہار اور ترسیل پر پابندی بھی عائد کر دیتا ہے۔ بیانیہ اور لسانی سطح پر ان کا استحصال بھی کرتا ہے اور بعض دفعہ مصنوعی بھی ہو جاتا ہے۔ بدیعیاتی تشکیک بلاشبہ ایک منطقی تکنیک ہے۔ بدیعیاتی تجزیے کا پیمانہ ہیئت، نقد، تفہیم اور تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے اور ادراک کے قیاسات اور نظریات کو تنقیدی نظریات سے جدا کر کے ساختیاتی تخاطبے کا حصہ بنا دیتا ہے جس میں "نشان" (Sign) کے وظائف اور پیغام کی ترسیل اور اس کی حرکیات سے بحث کی جاتی ہے اور اصل متن کی غیر متوقع تشریح بھی ممکن ہو پاتی ہے جس میں متبادل واقعات کے ساتھ ہی مردم گریز تشریحات اور شعوری طور پر متن کی غلط تشریح بھی نمودار ہوتی ہے جو کہ تبدیلی کی قوت اور نمایاں حقائق کی مدد سے تاریخ کاری کو ہی جنم نہیں دیتی بلکہ معروضی حقائق کو تاریخی واقعات کا حصہ بھی بنا دیتی ہے یوں تنقیدی نظریہ میکانی پیانوں کے ساتھ متن کا تجزیہ کرتے ہوئے بیانیہ کی صورت میں نیوکلیائی فرہنگ کا اضافہ کر دیتا ہے۔

ڈیرک ڈی کرچیخوف (Derric Dekerckhove) نے لکھا ہے "جوہری توانائی نے مغربی تہذیب پر بم گرایا ہے جو کہ بائیو کلچرل شے ہے جس سے سائیکوایکٹو (Psycho Active) کا تجربہ ہوا اور قوت سے ترسیل عامہ میں بھی تبدیلیاں ہوئیں لیکن یہ اطلاعاتی نہیں بلکہ ان کی نوعیت تبدیلی ہیئت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔"

دریدا کا خیال ہے کہ زبان اور ادب کی نیوکلیائی جنگ ایک دوسرے سے منسلک ہیں حالانکہ یہ دونوں آزادانہ طور پر حقیقت کو عیاں کر دیتے ہیں لیکن ان کی مکمل طور پر نیوکلیائی

جنگ سے شناسائی نہیں ہوتی جبکہ انسان کا احوال تجربے میں آ چکا ہوتا ہے۔

نیو کلیائی تنقید میں ہم عموماً Diacritics کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور ادب کے حوالے سے ادب ہی کی بات کرتے ہیں پھر رزمیہ سے شاعری کو الگ کرتے ہوئے معروضی اہداف کو پالینے کی کوشش کرتے ہیں جو ادب "حاصل" کرنے کی خواہش کے قانونِ فطرت کو کبھی محدود نہیں کرتا۔ عموماً ہم افسانوی اور حکایتی زبان بولتے ہیں ان میں واہموں کی بھرمار ہوتی ہے۔ ہماری تحریریں بدعیات کے زیرِ اثر ہوتی ہیں۔ نیو کلیائی جنگ زبان کی محتاج نہیں ہوتیں سوائے اس کے کہ ہم اسے بولتے ہیں لیکن ان کے معنی کی ترسیل کی اہمیت لسان میں معدوم ہو جاتی ہے۔ تارنخیت ادب میں عصریت کو بھر دیتی ہے جس سے نیو کلیائی عہد میں ساختیاتی سطح پر تنقید میں غیر متعلق امور در آتے ہیں۔ نیو کلیائی آگہی تاریخ کا اختتام نہیں ہے لیکن نیو کلیائی تارنخیت کی حامل ہوتی ہے جس سے ردِ تشکیک الہام (Apocalypse) دریافت (Revelation) اور اس کی صداقت مکمل طور پر کسی آگہی یا علم کے بغیر ہوتی ہے۔ دریدا کا خیال ہے کہ اطلاعات اور زبان کی ترسیل میں غیر زبانی زبان کے سانچے کے رموز اور جغرافیائی رد رموز پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن شاندار متن کے مظہر میں اسے وسعت ملتی ہے۔ وقتی طور پر نیو کلیائی جنگ نہیں ہوتی بلکہ اسے زبان اور تحریر کے ذریعے پیرائے اظہار میں لایا جاتا ہے۔

نیو کلیائی تباہ کاریوں کی دہشت سے متن اور اس کی لفظیات بدل جاتی ہیں، معنیاتی نظام تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے اور ترسیلی سانچے، متن کے عدم ابلاغ سے معاشرے میں خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ تصادم کی کیفیت ابھرتی ہے تو جدید تکنیکی معاشرے میں نیو کلیائی تباہ کاریاں جنم لیتی ہیں۔

پس ردِ تشکیل (Post Deconstruction)

پس ردِ تشکیل کا نظریہ لسانی اور متنی روایت کے سکہ بند رویوں اور تصورات سے انحراف ہے کیونکہ ردِ تشکیل میں معنویت کو پالینے کے لئے افتراق، ابہام، تناقض کو ابھارا جاتا ہے۔ لسانی صداقت کا اصل میں کوئی وجود نہیں ہوتا کیونکہ زبان معاشرے کا مصنوعی وظیفہ

ہے جس کو اپنے مقاصد کے لئے جو جیسا چاہتا ہے، استعمال کرتا ہے۔ زبان کا اصل معنوں میں کوئی سائنسی جواز نہیں ہوتا۔ قواعدیاتی میکانیت فرد کے اظہار سے جنم لیتی ہے جسے زیرک نقاد اور آگاہ قاری تسخیر کر کے مخصوص نظامیانے (Systematization) میں تبدیل کر دیتا ہے، چاہے یہ قواعدیات کا علم ہو یا نشانیات کی آگہی یا علم و عروض کی مباحث جسے غلطی سے "سائنس" کہہ دیا جاتا ہے۔ لسانی ڈرامائیت نے پس ردِ تشکیل کو جنم دیا کیونکہ اس سے جمالیاتی اور معنیاتی شناخت کو لسانی حوالے سے شفاف تخاطبہ (ڈسکورس) مہیا ہوتا ہے، متن دوسرے متن میں نفوذ تو کرتا ہے لیکن اصل میں اسی دوران اس کی تشریح گمراہ کن انداز میں ترتیب پاکر "صداقت" کے مفہوم کو معدوم کر دیتی ہے۔ متن کی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے نام اور شناخت کو اپنے اصل حوالے سے متعارف کروائے۔

ردِ تشکیل متن میں "کیا ہے" کی بات کرتی ہے وہ یہ نہیں سوچتی کہ متن کی "یہ" "میں" "یہ" کہاں سے آئی۔ "یہ" سے مراد متن کی معنویت ہے جو "یہ" کا سراغ اس وقت لگا سکتی ہے جب روایت کی فکر کو تسلیم کر لیا جائے۔ اثبات اور رجائیت کے شعور کے ساتھ ہی متن کا شعور بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ لسانی اور معاشرتی تشکیلات کو افراد ہی بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں لہٰذا متن بھی ان نامیاتی مشابہتوں سے ترتیب پاکر متن میں در آنے والی وجودی وحدتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے جس سے عملیاتی، تجربی اور معطیاتی طریقہ کار کا استدلال جنم لیتا ہے۔

پس ردِ تشکیل کا ادبی نظریہ فکری بدعتوں کا ادراک کرتے ہوئے متن اور قرات کے انتشار کو ایک مرکزیت عطا کرتی ہے جو کہ ردِ تشکیل کے نظریے میں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ اس نئے فکری عمل میں قاری کی ہی نہیں بلکہ متن کی بازیافت ممکن ہو پاتی ہے جو کہ استنباطی نظریہ سازی کے سبب اپنے مرکز سے بھٹک گئی تھی۔

پس ردِ تشکیل کے نظریے میں ذہنی قیاسات کو مخصوص "نظامیانے" کے تحت متنی نظریے میں سمو دیا جاتا ہے جو اپنے فکری برتاؤ سے اصل تصورات کو جنم دیتا ہے اور مظہر کی تشریح کرتے ہوئے "جوہر" اور "عدم جوہر" کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ دیتا ہے لیکن پس ردِ

تشکیل میں اہم عناصر زبان، متن (تحریر) قاری اور معنی کے ہوتے ہیں جو اپنے چہرے کو کسی حد تک مسخ کیے ہوتے ہیں۔ جس سے متن میں وہ پوشیدہ عناصر بھی ابھر کے سامنے آتے ہیں جو متن کے ابلاغ میں رخنے ڈالتے ہیں، جن میں تہذیبی برتری، اقتداری متعلقات، بدیعیات اور آئیڈیالوجی کے متغیرات ان اندرونی اور خارجی عناصر پر اثر انداز ہوتے ہیں (جنھیں جلی اور خفی عناصر بھی کہا جاسکتا ہے) نیا ادبی نظریہ اور بالخصوص پس ردِّ تشکیل کے نظریے میں نقاد، مفسر اور قاری کے رشتے نئے نوعیت کے ہیں جس میں متن کے معنی پس منظر کی نئی جدلیات کے بعد تشکیل پاتے ہیں۔ متن اور معنی کی اصطلاح تجریدی نوعیت کی نہیں ہوتی اگر متن کو قرات سے پہلے تجرید اور خلاصے کی تکنیک کے تحت متن کے بنیادی مقولے (Motto) کو دریافت کرلیا جائے تو قرات کے بعد متن کی معنویت عام فہم ہو جاتی ہے اور اس فریم ورک میں رہ کر متن کی کل آگہی ممکن ہو پاتی ہے۔ پس ردِّ تشکیل نے ردِّ تشکیل کے ادبی اور لسانی نظریے کو توسیع دی ہے اور تنقیدی نظریے کو مزید وسعت دینے کی کوشش کی ہے۔

پس ردِّ تشکیل کا نظریہ ردِّ تشکیل کے بنیادی تنقیدی تصورات کا ردِّ عمل ہے کیونکہ ردِّ تشکیل فکری اور تنقیدی سطح پر تشدد پسندی کا عندیہ دیتا ہے۔

اس سلسلے میں تین نکات ابھر کے سامنے آتے ہیں:

(۱) ردِّ تشکیل عدمیت (Nihilism) کا نظریہ ہے۔

(۲) ردِّ تشکیل افتراق سے شناخت کو زیر کرنا چاہتی ہے

(۳) ردِّ تشکیل پر حتمی عینیت پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے (خاص کر دریدا کے Il n'y a pas d'horst کے ریمارکس پر)

اقلیتی مخاطبہ (Minority Discourse)

اقلیتی مخاطبہ کوئی نیا ادبی و تنقیدی نظریہ نہیں، ادبی اور فکری تاریخ میں اس کا عکس کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے۔ سیاسی تبدیلیوں اور مغرب کے مکتبی اداروں میں اس تنقیدی مظہر نے ''نسلی اقلیتی ادب'' کے موضوع کو پروان چڑھایا۔ خاص طور پر امریکہ میں افرو امریکن (سیاہ فام) باشندوں، مقامی سرخ ہندیوں، امریکہ کے چکا کو ادب ایشیائی ادب (چینی، جاپانی،

کورین، ویت نامی اور فلپینو ادب جو امریکہ میں بسنے والے ایشیائی باشندے انگریزی میں لکھتے ہیں) روایتی معنوں میں یہ مطالعے کثیر الثقافتی (Multi-Cultural) ہوتے ہیں۔ ان مطالعوں میں لکھاری اپنی ثقافتی شناخت کے حوالے سے ثقافتی رنگارنگی اور لبرل اہداف کو پالینے کی کوشش کرتا ہے۔ اقلیتی مخاطبے کو بہت سے لوگ ''نظریہ'' قرار دینے کو تیار نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقلیتی اور نسلی گروہوں نے امریکہ میں گوری ثقافت کے جبری حاوی محرک کو ہمیشہ تشکیک کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کے خیال میں اقلیت کو اپنے سیاق میں اپنی زبان، ثقافت اور ادب کی تشریح و تشکیل کرنی چاہیے۔ کیونکہ امریکہ میں گوری نسل کے لوگ اپنے مقصد کے تحت مطالب اخذ کر لیتے ہیں اور انھیں استعمال کرتے ہیں۔ امریکہ میں اقلیت کے ثقافتی مزاج میں خلیجے کا افتراق موجود ہے، جو کہ اقلیتی مخاطبے کا حاوی کلیدی اور اہم موضوع ہے۔ یہ مطالعے ثقافتی اور روایتوں کو حاشیائی نظریے کے تحت اختصاصی رسائی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں کہ ''اکثریت'' کے فکری نظریات اور مفروضات اقلیتی مخاطبے میں رخنہ اندازی کرتے ہیں۔

ہندی ہندوستان اور اردو پاکستان کی قومی زبانیں ہیں۔ یہاں پر اقلیتی زبانیں ان دونوں ممالک کے مخصوص مخاطبوں کو پیش کرتی ہیں ان اقلیتی زبانوں میں فکری گہرائی اور اظہار اور ترسیل کا موثر ملکہ بھی موجود ہے جہاں ایک طرف اقلیتی مخاطبہ مثبت پہلوؤں کا حامل ہے تو دوسری جانب اس کے منفی اثرات بھی کم نہیں۔ بعض دفعہ حاوی یا اکثریت کی زبان ان اقلیتی زبانوں کے مخاطبے کو دانستہ طور پر عصبیاتی یا ثقافتی مرکزیت کے احساس برتری کے زعم میں دبا کر رکھنا چاہتی ہیں اور اس دباؤ سے اقلیتی مخاطبے میں مزاحمت کا رویہ پروان چڑھتا ہے۔ اس سے اقلیت اور اکثریت دونوں کے لیے لسانی مخاطبے کو نقصان پہنچتا ہے۔ اقتداری (پیورٹن) نظریہ حاوی یا اکثریت مخاطبے کو کمزور بناتا ہے کیوں کہ اس رجحان کے تحت اکثریتی زبانیں اقلیتی مخاطبے کو اپنے مخاطباتی نظام اور لسانی تشکیلات میں شامل کرنے کے حق میں نہیں ہوتیں۔ غالباً اس لیے کہ اس سے اکثریت مخاطبے کو اپنی شناخت میں دراڑیں پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اقلیتی مخاطبہ مائیکرو (micro) نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں روایت اور اسطور میں پیوست ہوتی ہیں اور ثقافتی شناخت ان کے مخاطبے کا بنیادی مقولہ ہوتا ہے۔ لوک

درجے کے مطالعے کا رجحان ہو یا تاریخی وسیاسی متعلقات کی بازیافت...... یہ سب عنصر اقلیتی مخاطبے کے کلیدی عوامل قرار پائے ہیں۔

ساختیات کے میدان میں مقامی اساطیر قبائلی مطالعوں نسلی مطالعوں اور چند بشریاتی مطالعوں میں اقلیتی مخاطبے کا عنصر غالب ہے۔ اسی طرح امریکہ میں ایبانک تنقید اور ایک طرف نسلی وثقافتی مطالعے کے زیر میں آتی ہے تو دوسری جانب یہ مطالعے اقلیتی نوعیت کا مخاطبہ بھی ہے۔ اقلیتی مخاطبے کا احاطہ پس تانیثی تنقید...... "گے اور لزبن" اور کوئر نظریات (queer theories) تک وسیع ہے۔

سابقہ نو آبادیاتی نیو کلیائی مخاطبہ

(Former Colonist Neclear Discourse)

پس نو آبادیاتی نظریہ اور نیو کلیائی نظریے کو قریب قریب ایک ہی وقت میں فروغ حاصل ہوا۔ ۴۰ء کی دہائی کے آخری برسوں میں یورپی اور بالخصوص برطانوی نو آبادیاتی نظام سے کئی ایشیائی اور افریقی قوموں نے نجات حاصل کی۔ ۶/ اگست ۱۹۴۵ میں امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر دنیا کا پہلا بم گرایا جس سے دو لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور تین روز بعد ۹/ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے شہر ناگاساکی پر امریکہ نے دوسری جوہر بم گرایا جس کی قوت بارہ کلوٹن این ٹی تھی۔ جس سے چالیس ہزار افراد موقع پر ہلاک ہوگئے اور یوں امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس کے بعد چین، ہندوستان اور پاکستان بھی اس نیو کلیائی دوڑ میں شریک ہو گیا۔

سابقہ نو آبادیاتی نیو کلیائی مخاطبہ سابقہ نو آبادیاتی مزاج کا ڈسکواس ہے کیوں کہ یہ تو ایک طرف ثقافتی مطالعوں کے زیر میں آتی ہے تو دوسری جانب نیو کلیائی تباہ کاریوں سے ادبی اور لسانی ڈسکواس پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو کہ فکری نوعیت کی تبدیلی ہوتی ہے۔

نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے والی قوموں کو احساس ہوا کہ ان کے سابقہ نو آبادیاتی آقا انھیں التباس میں رکھ کر اور آسائشات زندگی کا جھانسہ دے کر مزید اندھیرے

کے غار میں دھکیل رہے ہیں تو ان قوموں کی "انا" جاگ گئی اور کسی نہ کسی طریقے سے ان روایتی، قدامت پسند۔ پس ماندہ اور غریب قوموں نے بھی نیو کلیائی صلاحیت حاصل کرلی۔

نیو کلیائی ڈسکورس اب ثقافتی ڈسکورس میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب تمام جنگیں تصادم اور معرکے اصل میں تہذیبی برتری حاصل کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ فکری اور تہذیبی طور پر دوسروں کو کمزور کرکے اس پر حاوی ہوا جاتا ہے اگر قوت کا توازن مساوی نہ ہو تو سائنسی اور فنی اعتبار سے برتر قومیت چھوٹی قوموں کو اپنا "حلیف" یا "غلام" بنالیتی ہیں۔ یورپ ہو یا امریکہ ہر جگہ تہذیبی احیاء اور نسلی برتری کا تصور ان نیو کلیائی مباحث کی بین السطور میں چھپا ہوا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کا سب سے بڑا دشمن جرمنی تھا لیکن امریکہ نے جوہری بم جاپان پر گرایا کیونکہ جاپان ان کا نسلی حریف تھا۔ جبکہ ثقافتی و نسلی سطح پر جرمنی والے "گوری چمڑی" والے تھے اور احیاء نسل کے حوالے سے ان کے سیاسی اور عسکریت دشمن ہوتے ہوئے بھی ان کے تہذیبی و نسلی حلیف تھے لہٰذا جرمن قوم کو امریکیوں نے جوہری صدمہ نہیں پہنچایا۔

قوت کا توازن اگر ٹھیک ہو تو کوئی کسی نہ کو ڈرا دھمکا سکتا ہے نہ ہی کسی پر ظلم ڈھا سکتا ہے اور نہ ہی جوہری بم کی دھمکی سے اسے زیر کر سکتا ہے۔ اگر دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے پاس ایٹم بم ہوتا تو کیا امریکہ کی جرأت ہوتی کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم گراتا۔ ویت نام کی جنگ طویل عرصے تک جاری رہی امریکہ نے شمالی ویت نام صرف اس لیے جوہری بم نہ گرایا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو روس یا چین امریکی علاقوں پر بم گرا کر حساب برابر کر دیتا۔ یہی ایک ایسا دہشت اور خوف تھا جس نے دونوں بڑی نیو کلیائی قوتوں کو جوہری بم کے استعمال سے باز رکھا اور اس کے بعد مکالماتی ڈسکورس کے بعد ویت نام کا مسئلہ حل ہوا۔

بہر حال چین ہو یا جاپان، ہندوستان ہو یا پاکستان یہ سب مشرقی تہذیبوں کے علاقے ہیں ان میں ایک فکری اور تہذیبی ارتباط کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا ہے اور اس کا فکری ڈسکورس بھی کسی نہ کسی طور پر نو آبادیاتی ڈسکورس سے منسلک ہے کیونکہ جاپان کو یہ احساس ہے کہ امریکہ جوہری بم گرانے کے بعد اب بھی تاوان وصول کر رہا ہے۔ ایک طرف تو امریکہ ایٹمی برتری کے زعم میں یورپی تہذیب (یورپی مارکیٹ، یورو کرنسی) کی صورت میں ایک

عالمی وحدت اور قوت کی شکل میں تبدیل کر رہا ہے اور قلم کا نشانہ سابقہ نو آبادیاتی قومیں بن رہی ہیں۔ بڑی عالمی قوتوں کی خیمہ بندی کے سبب چھوٹے موٹے مسائل کو بڑی صفائی سے مزید الجھا کر بڑا کر دیا جاتا ہے تاکہ ان بڑی قوموں کی بالادستی بر قرار رہے اور چھوٹی قومیں یوں اپنے ڈسکورس کو دانستہ یا نادانستہ طور پر طاقِ نسیاں کر دیتی ہیں۔ خاص طور پر نئی نیو کلیائی اور سابقہ نو آبادیاتی قوموں (ہندوستان اور پاکستان) نے امریکہ اور روس کے نئے عالمی نظام کی سازش کی حمایت نہ کی اور نہ ہی ان کے آلہ کار بنے اور یوں نیا ڈسکورس ہی نیو کلیائی نظریے کی تولیت کا سبب بنا۔

سابقہ نو آبادیاتی قوموں کے نیو کلیائی دھماکے اصل میں پچھلے پچاس سال کے بعد نو آبادیاتی نظریے کے حوالے سے مغربی نو آبادیاتی قوتوں کے مذموم عزائم، ریاکاری، طوطا چشمی اور مکاری کا ردِ عمل تھا کیونکہ نو آبادیاتی نظام سے آباد ہونے والی قومیں یہ محسوس کر رہی تھیں کہ یہ بڑی سامراجی قوتوں کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر کبھی بھی ترقی نہ پا سکیں گی بالخصوص ایشیا کی سابقہ نو آبادیات کے ڈسکورس میں۔ "اجتماعی وجودی انا" ابھری جس نے سابقہ نو آبادیات کے آقاؤں پر یہ بات ثابت کر دی کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کو تم ناممکن تصور کیے بیٹھے ہو۔ پاکستان اور ہندوستان کے ایٹمی بم کے دھماکوں کے بعد فکری اور لسانی متن کا ڈسکورس تبدیل ہو چکا ہے جس نے نقلی اور اسلوبیاتی جمالیات کو متاثر کیا نئے ذخیرئہ الفاظ لغت، فرہنگ، کشاف کے نئے انگ ڈھنگ کے ساتھ تشکیک اور تشفیق و فکر نئی لفظیاتی معنویت سے ہم کنار ہوتی۔ یہ روز آبادیاتی نظریے کا یہی ڈسکورس ہے کہ اس نے سابقہ نو آبادیاتی اقوام میں شعور ذات شعور انا اور شعور معاشرت اجتماعی کے نئے رویوں کو جنم دیا۔ نیو کلیائی مخاطبے نے نو آبادیات باقیات پر گہری زد لگائی جس سے ادبی اور صحافتی متن ہی نہیں بلکہ برقیاتی متن میں بھی نئے ڈسکورس کا انکشاف ہوا۔ سابقہ نو آبادیاتی قوموں میں داخلی یا اندرونی گروہوں کے درمیان قدرے مشترکہ مخاطباتی لہجہ بھی دریافت ہوا۔

قبل متن کا نظریہ (Hyper Text Theory)

تنقید کے آلاتیاتی (Instrumental) نظریے نے سائنسی نظریات سے لے کر

آئیڈیالوجیکل نظریات کو بھی متاثر کیا کیونکہ مشاہداتی نتائج منطق کو معروضی حتمیت کی فکری روش کو مستحکم کرتے ہیں۔ قبل متن (Hyper Text) کا نظریہ بھی نتاجیت کا نظریہ ہے جو کہ عملیاتی ہونے کے ساتھ ساتھ آئیڈیالوجیکل اور ثقافتی نوعیت کے فکری مباحث کے دروازے بھی کھولتا ہے۔

حاسب (Computer) کی ٹیکنالوجی نے علوم اور عام اطلاعات کو مختصر سے ٹکڑے (Chip) میں منتقل و محفوظ کر دیا اور برقیاتی قبل متن کی لفظیات اور اس کے تصویری پیکر (Image) کو ممکن بنا دیا۔ جس نے قرأت کے تجربے کو تبدیل ہی نہیں کیا بلکہ کچھ عالموں کے نزدیک یہ فطری امر بھی عیاں ہوا کہ قاری متن کو کس طور پر قرأت کر رہا ہے۔ یہ اس نئی اطلاعاتی ٹیکنالوجی کا ریڈیکل مزاج بھی ہے جیسے طباعت کو اعلیٰ درجے کا 'Interactive' انقلابی رویہ بھی کہا جاتا ہے جہاں سے برقیاتی متن کنٹرول ہوتا ہے۔

"قبل متن" کے نظریے میں بہت سے عصری نشانیاتی نظریے کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے، جن میں دریدا کا "ردِ مرکزیت" (Decentering)، بارتھ کا "مشیانہ" (Readerly) اور "او بیانیہ" (Writerly) متن کے تصورات شامل ہیں جو کہ مختلف Block میں یکجا ہو کر متن کو تشکیل دیتے ہیں۔ اور آخر کار برقیاتی انسلاک کے ساتھ ایک مقام پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔

"قبل متن" بنیادی طور پر بین المتنیت اور وسیع پیمانے پر متن کو مرکزیت نو سے ہمکنار کرتا ہے اور بصری سطح پر قاری کو متن کے "کیا" اور "کیسے" سے متعارف کرواکر اسے متن پر اختیار دے کر "آزادی" فراہم کرتا ہے کہ متن کو کس طور پر قرأت کیا جائے۔ یوں متن کی خود کاریت کسی طور پر قاری کے ہاتھوں میں آجاتی ہے لہٰذا مصنف یا مدیر سے انحراف کرتے ہوئے قاری اپنی روش کو خود چنتا ہے اور متن کی قرأت کرتا ہے۔

"قبل متن" (Hyper Text) کی اصطلاح ۱۹۶۰ء میں تھورڈو ایچ نیلسن (Theordor H. Nelson) نے استعمال کی جو کہ اصل میں برقیاتی متن کی ہیئت ہے جو کہ طباعت کے مزاج کو اطلاعاتی اور تکنیکی بنیادوں پر ریڈیکل اطلاقیات سے باہم کرتی ہے، جس سے نیلسن "غیر ترتیبی" یا غیر نتائجی (Non-Sequnitial) مراد لیتے ہیں۔ ان کے خیال میں متن اور اس کی شاخیں قاری کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی پسند سے متن کا انتخاب کرے جو

کہ پردے (اسکرین، مونیٹر) پر نمودار ہو کر قاری کو مختلف راہوں پر بھی ڈال دیتا ہے۔ متن بلاک (Block) سے ترتیب پاتا ہے جس کے لیے بارتھ نے Lexia کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ متن کو اسکرین پر برقیاتی نقطے ایک دوسرے سے باہم کر کے متن کی صورت دیتے ہیں۔ "قبل متن" بصری اطلاعات، نظریے سے پہلے متن کے تمام حصے زبانی مخاطبے سے تمثال (امیج) نقشوں، شکل بند سہ اور آوازوں کو زبانی فقروں کی صورت میں استعمال کرتے ہیں۔ "قبل متن" بصری اور غیر گفتاری زبان کے درمیان رابطے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ تھیوڈر نیلس نے اسے "ادبی میکانیت" کا نظریہ بھی کہا۔

"قبل متن" کے تنقیدی نظریے پر ردِ تشکیلی اور پس ساختیاتی نقاد نیلسن کے علاوہ دریدا، فوکو، بارتھ اور انڈریس وین ڈیم (Andries Vand Dam) نے صراحت لکھا ہے۔ بارتھ نے S/Z میں لکھا ہے کہ آئیڈیل متنیت اصل میں حاسبی (کمپیوٹر) "قبل متن" سے مشابہ ہے۔ متن Block کی صورت میں ترتیب پا کر الفاظ (Image) کو تشکیل دیتا ہے اور متن کی کئی سمتوں اور جہات کا انکشاف کرتا ہے جو کہ زنجیر کی طرح سے ایک دوسرے سے باہم ہوتے ہیں۔ بارتھ نے اس سلسلے میں Link, Node, Network, Web اور Rat کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔

"قبل متن" کا شعور اطلاقی قواعدیات کی ایک شاخ ہے جو کہ تحریر اور Teleeport کے علم کو سائبر اسپیس (Cyber Space) میں منتقل کر کے زبان کو مشین (کمپیوٹر) سے متعارف کراتی ہے۔ یہ بین العمل اور رابطہ زبان اور بیانیہ ماحول کو تشکیل دے کر اسے بصری حقیقت کے آفاق میں داخل کر دیتی ہے۔ اس مقام پر قبل متن کا شعور، تصور کا کریکٹر یا یہ واقعاتی ہیئت میں تبدیل ہو کر اجتماعی ذات کو تشکیل دیتی ہے اور نیٹ ورث (Net Work) مخاطبے (ڈسکورس) کے امکانات کو تلاش کیا جاتا ہے جو کہ بعض دفعہ بلا ضرورت یا غلطی سے متن کی قرأت میں مخاطبے کا حصہ تصور کر لیے جاتے ہیں۔

برقیاتی قبل متن کے نظریے نے تحریرات کے سلسلے میں ثقافت، قوت اور فرد کے کئی فکری مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ یہ عناصر دیگر لسانیاتی نظریوں میں فطری میکانیت کی ہیئت میں اہم تصور کیے گئے ہیں جو کہ ردِ تشکیلیت کے ٹیکنالوجیکل نظریات میں پیش پیش

ہونے کے ساتھ ساتھ اس عمیق فکری حرکیات کے سبب معنویت سے مفاہیم کی نئی جمالیات کو خلق کرتے ہیں کیونکہ "قبل متن" کا لسانی اور فنی نظریہ ادب و فکر کے ثقافتی قیاسات کو "ردِ مرکزیت" کے علم سے گذر کر قرأت، تحریر، ادبیانہ وصف اور تخلیقیت کے نئے مباحث کا نئے سرے سے آغاز کرتے ہوئے متنی سطح پر ماضی اور حال کی زمانی کیفیات پر بھی نظرِ ثانی (Re-vision) کرتے ہیں۔

"قبل متن" کے نظریے پر کئی کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ چند اہم تحریروں کی فہرست درج ہے:

(1) Willaim Ivins. M, Print And Visual Communication (1969)
(2) Therdor H. Helson, Literary Machinies (1981)
(3) George L. Ullmer, Applied Grammatology (1985)
(4) Edward Barrett (ed), Text, Context And Hyper Text (1988)
(5) Jakob Nielsen, "Trip Report: Hyper, Hyper" (Paper) (1989)
(6) George P. Landow, Hyper Text (1992)

عمل کلام کا نظریہ (Speech Act Theory)

زبان کا عملیاتی نظریہ ہے، جس کے ابتدائی خدوخال وتگنسٹائن نے واضح کیے۔ اس نظریے کے تحت لسانی ساخت ہمیشہ نہیں ہوتی لیکن اسے ایسے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ لوگ جب زبان بولتے ہیں تو وہ یہ تصور کر لیتے ہیں کہ زبان کا نظام پیچیدہ اصول سے ترتیب پاتا ہے اور خصوصی معنی لہجے سے سیاق میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کارکردگی میں "زبان" کبھی بھی علامت، لفظ یا فقرے کی تشکیل نہیں کرتی۔

برطانوی فلسفی جان آسٹن (John Austin) (۱۹۱۱ء-۱۹۶۰ء) کی کتاب How To Do Things With Words (۱۹۶۲ء) میں اس نظریے کی تشریح ملتی ہے۔ اس نظریے کو بعد میں دو لسانی فلسفیوں جان سیرل (John Searle) اور ایچ بی گریس (H.B. Grice) نے مزید ارتقائی شکل دی۔

آسٹن کا عمل کلام کا نظریہ براہ راست قدامت پسندانہ رجحانات اور فلسفوں سے کلی طور پر انحراف تھا۔ آسٹن کے عمل کلام کے نظریے کے اہم نکات یہ ہیں:

(۱) ہر جملے کا علیحدہ تجزیہ کیا جائے۔ مخاطبے کا سیاق تجزیہ سے حاصل کیا جائے اور فقروں کے لہجے کے احوال اخذ کیا جائے۔

(۲) منطقی محاصرے کے بعد صرف معیاری فقروں کی اقسام بیان کر دی جائیں جو اس صورت حال کو واضح کر دیں گی یا اس کے صحیح یا غلط ہونے کی شہادت مل جائے گی۔

جان سیریل نے آسٹن کے اس نظریے کو توسیع دیتے ہوئے لسان کے ان دعووں کو غلط ثابت کیا اور احساس دلایا کہ ہم کلی لسان کو مکمل طور پر لسانی سیاق میں لیتے ہیں یہاں تک کہ اداروں کی صورت حال بھی لسانیات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ تحریری اور گفتاری زبان تین نکات کی تقلید کرتی ہیں اور اس عمل میں بعض دفعہ چار امتیازی عناصر تکلم کے عمل میں ظاہر ہوتے ہیں:

(۱) ہمارے لہجے میں فقرہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ آسٹن اس عمل کو "locution" کہتے ہیں۔

(۲) ہم معروض کا حوالہ دیتے ہیں اور بعض معروض کے متعلق پیش گوئیاں بھی کرتے ہیں۔

(۳) Illocutionary Act کو سرانجام دیتے ہیں۔

(۴) اور کبھی کبھار Perlocutionary Act کی بھی تکمیل کرتے ہیں۔

Illocutionary Act اصل میں locution سے ہی انجام پاتا ہے۔ اس کا روایتی فلسفے اور منطق پر خاصا زور رہا ہے جس نے عمل کلام کے نظریے پر اپنے گہرے اثرات ثبت کئے ہیں۔ ان میں بنیادی مباحث، سوالات، اشاروں، قول، مدح، مشکوریت اور فہمائش وغیرہ پر ہوتی ہے۔

فقرے قواعدی ہیئت میں الفاظ حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً "میں تم کو کل چھوڑ آؤں گا۔" ممکن ہے اس فقرے میں کوئی خاص زبانی یا گفتاری اور سیاق کی صورت حال Illocutionary Force میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یہ فقرہ "وعدہ" بھی ہو سکتا ہے اور اسے "دھمکی" بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ Illocutionary Act میں بیان یا یقین کسوٹی ہوتی ہے اور اس کے سچے اور جھوٹے ہونے سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن اس بات کی اہمیت ضرور ہے کہ آیا فقرہ کلام و گفتار کی صورت حال ترسیل کے عمل سے گذر کر اپنا وظیفہ انجام دینے میں کامیاب رہی ہے کہ نہیں۔ آسٹن نے اس کے لئے "انبساطیت" (Felicitously) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

انبساطیت کی کارکردگی Illocutionary Act پر انحصار کرتے ہوئے اس عمل کی صحیح صورت حال کو بھی واضح کرتی ہے جس میں کئی افعال در آتے ہیں۔ یہ صورت حال ضمنی لسانیات اور معاشرے (اداروں) کے روایتی پہلو ہوتے ہیں جو نہایت ہی پیچیدگی کے ساتھ زبان کی تشریح کرتے ہوئے Illocutionary Act کی کامیاب کارکردگی کا یقین دلاتے ہیں۔ جیسے "میں کل تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس ملاقات کا انحصار اس بات پر ہے کہ یہ ملاقات خصوصی حالات میں ہو رہی ہے۔ اس میں خوشگوار فضا بھی محسوس کی جا سکتی ہے اور یہ فقرہ "دھمکی" کے معنوں میں بھی لیا جا سکتا ہے۔

آسٹن نے اپنی کتاب میں Locutions کی دو اقسام بتائی ہیں:

(۱) Constatives: اس قسم کے جملے حقیقت یا معاملات کے سلسلے میں "سچ" یا "جھوٹ" کا فیصلہ کرتے ہیں۔

(۲) کارکردگانہ Perormative: فقروں کا عمل، سوالات، وعدوں اور دعاؤں سے تکمیل پاتا ہے۔

Constatives کی کارکردگی اصل میں Illocutionary Force ہے جس کو آسٹن Explicit Performative کہتے ہیں۔ Illocutionary Act کا عمل ذہن کو متاثر کرتا ہے اور گہرائیوں میں اتر کر Peolocuhonary Act کا انکشاف کرتا ہے۔ کبھی کبھار زبان بولنے والا زبان کا غیر شعوری طور پر انحصار کرتا ہے جو کہ اس کے شعور سے متعلق نہیں ہوتی۔

۱۹۷۰ء کے بعد عمل تکلم کے نظریے نے ادب کی عملی تنقید پر مختلف انداز میں اثر ڈالا۔ بالخصوص براہ راست ادبی عمل پر تجزیاتی مخاطبے کی تکنیک کا اطلاق کیا گیا۔ تکلم کے عنصر کو ترتیب وار انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے غیر گفتاری مظہر کے فریم ورک کو شناخت کیا گیا۔ یوں تکلم کے نظریے کے تحت غیر ترتیب تکلم کو اہل قاری اور نقاد اپنی تیز فہمی کے سبب تسخیر کر لیتا ہے۔

عمل تکلم کا نظریہ ریڈیکل حوالے سے ادب کے نظریے اور بالخصوص نثر کے بیانیہ نظریے میں کئی نظریاتی ماڈل کو تشکیل دے چکا ہے جس میں مصنف اور بیانیہ کی صورت گری کرتا ہے اور اہل قاری مصنف کی عام وابستگی سے دور رہ کر اس صداقت کو پا لینے کی کوشش کرتا ہے جو فکشن کے لہجے کے فریم میں جڑی ہوتی ہے اور متبادل کے طور پر عمل کلام کے نظریے

میں نقال تنقید یا نظریے کے تصور کو بھی ابھارتی ہے۔ زبانی رابطے میں عمل متن ہوتے ہیں اور لہجے انسانی سطح پر تفاعل کے عمل سے گذرتا ہے بعض دفعہ "نقال مخاطبہ" بھی ابھرتا ہے، جس میں ذاتی محسوسات کو بیان کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ تخلیق کار کا عمل قاری کا تجزیہ اور ادبی تاریخ کا واقعہ تکلم کے نظریے کو معنویت سے ہمکنار کرتا ہے۔

دریدا نے "ردِّ تشکیل" اور "عمل کلام کے نظریے" کے مابین مفید مکالمہ کیا ہے۔ فل مین (Felman) نے ڈان جان (Don Joun) کا تجزیہ اپنی ناتجربہ کاری کے سبب "باطل" انداز میں کیا۔ اس نوع کا مکالمہ عمل کلام کے نظریے اور معاشرتی نقادوں کے درمیان بھی رہا جو کہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ اس کی وابستگی تصوراتی زبان سے ہے جو معروض اور تجرید، موضوع اور رواجی کلام کو ثقافتی اور سیاسی احوال میں تبدیل کردیتی ہے۔

عمل کلام کا نظریہ بذات خود سیاق کا نظریہ ہے نہ کہ مجرد طور پر سیاق سے الگ کوئی ہیئت ہے۔ سیریل، اسر (Iser)، ہومین (Ohmann) اور پرٹ (Pratt) اس بات پر متفق ہیں کہ فکشن کا عمل کلام مخصوص قسم کے Illocutionary Force کو متعارف کراتا ہے اور پھر ادب اور انفرادی اصناف کلام کے رواجی ضوابط کے تحت اپنی ہیئت کی تشکیل خود ہی کرتے ہیں۔

عمل تکلم کے نظریے کے سلسلے میں یہ تحریریں معتبر جانی گئیں:

(1) John R. Sezarle, Speech Acts: an Essay In The Philosophy Of Language (1970)

(2) H. P. Grice, "Logic And Conversation" In Syntax And Semantics. 3 (1975)

(3) Richard Ohmann, "Speech Acts And The Definition Of Literature." Philosophy And Phietoric 4 (1971)

(4) Charless Altieri, "The Poem As Act" Iowa Review 6 (1975)

(5) John R. Searle "The Logical Status Of Fictional Discourse" In Expression And Meaning (1979)

(6) Mary Louise Pratt, "Toward A Speech Act Theory Of Literary Dixcourse" 1977)

(7) S. Lanser, "The Narrative Act" (1981)

(8) S. Felman, "The Literary Speech Act" (1983)

(9) S. Petrey, Speech Acts And Literary Theory" (1990)

کوئر نظریہ (Queer Thoery)

کوئر نظریے کا اردو میں ابھی تک کوئی ترجمہ دستیاب نہیں۔ انگریزی لغات میں اس کے معنی "دوسرے سے مختلف" کے بیان کئے گئے ہیں۔ کہیں لکھا ہے کہ "کوئر" (Queer) ایک عامیانہ لفظ ہے جس کے معنی "ہم جنس" کے ہیں۔ بالخصوص یہ اصطلاح مردوں کے درمیان جنسی تعلقات کی نوعیات کو بیان کرتی ہے۔ جبکہ پاپولر آکسفورڈ ڈکشنری میں "کوئر" کا ترجمہ "عجیب طرفہ" اور "نادار" کیا گیا ہے لہٰذا ہم انگریزی لفظ Queer پر ہی اکتفا کریں گے۔

کوئر جدید ادبی معاشرتی تنقید اور نظریے کا حاشیائی رویہ ہے جس میں فکری رویے اور متنوع تصورات حتمی اور متعین نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی مظہر کا اچھا یا برا پہلو پیش نظر ہوتا ہے۔ ریڈیکل سطح پر اسے فکری اور عقلی تحدیدات سے بھی مبرا تصور کیا گیا ہے۔ ان تفاعلی اور تجزیاتی مطالعوں کی تشکیل میں مرکزی مباحث اس نکتے پر ہی ہوتی ہے کہ ہم جنسیت اور فطری جنسیت (Hetero Sexual) ایک نارمل اور فطری رویہ ہے۔

اس سلسلے میں ایوا سیڈوک (Evasedwick) اور جیوڈتھ بٹلر (Udth Butler) کے کوئر نظریے نے جنسیاتی اور ثقافتی تشکیل سازی کے کئی فکری سوالات اٹھاتے ہوئے ہم شہوت کار (Homoerotic) تعلقات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جبکہ تانیثیت پر مکالمہ کرنے سے قبل کوئر مطالعے اور مختلف نسلی مطالعوں نے مناجیات، فکری قوت اور اس کی معاشرتی تحریک سے منسلک دیگر پہلوؤں سے علیحدہ ہو کر ان کی قابل عمل حکمت عملیوں اور نظریات پر خاصی عرق ریزی کی۔

(Peromative) کا تاریخی عنصر جدید تنقیدی نظریے میں "انجام دہی" کے صنفی اور جنسی رویے کو روشناس کروانے کا سبب بنا اسی کے بطن سے تانیثی تحریک برپا ہو کر "گے اور لزبن" کی مباحث تنقیدی نظریات تک پہنچی۔

اس تحریک کی فکری مؤید امریکی فلسفی خاتون جیوڈتھ بٹلر ہیں۔ انھوں نے نویں دہائی میں اپنی تین کتابوں میں کوئر نظریے کی تفہیم و تشریح کی جو کوئر نظریے کی مباحث کا مبدا بھی بنا۔

(1) Gender Trouble: Feminism And The Subversion of Identity (1990)

(2) Bodies That Matter: On The Discursive Limits of Sex (1993)

(3) Excitable Speech: A Politics Of Speech Act (1997)

ان تینوں کتابوں نے امریکہ کی ادبی فضا میں نئے ثقافتی مطالعوں کی بھی بنا ڈالی جو تانیثی تحریک سے ہوتی ہوئی "گے اور لزبن" مطالعوں کا احاطہ کرتی تھیں۔ کوئر نظریہ "گے اور لزبن" مطالعوں کے آدن گار تصور سے اخذ کیا گیا ہے جس کے ڈانڈے سیاسی تحریکوں سے بھی ملتے ہیں۔ ان رویوں میں "گے آزادی" (Gay Liberation) کا نعرہ سب سے اہم ہے۔ کوئر (Queer) کی اصطلاح کو جب رواج ہوا تو ہم جنسیت مخالف طبقے نے اسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اصطلاح عام ہوتی چلی گئی۔ کوئر نظریے میں صنفی جبر کے حوالے سے متن، موضوع، شناخت کے مسئلے پر بھی لکھا گیا۔ رینے جراڑ (Rene Girard) اور ایوا سیڈوک کا کہنا ہے کہ "خواہش" شناخت اور رقابت سے تشکیل پاتی ہے۔ فطری جنسی عمل میں مشغول مرد سے جنسی خواہش اسے کسی "ہیرو" کی شناخت کے بعد دریافت ہوتی ہے جس کے ساتھ رقابت کی مصنوعی خواہش ابھرتی ہے۔ "ہیرو" اس مرد کا آدرش بھی ہو سکتا ہے۔ فیٹیس کے سراپے سے ذہنی اور قلبی تسکین میسر آتی ہے۔

○○

گیارھواں باب

دبستان

دبستان

باختن دبستان (Bakhtin School)

باختن دبستان نے ادب کو معاشرتی مظہر کے حوالے سے مطالعہ کیا، اس کے ارتقائی سفر میں کئی دوسرے عوامل بھی پوشیدہ تھے۔ روسی ہیئت پسندی پر جب برے دن آئے تو اس دبستان نے ادبی تنقید اور تجزیہ نگاری میں ایسی راہ نکالی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میخائل باختن نے اپنے لسانی نظریے کو بیان کرتے ہوئے اپنی اکثر تحریروں میں مختلف اقتدار نظام کو پیش کیا۔ انھوں نے تقریباً ہر معاشرتی اور فکری مظہر پر گہرائی سے سوچتے ہوئے روس میں پروان چڑھنے والی اپاہج فکری روش سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا جہاں فکر ایک مخصوص گروہ کی جاگیر بن کے رہ گئی تھی، جس سے فکری جمود اور جبر کا استبداد جنم لیتا تھا۔ اس دبستان نے ادبی متن کے لسانی حرکی تناظر کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور احساس دلوایا کہ ادب براہ راست معاشرتی قوتوں کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن باختن دبستان نے کسی نہ کسی طور پر ہیئت پسندانہ حوالے سے ادبی ساخت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا اور اس بات کو سمجھنے کی بھی کوشش کی کہ زبان میں حرکی اور "متحرک" نوعیت "ماہیت" کی ہوتی ہے جو تخلیقی ادب کی روایت میں اظہار کی نئی جہات کا انکشاف کرتی ہے مگر اس بات پر کبھی زور نہیں دیا گیا کہ متن معاشرے یا طبقات میں دلچسپی لیتا ہے۔ بعض دفعہ زبان اقتدار کو انتشار سے بھی دوچار کر دیتی ہے اور زبان کے کسی متبادل، اور اس کے لئے آزادانہ اور خود مختارانہ راہیں کھولتی ہے۔ باختن نے سویت ساختیات کے ایجنڈے کو سرے سے رد کر دیا۔ انھوں نے "باغی" کا تجزیہ کرتے ہوئے Rabelis And His World (1968)

میں فرانسیسی تاریخی ماڈل کو زمانی احوال سے جوڑ دیا اور یہ مطالعے بعد میں فیشن ایبل نوعیت کے بھی ہوگئے۔ انھوں نے لب و لہجے کی آوازوں کو ترتیب دیتے ہوئے تاریخی اطلاعات کو ابلاغ کی قرات کی جانب موڑ دیا۔ وہ اسٹالن کے سخت مخالف تھے لیکن اسٹالن کی حکومت ان پر پابندیاں اس سبب عائد نہ کرسکی کہ باختن کے پاس تحریر، زبان اور اظہار کی متبادل راہیں موجود تھیں۔ باختن دبستان سے پاویل میڈوڈیو (Pavel Medvendev) اور ولنٹنیائن وولوشینیف (Valentin Voloshinov) بھی متعلق رہے۔ باختن کے فکری محرکات وہی تھے جو ہیئت پسندی کے تھے جس میں ادب پارے کے لسانی سانچے سے بحث کی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ زبان کے مارکسی عقائد کا بھی دم بھرتے تھے اور زبان کو آئیڈیالوجی سے علیحدہ نہ کرسکے یوں ادبی حسیات اور جمالیات، معاشرتی اور معاشی جبر کی شکل میں نظریات کی دنیا آباد کرلیتی ہے۔ یہ رسائی کس طور پر روایتی مارکسی قیاسات اور نظریات سے جدا ہو کر کسی نہ کسی طور پر ذہنی مظاہر کو جنم دیتے ہیں۔ اس مقام پر مادیت اور معیشت کا ذیلی ساختیہ ابھرتا ہے۔ باختن دبستان اس بات کا بھی اقرار کرتا ہے کہ آئیڈیالوجی کو کسی نہ کسی طور پر لسانی اظہار سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ وولوشینیف کے خیال میں شعور بذات خود ایک ایسی پائدار حقیقت بن جاتی ہے جہاں مادی Embodiment اشارے، زبان معاشرتی سطح پر نشانیات کا نظام مرتب کرتی ہے جو بذات خود مادی حقیقت ہوتی ہے۔

باختن دبستان کی ابتدا اس وقت ہوئی جب روسی ہیئت پسندی اپنے عروج پر تھی۔ کوئی یہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ یہ شعر و ادب کے لئے خوش آئند بات ہے جس کا تعلق غیر آزمائشی تاثر پسندی سے ہے یا یہ محض خشک فلسفہ ہے۔ ہیئت پسندوں نے ادب و لسان کے فنی حوالے سے جو یک کلاسے کی تشکیلات کیں اس سے کہیں زیادہ اہم انجادرجے کی تدابیر باختن نے نئے تصورات کے اضافے کے ساتھ پیش کیں وہ شروع ہی سے ہیئت پسندوں کے دو بنیادی مفروضات سے اختلاف کرتے تھے۔

(۱) متن کا انعکاس، جو ادبی عمل کو فن (کرافٹ) کہتا ہے

(۲) مطالعے میں تاریخی عوامل کو شامل نہ کرنا

باختن نے ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کے شعری مسائل (۱۹۲۹ء) پر معرکہ آرا کتاب

سے پہلے صوتیات کا تجزیہ کیا پھر اس کی تفاعلی لسانیات پر توجہ کی کیونکہ زبان کا تفاعل خارجی اور غیر لسانی عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ ترانکا کا خیال تھا کہ ساختیات سے منفرد فکری سرگرمی ظاہر ہو سکتی ہے کیونکہ یہ زبان کے وصف کا مطالعہ کرنے کے لئے بہترین پیمانہ ہے جو لسان کے مختلف حصوں میں رابطہ پیدا کر کے انھیں تجزیہ کرتے ہوئے ان کی درجہ بندی بھی کرتا ہے۔ ساختیاتی فکر پراگ دبستان (سرکل) میں خصوصی دلچسپی لیتی ہے لیکن اس کے ایجنڈے سے اسے بحث نہیں ہوتی یہ دبستان تاریخی اور زمانی سطح پر فکری لسانیات کے حوالے سے کوئی بحث نہیں چھیڑتا۔ فرنس برمینو (Brentatc) نے اس تحریک سے زبردست اثر قبول کرتے ہوئے جینی اور بیانیہ نفسیات میں فرق کو واضح کیا جو کہ اہل پراگ کے لئے ایک عرصے سے کٹھن مسئلہ تھا۔ پراگ دبستان نے برمینو کے طریقہ کار کی تکنیک سے ہی اپنے مطالعوں کی بنیاد رکھی حالانکہ اس مکتب نے شاید ہی لسانی تفتیش میں نوعیات کو شامل کیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں اس دبستان کے رکن تروبکی نے صوتیاتی مطالعے شروع کئے جسے Language Alliance کے نام سے پکارا گیا اور وہ Spechbundless کے نام سے بھی معروف ہوئے۔ جہاں پر صوتیات زبان کے مشترکہ خدوخال کو واضح کرتے ہوئے اسے تاریخی احوال سے غیر متعلق قرار دیا گیا۔ پراگ سرکل میں رومن جیکب سن کی تحقیق نے فرانسیسی ساختیات پر گہرا اثر ڈالا جو کسی طور پر نئے سائنسی تصورات سے کم نہ تھا۔

پراگ دبستان کی شروعات ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں کارل یونیورسٹی پراگ سے ہوتی ہے جہاں ایک نشست میں ساختیہ اور اس کے باطنی مظاہر پر نئے زاویوں پر نگاہ ڈالی گئی۔ اس اجلاس میں لسانیات کے جرمن طالب علم بیکر نے "یورپی زبانوں کی روح" کے موضوع پر خطاب کیا لیکن بعد میں اس یونیورسٹی سے باہر نجی محفلوں اور قہوہ خانوں میں منعقد ہوئے، جس میں سابقہ ماسکو سرکل سے متعلق اہل فکر بھی شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی سالویک کانفرنس پراگ میں منعقد ہوئی۔ بعد ازاں جیکب سن نے ساسر کے نظریات کو نئے معنی دیئے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کی کتاب "چیک شاعری" شائع ہو چکی تھی جسے میکسم گورکی کی سرپرستی میں شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں شاعرانہ حوالے سے شاعرانہ مظاہر اور شعر کی لفظی معنویت سے بحث کی گئی تھی۔ جیکب سن اور تنجانوف نے "Nuwylef" نامی جریدے میں اس

لکھی جس میں ان دونوں کے ناولوں کے تقابلی تجزیے کے بعد نہایت جرأت کے ساتھ ان تضادات کو واضح کیا جو ان ناول نگاروں کے یہاں نظر آتے ہیں کیونکہ تحریر میں جو بھی فکر و نظریات ہوتے ہیں وہ ادیب کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوتے ہیں۔ ادیب اپنے مزاج اور رویوں سے اس کو اپنے مزاج کے مطابق تشکیل دے پاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادیب کے یہ فکری تضادات فکشن کے فردیاتی منظر کو ناول کا رنگ دیتے ہیں۔ دوستوئسکی نے نئے یک کلامیہ ہیئت (Polyphinic) کو متعارف کروایا جو وحدت کا انکشاف کرتی ہے جو کئی اظہار کے نکات کو ناول کے مختلف کرداروں کی زبان سے ادا کرواتے ہیں۔ ناول نگار کا بیان شعری مخاطبہ ہوتا ہے جہاں شعوری طور پر بہت سے کردار نہ ناول نگار کے ذہن میں مدغم ہوتے ہیں اور نہ خیال کا کوئی نکتہ انھیں درپیش ہوتا ہے۔ باختن کی تحریریں کلاسیک، قرونِ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کی ثقافتی آزادی تہذیبی یک کلامیہ اور ہیئت کا بھی پتہ لگاتی ہیں۔ باختن اور ہیئت پسند دبستانوں نے لسانیات پر زور دیا لیکن باختن زبان کو ساسر کے لسانی ماڈل کے برعکس دیکھتے ہیں اور یہ دبستان بارتھ اور دیگر ماہر ساختیات کی طرح ادیب کے متعلق ریڈیکل سوالات نہیں اٹھاتی لیکن بارتھ اور باختن دونوں کو ہی اہم گردانتے ہیں جو ان کے معاشرتی اور نظریاتی ذہن سے پیدا ہوتی ہیں۔

باختن دبستان کے اثرات پس ساختیات پر پڑے۔ جولیا کرسٹیوا نے باختن کے نظریات کے زیرِ اثر رہ کر ہی "بین المتنیت" کا نظریہ پیش کیا اور ساختیاتی علوم میں متن کے تصورات کو وسعت دی۔ ۱۹۶۷ء میں "ٹیل کویل" (Telquel) گروپ نے باختن کے نظریات پر پُرمغز مباحث کا آغاز کیا اور ترتو (Tartu) کے نشانیاتی دبستان میں اس دبستان کی بازگشت سنی گئی۔ لاٹ مین (Lotman) نے بھی باختن دبستان کے تحت رمزی تصورات کو نئی معنویت سے آشکار کیا۔

پراگ کا دبستان (The Prague School)

۱۹۲۶ء میں رومن جیکب سن نے پراگ دبستان کو منظم کیا۔ ان کے رفقا میں ولیم میتھیوز، باشلف ہاورنک، جین مکوروسکی اور بھول ترانکا کے نام لئے جاتے ہیں۔ اس دبستان نے سب

بات کا اظہار کیا کہ ہم ادب اور لسانی مسئلوں پر تحقیقات دو وجہوں کی بنا پر کرتے ہیں:

(۱) ہیئت پسندانہ عقائد سے باہر نکلا جائے

(۲) تجانوف کے ادب اور معاشرتی تشخص کے نتائج پر توجہ دی جائے

ولیم میتھوز نے پراگ دبستان کو Work Sybiosis کہا جبکہ ٹروپ میڈ سکی کا کہنا ہے کہ یہ محققین اور اسلوبیاتی وحدت کی مشترکہ کامیابی ہے جس نے اصولوں کی رہنمائی کی۔ چیک ماہر جمالیات اور فلسفی جین مکورووسکی نے ساختیات پر تجربی معطیات کے جبر کو رد کرتے ہوئے اس بات کا احاطہ کیا کہ تجربی معطیات صرف تحقیقی طریقہ کار میں ہی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ ساختیات، نفسیات، لسانیات، ادبی نظریے، تاریخی نظریے، فنون لطیفہ، حیاتیات اور عمرانیات سے اصول تو لے سکتی ہے لیکن تنقید کا من مانا رویہ ساختیات کے لئے زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ ۱۹۲۸ء میں جیکب سن اور تجانوف نے معاشرتی اور جمالیاتی تصورات کو "نظام کے نظام" میں سمو دیا۔ جین مکورووسکی نے لسانی اشاروں کے نئے شعور کی نئی حسیات سے پردہ اٹھاتے ہوئے ادب کو معاشرتی سیاق میں پرکھا۔ شکلوروسکی نے ساختیات کے موضوع کو طریقہ کار سے متعارف کروایا (جس کا دعویٰ ہیئت پسندی بھی کرتی تھی) جس سے مستقبلیت کے آون گار تصور کی بنیاد پڑی اور روسی و اطالوی مستقبل پسند روسی ہیئت پسندی کے ہم نوا تھے جو جنگ عظیم اوّل کے بورژوا انحطاط پسند ثقافت سے دل برداشتہ تھے۔ فرانسیسی علامت پسندی سے بھی اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔ شکلوروسکی نے پوٹی بینا کے اس خیال سے شدید اختلاف کیا کہ "فن تمثال کے تصورات ہیں جو 'نامعلوم' کو گرفت میں لیتے ہیں۔" شکلوروسکی کا کہنا تھا کہ "فن نامعلوم کی تلاش نہیں وہ 'معلوم' سے تصورات اخذ کرتا ہے جو زندگی کی حسیات کو بغیر کسی سیاق کے بیان کرتا ہے۔ ۱۹۲۹ء کے بعد پراگ میں سیاسی اور معاشرتی جبر کی فضا سے بددل ہو کر پراگ دبستان سے متعلق کئی اہل فکر کوپن ہیگن، نیویارک، فرانس اور یورپ کے کئی دوسرے ممالک میں جا بسے۔

ساختیات کی اسلوبیاتی اور فکری تسخیر میں پراگ مکتب اس لئے بھی معتبر جانا گیا کہ اس نے صوتیات کی اکائیوں کا سراغ لگایا۔ خاص طور پر امریکہ میں "ییل دبستان" برنارڈ بلواچ (جنہیں بلوم فیلڈ کا شاگرد بھی کہا جاتا ہے) نے صوتیات کے میدان میں بڑا نام پیدا کیا۔

فرانسیسی نقاد اندرے میرنٹ نے زبان کی صوتیاتی ساخت پر کام کیا۔ بلوم فیلڈ اور اسپائر کی صوتیاتی ساخت کی روایت کو سی ایف ہوکیٹ اور حرف نحو کے تصور کو جے ایچ گرین نے نئے معنی پہنائے۔ اسپائر کے شاگرد کینیت پک نے انجیل کے حوالے سے کئی ساختی نمونوں کے مطالعے کئے۔ زیلنگ ہیرس نے لسانی ساختیات کو نئے معنی دیئے۔ امریکہ میں نوعم چامسکی نے قواعدی تحقیقات سے اپنے کارہائے نمایاں کا احساس بھی دلوایا۔

جنیوا دبستان The Geneva School

جنیوا دبستان کا نام اس لیے پڑا کہ ساسر نے یونیورسٹی آف جنیوا میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۱ء تک لسانیات اور نشانیات پر خطبات دیئے تھے اور یہی خطبات بعد میں جدید لسانی ساختیاتی بحث کی بنیاد بنا۔ اس دبستان کا ایمیلی بنیاسٹ (Emile Benvniste) اور گریماز پر گہرا اثر ہے۔ جنیوا دبستان پر ساسر کے نظریات کا گہرا اثر رہا ہے جس میں حیاتیاتی عوامل کو لسانی مبدا اقرار دیا گیا ہے کیونکہ انیسویں صدی میں ڈارون کے حیاتیاتی ماڈل نے کئی نئی سائنسوں کی بنیاد رکھیں۔ (جس میں عمرانیات، نفسیات اور لسانیات بھی شامل ہیں) کیونکہ ارتقائی تصورات کی آگہی کے لئے بین السطور میں یکسانیت کی معطیات سرگرم عمل ہوتی ہیں جیسا کہ برنتانو (Brentano) نے قواعدیاتی نظام اور معنی کے درمیان احتیاطی رشتوں کا سراغ لگایا جبکہ ساسر کے یہاں لسانی نقشہ بندی معنی اور نظام کے تحت ہی ممکن ہو پاتی ہے۔ کوئی پچاس سال بعد ژان پی ژے (Piaget) نے نظام کی نقشہ بندی کی اہمیت کو اُجاگر کیا جو کہ نفسیاتی بندشوں کے سامنے اپنے عمل کا آغاز کرتا تھا جس میں زبان کا ساختیہ جنم لے کر طبقے کی گفتار کا شعور بن جاتا ہے جو اصل میں تکلم (Parole) اور قواعدیاتی نظام کا فرق کرتا ہے۔ فرد واحد لسانی نظام کے تحت معنویت کو متعین کرتا ہے لیکن نئی قواعدیاتی لسانیات نے انیسویں صدی کی تاریخی لسانیات کے تصور سے شدید اختلاف کیا لہٰذا جنیوا دبستان نے غیر وقتی (Diachronic) اور ہم وقتی (Synchronic) عناصر کو لسانی حوالے سے ایک دوسرے سے ممیز بھی کیا۔ ساسر کے خطبات میں تمام کا تمام زور زبان کی زمانی حوالے سے تھا۔ اسی دوران ماہر صوتیات کازان (Kazan) جین بوڈین ڈی کورٹنی (Jan Boudouin de-Courtenay) نے نئی قواعدیات کی مروجہ

فکری لہر سے علیحدہ ہوتے ہوئے صوتیات کے مقابل میں قواعدیاتی اور لغوی نظام کی زبان کو پیش کیا جبکہ فریڈرک جیمسن کا کہنا ہے کہ "ان سب کو دوبارہ ایک ساتھ ہونا پڑے گا۔"

ساسر کے "کورس" میں لسانیات کی بنیاد "نشانیات" کو قرار دیا گیا ہے جو زمان کا ساختیہ تشکیل دیتی ہے لیکن بعد میں غیر مطبوعہ لسانی مطالعوں میں جملے کی تبدیلی یا معنی پیدا کرنے کے لئے (Anagrams) کے رویوں کو ساسر نے لاطینی شعرا کے حوالے سے مطالعہ کرتے ہوئے "زبان" اور "نشان" کے روایتی تصور کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ ساسر نے نشانیات کی بنیاد پر زبان کو دو حصوں میں تقسیم و تبدیل کر دیا۔ ان کے یہاں اشارہ بھی اختیاطی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی کو "معنی نما" اور "تصور نما" میں تبدیل کر دیا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ جنیوا دبستان نے جدید ساختیات کی بنیاد کھڑی کرنے میں پہلی اینٹ رکھی جس میں لسانی حوالے میں پوشیدہ انسانی تصورات اور افکار کی بازیافت کی گئی۔ روزلیٹ نے متبادلیاتی اسلوب کو روشناس کراتے ہوئے ساختیے کے ذاتی متعلقات کو کم اور ہیئتی نکات کو زیادہ اہمیت دی جبکہ بلس مر نے نئی امریکی تنقید کے زیر اثر رو کر ہیئت کے ادراک کو نحویاتی ساختیے کے ساتھ منسلک کر دیا۔ لیکن ان لوگوں کی نظر میں متن کا جمال ذاتی شعور سے متعلق ہوتا ہے، متن میں اگر معروضی نمونوں کی تعداد بڑھ جائے تو متن کا حسن ماند پڑ جاتا ہے لہٰذا اس دبستان ادب کو "ثقافتی پیداوار" نہیں کہتا۔

جنیوا دبستان کے بنیاد گزاروں میں مارسل رے منڈ (Marcel Raymond) اور البرٹ بیوگیوں (Albert Beguin) کے نام لئے جاتے ہیں۔ مارسل رے منڈ، جین استاربنسکی (Starobinsk) (یہ پیشے کے اعتبار سے میڈیکل ڈاکٹر تھے) اور ژاں روسے (Rousset) کے شاگرد تھے۔ یہ سب یونیورسٹی آف جنیوا سے متعلق تھے۔ جارج پولٹ (Poulet) بلجیم میں پیدا ہوئے لیکن سوئیزرلینڈ میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہے۔ روسے براہ راست پولٹ سے متاثر تھے۔ بعد میں فرانسیسی نقاد ژاں پرس رچرڈ (Jean Pierre Richard) اور امریکی نقاد بلس مر (Miller) بھی ان سے متاثر رہے۔ پولٹ جنیوا مکتب کو "دبستان" نہیں کہتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ کوئی معتقدہ (Doctrine) اور (Manifesto) نہیں ہے بلکہ چند ہم خیال دوستوں کا حلقہ ہے جن کا ادب کے حوالے سے اپنا مخصوص تناظر ہے یا یہ کہہ لیں کہ یہ

وجودیاتی تاثریت کا نیٹ ورک (Net Work) ہے جس کا تعلق انفرادی فنکارانہ شعور سے منسلک کیا گیا۔ لیکن ان کی مناجیات ایک دوسرے سے مختلف ہیں جو ادب کے خیال (Idea) سے پھوٹتی ہیں جو کہ انسان کے غیر مساوی تاثراتی نظام میں بھی پوشیدہ ہے اور نشان کے بامعنی دعوٰی کو اپنے وجدان کی وساطت سے گرفت میں لیتے ہیں۔

جنیوا کے دبستان" نے ساسر کے لسانی نظریات سے گہری آگہی قبول کی جو کہ لسانیات مظہریاتی وجودیات میں داخل ہو جاتی ہے جن میں ہوسرل، جاپر، بچلارڈ (Bechelard) کی رومانی روایت بھی شامل ہے تو دوسری جانب اے۔ او۔ لووی جوئے (A.O.Lovejoy) اور برگساں کے زمانی نظریے سے بھی متعلق ہے جو کہ خالصتاً مکتبی تاریخیت (Academic Historism) ہے۔

"جنیوا کے دبستان" پر فرانسیسی زبان میں خاصا لکھا گیا ہے۔ پولٹ، روسے، رے منڈ، بلس مر، جے ساغن، ایس۔ لو آل (S. Lawall) اے لیونارڈ (A. Leonard) گروٹازر (Grotzer) نے کتابیں لکھی ہیں۔

کوپن ہیگن دبستان (The Copenhagen School)

لوئی ہیلم سلیو (Louis Hjelmslev) نے ساسر کے لسانی نظریات سے الگ ہو کر ساختیے کے سیاق کو جداگانہ انداز میں مطالعہ کیا۔ ساسر کے نظریات کے تحت ہی جیکب سن اور ہیئت پسندوں نے شعری خاکے تشکیل دیتے ہوئے نشانیات کا ابلاغی ماڈل وضع کیا جس میں منطقی قواعدیات یا الجبرا کو لازمی معنوں میں تصور کرتے ہوئے ساختیے کے طریقہ کار کے نظریات کو نئے انداز میں پیش کیا اور یہ بات واضح کر دی گئی کہ محض زبان ابلاغ کا آخری ماڈل نہیں ہوتا۔ نشانیات زیادہ سے زیادہ Glossematics کا نظریہ ہے۔ ۱۹۴۳ء میں ہیلم سلیو نے اصلیت (جوہر)، تاثر اور سیاق کے درمیان فرق واضح کرتے ہوئے بتایا کہ ذہنی ساختیہ طبعی جوہر کو ظاہر کرپاتا ہے جو تاثر کو ابلاغ کرنا چاہتا ہے۔ ہیلم سلیو کے افتراق نے Glossematics کے زاویۂ نگاہ کو وسعت دی کیونکہ یہ مطالعہ ہیئت اور تاثر، ہیئت اور سیاق کے مابین رشتوں کی بازیافت کا نام ہے۔ لہٰذا کوپن ہیگن کا دبستان بھی ہیئت پسندانہ دبستان کے قریب کہلایا

جس نے کڑے معنوں میں ہیئت کی لسانیات کو علمیات کی سمت پر ڈال دیا جو نشانیات کے علم پر قدرے حاوی ہو گیا۔ لہٰذا ہیلم سلیو کے لسانی نظام کی تجریدیت پر زور دیتے ہوئے اس بات کا احاطہ کیا گیا۔ صوتی یا تحریری مواد کے بغیر زبان کی کارکردگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

کوپن ہیگن کا دبستان تاریخی سوالات سے اجتناب برتتا ہے اور زمانی و تاریخی بحث سے بھی قدرے دور رہتا ہے کیونکہ یہ دو اصطلاحات (زمانی اور تاریخی) Glossematics کے تصور کو نظر انداز کرتی ہیں جس میں لسانی ساختیہ سکڑ کر علامتی اور الجبرائی نظام میں تبدیل ہو کر بنیادی طور پر تجریدی نوعیت کے ابلاغ کو جنم دیتی ہیں اور ان اصولوں کو نحوی اُفقی رشتوں (Syntagmatics) اور ان کی عمومیت (Paradigmatic) صوریت، نحو اور زمرے کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہیلم سلیو نے تحقیق کے لئے الجبرائی لسان سے مدد لی جو کہ ہیئت کے سیاق میں اس تاثر اور افتراق پر محیط تھا۔ اصل میں یہ افتراق زبان کے طریقہ کار کو بیان کرتا تھا۔

ییل دبستان (The Yale School)

ییل اسکول کے پس منظر میں ساسر کے یورپی نظریات کا بڑا عمل دخل ہے لیکن گریماز کی منطق نے تیز فہمی کے سبب مغرب کے لسانی ماحول اور تنقید میں نئے سوالات اٹھائے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہیئت پسندی اور ساختیات کو ہیئت یا ساختیے کی "محدودیت" میں نہیں رکھنا جانا چاہئے۔ ان کے خیالات نے Taxonomy اور بیانیہ کے تصورات کے تحت متن میں موجود نئے حقائق کا انکشاف کیا۔ ان نکات کو لیونارڈ بلوم فیلڈ (Leonard Bloom Field) کی معاونت نے مزید وسعت دی اور ییل دبستان کے تحت ان نئے رویوں پر مباحث شروع کی گئی جو کہ یارورڈ یونیورسٹی سے منسلک جیکب سن کے خیالات سے قدرے مختلف تھیں۔ گو بلوم فیلڈ کے ساختیات، شعریات اور دیگر ساختیاتی رویوں پر گریماز سے مختلف خیالات تھے لیکن بلوم فیلڈ نے اپنے نظریہ "تقسیماتی تجزیے" (Distributional Analysis) کی مدد سے ساختیات کے تصور کو نئی جہات سے آشنا کیا۔ بلوم فیلڈ نے اطلاقی بیوہاری (Behaverist) لسانی رسائی (Approach) کو اپناتے ہوئے اپنی کلاسیکی قواعدیاتی تربیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ساختیات کے کئی اطلاقی مسائل پر توجہ کی حالانکہ اس سے قبل امریکہ میں ہی فرینز بوس

(Franz Boss) نے امریکہ کے مقامی سرخ ہندیوں کے لسانی مطالعے کے بعد "باطنی منطق" کا نظریہ قائم کیا۔ پھر ایڈورڈ سپیر (Edward Sapir-1939) نے لسانی نمونوں کا نظریہ پیش کرتے ہوئے تقسیمی معیارات کے اصول وضع کئے جو مظہر کی شناخت کرنے میں مددگار ثابت ہوتے تھے۔ بلوم فیلڈ کا کہنا تھا کہ یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ جب بھی معنویت متعارف کرائی جاتی ہے اور فکری متعلقات جب بھی لسانی مطالعوں میں شامل کئے جاتے ہیں تو موضوعی معیارات کا اطلاق سائنسی اطلاق میں بگاڑ پیدا کرتا ہے لہٰذا انھوں نے اس سلسلے میں "فکر شکن" نظریے کا عندیہ دیتے ہوئے اس بات کا احاطہ کیا کہ لسانیات کو طبعی اور علم صوت (Acourtical) کی صورت میں مرکوز ہو جانا چاہئے کیونکہ اس عمل سے زبان کے مظہر کی پیائش اور تحقیق ممکن ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "لسان" (Language, 1933) میں زبان کے ان عناصر سے بحث کی جو لسانی مطالعوں میں شامل کئے جا سکتے تھے۔

بلوم فیلڈ کا نظریہ "تقسیماتی تجزیہ" اصل میں کسی دوسرے سیاق کی وحدت کی جانچ کے متبادل کا نظریہ ہے جو متن میں لازمی نوعیت کی ضروری تبدیلی کا سبب بنتے ہیں اور متبادل کے کئی درجوں کو تشکیل دیتے ہیں جو اصل میں زبان کے مطالعہ لفظ (Morphological) کے درجات خیال کئے جاتے ہیں جن میں Morpheme مختصر زبان کی ایسی وحدت ہوتی ہے جس کے اپنے معنی ہوتے ہیں۔ بلوم فیلڈ نے ساختیے کی درجہ بندی اس لئے کی کہ لسانی سطح پر زبان کی وحدت کے کئی بلند اور کمتر درجے ہوتے ہیں جو فونیم / اصوات (Phnemes) کے بنیادی اجزاء ہیں۔ بلوم فیلڈ نے نئی اصطلاح EME کو روشناس کراتے ہوئے بتایا کہ یہ تفاعلی کے سیاقی معیارات ہوتے ہیں (جس میں قواعد، نشان اور Tagmemes وغیرہ شامل ہیں) جس نے قواعدیاتی حوالے سے نحو کے نئے مطالعوں کو جنم دیا جو قواعدیاتی اور معنیاتی ساختیے اور جملوں میں آنے والے معمہ کا تجزیہ کرتا ہے۔

زیلن ہیرس (Zellin Harris) نے بلوم فیلڈ کے معنی کی ہیئت کے طریقہ عمل کا تجزیہ سکہ بند لسانی معروضیت کے ساتھ کیا۔ ان کی کتاب Methods in Structualal Linguistics (1951) میں بلوم فیلڈ کے Taxonomic مطالعوں کو پیش کرتے ہوئے اسے نئی معنویت دی گئی۔ ۱۹۵۰ء میں جیکب سن نے ہارورڈ یونیورسٹی میں پراگ سرکل اور فرانسیسی ماہر لسانیات

اندرے مارٹینڈ (Andre Mattinet) کو امریکی لسانیات سے متعارف کرایا۔ اس زمانے میں بلوم فیلڈ کے طریقہ کار کی رونمائی ییل یونیورسٹی میں ہو چکی تھی (یاد رہے کہ بلوم فیلڈ ۱۹۴۰-۴۷ء تک ییل یونیورسٹی میں تدریس اور تحقیق سے متعلق رہے) اسی دوران مارٹینڈ نے پراگ دبستان کے نظریات کو پس منظر میں رکھتے ہوئے "دوہرے صاف تلفظ" (Double Articulation) کا فونیم پیش کیا۔ یہ فونیم دو باہمی اختلافات کی مرکزیت کے رجحان کو واضح کرتا تھا جن میں ایک کا تعلق علم کی آواز سے تھا اور دوسرے کا تعلق ذہن سے متعلق تھا۔ امریکی بیوہاریوں (Behaviorist) رسائی اور پراگ دبستان کے درمیان اختلافی تناؤ معنی اور صوتیات کے مبادلے سے متعلق تھا جہاں ساختیاتی لسانی تاریخ اور اس کے اثرات تمام دنیا کی فکری برادری پر پڑے۔

نوعم چامسکی نے نظریاتی سطح پر بیوہاریت کی رسائی کو اپناتے ہوئے ان کا برقی یا مبادلیاتی قواعدیات کا نظریہ زبان اور معنویت کے نظریے کے درمیان تناؤ کم کرنے کا سبب بنا کیونکہ انھوں نے اپنے اس نظریے میں تجربی رسائی کو قدرے کم کام میں لاتے ہوئے عقلی بنیادوں پر اپنے نظریے کی تشکیل کی۔ ۱۹۴۶ء میں چامسکی نے ہیرس کے مشہور مقالے From Morpheme to Utterance (Language, 20) سے خاصا اثر قبول کیا اور بتایا کہ اس مقالے کے بین السطور میں ساختیے کا Morphemes چھپا ہوا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں چامسکی نے قواعد کے نظریے کو دو سطحوں میں ممیز کیا جن میں پہلا صوتیاتی تھا تو دوسرا تشکیلی نوعیت کا تھا۔ ان کے نظریہ "نحویاتی ساختیے" میں مبادلیات کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمیق اور سطحی ساختیے کے تصور کو سامنے لایا گیا جس میں "اہلیت" (Competence) اور "کارکردگی" (Performance) کے نظریے کی تشریح کرتے ہوئے۔ اس بات کا احاطہ کیا گیا کہ زبان بولنے والے کا شعور داخلی اصولوں پر وضع ہوتا ہے۔ یہ تمام مبادلیات ساختیے کی ہیئتی عملیات سے متعلق ہوتے ہیں جو زبان کے قواعدی جملوں میں مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں۔ چامسکی نے "آفاقی قواعد" کا نظریہ پیش کرتے ہوئے ذاتی وراثت کے لسانیات کے انفرادی اور منفرد اصولوں سے اختلاف کیا ہے۔ اس نظریے میں فرانسیسی ساختیات دانوں کو خاصی جاذبیت نظر آئی۔ بی۔ ایف۔ اسکینر (B.F. Skinner) نے بیوہاریت کے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے حسیت

کی خلا کو محسوس کرتے ہوئے زبان کی تخلیقی نبضوں کو تلاش کیا۔ چامسکی کا خیال ہے کہ تجربی طریقہ عمل انسان کی باطنی دانش کو بیان نہیں کر پاتا جبکہ ذہنیات (Mentalism) کو فرانسیسی ساختیات دانوں نے خوب بیان کیا ہے۔ لیوی اسٹروس نے "انسانی روح (Human Sprit)" کا ماڈل فراہم کرتے ہوئے "باطنی تصورات" کا تصور واضح کیا جس سے کئی ساختیے ترتیب پاتے ہیں جس کو ریکارٹ نے "عقلیت" (Rationalism) کہا ہے۔

روسی ہیئت پسندی (Russian Formalism)

یہ ادبی نظریہ تنقید اور ادبی اور انتقادی رجحان ہے جو ایک دبستان کی صورت میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پیٹر گراڈ میں پروان چڑھا۔ جو اصل میں ہیئت پسندانہ رویے کا فکری رد عمل تھا۔ جہاں تخلیق ہیئتی یا صوری حصار میں رہ کر اپنا مطالعہ مکمل کرتی تھی جس کا نفس مضمون اور معاشرتی اقدار سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا تھا۔ روسی ہیئت پسندی نے ہیئت پسندی سے الگ راہیں اختیار کرتے ہوئے ہیئت پسندی کی نئی تاویلات پیش کیں۔ اس نئے رجحان کو ارتقائی شکل دینے والوں میں اپسکی، تیینانوف، تودوروف، اخن بام، وکٹر شکلووسکی، رومن جیکب سن، بورس توماشیوسکی، وولوف شطف، زائنڈانوف، باختن، بریک، جین مکوروووسکی، ویلک، وکٹر زاہر ماوسکی، وکٹر ونوگرازوف وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

سیاسی بے چینی کے سبب یہ حلقہ ماسکو سے چیکوسلواکیہ منتقل ہو گیا۔ پراگ کے لسانی حلقے کے ساتھ مل کر اس رویے میں نئے فکری اضافے ہوئے۔ روسی ہیئت پسندی بنیادی طور پر لسانی اختصاص کا نظریہ ہے جو شعری اور نثری زبان کے بنیادی تضادات کو "عمومی" حصار سے نکال کر "عملی" شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں جس میں زبان کا بنیادی تفاعل، قاری تک پیغام اور اطلاعات کا ابلاغ ہوتا ہے اور تضادات سے کام لے کر ادبی زبان ذات کا مرکز بن جاتی ہے اور خصوصی نوعیت کا مزاج اپنی ہیئت خود تشکیل دیتا ہے جس کے بین العملی رشتوں کو لسانی "نشان" "معنویت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ ادب کی زبان عملی ڈسکورس سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ قانون فطرت ہی امتیازی خدوخال کو جنم دیتے ہیں جس کو روسی ہیئت پسند Literaraness کہتے ہیں۔ جیکب سن نے ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا کہ ادبی سائنس کے مطالعے کا

معروض ادبی نہیں "ادبیت" (Literariness) ہوتا ہے۔ جین مکوروو سکی نے لکھا ہے کہ یہ کم از کم گفتاری لہجہ کو پیش منظر میں لاتی ہے جس سے مراد یہ تھی کہ عمل (تخلیقی تحریر) کا اظہار بذات خود کلام کا عمل ہے۔ پروپ (Proppe) Morphology of the Folktale (1928) میں تاریخی توجیحات سے اختلاف کرتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ لوئی اسٹروس کے داخلی تجزیات نے پروپ کے بیانیہ کو مزید سائنسی رنگ دے دیا۔ یوری لوٹمین (Lotman. 1922) نے متن پر آئیڈیالوجی اور ثقافت کے اثرات کا مطالعہ کیا یہاں تک کہ اس رجحان نے متن کے ابلاغ اور فلم پر اپنے تجربات کئے جن میں کرسٹین مدس کلوویل چوبرول، ژاں فرائی، فلپس سولر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ روسی ہیئت پسندی نے ساختیات کو تازہ ترین نظریہ ہی عطا نہیں کیا بلکہ فرانسیسی ساختیات میں شعری ساختیے کو نقد کے نئے نظریات سے روشناس کرایا۔

جب بھی اینگلو امریکن "نئی تنقید" کی روایت کی بحث طول پکڑ کر عملی تنقید کے دائرے میں داخل ہوتی ہے تو متن کی نامیاتی وحدت کا ذکر ہوتا ہے جو کہ روسی ہیئت پسندی کے مطالعے کے بغیر ادھورا تصور کیا جاتا ہے۔ تنقید کی یہ دونوں شاخیں ادبی متن کو دریافت کرتے ہوئے مغرب کی آخری دور والی لولی لنگڑی رومانیت اور روحانیت میں لتھڑی ہوئی شعری روایت کو یکسر رد کردیتی ہے۔ روسی ہیئت پسندی تفصیل کی گہرائیوں میں اتر کر قرات کی تجربی (Empirical) رسائی کو اپناتی ہے۔ روسی ہیئت پسندی ادب کے نظریے میں مناجیات اور سائنسی نقطۂ نظر کو اولیت دیتی ہے۔ نئی تنقید میں متن مخصوص گفتاری نظام پر زور دیتے ہوئے غیر تصوراتی فطرت کی ادبی معنویت کو ابھارتی ہے۔ قرات کی اس رسائی میں کسی تحقیق میں منطقی بیانات اور مقولوں کو گھٹایا نہیں جاتا کیونکہ ان مطالعوں میں اولین نکتہ "بنیادی" طور پر انسانی بھی ہوتا ہے جسے تحقیق کے متن سے بہت قریب رہ کر اخذ کیا جاتا ہے۔

روسی ہیئت پسندی نے ادبی نظریے میں تکنیکی اور کرافٹ کی مہارت کو فروغ دیا۔ شعراء اور فنکاروں کے پروقار بدیعیات کو نظر انداز کرتے ہوئے ادبی عمل میں میکانی تناظر کو زندہ رکھا۔ شکلولوفسکی کا ذہن اس سلسلے میں مایاکوسکی کی طرح خالصتاً مادہ پرستانہ تھا۔ روسی ہیئت پسندی کے اولین دور میں اسلوبیاتی عنصر خاصا حاوی رہا۔ روسی ہیئت پسندی کا ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۵ء

کے دوران سوویت یونین سے کمیونزم کے نام پر شدید قسم کی فکری اور نظریاتی مخاصمت رہی لیکن ۱۹۲۵ء میں روسی ہیئت پسندی کی عالمانہ اور تنقیدی مناجیات کو قبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ ٹروٹاسکی (Trotsky) نے فکری، عملی اور نظریاتی فطانت سے اپنی کتاب "ادب اور انقلاب" (Literature and Revolution) میں روسی ہیئت پسندی سے شدید اختلاف کیا لیکن جیکب سن اور ٹینانوف نے ٹروٹاسکی کے روسی ہیئت پسندی پر لگائے الزامات کا جواب دیتے ہوئے روسی ہیئت پسندی کا موثر انداز میں دفاع کیا۔ ۱۹۳۰ء میں سوویت یونین کی ناپسندیدگی کی وجہ سے روس میں ہیئت پسندی نے قریب قریب دم توڑ دیا لیکن باختن کے دبستان نے ہیئت پسندی کی عمرانیاتی جہت کی مدد سے کمیونزم کے "Social Command" کے نظریاتی پیانے کو نہایت ہی ذہانت سے کام میں لاتے ہوئے روسی ہیئت پسندی اور مارکسی روایت کو یکجا کیا۔ اسکا پھل کئی سال بعد ساختیاتی ہیئت پسندی کی صورت میں کاشت کیا گیا۔ چیک ہیئت پسندی (پراگ کا لسانی مکتب) اور امریکہ میں "نئی تنقید" (۱۹۴۰-۵۰ء) کے پس منظر میں روسی ہیئت پسندی کے اثرات نمایاں تھے۔

شکاگو دبستان (Chicago School)

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں انسانی اساسی نظریے کے تحت یونیورسٹی آف شکاگو (امریکہ) میں انگریزی کے چند اساتذہ نے "شکاگو دبستان" کی بنیاد رکھی۔ رونالڈ ایس کرین (Ronald S. Grane) کو اس دبستان کا کلیدی بنیاد گذار کہا جاتا ہے۔

اس دبستان کی بنیاد رکھنے میں تنقیدی تحریروں کا ایک مجموعہ "نقاد اور تنقید: قدیم اور جدید" (Critics and Critism: Ancient and Modern) (۱۹۵۲ء) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتاب سے پہلے ایلڈر اولسن (Elder Olson) میں شائع ہوتے رہے جس پر کرین نے عملی تنقید کے حوالے سے تعارفی نوٹ لکھے۔ ان مقالات کے بطن سے ایک نئے ادبی رویے کی شروعات ہوئی۔ شروع شروع میں لوگوں نے اس کا کم نوٹس لیا۔ کرین جو کہ "Modern Philology" جیسے ادبی جریدے کے مدیر بھی تھے، انھوں نے ۱۹۴۰ء میں ارسطو کے مضامین کو نئے سرے سے شائع کیا۔ پھر چودہ پرانے اور چھ نئے مقالات کے ساتھ "نقاد

اور تنقید: قدیم اور جدید" (۱۹۵۲ء) کو کتابی صورت میں شائع کیا اور یہی کتاب "شکاگو دبستان" کی عمارت کی پہلی اینٹ ثابت ہوئی۔ شکاگو دبستان کے تنقیدی رویے میں دو نکات اہم تھے:

(۱) تکثیریت (Pluralism)

(۲) نئی ارسطوئی تنقید کا منطقی میدان

اس کے علاوہ میکیین (Micheon) کے مقالے The Philosophic bases of Art اور لسن (Olson) کے مقالے An out line of Poetic Theory and Critism اور گرین (Grane) کے مقالے The Languages of Criticsm and Structure of Poetry (گرین کا یہ مقالہ دراصل چار خطبات پر مبنی ہے جو ۱۹۵۳ء میں انھوں نے یونیورسٹی آف ٹورنٹو، کینیڈا میں دیے تھے) ان تینوں مقالات نے "شکاگو دبستان" کی فکری اور نظریاتی حدود کو متعین کیا۔ اس مکتب نے بنیادی طور پر ادب کی فطرت اور قیاسات، شعریات کی تشریحی مناجیات کے بنیادی دعووں کا اظہار کیا۔

خاص طور پر شکاگو کے مدرسۂ فکر نے تشریح شعر کے سلسلے میں جو معتقدہ (Doctrine) پیش کیا، اسے بہت سے نقادوں نے خوش آمدید نہیں کہا کیونکہ افلاطون اور ارسطو کے بعد بھی مشاہداتی مظہر ہر نقد میں ظاہر ہو تا رہا جو کہ ممکن ہے ایک مفروضہ ہو۔

نوارسطوئی تنقید کے حوالے سے شکاگو کے مکتب کا مزاج عملیاتی (Pragmatic) نوعیت کا تھا جس کی تمام دلچسپیاں شعریات سے متعلق تھیں۔ لہٰذا اس مکتب نے شعریات کے متن پر عملی تنقید کے نمونے پیش کئے خاص طور پر فنکارانہ اصولوں کو اخذ کر کے استدلال کے ساتھ شعری متن کی عمارت تشکیل دی گئی۔ لفظیات کو زبانی معنویت سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کے تاریخی اور سوانحی پس منظر کو بھی ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس سبب عمومی نوعیت کے خدوخال بھی واضح ہوئے جس سے مختلف قسم کے متن سامنے آئے اور یہی انفرادی متن شعریات میں عموماً نمایاں ہوتا ہے جو کسی طور پر قاری کی اساس تنقید میں بھی اپنا عکس دکھاتے ہیں۔

"شکاگو کے دبستان" نے ادبی تنقید کو نئے نظریات سے متعارف کرایا۔ خاص طور پر

ارسطوئی تنقید کے حوالے سے نئی جمالیات، تنقیدی عملیات کے نئے اُفق سر کئے گئے۔ ان قدامت پسندانہ مطالعاتی وساطت سے صوری نمونوں کی ساخت کو ارسطو کے اضافی (Genre) نظریات کے حوالے سے پرکھا گیا۔

شکاگو کے تنقیدی رویے میں "نئی تنقید" کا رنگ بھی ملتا ہے اور پس ساختیات (بالخصوص ردِ تشکیل) کے نظریے میں اس مکتب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ آج بھی ساختیات کے جدید بیانیہ نظریے میں "شکاگو دبستان" کہیں نہ کہیں ضرور نظر آتا ہے۔

مشہور امریکی نقاد ڈبلیو۔ کے ومسٹ جونیئر (Wismatt Jr.) نے شکاگو کے دبستان پر شدید تنقید اور اعتراضات کئے۔

سی ڈبلیو بوتھ (Boot)، مارش (March)، جے ہولووے (Holloway)، ڈبلیو سٹین (Sutton)، ویلیک (Wellek) اور لیچ (Leitch) نے شکاگو دبستان کے حوالے سے اپنی تحریریں چھوڑی ہیں۔

ماسکو-ٹرٹو دبستان (Moscow-Trartu School)

ماسکو-ٹرٹو مدرسۂ فکر نے لسانیات اور اس سے متعلق علوم مثلاً ساختیاتی شعریات، لوک ورثے، اساطیر، نظریۂ شعریات اور ثقافتی نظریے پر قدرے وسیع تناظر سے تحقیقی نظر ڈالی۔ ۱۹۳۰ء میں سویت عالموں نے اس کی شروعات کی۔ جن کا تعلق ماسکو کی اکادمی آف سائنس سے تھا۔ اس مدرسۂ فکر کے بنیاد گذاروں میں ویچاسلوف ایونوف (Vja'ceslave Ivanonv)، ولیڈامیر ٹوپوروف (Vladimir Toporov)، میخائل گیس پاروف (Michail Gasparov)، الیازر میلاٹیسکی (Eliazarmeletnskij) کے نام لئے جاتے ہیں جبکہ اسٹونیا کی ٹرٹو یونیورسٹی میں اس مکتب کو پروان چڑھانے میں جورج لوٹمین (Jurij Lotman) زارا مینس (Zara Minc)، گورسرنوف (Igorcernov) پیش پیش تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب ماسکو ٹرٹو مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں، نقادوں اور اہل فکر نے خروشیف کے دور حکومت میں تھوڑی سی فکری آزادی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے تصورات کو پیش کیا۔ ان لوگوں نے سرکاری مارکسٹ۔ لینن آئیڈیالوجی کو مسترد کرتے ہوئے بیسویں صدی کے اوّلین دور کی روسی لسانی اور حقی

روایت کو بازیافت کرنا چاہا جس کے ڈانڈے روسی ہیئت پسندی اور پراگ کے ساختیاتی دبستان سے ملتے ہیں۔ جن پر رومن جیکب سن اور یوری تجانوف کی فکری اور تنقیدی تحریروں کا گہرا اثر تھا۔

یہ فکری روایت عمومی لسانیاتی تناظر میں تھی جس میں Cybernetics اور مشرقی مطالعوں اور شعر گری کے موضوعات کو جگہ دی گئی تھی۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں ماسکو کے ٹرٹو مکتبہ فکر کی فکری قوت میں اضافہ ہوا لیکن اس فکری روایت کو میخائل باختن، اولگا فریڈن برگ (Frejdenberg)، پاول فلورنسکی (Florenskij)، گستاف اسپنٹ (Spent)، ولاڈ میر پروپ (Propp) اور پیٹر بوگاٹاریون (Bogatyrev) احاطۂ فکر میں نہ لاسکے اور اس فکری رجحان کو مشکوک قرار دیتے رہے۔

ماسکو کے ٹرٹو دبستان نے ایک جریدے "Work on Semiotics" کی ۲۳ جلدیں شائع کیں۔ یہ جریدہ ۱۹۷۰ء کے وسط تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اور ۱۹۸۰ء کے شروع میں اس مکتبہ فکر کے کئی اہل فکر و نظر امریکہ اور مغربی یورپ نقل مکانی کر گئے۔ (جن میں ایلک سینڈر پیچار سکی (Pjatigor Skiri)، بورس اوگیابین (Ogiabenih)، بورس گیس پاروف (Gasparon)، ڈیمانی سیگل (Segl) شامل ہیں۔ اس کے بعد اس فکری تحریک کی باگ ڈور نئی نسل کے ہاتھوں میں آگئی۔ گوربچوف کے دور حکومت میں ان لوگوں کی اسٹیبلشمنٹ سے خاصی تکرار رہی، بعد میں انھوں نے سویت حکومت کو اپنی فکری قوت سے زیر کرتے ہوئے سب سے سکہ بند مارکسی دانشوروں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ یہ لوگ روایتی سویت آئیڈیالوجی کو ہمیشہ نشانہ بناتے رہے کیونکہ اب فضا تبدیل ہو رہی تھی۔ اور ان لوگوں نے ۱۹۸۰ء کے اواخر میں استونیا اور ٹوٹتے ہوئے سویت یونین میں نئی فکری امنگوں کو اٹھتے دیکھا۔ اس حلقے نے فکری اور تنقیدی سطح پر چار اہم کام کئے:

(۱) انقلاب روس کے بعد ثقافتی سطح پر جو ادبی کام غیر مطالعہ رہے اس کا از سر نو مطالعہ کیا گیا۔

(۲) عملیات (Pragmatism) اور مناجیاتی رسائی کے نظریے کو وسعت دیتے ہوئے شعریات اور ادبی نظریے کی درجہ بندی بھی کی۔

(۳) نظریاتی فریم ورک کے ارتقائی منازل کی نشاندہی کرتے ہوئے، ساسر، ٹروبٹ یا سکی، جیکب سن کی ساختیاتی مناجیات کو اپنے کلیدی تصورات میں جگہ دی۔ (جس میں لینگ / پیرول / کوڈ / پیغام / تاریخی / غیر تاریخی / نشان / غیر نشان کے لسانی تصورات کی اطلاقی توجیحات پیش کی گئی۔)

(۴) انسانی سطح پر ادب کے اطلاقی تصورات کا سہارا لیتے ہوئے، لوک ورثے، متحرک فلموں اور اساطیری کی ثقافتی فعلیات کو نئی لسانی رسائی کے ساتھ پیش کیا گیا اور زبان کے مرکزی رول کو فطری رتبہ دے کر ایک طرف تو اس کی منزلت میں اضافہ کیا گیا تو دوسری طرف زبان کو مخصوص فریم ورک میں رکھ کر اسے نئی اصلاحاتی معنویت سے ہمکنار کیا گیا۔

لہٰذا یوں فرہنگ خوانی کی نئی روش تشکیل ہو پائی، علائم کے مجموعے ان کی معاونت سے نئی معنویت کو بھی دریافت کیا گیا جن میں قواعدیات کا میدان بھی شامل مطالعہ رہا۔ اس سلسلے میں سہل نظام نشانیاتی شاہراہوں سے گذار کر اس کی نئی تشریحات بھی کی گئی اور Cartomancy کے اصول یا Paremiological لوک ورثے کی اصناف کو بھی زیر مطالعہ لایا گیا۔

ماسکو کے ٹرٹو مکتبہ فکر نے زبان کے ماڈل کو خاصا تبدیل بھی کردیا لیکن پھر بھی اس کے اصطلاحی متعلقات میں کوئی زیادہ فرق دیکھنے میں نہیں آیا کیونکہ اس سلسلے میں خاصے لسانی عالموں نے اپنی فکری مرکوزیت "متن" کی حد تک محدود کر رکھی تھی جب کہ اصل میں رموز (Code) کی بھی اپنی مستحکم اور مضبوط حیثیت ہوتی ہے۔ کیونکہ پیچیدہ معنیاتی معروض کی تشریح کے لئے صوریاتی مابعد لسانیات سے کسی طور پر نظریں نہیں چرائی جاسکتی لہٰذا ماسکو ٹرٹو مکتب فکر نے اپنے مرکوز اصولوں میں لسانی اصل کے مجموعوں، ثقافت اور اس کی پیچیدہ میکانیت سے بحث کرتے ہوئے اس عمل میں در آنے والے تصادمی رموز کا بھی انکشاف کیا جن سے یہ مثبت فکری کشادگی اس صورت میں ہوئی کہ ان مباحث سے سنوں لسانیات (Neurolinguistic)، عمرانیات، تخلیقیت اور مبادلیات کی فکری راہیں روشن ہوئیں۔

اس مدرسہ فکر نے شعر و شعریات سے ہمیشہ وہی دلچسپی کا اظہار کیا اور لیوٹر کو رہا

(Levsoerba) اور جیکب سن نے روسی روایت کو بنیاد بناتے ہوئے شعری متن کے لسانی حوالے سے تشریح و تفہیم کی، جب ہیئت پسند سے قریب تر تھی اور ابتدائی دنوں کی ساختیات پر ان مطالعوں کا گہرا اثر بھی رہا اور پس اسٹالن دور میں اس کی دھوم بھی رہی کیونکہ اس وقت لسانی حوالے کے ساتھ بیسویں صدی کی ثقافت کو مطالعہ کیا گیا لہٰذا اس زمانے میں "اصل" ادب طاق نسیاں ہو کر رہ گیا۔ یہ تحریک روس میں بہتر تصور کی جاتی رہی کیونکہ سویت معاشرہ ساختیاتی مباحث کو مخصوص آئیڈیالوجی کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتا تھا۔ کولاج گرمیلو، اینا ایکسمنووا، اوسپ میڈل اسٹپ، ٹوپوروف سیگل، لیوین، سیوجان، لیم ہینسلن، گوواری، لیوٹن اور زرامینس (وفات ۱۹۹۰ء) نے اس مدرسہ فکر کو اپنی تحریروں سے مالا مال کیا۔ اس کے علاوہ الیگزنڈر بلاک، اندرج بلائج نے لسانی حوالے سے علامتی تحریک پر تحقیق بھی کی اور ٹرٹو مکتب خیال نے "بلاک ویلوم" (Blok Volemes) کے نام سے جریدہ بھی شائع کیا۔

ماسکو ٹرٹو مکتب نے شعریات کے میدان میں دو تحقیقی وصف کو اہمیت دی جن میں پہلی روایتی متنوں میں ساختیات کی حسی توجیح تھی۔

دوسری جانب اس مکتب نے نجی اور انفرادی متن کی درجہ بندی کو صوتیات، مطالعوں میں کلیت کا بھی نفوذ ہوا۔ اس رسائی کو سب سے پہلے لوٹمین (Lotman) نے اپنے ابتدائی مونوگراف "شعری متن کا تجزیہ" (ترجمہ ۱۹۷۶ء) (Analysis of the peotic Text)، "ساخت کا فنکارانہ متن" (ترجمہ ۱۹۷۷ء) (Structure of Artistic Text) میں اپناتے ہوئے ساختیاتی شعریات کو اپنے مطالعے کا محور بنایا۔ ۱۹۳۰ء میں جیکب سن نے اپنے کلاسیکی مقالے "لسانیات اور شعریات" (Linguistics and Poetics) اسی طرح تجانوف کے کئی مطالعے شعریات کی نشانیات سے متعلق تھے۔ جن کو ۱۹۸۱ء میں ایم۔ سوسا (M sosa) اور بی۔ ہاروے (B.Harvey) نے The Problem of Languge کے نام سے ترجمہ کیا۔

لوٹمین نے شعری تفاعل کے تصور پر زور دیتے ہوئے درجہ بندی کی شیرازہ بندی کر کے متوازی فریم ورک کو شعری مطالعوں میں شامل کیا اور ساتھ ہی شعری مطالعوں میں مخاطبوں (ڈسکورس) کی گمشدگی کو محسوس کرتے ہوئے ان کی بازیافت اور اس کے انسلاک

پر زور دیا۔ یہ دونوں منصوبے اصل میں عملیاتی اور نحویاتی نوعیت کے تھے۔ ان مطالعوں سے نحوی نوعیت کے نتائج برآمد ہوئے جو اصل میں نظم کے افقی (Intralinear) اور عمودی (Interlinear, Intersporphic) کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے تھے۔

لوٹمین اور ان کے ہمنواؤں نے "زائد متنیت" (Extra Textual) کے ساختیاتی رول اور اس کے عناصر پر بھی کئی مطالعات کو مرکوز کیا۔ ان لوگوں نے بالخصوص شعریات کے انسلاکی اور جمالیاتی نتائج پر بحث کرتے ہوئے ان کے دیگر سیاقوں کا تقابل بھی کیا (جو کہ شعری دائرے ہوتے ہیں اور شعریات کے انتخاب کو ترتیب بھی دیتے ہیں) یہ مصنف کے تخلیقی، فکری انتقادی عمل اور اس کے مخصوص مدرسہ فکر کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ شاعرانہ متن ہمیشہ لچکدار ہوتا ہے اور نہ صرف اپنے "متن" میں "مقامی" ہوتا ہے بلکہ وہ اپنی ثقافتی حدود سے باہر نکل کر مختلف ثقافتی رموز کو بھی اپنی شعریات میں خوش آمدید کہتا ہے۔ اس سلسلے میں انیسویں اور بیسویں صدی کے کئی شعراء کی شاعری کے تجزیات اور مطالعے کیے گئے اور نچلی سطح پر ان تخلیقات کے متن کے ساتھ ادبی، ثقافتی اور تاریخی عناصر کے ساتھ مطالعہ کرتے ہوئے تشریحات، معنی اور مفہوم کے نئے آسمانوں کو تسخیر کیا گیا۔ اے۔ زولووسکی (A. Zolkovskij) اور جیو سیگلوف (Ju.Sceglov) نے مرکزی خیال متن (Theme Text) کا ماڈل ادبی عمل میں دریافت کیا۔ جس نے اعلیٰ سطح پر ادبی عمل میں مابعد لسان کی ہیئت کو ابھارا جو کہ "سیاق کے منصوبے" اور "اظہار کے منصوبے" میں رابطے کا وظیفہ انجام دیتا ہے لیکن اس رسائی کو ماسکو ٹرٹو مکتب فکر کے دیگر محققین نے زیادہ بہتر نہ جانا۔

ماسکو کے ٹرٹو مدرسہ فکر کی شعریاتی تحقیقی رسائی کو اپناتے ہوئے شعری تجزیاتی تنقید میں تین مختلف درجات پر مباحث کی گئی۔

(۱) آہنگ نظم

ٹاما۔ کاوسکی (Tomasevskij) نے "آہنگ نظم" پر لنگو۔ شماریاتی (Lingue-Statistical) ماڈل پیش کیا جسے کیرل ترونسکی (Kiril Tarano Vsky) نے ۱۹۵۰ء میں مزید توسیع دی اور ایک ماہر ریاضیات اندوج کولموگروف (Kolmogorov) اور ان کے شاگردوں نے اس ماڈل کی نئی توجیحات پیش کیا۔ ان محققین نے انفرادی سطح پر نشانیاتی تشکیلات کی تحریک شروع کی جو

کہ سویت یونین کی ساختیاتی نشانیات سے قریب تر بھی تھی۔ میخائل گیس پاروف نے بیسویں صدی میں روسی شعریات کے نظام شعر گری کو بیان کرتے ہوئے پہلے کی عدم شناخت رسائیوں سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ جدید روسی شاعری کا آہنگ، ہیئت، عروض، قدیم شاعری سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لسانی مناجیات کا سہارا لے کر شعر گری کے سوادی نظریے کو بھی اخذ کیا گیا۔ جس کو رنڈنیو (Rundnev) بیویاسکی (Baevskiji) اور ایم۔ جیولوٹمین (یوری لوٹمین کے صاحب زادے) نے مزید توسیع دیتے ہوئے اسے شعریات لے کر انفرادی شاعر اور اس کی شعریات کے جوہر اور دیگر تحریکوں کو بھی شامل کیا گیا۔

۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۹ء کے دوران اس حوالے سے گیس پاروف نے مونوگراف بھی لکھے۔ ان کا سب سے بڑا فکری کارنامہ مواد کی ہیئت اور نحویات کے درمیان انسلاک کی صورتحال کا سراغ لگاتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کی جانب بہت سا تحقیقی مواد مخصوص تقسیم کے لئے مددگار ثابت ہوتا ہے جو کہ پیچیدہ شکل اور تحقیق کے لئے کٹھن مسائل بھی پیدا کرتا ہے۔

(۲) شعری فرہنگ:

ٹڑوکتب نے شروع کے دنوں میں ہی شاعر کے مخصوص خزانہ الفاظ (فرہنگ) سے دلچسپی لی جو کہ شاعر اپنی شاعری میں استعمال کرتا ہے اور لسانیات کے بدلتے ہوئے آفاق میں شاعر کی فرہنگ کو معروض تجزیاتی رسائی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا۔ جدید شعراء کی شعری تخلیقیت میں عموماً تمثال کی معنویت، مقولہ (Motifts) کا عنصر مروجہ معنویت سے قریب نہیں ہوتا۔ شعری فرہنگ کے موضوع کے تحت ماسکو ٹڑوکتیہ فکر کے نقادوں اور محققین نے بلوک (Blok)، آکسماٹوا (Axmatova) اور میڈل اسٹیم (Mandel Stam) اور کئی دیگر شعراء کو اپنے مطالعوں میں شامل کیا۔

(۳) بین المتنی انسلاک:

یہ موضوع روسی ساختیات کی وسعت میں کار آمد عنصر تصور کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں بین المتنی انسلاک کا ربط تحقیق سے تو تھا لیکن یہ جلد ہی Acmeism میں تبدیل ہو گیا۔ پھر یہ رجحان ادبی وصف کی بنیاد بنا۔

Acmeism بیسویں صدی کی ایک اہم روسی فکری اور ادبی تحریک ہے جس نے اشاریت پسندوں کی دوسری دنیا کو اپنے رنگوں، اپنی اصوات اور اپنی تشبیہوں کے ساتھ ترجیح دی۔ اس کے علاوہ اس فکری رجحان سے شعریات کے ذیلی متن کو دریافت کرتے ہوئے اس کے نحویاتی مزاج کا تقابل بھی کیا۔ ان فکری مباحث اور ان تجزیات میں لیوتھن (Levinton) اور ٹیمنسک (Timencik) پیش پیش رہے۔ بین المتنیت کی اس کار آمد رسائی نے روسی جدیدیت پسند رجحان کو فکری ایندھن فراہم کیا اور اس مکتبہ فکر کے سبب بین المتنیت کا تصور مزید وسیع ہو کر نشانیات سے متحرک فلموں تک آن پہنچا۔

OO

بارھواں باب

شخصیات

شخصیات

مائر ہاورڈ ابرام (Meyer Howard Abrams)-1912

امریکی عالم، نقاد، ماہر تعلیم لانگ بیچ نیوجرسی میں پیدا ہوا۔ ہاورڈ یونیورسٹی سے علوم انسانی میں بی اے کیا۔ ۱۹۳۸ء میں ان کا سینئر اعزازی مقالہ "The Milk of Paradise" ہاورڈ یونیورسٹی سے شائع ہوا۔ اسی مقالے نے ان کے علمی اور تنقیدی مستقبل کی راہیں ہموار کیں۔ انھوں نے انگلستانی رومانویت پر کام کرتے ہوئے "The Mirror and the lamp and natural supernaturalism" ۳۵-۱۹۳۴ء میں لکھی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں بحیثیت "ہنری فیلوز" کے تعلیم حاصل کرتے رہے اور ۱۹۳۶ء میں امریکہ واپسی پر ہاورڈ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ۱۹۳۸ء میں انگریزی کا انسٹرکٹر مقرر ہوا اور اسی یونیورسٹی سے "رومانی نظریات کی شاعری اور تنقید" پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ ہاورڈ کی Psycho-Acoustic Laboratory میں بحیثیت تحقیقی معاون کے کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۵ء میں سیل یونیورسٹی میں انگریزی کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوا۔ وہ رائل یونیورسٹی (مالٹا) انڈیانا یونیورسٹی (۱۹۶۳ء) یونیورسٹی آف ٹورنٹو (کینیڈا) (۱۹۶۴ء) اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا لاس انجلیس (۱۹۷۵ء) میں کئی خطبات دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں کئی انعامات اور اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں انھیں یونیورسٹی آف راچسٹر سے ہیومن لیٹرز کی سند بھی ملی۔ ابرام کا سب سے پسندیدہ نقاد جے ہلس مر ہے جس نے ردِ تشکیل کو روایتی تنقید پر حملہ قرار دیا۔ وہ اپنی تنقیدوں میں انسانی علمیت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رومانی ادب میں زبان اپنے محدود تصور کے ساتھ سامنے آتی ہے، جو نقالی لگتی ہے لیکن ادبی متن کا ابلاغ معنویت سے براہ راست ہوتا ہے۔ ردِ تشکیل نظریے کے حوالے سے ابرام کا ایک مقالہ

۱۹۷۷ء میں Critical Inquiry کے ساتویں شمارے میں "The deconstructive angel" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے جس نے رد تشکیل کی تنقید کے نظریے پر نئے مباحث کا آغاز کیا۔ انھوں نے ایک حوالہ جاتی ادبی فرہنگ Glossary of Literary Terms کو ترتیب دیا جس کے ۱۹۵۷ء سے اب تک چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

لوئی آلتھیوز
1918-1990 (Louis Althusser)

فرانسیسی فلسفی، مارکسی نظریہ دان، الجزائر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں فرانس کی معروف درسگاہ Ecole Normale Sup'erieure (پیرس) سے فلسفے کی سند حاصل کی اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ اسی زمانے میں اعصابی تناؤ کا شکار ہو کر ذہنی امراض کے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کی ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی شروع سے ہی پریشانیوں میں گھری رہی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران پانچ سال نازیوں کی قید میں رہے۔ ۱۹۸۰ء میں اعصابی تناؤ میں آ کر اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔

کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت سے قبل وہ بحیثیت کیتھولک طالب علم کے ایک مزاحمتی گروپ کے ساتھ شامل رہے۔ کمیونسٹ پارٹی میں ان کی ذہنی تربیت نے ان کی نظریاتی تحریروں پر اثر ڈالا مگر انھیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ سوویت یونین کے کمیونزم میں انفرادی آزادی فاشزم کی طرح محدود ہے لہٰذا انھوں نے مارکسزم کی روایتی تعریف سے انحراف کرتے ہوئے فرانسیسی طرز کے انسانی مارکسزم پر تنقید کی جو مارکس کے معاشی اور سیاسی فلسفے سے مرتب کیا گیا تھا، جس کا اصل مبدا مارکس کی تحریر Economic and Philosophical Manuscripts (۱۸۳۹-۴۰ء) تھا جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ آلتھیوز نے مارکسی مسودے میں متن کے معنی اور مغائرت کے تصور کو دانستہ طور پر بھلا دینے کی کوشش کو بورژوائی فلسفہ کہا۔

آلتھیوز کا نام ۱۹۶۵ء کے بعد نظری اور فکری اُفق پر ابھرا جبکہ اہل دانش اور نظریہ دان سارتر اور اسٹروس کے ساختیاتی تصورات پر خاصی بحث کر چکے تھے۔ ان کے مضامین کمیونسٹ پارٹی کے ایک جریدے میں شائع ہوتے رہے جسے بعد میں "For Marx" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کی کتاب "لینن اینڈ فلاسفی" شائع ہوئی۔ انھوں نے مارکس

کے متن کی قرأت کے دوران کئی نظریاتی اور ساختیاتی سوال اٹھائے اور اپنے زمانے کے سب سے اہم ساختیاتی مارکسی نقاد بھی قرار پائے لیکن وہ "ساختیاتی آئیڈیالوجی" سے انکار کرتے ہیں۔ ایلکس کالینکاس (Alex Callincos) نے ۱۹۷۶ء میں آلتھیوز کے مارکسی فلسفے پر ایک کتاب "Althusser's Marxism" لکھی۔ اس کے علاوہ مشہور جریدے "New Left Wing" (جنوری فروری ۱۹۷۲ء) میں نارمن گراس (Norman Geras) نے بعنوان "Althusser's Marxism: An Account and Assessment" مقالہ لکھا جس میں آلتھیوز کی مارکسی تنقید اور نظریات کا تعین کیا گیا۔

میخائل میکولووچ باختن
1895-1975 (Michail Mikhailovich Bakthin)

پیدائش ۱۶ر نومبر ۱۸۹۵ء (پرانی تقویم کے مطابق ۴ر نومبر) وفات ۷ر مارچ ۱۹۷۵ء لسانی فلسفی ادیب اور ثقافت کے نقاد، ماسکو کے جنوبی علاقے اورل (Orel) میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ چھوٹے ہی تھے کہ ان کا خاندانی کاروبار ختم ہو گیا اور آبائی جائیداد بھی ہاتھوں سے جاتی رہی۔ یونیورسٹی آف پیٹر گراڈ سے کلاسیک اور لسانیات کی سند حاصل کی۔ ۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۸ء تک اس علاقے میں خانہ جنگی ہوتی رہی جس سے وہ دور رہے باختن نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بورین نوریلتی اور ڈی۔ کے پیٹروسکی (فلسفی) اور اے۔ ای وریڈنگی کے شاگرد رہے۔ اسی دوران انھوں نے قدیم یونانی اور جرمن فلسفے کا مطالعہ کیا جبکہ ان کے دیگر ساتھیوں نے سرکاری ملازمتیں اختیار کیں مگر باختن روسی مارکسزم سے متاثر نہ ہوئے۔ ہیئت پسندوں، فرائڈی نظریات اور لسانی ساختیات کے کئی محاذوں پر اختلاف کیا لیکن باختن کی شہرت ان کی کتاب "دوستفسکی کے فن کے مسائل" (۱۹۲۹ء) سے ہوئی جس کا مارکسزم سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کتاب میں لسانیات کے حوالے سے دوستفسکی کی معنویت کو اجاگر کیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں "باختن دبستان" (سرکل) کو تشکیل دیا جس میں دوشینوف (۱۸۹۶ء-۱۹۳۶ء) اور ایم وی پازینا (۱۸۹۹ء-۱۹۷۰ء) پیش پیش تھے۔ انھی دنوں ایم اے گیلنی نئے نئے جرمنی سے فلسفے، نئے "کانٹین ازم" کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ باختن اور ان کے قریبی دوست ایل وی پمپسکی نے مقامی بالشویک کی طرف سے اٹھائے گئے مذہبی

سوالات سے شدید اختلاف کیا۔ باختن ۱۹۶۱ء تک "سرآناس" میں درس و تدریس سے متعلق رہے۔ ۱۹۶۹ء میں واپس ماسکو آئے جو ہیں انتقال ہوا۔ ان کی دیگر تصانیت میں Rabealis and his world (1968-84)، Vern Mcgreeis Speech Genres and Other Late Essay (1986) اہم ہیں۔

ڈیوڈ بلاچ (David Blech)

انڈیانا یونیورسٹی (امریکہ) میں پروفیسر ہیں۔ ان کا "NCTE" مونوگراف "Reading of Feeling" میں شائع ہوا جس میں ادبی مطالعات کے نفسیاتی اور Pedagolical متعلقات سے بحث کی گئی ہے۔ ۱۹۷۸ء میں ان کی کتاب "Subjective Criticism" شائع ہوئی۔ ان کے مطالعات میں انفرادی قرات کے مسائل پر توجہ دی گئی جو قاری کی باطنی اور ذاتی نفسیات سے متعلق ہوتے ہیں۔ کتاب کا کلیدی نکتہ معروضی تنقیدی رجحان سے موضوعی تنقیدی رجحان کی طرف مراجعت تھا۔ انھوں نے جدید سائنسی فلسفی کوہن کی معروضی کائنات کو حقیقتوں کی بنیاد قرار دیا کیونکہ آگہی افراد سے حاصل کی جاتی ہے نہ کہ مشاہداتی عمل سے اس کا ظہور ہوتا ہے عمل انسان ہی پیدا کرتا ہے وہ زمین پر پڑا ہوا نہیں ملتا لہٰذا تنقید کا عمل موضوعی محرک ہوتا ہے۔ کیونکہ آگہی کا عمل "تشریحی طبقے" کے معاہدے اور پیماں کا پیداواری عمل ہوتا ہے جس کی فرد آزادانہ طور پر انسانی حوالے سے تشریح کرتا ہے۔ جو کہ اصل میں ایسی قسم کی تشریح ہوتی ہے جو کہ محرکی طور پر علامتوں کی تشکیل نو کرتے ہوئے تصورات کی اساس بنتی ہے۔ اس سلسلے میں بلاچ نے اپنا مشہور مقالہ "Spistemological Assumption in the Study of Response" لکھا جو ان کی کتاب Subjective Criticism میں شامل ہے۔

ہیرولڈ بلوم (Harold Bloom) 1930

امریکی ادبی نقاد نیو یارک میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۱ء میں کارنیل یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے اور ۱۹۵۵ء میں ییل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور یہیں سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۰ء میں پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۷۴ء سے وہ یہاں پر بحیثیت Devane پروفیسر کے کام کر رہے ہیں۔

بلوم نے انگریزی اور امریکی شاعری میں رومانیت کی روایتی تشریح سے اپنی تنقید کا آغاز کیا۔ انھوں نے تاریخی سیاق میں "تخلیقی اصل" کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی فکری رشتوں کا سراغ لگایا اور یہ احساس دلایا کہ یہ "نظریہ شکن" ہوتی ہے جیسا کہ ٹی ایس ایلیٹ کی تمام ادبی وابستگی مسیحی اقدار میں پوشیدہ ہے۔ قدامت پسندی، کلاسیک ازم اور روایت پسندی کے بطن میں رومانیت اور اس کے تصور شعر کے علاوہ انفرادی پیکریت (تمثالیت) کو مابعد الطبعیات اور سترہویں صدی کی مذہبی شاعری کے سیاق میں پرکھتی ہے۔ بلوم نے اپنی تنقید کی بنیاد خاص انگریزی رومانوی تنقید کے اصولوں پر استوار کی۔

۱۹۷۲ء میں ہیرولڈ بلوم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "Figures of Capable Imagination" چھپا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ "ہم جو بھی معاملہ کرتے ہیں وہ موضوع کا محاصرہ (گھیراؤ) ہوتا ہے اور ادب بذات خود رقابت، غلط تشریح، جبر، عام سرقہ اور Savage Misprision کو ابھارتا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں بلوم نے ایمرسن سے اسٹیون تک امریکی رومانی شعراء کا جائزہ لیا ہے جن کو بلوم نے جدلیاتی فضاء، آزادی اور اقتدار کے حوالے سے تشریح کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کے آخری باب میں انھوں نے تشریحی طریقہ کار کو بیان کیا ہے جو انھوں نے ان مطالعوں میں استعمال کیا جسے وہ "شعری کراسنگ" (Poetic Crossing) کہتے ہیں، جس سے نظریہ شعر میں معنی اخذ کیے جاتے ہیں جس کی مثالیں وہ پچیں روشن خیال اور ادب سے برآمد کرتے ہوئے اس کو ورس ورتھ کی شاعری کا بحران کہتے ہیں اور عصری ادبی تاریخ، روشن خیال عہد تک ایک کہانی کی ایک ہی کہانی ہے جسے وہ دیوتاؤں اور Demurges کی کشمکش کہتے ہیں۔

بلوم نے کئی نظریاتی اور تنقیدی کتابیں لکھیں لیکن ان کی مشہور کتابوں میں "The Anxiety of Influence" (1973)، "Map of Misteading" اور "Myth Making" (1959) قابل ذکر ہیں۔

رونالڈ بارتھ (Roland Barthes) 1915-1980

فرانس کے شہر چیر بروگ (Cherbourg) میں پیدا ہوئے۔ (بعض کتابوں میں ان کا مقام پیدائش بیون (Bayonne) درج ہے) ان کی نشوونما بیون اور پیرس میں ہوئی۔ ۱۹۳۹ء

میں انھوں نے سوروبون (Sorbonne) سے فرانسیسی ادب اور کلاسیک کی سند حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نجارست اور اسکندریہ (مصر) کی جامعات میں پڑھایا۔ پھر انھوں نے نیشنل سائنٹفک ریسرچ میں شمولیت اختیار کی۔ وہ ایک جریدے Communication کے مدیر رہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد Ecole Pratique سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۷۶ء سے اپنی موت تک وہ کالج ڈی فرانس میں "ادبی نشانیات" کے پروفیسر رہے۔

وہ ایک عرصے تک ژاں پال سارتر کے نظریات سے متاثر رہے بعد میں وہ سارتر کے نظریات کے ناقد بن گئے۔ بارتھ نے شروع سے ہی مغربی فکر سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا جو فلسفہ وجودیت کا بھی مقدم نکتہ تھی کیونکہ وجودیت نے فرد کو اہمیت دیتے ہوئے اس کی آزادی پر زور دیا جو "فرد" کے سبب ہی پروان چڑھتی ہے۔ بارتھ نے لازمیت اور جبریت کے خلاف علم اٹھاتے ہوئے اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ انتشار اور نراجیت (انارکی) کو بھی قبول کرنے کو بھی برا تصور نہیں کرتا۔ ادب کے سلسلے میں ان کا خیال ہے کہ ادب اور اشیاء عوامل کی معنی خیزی کا پیغام دیتے ہیں جس میں معین معنی شامل نہیں ہوتے۔ مصنف، متن اور قاری کا رشتہ اپنی نشاط کے اعتبار سے شہوانی نوعیت کا ہوتا ہے وہ قرات کے دوران جسم سے بات کرتا ہے۔ وہ ادب کو "مانوس تصور" کہتے ہیں اور اس "مانوس تصور" کو رد کردینے کے حامی ہیں۔ بارتھ نے ادب کے مقتدر اور کلاسیکی تصور پر اپنی برہمی کا بھی اظہار کیا ہے۔ مکتبی تنقید کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ پیارنو سے بھی متاثر رہے۔ جب ہی انھیں ادبی تنقید پر غیر تاریخی تصور کے فقدان پر اعتراض ہے لیکن وہ عصری ادبی تاریخوں سے مطمئن بھی نہیں کیونکہ ان کے یہاں ادب اور معاشرے کے معنی خیز جدلیاتی رشتوں میں روح دکھائی نہیں دیتی۔ زبان میں معنویت پہلے سے چھپی ہوتی ہے جس کی مدد سے مخصوص ثقافت معاشرتی حقائق کو قیاس میں لاتی ہے۔ بارتھ نے موضوعی فلسفیانہ جمالیاتی نظریات اور لسانی ہیئت پسندی کے درمیان خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ ان کی علمی و تنقیدی شہرت، وجودیت پسند، مارکسسٹ، ماہر ساختیات، لسانیت دان، متنی نقاد کی ہے۔ عمرانیات کو انھوں نے ادب کے ساتھ جوڑ دیا اور فکری رویوں کی نئی حدود بھی متعین کیں اور اس کی درجہ بندی سے انحراف کرتے ہوئے "نظامیانہ" (Systematization) کو رد کیا۔ لہٰذا ماہر عمرانیات ان

کے نظریات سے معاملہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ ان کی مشہور کتابیں یہ ہیں:

(1) Writing Degree Zero (2) Elements of Semiology (3) S/Z

نوام اورام چاسکی 1928 (Noam Avram Chomsky)

امریکی ماہر لسانیات، سیاسی مضمون نگار، سیاسی ایکٹووسٹ، فلاڈلفیا (پینسلوانیہ) میں پیدا ہوئے۔ والد عبرانی کے عالم تھے جو ۱۹۱۳ء میں روس سے نقل مکانی کر کے امریکہ آئے اور گرناس ٹیچنگ کالج فلاڈلفیا میں بطور عالم کے خدمات انجام دیتے رہے۔ جب نوام چاسکی دس سال کے تھے تو انھوں نے اپنے والد کے مرتب کیے ہوئے انیسویں صدی کے ایک مسودے کی پروف خوانی کی جس کا نام "David Kimhi Hebrew Grammar" تھا۔ انھوں نے فلاڈلفیا کے ایک اسکول سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد یونیورسٹی آف پینسلوانیہ میں داخلہ لیا جہاں انھوں نے لسانیات، ریاضی اور فلسفے کے مضامین لیے۔ ان تدریسی مطالعوں کے علاوہ مشرق وسطی کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور اسرائیل کا معروض وجود میں آجانے کے بعد انھوں نے فلسطین جانے کا ارادہ کیا مگر اس وقت زیلن ہیرس جو اس جامعہ میں لسانیات کے پروفیسر تھے اور چاسکی کے ساتھ مشرق وسطی کی سیاست میں دلچسپی لیتے تھے، چاسکی کو فلسطین کے سفر سے باز رکھا اور انھیں اپنی تعلیم مکمل کرنے کا مشورہ دیا۔ ۱۹۴۹ء میں چاسکی نے لسانیات میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اسی جامعہ سے ایم اے لسانیات کرنے کے بعد ۵۱-۱۹۵۰ء میں وہیں لسانیات کے اسسٹنٹ انسٹرکٹر بھی رہے۔ ساتھ ہی وہ سیکو اسرائیل اسکول میں عبرانی پڑھاتے رہے ۱۹۵۵ء میں انھوں نے یونیورسٹی آف پنسلوانیہ سے "تبدیلی ہیئت تجزیے" (Trans Formational Analysis) کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور میساچوسس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MIT) میں جدید زبانوں کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ چاسکی کا نظریہ زبان بہت ہی غیر رواتی ہے لہٰذا کئی لسانی جرائد نے ان کے مقالات کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ۲۹ رسال کی عمر میں ان کی کتاب Syntactic Structure نیدرلینڈ (ہالینڈ) سے شائع ہوئی۔ ان کا لسانی نظریہ اصل میں تجربی (Empiricalism) ساختیات اور بلوم فیلڈ کے نظریات کا مغلوبہ ہے۔ چاسکی نے زبان

کو عادات کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہوئے اسے بیوہار (Behavior) کا نظریہ بنادیا۔ انھوں نے ریاضی کے حوالے سے اپنا لسانی نظریہ پیش کیا۔ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے Aspects of the Theory of Syntax لکھی جس میں انھوں نے تجربی اور بیوہار کی رسائی پر سخت تنقید کی اور عقلیت کے فلسفے سے اپنے آپ کو قریب کیا خاص کر وہ ڈیکارٹ سے خاصے متاثر ہوئے۔ چھٹی کی دہائی میں چامسکی کے سیاسی نظریات سے متاثر ہو کر نیویارک میں "ریڈیکل جیوش کمیونٹی آف نیویارک" تشکیل دی گئی۔ یہ تنظیم اشتراکی اور نراجی فلسفے اور نظریات کی قائل تھی۔ چامسکی ویت نام کی جنگ کے خلاف مظاہروں میں بھی پیش پیش رہے۔ ۱۹۶۳ء میں مشرق وسطی میں امن کی کوششوں پر کتاب لکھی۔ ۹۰ء کی کویت عراق جنگ پر بھی ان کی کتاب آچکی ہے۔

جاناتھن کلر Jonatan Culler (1944)

امریکی ادبی نقاد اور نظریہ دان، امریکی ریاست اوہایو کے شہر کلیولینڈ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں ہارورڈ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ سینٹ کالج آکسفورڈ سے بی اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء میں بی۔ فل اور ۱۹۷۲ء میں ڈی۔ فل کی ڈگری مکمل کی۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں رسل نوویل کا انعام ملا۔ وہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھا چکے ہیں۔ وہ کارنیل اور نیویارک میں تقابلی ادب کی تدریس سے بھی متعلق رہے۔

کلر نے فرانسیسی ساختیات اور پس ساختیات کو انگریزی زبان سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے تشریح متن، قاری، ادبی قرائن کے علاوہ فلوبرڈ، ساسر، بارتھ پر بھی لکھا۔ ان کی دو کتابوں نے ساختیاتی فکر میں اہم جگہ پائی۔

(1) On Deconstruction, Theory and Criticism After Structuralism (1982)
(2) Structuralist Poetics (1975)

پال ڈی مین 1919-1983 (Paul Deman)

نقاد اور ادبی نظریہ دان، بلجیم کے شہر انتورپ (Antwerp) میں پیدا ہوئے۔ ڈی مین جب سولہ سال کے تھے تو ان کے بھائی کا ریل کے حادثے میں انتقال ہو گیا اور اس صدمے

سے ان کی والدہ نے خودکشی کر لی۔ ڈی مین نے یونیورسٹی آف برسلز سے سائنس اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا ایک مضمون "یہودی جدید ادب میں" نزاع کا سبب بھی رہا۔ اس پر خاصی لے دے ہوئی۔ اس مضمون میں انھوں نے جدید ادب پر یہودی اثرات کا جائزہ لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انھوں نے کئی تراجم کے علاوہ میلول کی "موبی ڈک" کا ترجمہ بھی کیا۔ انھوں نے فن کی کتابوں کا طباعت خانہ بھی کھولا مگر وہ اس میں ناکام رہے۔ ۱۹۴۸ء میں انھیں ایک کتاب گھر میں کلرک کی ملازمت مل گئی جہاں ان کی ملاقات مشہور ادیبہ میکارتھی سے ہوئی۔ وہ ڈی مین کی قاموسی علمیت سے بہت متاثر تھیں۔ انھی کی سفارش پر وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک بورڈ کالج نیویارک میں پڑھاتے رہے۔ اسی دوران انھوں نے اپنی ایک سابقہ طالبہ سے بغیر پہلی بیوی سے علیحدگی یا طلاق کے شادی کر لی۔ بعد میں وہ بوسٹن آگئے اور ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ تقابلی ادب میں داخلہ لیا۔ وہ کارنیل یونیورسٹی (۱۹۶۰-۶۷ء)، جان ہاپکنز یونیورسٹی (۱۹۶۷-۱۹۷۰ء)، اور ییل یونیورسٹی (۱۹۷۰-۱۹۸۳ء) میں پڑھا چکے ہیں۔ وہ ان جامعات میں فرانسیسی ادب کی تعلیم دیتے رہے۔ ڈی مین کی تحریریں پس ساختیاتی تنقیدی رویوں سے پر ہیں۔ ان کے خیال میں اصل قرات غیر معمولی ہوتی ہے۔ ان کی کتاب "Blindness And In Sight" (1971) اصل میں آوں گارد فکر کی قوت ہے جس میں کئی حوالے سے ساختیات کے نظریات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ پھر ڈی مین نے ہیرالڈ بلوم، جیفری ہارٹ مین، ہلس ملر کے ساتھ مل کر "ییل دبستان" تشکیل دیا۔ (جس کو Gang of Four بھی کہا جاتا ہے) اس مکتب کے مقلدین میں سنتھیا چیس (Cynthia Chase) باربرا جانسن (Barbara Jonson) اور کارل جیکب (Caral Jacabs) کے نام نمایاں ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ڈی مین کی دریدا سے ملاقات ہوئی۔ ڈی مین دریدا کی فکر سے خاصے متاثر ہوئے اور دونوں نے روسو کے متن ہیڈیگر کی تنقید اور مابعد الطبعیات شکنی پر مشترکہ طور پر لکھا۔ ڈی مین نے ہیڈیگر کے قول محال پر لکھتے ہوئے ہیڈیگر کے جرمن نغماتی شاعر ہولڈن کی غلط قرات پر تنقید کی۔ ان کی دیگر کتابوں میں

(1) Allegories of Reading (1979) (2) Resistance Theory (1986)
(3) Aesthetic Ideology (1988) (4) Fugitive Writing

بہت اہم ہیں۔

ژاک دریدا (Jacques Derrida) 1930

فلسفی، لسانی اور ادبی نظریہ دان، فرانسیسی الجزائر کے مقام الیبر (Al Biar) میں پیدا ہوئے۔ فرانس میں فوجی ملازمت سے فارغ ہو کر ایکولو نارمل سے ژان ہائے پولٹ (Jean Hypplite) کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ (ہائے پولٹ نے ہیگل کی مظہریات کو فرانسیسی میں ترجمہ کیا) ۵۷-۱۹۵۶ء کے دوران ہاورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۰ء تک فرانس کی سوربون میں فلسفہ پڑھاتے رہے۔ جہاں نوجوان دانشوروں کے ایک حلقے نے معروف آوان گارد جریدہ تیل کویکل (Tel-Quel) جاری کیا۔ ۱۹۷۰ء تک دریدا ایکولو نارمل میں فلسفہ تاریخ کے استاد رہے اور مشہور گروپ "Grepe" کے رکن رہے جس کا مقصد فلسفے کی تدریس کے لئے بہتر ماحول پیدا کرنا تھا۔ دریدا نے انگلستان اور امریکہ کی کئی جامعات مثلاً ییل، جان ہاپکنز، یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، لاس انجلیس میں بطور مہمان پروفیسر کے خطبات دیئے۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ہوسرل کی ایک کتاب کے حصے سے اثر قبول کرتے ہوئے "The Origin of Geometry" لکھی جس میں دریدا نے مغربی مابعد الطبعیات پر سخت اعتراضات کئے کیونکہ علمیاتی بنیاد پر معنی اور تخلیق گفتاری دنیا کو رد کرتی ہے۔ دریدا کے اس کڑے مطالعے نے روسو، فرائڈ، لیوی اسٹروس اور فوکو پر سخت تنقید کی اور مغربی فلسفے کی تاریخ کو نئے انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے فلسفے کو "تکلیف زدہ" روایت قرار دیا جو اس کے تحریری مخاطبے میں بھی نظر آتی ہے۔ دریدا اس بات کے قائل ہیں کہ "متن سے باہر کچھ نہیں ہوتا"۔ دریدا کے فلسفیانہ، لسانی اور متنی تصورات متنازعہ ہیں جو انکاریت اور غیر ذمہ داری کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا رڈ تشکیل کا نظریہ خالصتاً تنقید کو نئی صورت میں پیش کرنے کا نظریہ ہے۔ دریدا نے روسو، ساسر، فرائڈ، افلاطون، ژاں ژینے، ملارمے، ہوسرل، اے جے آسٹن اور کانٹ کے متنوں کو گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کی نئی تشریح خلق کی۔ وہ پہلے ایک اچھے قاری ہیں پھر ماہر مفسر ہیں جس کے پس منظر میں ان کی فلسفیانہ تربیت کا بڑا ہاتھ ہے۔

ان کی معروف کتابوں میں:

(1) Of Grammatology (1976) (2) Edmund Husserl's Origin of Geometry

(1978) (3) The Archealogy of the Frivolous, Reading Condillac (1981) (4) Writing and Difference (1978) (5) Position (1981) (6) Margins of Philosophy (1983) (7) Barbara Jonson's Dissemination (1981) (8) The Postcard (1985) شامل ہیں۔

مشل فوکو (Michel Foucault) 1926-1984

فرانسیسی فلسفی، نقاد، ماہر نفسیات، ۱۹۴۸ء میں سوربن یونیورسٹی سے فلسفے کی اور ۱۹۵۰ء میں نفسیات کی سند حاصل کی۔ دو سال بعد انھوں نے نفسیاتی امراض کے شعبے سے ڈپلوما حاصل کیا۔ اسی تربیت کے پس منظر میں انھوں نے "Madness and Civilization" لکھی جس نے انھیں بحیثیت نقاد، فلسفی اور نفسیات دان کے شہرت بخشی، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے انحرافی نظریات کا بھی مطالعہ کیا اور معاشرتی سطح پر نفسیاتی تاریخ کے ارتقا کا مطالعہ کرتے ہوئے انھوں نے نفسی امراض، جنسیات، معاشیات، فطری سائنس، قواعد، لسانیات اور جرمیات کے علوم میں بھی دلچسپی لی۔

وہ یونیورسٹی آف کلیر ماؤنٹ، فرینڈز میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد وہ کالج ڈی فرانس میں تاریخ اور نظام افکار کے پروفیسر بھی رہے۔ ایلن تورین اور فوکو نے ایک ساتھ ہی اپنا فکری سفر شروع کیا لیکن فوکو نے وجودیت اور ساختیات میں دلچسپی لی۔ جن دنوں فرانس میں دو نظریہ حیات کی کشمکش جاری تھی تو فوکو مارکسزم سے دور رہے۔ فوکو کی شروع کی تحریروں میں شاید ہی کہیں مارکس کا نام آیا تھا۔ ان کی فکری رسائی غیر تاریخی ہے لہٰذا وہ مارکس کے روایتی تجزیات، دوخالقیت اور عملیات سے دور رہے۔ ان کی ساری دلچسپی اس بات پر رہی کہ عقائد اور ساختیات کی آگہی انسانی فکر کے بین السطور میں رواں دواں ہوتی ہے جو شخصیات کا بھی انعکاس کرتی ہے۔ ان کی تمام فکری سرگرمیاں تاریخی رویوں سے انحراف کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ فوکو اپنے "ساختیاتی" ہونے کے منکر ہیں۔ انھوں نے بارتھ، آلتھیوز، لاکان، سارتر اور لیوی اسٹروس سے جو ادبی اور فکری محاکمہ کیا، وہ کسی ڈسکورس سے کم نہیں۔ انھوں نے ماہر عمرانیات اگسٹ کاملے اور درکھائم کے نظریات سے بھی گہرا اثر قبول کیا۔ وہ ڈسکورس (مخاطبے) کو فرد کے ذہن کی کلیدی سرگرمی کہتے ہیں۔ معنویت ان

کے یہاں ایک وسیع میدان ہے۔ فوکو کا خیال ہے کہ اقتداری طبقہ ایک مخصوص ڈسکورس کو طاقت کے ذریعے پوری قوم پر نافذ کر دیتا ہے۔ ان کی معروف کتابوں کے نام یہ ہیں:

(1) Madness and Civilization (1961) (2) The Birth of the Clinic (1965)
(3) The Order of Theings (1966) (4) History of Sexuality (Ist vol. 1987)

ٹیری فرانیس ایگلٹن (Terry Francis Eagleton) 1943

انگلستانی ادبی نقاد، مضمون نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور مدیر سیل فورڈ (Salford) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ مقامی اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے ملحق ٹرنٹی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ جہاں ان کی ملاقات مشہور انگریزی مارکسی نقاد ریمنڈ ولیم سے ہوئی اور مستقبل میں ان کی تحریروں پر ریمنڈ کا خاصا اثر رہا۔ ایگلٹن نے ٹرنٹی کالج سے ہی ماسٹر اور ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی اور اکیس سال کی عمر میں جیسن کالج کیمبرج کے فیلو منتخب ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں وڈھم کالج (آکسفورڈ) آگئے۔ ۱۹۸۸ء میں ریمنڈ ولیم کے انتقال کے بعد ایگلٹن برطانیہ کے سب سے معروف مارکسی ادبی نقاد قرار پائے۔ ان کی ادبی تنقیدوں میں تاریخی، سیاسی اور معاشرتی صورت حال کے رشتوں کو دیکھا جا سکتا ہے اور انھوں نے تخلیقی سطح پر ''متن کی سائنس'' کے تصور کو پروان چڑھایا۔ ان کا خیال ہے کہ ماورائی نظریات کی غلط تشریح متن کی تفہیم میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ ایگلٹن متنازعہ نقاد ہیں جو کبھی کبھار جمالیاتی پیمانوں سے بھی اپنے انتقادی نظریات کی تزئین کرتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے درمیانی عرصے میں وہ بحیثیت ''ہیومن اسٹک سوشلسٹ'' کے بھی معروف ہوئے جو ریمنڈ ولیم کی فکری اور تنقیدی روایت کا حصہ تھا۔ ان کی اہم کتابوں میں:

(1) Myth and Power (1975) (2) Literary Theory: An Introduction (1983)
(3) The Function of Criticism: From "The Spectator" to Post Structuralism (1984) (4) The Ideology of Aestetic (1990) شامل ہیں۔

امبرٹو ایکو (Umbertoeco) 1932

اطالوی ماہر نشانیات، نقاد، ناول نگار شمالی اٹلی کے چھوٹے سے قصبے سانڈریا (Sandria)

میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فلسفہ اور ادب کا مطالعہ کیا اور ۱۹۵۴ء میں ٹورین (Turin) یونیورسٹی سے فلسفے کے مضمون میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں وہ اطالوی ٹیلی ویژن سے منسلک ہوئے۔ وہ اس سے قبل دوران ملازمت ۱۹۶۴ء تک مختلف تعلیمی اور تحقیقی اداروں اور درسگاہوں میں خطبات دیتے رہے لیکن وہ زیادہ تر ٹورین یونیورسٹی سے ہی منسلک رہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۵ء تک وہ میلان یونیورسٹی میں لیکچرار رہے پھر ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۹ء تک وہ فلورنس میں بصری ابلاغ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ دو سال بعد انھیں میلان پولی ٹیکنک میں نشانیات کے پروفیسر کے لیے منتخب کیا گیا اور آج کل اسی حیثیت سے یونیورسٹی آف بلوونا (Boloana) میں تعینات ہیں۔ شروع شروع میں ایکو نے تاریخی، ادبی اور فلسفیانہ موضوعات پر مقالے لکھے جو ان کی پہلی کتاب میں شامل ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے جیمس جوائس کی شعریات پر کام کیا وہ ایک مشہور ہفت روزہ "Espresso" (میلان) میں مضامین، کالم لکھنے کے علاوہ لوگوں کے انٹرویوز بھی لیتے رہے۔ لسانیات کا مطالعہ بنیادی طور پر ان کا مکتبی کارہائے نمایاں ہے لہٰذا ان کی کتاب "A Theory of Semiotics" (1976) کو اس میدان میں پہلا ''سائنسی رجحان'' قرار دیا گیا جس نے نشانیات کا تجریدی اور تجزیاتی ماڈل فراہم کیا۔ انھوں نے "The Absent Structure" (1968) میں نشانیات کا علمیات کے ساتھ تقابل کر کے نئی ساختیاتی بحث کو چھیڑا۔ اس کتاب کے سات زبان میں تراجم ہوئے۔ ایکو کی یہ کتاب اہرام، ریاضی کے کلیوں، جدول، نوٹس کے حاشیوں سے بھری پڑی ہے جس میں گہرے فلسفیانہ مفاہیم پوشیدہ ہیں جو نظریاتی متعلقات اور ممکنات کے پس منظر میں معاشرتی سطح پر تفاعل کی ایک ایسی مشترکہ وحدت بن جاتی ہے جو ہر مظہر میں نظر آتی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "The Role of the Reader" (1979) ان کے نو مقالات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۲۹ء سے ۱۹۷۷ء تک مختلف جرائد میں شائع ہوتے رہے جس میں انھوں نے تحقیقی نقطہ نظر سے ''بند اور کھلے'' متن کے درمیان پائے جانے والی جدلیات سے بحث کی ہے اور متن کی تشریح میں قاری کے رول کی شراکت اور معاونت پر سیر حاصل بحث کی ہے ''نشانیات اور زبان کے فلسفے'' میں انھوں نے نشان، علامت، رموز، استعاروں اور Isotopsy کو موضوع بحث بنایا ہے۔

ناتھروپ ہرمن فرائی (Northrop Herman Frye) 1912-1991

کینیڈین ادیب، نقاد، ماہر تعلیم، ادبی نظریہ دان، عیسائی مبلغ ۱۴ر جولائی ۱۹۱۲ء میں شربروک کیوبک، کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ ۲۳ر جولائی ۱۹۹۱ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے ٹورنٹو میں انتقال ہوا۔ فرائی ابتدائی تعلیم مانکٹن (Moneton) نیو بروشوک سے حاصل کرنے کے بعد موسیقی اور ایک سال تجارتی کالج میں تربیت حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں یونیورسٹی آف ٹورنٹو، وکٹوریہ کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۳ء میں اعزاز کے ساتھ فلسفہ اور انگریزی میں سند حاصل کی۔ تین سال بعد امیونل کالج ٹورنٹو سے الہیات کی ڈگری بھی حاصل کی اور کچھ کام انگریزی میں بھی کیا۔ ۱۹۳۶ء میں یونائیٹڈ چرچ آف کینیڈا نے انھیں مبلغ نامزد کیا۔ ۱۹۴۰ء میں فرائی نے مارٹن کالج آکسفورڈ سے انگریزی میں ایم اے کرنے سے ایک سال قبل ہی وکٹوریہ کالج میں لکچرار بن چکے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پروفیسر بنے اور ۱۹۵۹ء میں اسی کالج کے پرنسپل نامزد ہوئے۔ وہ یونیورسٹی آف ٹورنٹو میں پچاس سال تدریس کے پیشے سے منسلک رہے۔ فرائی بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے رجحان ساز نقاد کی صورت میں ابھرے جب ان کے چار مضامین پر مبنی کتاب "اناٹومی آف کریٹیسزم" سامنے آئی۔ یہ تنقیدی مطالعہ اصل میں علامتوں، اسطور، قوسیاتی (آرکی ٹائپ) تنقید کے ادبی نظریات پر مشتمل تھا۔ جس میں فرائی نے خالصتاً انسانی رسائی کو اپنایا جس کو نقادوں نے "کلاسیک آف ماڈرن کریٹیسزم" بھی کہا کیونکہ اس کتاب میں اقدار پر نکتہ آفرینی کے علاوہ جمالیاتی متعلقات کی آگہی سے بحث کرتے ہوئے ارسطو کے شعری نظریات اور نظام کی نامیاتی رسائی پر مغز باتیں کی گئی ہیں۔ خاص طور پر فرائی نے اس کتاب میں اصطلاحات کے طریقہ کار کی درجہ بندی کو بھی روشناس کروایا۔ ۱۹۴۷ء میں فرائی نے ولیم بلیک پر کتاب لکھی اور بلیک کی شاعری کو اسطوری کہا لہٰذا نقادوں نے فرائی کو "اسطوری دبستان" سے وابستہ کرایا۔ اور انھوں نے علامتوں، آرکی ٹائپ، اسطور کو ادب کا ساختیاتی اصول قرار دیا۔ فرائی کی علمی و تنقیدی کتابیں یہ ہیں:

(1) Fearfull Symmetry (1947) (2) Antonomy of Criticism (1957) (3) Fables fo Identity (1963) (4) Developing Imagination (1963) (5) The

Well-Tempred Critic (1963) (6) T.S. Eliot (1963) (7) Educated Imagination (1964) (8) Return of Eden (1965) (9) A Natural Perspective (1965) (10) Fool of time (1967) (11) The Modern Century (1967) (12) A Study of English Romanticism (1968) (13) The Stubborn Structure (1970) (14) The Great Code (Onbible)

اسٹینلے یوژن فش (Stanley Eugene Fish) 1938

امریکی ادبی نقاد اور نظریہ دان، امریکہ کی ریاست روڈ آئی لینڈ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں پنسلوانیہ یونیورسٹی سے بی اے، ۱۹۶۰ء میں ییل یونیورسٹی سے ایم اے اور ۱۹۶۲ء میں پی ایچ ڈی کی۔ ان کا زیادہ تر کام قاری اساس تنقید پر ہے۔ ان کی کتاب Surprised by Sin: The Reader in Paradise Lost (۱۹۶۷ء) میں شائع ہوئی۔ انھوں نے ۶۳-۱۹۶۲ء میں برکلے یونیورسٹی کیلی فورنیا سے اپنے تدریسی کیریئر کا آغاز کیا۔ ۶۲ء سے ۶۷ء تک اسسٹنٹ پروفیسر اور ۶۷ء سے ۶۹ء تک انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ۶۹ء سے ۷۴ء تک جان ہاپکنز یونیورسٹی مریے لینڈ، بالٹی مور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۵ء تک نارتھ کیرولینا کی ڈرہم یونیورسٹی میں انگریزی اور قانون کے پروفیسر نامزد ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا میں مہمان پروفیسر بھی رہے۔ انھوں نے نشاۃ ثانیہ پر کئی مضامین لکھے۔ فش موضوعی نوعیت کی حتمی تشریحات میں دلچسپی لیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ قاری کو متن کی قرات کے دوران الفاظ کی ترتیب پر غور کرنا چاہئے۔ وہ قاری کو اہمیت دیتے ہوئے اس کے ذاتی تجربے کو اہم اور کلیدی تصور کرتے ہیں اور متن کی معنویت قاری کی قرات کے بعد ہی نمایاں ہوتی ہے لہٰذا نقاد کے لئے ضروری ہے کہ متن پر قاری کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والی صورت حال کا تجزیہ کرے۔ لہٰذا فش متن کے تجزیے کے لئے "مخاطبے" کے عمل سے گذرتا ہے جس سے بعض دفعہ قاری کی موضوعی تشریح سخت قسم کی مقتدریت کو تشکیل دے دیتی ہے جس کو وہ اپنے طور پر جدلیاتی تصور کئے ہوئے ہیں لیکن وہ ادبی افہام و تفہیم کو اقتباطی تصور نہیں کرتے، وہ موضوعی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی معروض سے انکار نہیں کرتے جو لسان کے باطن میں ابلاغ کے عمل سے دو چار ہوتی ہے۔ فش نے اپنے ہم عصر دریدا اور فوکو سے بھی اثر قبول کیا لہٰذا ان کے یہاں بھی تشریح کی جدلیاتی حکمت عملی انسان

پسندی کی طرف مراجعت کرتی نظر آتی ہے اور مخصوص احوال میں انسانی سطح پر خود انسان کو ہی دریافت نہیں کرپاتی جس سے یہ نتیجہ نکلا کہ فش کی تحریروں میں طنزیاتی رنگ بھی ابھر آتا ہے اور وہ معاشرتی متعلقات سے کنارہ کش ہو کر ہمیشہ کے لئے ذاتیت (Self-hood) کے التباس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی اہم کتابیں یہ ہیں:

(1) John Skelton Poetry (1965) (2) Self-Consuming Artifacts: The Experience of Seventeenth-Century Literature (1970) (3) The Living Temple: George Herbert and Catechizing (1978) (4) Is There a Text In This Class: A Authority Interpretative Communities (1980) (5) Doing What Come Naturally: Change, Retoric and the Practice of Theory in Leterary and Legal Study (1989)

واکر گبسن (Walker Gibson)

یونیورسٹی آف میساچوسیس (ایمرس) میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ متن کے اسٹائل اور زبان سے متعلق ان کی اصطلاح "نقلی قاری" (Mock Reader) خاصی معروف ہے۔ وہ ۱۹۶۲ء میں "Limits of Language" کو مرتب کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں "The Play of Language" کے معاون مدیر رہے۔ وہ کئی سیمناروں اور کئی جامعات میں لسانی اور قاری اساس تنقید کے تحت خطبات دے چکے ہیں۔ "کالج انگلش نمبر ۲ فروری ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں ان کے ایک مقالے "Authors, Speakers, Readers and Mock Readers" نے بہت شہرت پائی۔ ان کی کتاب کا نام "Tough, Sweet and Stuffy: An Essay on Modern American Prose Styles (1966) ہے۔ ۱۹۷۰ء میں گبسن نیشنل کونسل آف انگلش ٹیچر کے صدر رہے اور اسی زمانے سے وہ ایم ایل اے (MLA) میں صیغۂ درسی تحریروں کے صدر نشین بھی ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے NEH سیمینار کے تحت کالجوں کے اساتذہ کے لئے تحریر اور اسٹائل کا پروگرام ترتیب دیا۔

لوسین گولڈمین 1913-1970 (Lucien Goldmann)

رومانیہ نژاد فرانسیسی نقاد اور عمرانیات داں ۱۹۳۴ء میں فرانس میں مقیم ہوئے۔ گولڈمین کے تنقیدی نظریات پر لوکاش کے نظریات کا گہرا اثر رہا۔ وہ یورپ کی فکری تحریک "مارکسیت

ہیومن ازم" کے اہم نقادوں میں سے ایک ہیں۔ اس تحریک کو دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کی فکری فضا میں سب سے توانا فکری تحریک کہا گیا۔ وہ فرانس میں Ecole Pratique Deshautes Etudes اور "سینٹر آف شیولوجی آف لٹریچر" کے ناظم بھی رہے۔ انھوں نے کچھ دن ژاں پی اژے (Piaget) کے معاون کی حیثیت سے کام کیا اور "جنیاتی ساختیات (Genetica Structuralism) کا تصور پیش کیا جو کہ تاریخی تصور ہے۔ جولیا کرسٹیوا کی نظریاتی، علمی، تنقیدی اور لسانی منصوبوں میں بحیثیت معاون ان کی شریک رہی۔ گولڈمین کے مطالعوں میں ایک اہم تصور "تصور کائنات" کا ہے جس نے دنیا کے فکری حلقوں میں دھوم مچادی۔ اس میں کائنات کا تصور معاشرتی گروہوں کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔ گولڈمین کی نظر میں یہ تصور ادیب کے تناظر سے قریب تر ہے جو مطلق دنیا میں فن کے عمل سے بھی متعلق ہوتا ہے۔ الہیات کے نتائج کے سبب مصنف دنیا اور خدا کی حس سے دستبردار ہو جاتا ہے، خدا حاضر نہیں ہوتا، وہ چھپا ہوا ہے اور خاموشی سے مشاہدہ کر رہا ہے۔ اطالوی ماہر نشانیات ماریا کورٹی (Maria Corti) نے لکھا ہے "گولڈمین کے طریقہ کار اس وقت زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جب معاشرتی ساختیہ وسیع ادبی نظام کا ساختیہ بن جائے۔ یہ ادبی "کل" ہے جس سے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں اور مزید معاشرتی پہلوؤں کے پیغامات سامنے آتے ہیں۔"

گولڈمین کی کتابوں کے تراجم خاصے دنوں بعد انگریزی میں ہوئے۔ جس کے سبب ان کے اعتقادی اور فکری کارنامے وقت پر ابھر کر سامنے نہ آسکے۔ ان کی تحریروں کی فہرست یوں بنتی ہے۔

(1) The Hidden God (1959) (2) Towards a Sociology of the Novel (1864) (3) Essays on Method in the Sociology of Literature (Translated and Edited by Wiilaim Q. Bielhower 1980) (4) Jean Piaget and Philosophy (5) The Language and Criticism (6) Immanuel Kant (1971) (7) Kierkegard Vivant (1966) (8) Lukacs and Heidegger

یورگن ہبرماس 1929 (Jurgen Habermas)

جرمنی کے معاشرتی سائنسداں، مارکسی نقاد اور نظریہ داں ڈسل ڈورف (Dussl Dorf)

میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم کا آغاز گوٹنگس اور زیورچ یونیورسٹی سے ہوا۔ ۱۹۵۴ء میں بون یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ وہ ہیڈل برگ اور فرینکفرٹ یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۱ء تک میکس پلیک انسٹی ٹیوٹ کے ناظم رہے۔ آج کل فرینکفرٹ میں قیام پذیر ہیں۔

انھیں جرمنی کا سب سے اہم عصری معاشرتی نظریہ داں قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا بنیادی نظریہ لبرل اور ریڈیکل فلسفہ ہے۔ وہ کانٹ کے فلسفے سے متاثر ہیں لیکن ان کے خیالات سے حقیقت معروضی حوالے سے مکمل طور پر سامنے نہیں آتی۔ وہ مثبت نظریے کو رد کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ اپنی معروضیت کو تجربی سائنسوں سے تصدیق کرواتی ہے۔ کیمبرج ریویو میں برٹ میں شیفرڈ نے لکھا ہے کہ ان کی مثبتیت کے خلاف دلائل ایک ایسی آئیڈیالوجی کا ہتھیار ہے جو ڈیموکریٹ یونیورسٹی اصطلاحات کی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے۔ انھیں عقلی معاشرے پر یقین ہے۔ ہبرماس نے موضوع کے ماضی کی رسائی کی جانب سفر کو بھی موضوع بحث بنایا ہے، جس میں عصری سائنسی تھیوری میں فلسفیانہ کمزوری کو بیان کیا گیا ہے اور مصنف کی سماجی تبدیلی کے رجحان پر نظر دوڑائی ہے۔ انھوں نے چامسکی کے نظریہ "افزائشی گرامر" کو رد کر دیا اور سامر کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی لسانیات حاضر معاشرتی موضوعات سے ہٹ کر خالصتاً ہیئتی اور معروضی مظہریات سے بحث کرتی ہے۔ ۷۰-۱۹۶۰ء کے دوران جواز اور استدلال پر ہبرماس کا گڈامیر سے تفہیماتی پس منظر میں مکالمہ بھی رہا جس میں ابلاغ اور معاشرتی نظام عملیات کے نومولد سانچے پر بڑی گرماگرم بحث رہی۔ اس سلسلے میں ہبرماس نے (1970) "Toward a Theory of Communicative Competence" نامی اپنا معروف مقالہ بھی لکھا۔ ان کی کچھ کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

(1) Communication and the Evolution of Socieity (1979) (2) The Philosophical Discourse of Modernity (1987) (3) Theory and Practice (1973)

جیفری ایچ ہارٹ مین 1929 (Geoffry H. Hartman)

امریکی ادبی نقاد جرمنی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں امریکہ نقل مکانی کی۔ ۱۹۴۹ء میں

کوئن کالج نیویارک سے بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں ییل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر کے اسی جامعہ میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۲ء تک تقابلی ادب کا مضمون پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک اوہایو یونیورسٹی اور ۶۷-۱۹۶۵ء تک کورنیل یونیورسٹی میں استاد رہے۔ کچھ سال بعد ییل یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر واپس آئے۔

ہارٹ مین کے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تیاری میں مشہور نظریاتی ادبی نقاد رینے ویلیک (Rene Wellek) نے رہنمائی کی۔ ان کے مقالے کا عنوان "The Unmediated Vision: An Interpritation of the Wordsworth, Hopkins, Kilke and Valery" تھا۔ یہ مقالہ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ہارٹ مین نے بغیر اجازت کئی سال ییل یونیورسٹی میں رد تشکیل کے نظریے کی تشہیر کی جو بقول ہارٹ مین ان کی اس سے قبل کی جانے والی تنقید کی معذرت تھی۔ متن پر ان کا سب سے زیادہ متنازعہ کام "Text Literature / Derrida / Philosophy" کی صورت میں سامنے آیا۔ انھوں نے ایک آفاقی ماڈل بھی ترتیب دیا جو کہ دریدا کے اصل فکری کارناموں کو پس پشت ڈال کر ان کے خوبصورت جملوں کے سحر میں بھٹک جاتے ہیں۔ ہارٹ مین نے عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کی تنقید کو نظری نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی عملی تنقید تاریخ کے حوالے سے ایک وسیع تفہیماتی تناظر دریافت کرتی ہے جو نئے معنوں کا انکشاف کرتی ہے۔ انھوں نے تنقید میں "باہمی غلبے" کے عنصر کو اہم بتایا ہے۔ ہارٹ مین کے بنیادی انتقادی کارنامے ان کتابوں کی صورت میں سامنے آچکے ہیں۔

(1) Beyond Formalism (1970) (2) The Fate of Reading (175) (3) Akiba's Children (1978) (4) Criticism in the Wilderness (1980) (5) Saving the Text (1981) (6) Easay Pieces (1985)

ایرک ڈونلڈ ہرچ جونیئر 1928(Eric Donald Junior)

امریکی نقاد، ماہر تعلیم، امریکی ریاست ٹینیسی کے شہر میمفس میں پیدا ہوئے لیکن ریاست ارکنساس کے شہر ماروِیل میں پلے بڑھے۔ ۱۹۵۰ء میں کورنیل یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ ییل یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کرنے کے بعد فل برائٹ وظیفے پر ۱۹۵۷ء میں پی ایچ ڈی

کی۔ ۱۹۵۶ء میں ییل یونیورسٹی آف ورجینا (شارلٹ ویل) میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں ان کو "Kennan" پروفیسر آف انگلش" کا خطاب دیا گیا اور ۱۹۸۹ء میں وہ "لندن کینٹ" پروفیسر ہوئے۔ ہرچ کی پہلی کتاب ورس ورتھ اور شیلے کی رومانویت پر تھی ان کی دو کتابوں The Aim of validity in Interpretation (۱۹۷۶ء) میں نظریاتی بنیادوں پر مصنف کے "ارادے" اور "مشترکہ اقسام" پر بحث کی گئی ہے۔ اول الذکر کتاب اسکالر کے ریڈیکل تاریخی ترغیب کے ردِ عمل کے خلاف لکھی گئی۔ جس میں تاریخی عوامل، قانونی، انجیلی تشریحات کے متعلقات سے بحث کی گئی ہے۔ ہرچ کو متن کے مستحکم ہونے کے دعوئی سے انکار ہے جسے ادیبوں کی نسل دوسری نسل میں منتقل کرتی ہے، یہی صورت حال نقادوں اور شعرا کے یہاں بھی نظر آتی ہے جس سے ٹی ایس ایلیٹ اور ایزرا پاؤنڈ بھی نہ بچ سکے جو مصنف یا شاعر کو شاعری کی ترجیحات سے دور کر دیتی ہیں جو کہ غیر شخصی، معروضی اور نامعلوم ہوتی ہیں۔ ہرچ کے خیال میں اصل معنویت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور جو مصنف کی معنویت کے خلاف جاتا ہے وہ معنویت کو نہیں پاتا۔ وہ لسانیات اور تاریخ کا سہارا لے کر بڑی صفائی سے عوامی حقائق میں افتراق پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ذاتی دنیا کے پیچھے تحریری زبان کی پہنچ ہوتی ہے۔ آخر الذکر کتاب میں ہرچ نے معنی کی دوجانی (Dichotomy) کو توسیع فکر سے روشناس کراتے ہوئے متن کی ذمہ دارانہ قرات کو اہم قرار دیا کیونکہ اس سے معنی خیزی پیدا ہوتی ہے جو تاریخی اور موضوعاتی سیاق میں مختلف معنویت کو آشکار کرتے ہیں۔ جس کا پہلا مرحلہ تشریح اور دوسرا مرحلہ تنقید کا ہوتا ہے۔ اور قرات میں مغالطے اس سبب در آتے ہیں کہ قاری کی فلسفیانہ تربیت نہیں ہوتی۔ ہرچ نے ادبی تنقید کے علاوہ اسکول کی ابتدائی جماعتوں کے لئے کئی کتابیں اور نصابی سلسلے لکھے۔

نارمن نارووڈ ہالینڈ (Norman Norwood Holland) 1927

نیویارک میں پیدا ہوئے۔ میساچوسس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MIT) سے ۱۹۴۷ء میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۰ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ وہ بائیں بازو کے لبرل خیالات کے حامل ہیں۔ کیلی

فورنیا کی اسٹینفرڈ یونیورسٹی میں مہمان پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ۵۶-۱۹۵۵ء میں ایم آئی ٹی میں انسٹرکٹر رہے۔ ۵۶ء سے ۶۳ء تک اسسٹنٹ پروفیسر، ۶۳ء سے ۶۶ء تک معاون پروفیسر اور ۱۹۶۶ء سے یونیورسٹی آف نیویارک (بفیلو) میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ انھوں نے "سنی سینٹر (Suny Center) کی بنیاد رکھی جس کا مقصد فن کا نفسیاتی مطالعہ تھا۔ اس ادارے کے وہ ناظم بھی ہیں۔ وہ ایک غیر طبی امیدوار کے طور پر بوسٹن نفسیاتی انسٹی ٹیوٹ اور بوسٹن اور مغربی نیویارک کی نفسیاتی سوسائٹی کے رکن بھی ہیں۔ وہ کئی مقالات لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے شیکسپیئر پر تین کتابیں لکھیں۔ ہالینڈ نے نفسیاتی حوالے سے ادب کی تشریح کی اور ادبی اساس کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان دنوں شیکسپیئر کے نفسیاتی رویوں پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ ہالینڈ کو جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں میں بھی خاصی دلچسپی ہے، خوب سفر کرتے ہیں۔ فلم، عکاسی، اور دریائی سیاحت کا شوق ہے۔ ان کا ایک معروف مقالہ "Unity Identity Text Self" (1975) کو ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن نے شائع کیا۔ ہالینڈ نے اپنی معروف کتاب "The Dynamics of Literary Response" میں ادبی کام کے دوران تشکیل پانے والے ذہنی ماڈل کی تفاعل نقشہ بندی کی ہے جو کہ لاشعور کے واہمے کی صورت میں فکری سطح پر تخلیقی عمل میں موجود ہوتی ہیں۔

(1) The Dynamics of Literary Response (1968) (2) Poems in Person (1973) (3) Five Reader Reading (1975) (4) The First Modern Comedies (1959) (5) The Shakespearean Imagination (1964) (6) Poems in Persons (1973) (7) The Psycho Analystic Study of Literature (1975) (8) Lauging: A Psychology of Humor (1985) ان کی اہم کتابیں ہیں۔

نارمن ہالینڈ نے تحلیل نفسی کی تنقید میں کئی نئے افکار کو روشناس کرایا۔ دریدا اور لاکان کے بعد وہ نفسیاتی تنقید کے سلسلے میں سب سے معتبر ٹھہرے۔ انھوں نے "نئی تنقید" کے حصار سے باہر نکل کر نئی تنقیدی اور فکری رسائیوں کو بھی اپنانے کی کوشش کی۔

ولف گینگ ایزر (Wolfgang Iser) 1926

جرمن ادبی نقاد میرین برگ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یونیورسٹی لپزنگ اور یونیورسٹی

آف ٹوبن جن سے حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی آف ہیڈل برگ سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی جہاں پر انھوں ہانس جارج گڈامیر کے ساتھ مظہریاتی رسائی کو تفہیماتی یا متنی تشریح کا حصہ بنادیا۔ ایزر کا تدریسی اختصاص انگریزی ادب ہے۔ پچاس کی دہائی میں انھوں نے ہیڈل برگ اور گلاسکو یونیورسٹی میں پڑھایا۔ ۱۹۶۷ء میں وہ یونیورسٹی آف کونس ٹنس میں انگریزی ادب کے پروفیسر ہوئے وہ امریکی جامعات پرنسWeleyan میں بھی پڑھا چکے ہیں وہ کیلی فورنیا کی اروئن یونیورسٹی میں مستقل مہمان پروفیسر بھی ہیں۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ اٹھارویں صدی کے انگریزی ناول نگار ہنری فیلڈنگ کے "تصور کائنات" پر تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے وکٹورین عہد کے والٹر پیٹر کے جمالیاتی نظریات کا بھی مطالعہ کیا۔ بعد میں ہانس روبرٹ یاؤس کے ساتھ مل کر ایزر نے "نظریہ قبولیت" کا تعارف کراتے ہوئے اسے واضح کیا۔ ایزر کا خیال ہے کہ ادیب اور قاری کا رشتہ موسیقار اور گلوکار کا رشتہ ہے جس سے موسیقی وجود میں آتی ہے جیسے انھوں نے جرمن موسیقار بیتھون کی مثال سے ثابت کیا۔
اپنے مضمون "Prospecting" میں ایزر اس رجحان کی تشکیل کی کہ ادب بذات خود بحران کی صورت میں ہوتا ہے لیکن ان کا یہ کہنا بھی ہے کہ ادب بذات خود کبھی نہیں مرتا جس کا اعلان آوان گارد ادیب کئی بار کر چکے ہیں مگر ان کے معاشرتی وظائف مزید نمایاں نہیں ہوتے لہٰذا اس مقام پر ادب عصری ثقافت میں اپنا مقام وشناخت کھودیتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قاری اپنی شخصیت اور رویوں کے حوالے سے قرات پر اثر انداز ہوتا ہے جو اصل میں اس کا ساختیاتی تجربہ ہوتا ہے اور انجانی دنیا میں متن کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان کی اہم کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

(1) Fielding's World View (1952) (2) Walter Pater: The Eastetic Moment (1988) (3) The Effective Structure of the Text (1970) (4) Spenss's Arcadia: Function and History of the English Renaissance (1970 (5) The Implied Reader: Pattern's of Communication in Prose Fiction from Bunyan to Beckett (1974) (6) The Act of Reading: A Theory of the Aesthetic Response (1978) (7) Laurence Sterne: Tristram Shandy (1988) (8) Prospecting: From Reader Response to Literary Anthropology (1989) (9)The Fictive and the Imaginary: Charting Literary Anthropology (1993)

شروع کی سات کتابوں کو ایزر نے خود انگریزی میں ترجمہ کیا جبکہ آٹھویں کتاب کو ایزر اور ڈی ایچ ولسن نے مل کر ترجمہ کیا ہے۔

الفریڈ ہبڈنگ کوازبسکی

1879-1950 (Alfred Habdank Korzybski)

پولش نژاد، امریکی ماہر نشانیات، ۱۹۱۵ء میں پولینڈ سے امریکہ نقل مکانی کی۔ انھوں نے "عام نشانیات" (General Semantics) کی اصطلاح کو وضع کرتے ہوئے نئی تنقیدی رسائی کو روشناس کرایا جس کے تحت ارسطو کے لسانی ساختیے کو رد کرتے ہوئے بتایا کہ ارسطو کا لسانی ساختیہ خود ہی شناخت کھودیتا ہے کیونکہ اس میں غلط ملط الفاظ تجرید کی سطح پر آجاتے ہیں چاہے وہ صحیح ہو یا غلط — لہٰذا متن کا ساختیہ پیچیدگیوں کا سبب بن جاتا ہے۔
کوازبسکی نے لسانیات اور نشانیاتی موضوعات پر Ete-A Review of General Semantics میں کئی مقالات لکھے۔ نشانیاتی حوالے سے ان کی کتاب Science and Sanity An Introduction to non-Aristotelian System and General Semantics (1933) اہم ہے۔

جولیا کرسٹیوا 1941 (Julia Kristeva)

بلغارین نژاد، فرانسیسی نقاد اور ادبی نظریہ دان، فرانسیسی میں لکھتی ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم بلغارین میں چرچ کی ننوں (Nuns) کی زیر نگرانی ہوئی۔ شروع میں ان کی خواہش رہی کہ وہ طبعیات اور ستاروں کے علم سے متعلق کوئی پیشہ اختیار کریں لیکن ان کے متوسط خاندان کے روابط کمیونسٹ پارٹی کے ارکان اور بااثر لوگوں سے نہ ہونے کے سبب وہ اپنی تحقیقی تربیت سوویت یونین سے حاصل نہ کر سکیں لہٰذا انھوں نے اپنا میدان سائنس سے فلسفے میں تبدیل کرلیا۔ ۱۹۶۰ء میں مشرقی یورپ کے ثقافتی اور سیاسی بحران کے دوران کرسٹیوا بحیثیت صحافی اخبارات سے منسلک رہیں۔ اسی دوران انھوں نے لٹریری انسٹی ٹیوٹ آف صوفیہ (بلغاریہ) سے لسانیات میں سند حاصل کی۔ ۱۹۶۶ء میں جب "ثقافتی جبر" کم ہوا اور خروشیف کو اقتدار

سے علیحدہ کیا گیا تو وہ فرانس نقل مکانی کر گئیں۔ کرسٹیوا نے ۱۹۶۶ء میں لوسین گولڈ مین کے زیر نگرانی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لئے کام شروع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے تزواتن تودوروف (Todorov) کی بھی فکری تربیت کی۔ کرسٹیوا نے جیکب سن کے فکری پس منظر میں ساختیات کا خزانہ پایا۔ ۱۹۶۷ء سے پیرس میں "کریٹک" اور "لینگوئجز" میں ان کے مقالات شائع ہونا شروع ہوئے۔ انھوں نے ریڈیکل ساختیاتی جریدے "تیل کویل" (Tel-Quel) میں بھی مقالات لکھے اور اس کے مدیر، ناول نگار اور ادبی نظریہ دان فلپ سولر سے شادی بھی کی۔ ساٹھ کے اواخر میں انھوں نے "Trisieme Cycle" کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ ۱۹۷۳ء میں پی ایچ ڈی کا مقالہ La Revolution du langage poetique (انگریزی میں اس مقالے کے پہلے تین حصے شعری لسانیات میں انقلاب کے نام سے شائع ہو چکے ہیں)

کرسٹیوا ان دنوں پیرس یونیورسٹی میں لسانیات کی درس و تدریس سے متعلق ہیں۔ جیکب سن کا کہنا ہے کہ "وہ ہمیشہ مقامات اور اشیاء کو تبدیل کرتی رہتی ہیں۔" کرسٹیوا کمیونسٹ سیاست کو پسند کرتی ہیں مگر کمیونسٹ سکہ بند اصولوں سے انھیں اتفاق نہیں۔ ان کا نشانیاتی نظریہ ساختیاتی نظریے کے خلاف جاتا ہے۔ ان کے نفسیاتی نظریات پر فرائڈ اور لاکان کے گہرے اثرات ہیں۔ انھوں نے تانیثی تحریروں میں اس تحریک سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا۔ ان کی فکری تحریروں کو "Eclectic" بھی کہا گیا کیونکہ ان کی فکریات پر لاکان، بارتھ، التھیوزر، فوکو اور باختن کے نظریات کا عمیق اثر ہے۔ کرسٹیوا نے ادبی عمل کو "مخاطبہ" (ڈسکورس) قرار دیا جس میں سیاسی عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور قرات کے دوران "نئی تاریخیت" کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:

(1) Revolution in Poetic Language (1974) (2) About Chinese Women (1977) (3) Power of Horror (1982) (4) Tales of Love (1987) (5) Black Sun (1989)

رومن جیکب سن 1896-1982 (Roman Jakobson)

روسی نژاد امریکی ماہر لسانیات، ادبی تاریخ داں اور نظریہ داں ۱۹۱۸ء میں ماسکو یونیورسٹی کے لازریو انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل لینگوئجز سے لسانیات میں ڈپلومہ حاصل کیا۔

اسی ادارے میں ۱۹۲۰ء تک بحیثیت محقق کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں وہ ماسکو سے پراگ چلے گئے اور یہیں پر ۱۹۲۶ء میں روسی ہیئت پسندی کے دبستان کو تشکیل دیا اور پراگ دبستان کی بھی بنیاد رکھی۔ جیکب سن شروع سے ہی مستقبلیت کی تحریک سے متاثر رہے جس کو شکلو وسکی اور مایاوسکی نے پروان چڑھایا جن کی شاعری نے انقلاب روس سے قبل باغیانہ رجحان کو جنم دیا۔ جیکب سن کا خیال ہے کہ "لفظ کی صوتیات عمیق سطح پر معنویت سے وابستہ ہوتی ہے لہٰذا نئی شعری زبان صوتیات کے حوالے سے ہی خیالات اور تاثرات کا براہ راست اظہار کرتی ہے۔" ۱۹۳۰ء میں انھوں نے پراگ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ماسارک یونیورسٹی برینو میں روسی لسانیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر کے چیکو سلواکیہ پر قبضے کے بعد کوپن ہیگن (اوسلو) میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۰ء تک بطور مہمان استاد کے کام کرتے رہے۔ اسی دوران وہ کچھ عرصہ "اپسلا" میں بھی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۱ء میں امریکہ آ گئے۔ ۱۹۴۲-۴۶ء تک نیویارک میں بھی پڑھایا۔ ۱۹۵۷ء سے اپنی موت تک ہارورڈ یونیورسٹی کے میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (MIT) سے متعلق رہے۔ انھوں نے ۱۹۵۸ء میں یونیورسٹی آف انڈیانا (امریکہ) کی کانفرنس میں انقلابی زبان اور ادبی تفہیم پر نئی بحث کا آغاز کیا۔ ان کا خیال ہے کہ شاعری دوجانی، نحوی ساختیے کی زبان پر مبنی ہوتی ہے جو اپنے قواعد خود بناتی ہیں۔ بہت سے بڑے شعراء کی زبان سے نقاد مطمئن نہیں ہوتے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ شعری زبان کا تفاعل گونگا بہرہ ہوتا ہے۔ جس سے نقاد کے یہاں مختلف مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جیکب سن نے سالویک مطالعوں کے تحت لفظ کے نمونوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یوروپ کے "فوک ٹیل" پر بھی کام کیا۔ ان کی اہم کتابیں یہ ہیں:

(1) Selected Writing (2 Vols. 1971) (2) Slavic Epic Studies (1966) (3) Slavic Languages (1955) (4) Fundamental Language (1956) (5) Phonological Studies (1962)

فریڈرک جیمسن 1934 (Fredric Jameson)

امریکی نقاد، نظریہ داں، ۱۴ر اپریل ۱۹۳۴ء میں امریکی ریاست اوہایو کے شہر کلیولینڈ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم نیو جرسی سے حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے بی اے

اور ۱۹۵۶ء میں ایم اے کیا۔ ۱۹۶۰ء میں ییل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۷ء تک ہارورڈ یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۶ء تک سینٹاگو یونیورسٹی (کیلی فورنیا)، ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک ییل یونیورسٹی، ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۵ء تک سینٹا کروز یونیورسٹی (کیلی فورنیا) میں پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصہ قبل وہ ڈیوک یونیورسٹی سے متعلق تھے جہاں وہ تقابلی ادب کا مضمون پڑھاتے رہے ہیں۔ وہ روٹری فیلوشپ، ووڈرو ولس فیلوشپ اور فل برائٹ اسکالرشپ پر میونخ اور برلن جا چکے ہیں۔ ایک انسانی ادارے کی گرانٹ پر انھیں دو مرتبہ (۷۰-۱۹۶۹ء اور ۸۰-۱۹۷۹ء میں) Guggenhiem فیلو شپ عطا کی گئی۔ ان کے مشہور مقالے ''مابعد تفسیر'' (Metacommentary) پر بھی انھیں ولیم ویلی پاکر انعام مل چکا ہے جو انھیں جدید زبانوں کی ایسوسی ایشن کی جانب سے ملا۔ وہ مشہور جریدے Social Text کے معاون مدیر رہے اور Minnesota Review کے مدیر معاون بھی رہے۔ انھوں نے امریکہ میں مارکسی ادبی گروپ تشکیل دیا۔ وہ کئی جامعات میں توسیعی خطبات دے چکے ہیں۔ ان کا ادبی نظریہ وابستگی سے عبارت ہے۔ وہ مظہر کے مسائل کو اپنی فکر سے تشکیل دیتے ہیں جس کے پس منظر میں دنیا کی زندگی اور تاریخی بنیادیں واضح ہوتی ہیں جو کہ جیمسن کا جدلیاتی اسلوب بھی ہے۔ ان کی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

(1) Sartre: The Origins of a Style (1961) (2) Marxism and Form: Twentith Century Dialectical Theory of Literarture (1972) (3) The Prison House of Language: A Critical Account of Structuralism and Russian Formanlism (1972) (4) Fables of Aggression, Wyndham, Lewis, The Modernist As Fascist (1979) (5) The Political Unconscious: Narrative as a Socially Symbolic Act (1981)

ژاک لاکان (Jacques Lacan) 1901-1981

فرانسیسی ماہر تحلیل نفسی، پیرس کے متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مسیحی مکتبوں میں ہوئی پھر میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور ماہر نفسیات کی تربیت حاصل کی۔ ان کا پہلا مقالہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں "Paranoid Psychosis in its Relation

to Personality" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ لاکان نے فرائڈ کی طرح امریکی تحلیل نفسی، امریکی تجربیت، بیوہاریت، نفسیات اور عالمی تحلیل نفسی ایسوسی ایشن پر امریکی اراکین کے حاوی ہونے پر برہمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے نفسیات کی ''کلینکل تھیوری'' پر سخت اعتراضات بھی کیے۔ ۱۹۲۰ء کے عشرے میں تحلیل نفسی کے آون گارد گروپ سے بھی متاثر ہوئے اور پیشہ ورانہ آگہی کو دیگر عصری فکری تحریکوں مثلاً سوریلزم اور وجودیت سے بھی جوڑ دیا۔ ۱۹۳۳ء تک انھوں نے شاعری بھی کی۔ لاکان نے فرائڈ کے متن کو نئی قرات کے ساتھ پیش کیا اور فرائڈ کی زبان کو ساسر کے نظریہ لسان سے تقابل بھی کیا۔ ساسر کی لسانیات کا بنیادی اصول اقدار کے نظام میں نہیں ہے۔ بس اس میں ایک فرق یہ ہے کہ وہ ''نشان'' کی مدد سے اشیا کو ایک دوسرے سے تمیز کرپاتے ہیں۔ انھوں نے فرائڈ کی نظریاتی معنویت کو توسیع دی اور فرد کی وحدانی خودمختاری سے انکار کرتے ہوئے ''عمل'' پر زور دیا۔ کیونکہ فرد اور ''معنی نما'' کے رشتے تاریخ کی تبدیلی کا سبب بن جاتے ہیں لہذا فرد کی بازیافت میں کچھ بھی معین نہیں۔ لاکان کا خیال ہے کہ ان کے جدلیاتی اور لسانی نظریات دنیا کے افراد سے خطاب ہے جو فلسفے سے جڑے ہوئے ہیں لیکن وہ ساسر کی لسانی درجہ بندی پر تنقید کرتے ہوئے لسانیات کو معاشرتی حقیقت کا پیمانہ قرار دیتے ہیں۔ شروع میں لاکان اور لیوی اسٹراس نے خوابوں اور اساطیری تصورات کی نقشہ بندی کی۔ انھوں نے فرائڈ کے متن میں نئی معنویت کو تلاش کیا۔ لاکان نے ایڈگر ایلن پو کی مشہور کہانی ''چرایا ہوا خط'' (The Purloined Letter) کی ساختیاتی قرات کی۔ لاکان کے مطابق پو کی اس کہانی میں زبان کہانی کو نیا سیاق عطا کرتی ہے اور کہانی کے بیانیہ کے حوالے سے لاکان نئی حسیت کی تشکیل نو کرتے ہیں۔

وہ کئی مقالات اور کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے چند فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان کی مشہور کتاب کا نام یہ ہے: The Language of the Self (1968)

والٹر بین مائیکلز (Water Benn Michales)

امریکی نقاد کیلی فورنیا کی برکلے یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر

مقالات تشریحی قوانین سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ٹی ایس ایلیٹ اور تورو (Thoreau) پر بھی لکھا۔ حال ہی میں انھوں نے اپنی کتاب :American Epistemologis Literary Theory and Pragmatism مکمل کی ہے۔

جوزف ہلس ملر (Joseph Hillis Miller) 1928

امریکی عالم، نقاد اور ماہر تعلیم، نیوپورٹ نیوز، ورجینیا میں پیدا ہوئے۔ کچھ دن وہ اپنے والدین کے ساتھ لوئیس برگ (پینسلوانیہ) میں رہے جہاں ان کے والد بکنیل (Bucknell) یونیورسٹی میں ڈین آف مین (Men) تھے۔ کچھ دن بعد ان کا کنبہ بالائی نیویارک کے علاقے میں منتقل ہو گیا جہاں ان کے والد ایک بپٹسٹ (Baptist) تعلیمی ادارے کیوکا (Keuka) کالج کے صدر نامزد ہوئے۔ عیسائی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے کے سبب ملر بھی شروع میں اتوار کے مدرسے (Sunday School) میں شرکت کرتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں ملر نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ "وہاں انجیل کے متعلق بہت کم باتیں ہوتی تھیں میں ان معنوں میں مذہبی ہوں اور دوسرے معنوں میں مذہبی نہیں ہوں لیکن میں نے وہاں سے سچائی کی شدت اور کڑے پن کو محسوس کیا جہاں صداقت کے چند مشکوک قیاسات مجھے غفلت کے اندھیرے میں لے گئے، جن پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔"

ملر نے اوبرلن کالج (Oberlin College) سے ۱۹۴۸ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۴۹ء میں ایم اے کیا پھر انھوں نے طبعیات کی تعلیم حاصل کرنا چاہی اور نشاۃ ثانیہ کے مضمون تک مطالعہ کرتے ہوئے ان کے استاد اندریو بونگیوریو (bongiorno) ان کے تدریسی رُخ کو تبدیل کر دیا اور ایک میقات (سمسٹر) ملر کو "ارسطو کی بدیعیات" کا مطالعہ کرایا جس میں ارسطو کے لسان کی عمیق قرات کی گئی۔ پھر ملر ہاورڈ آ گئے جہاں پر مشہور نقاد ڈگلس بش نے ان کے پی ایچ ڈی کے لئے رہنمائی کی اور ۱۹۵۲ء میں انھوں نے "چارلس ڈکنس ور ان کے ناول کی دنیا" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ کر سند حاصل کی۔ اس سے قبل ایم۔اے کرنے سے پہلے ایک سال ولیم کالج میں پڑھاتے بھی رہے۔ ۱۹۵۳ء میں جان ہاپکنز یونیورسٹی میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے اور بیس سال بعد اسی جامعہ میں پروفیسر بنے۔ ۱۹۷۲ء میں ییل

یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریس و تحقیق شروع کی۔ ۱۹۸۶ء سے یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اروائن (Arvine) میں انگریزی اور تقابلی ادب کے پروفیسر ہیں۔ ملر نے لسانیات کی علمی حقیقتوں پر ۱۹۷۰ء میں لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے ماڈرن لینگویج اسوسی ایشن (MLA) کے تحت "The Triumph of Theory" کے موضوع پر خطبہ دیا جس میں "ردِ تشکیل" کے نظریے کا دفاع کیا گیا تھا۔ اور دائیں بازو کے لوگوں کے اس خدشے کو دور کیا کہ ردِ تشکیل روایتی انسان پسندی کے خلاف ہے تو دوسری طرف انھوں نے بیساریت کے لکھنے والوں کے A Historical رجحان کے بارے میں بتایا کہ یہ عصری معاشرے کے لئے ضروری ہے اور "ردِ تشکیل" سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ ادبی مطالعوں کو تہس نہس کر دیتی ہے۔

ہاورڈ میں زمانہ طالب علمی کے دوران ہی ملر نے نئی تنقید سے اثرات قبول کرتے ہوئے اور کامل طور پر متن کی قرات کے مفہوم کی تفہیم کی اور جان ہاپکنز میں قیام کے دوران ہی انھوں نے جنیوا دبستان کی مظہریاتی تنقید کا مطالعہ کیا۔ خاص طور پر ژورژ پولے (Georges Poulet) کی تحریریں اس سلسلے میں اہم رہیں۔ ملر کے بقول یہ موضوع تنقیدی رسائی ہے۔ جنیوا کے نقادوں نے نئی تنقید کے طریقہ کار کو تہ و بالا کر دیا۔ ییل یونیورسٹی میں ہیرالڈ بلوم، جفری ہارٹ مین اور پال ڈی مین ان کے فکری ہم نواؤں میں شامل تھے جن پر دریدا کی تحریروں کا گہرا اثر پڑا۔ ۱۹۸۸ء میں ملر اور تورو روف کا ٹائمز کے ادبی ضمیمے (۱۷-۲۳) میں ایک مکالمہ شائع ہوا جس میں ڈی مین کی نازیوں سے ہمدردی کے مسئلے پر خاصی نوک جھونک ہوئی۔ ڈی مین فلسفی ہیڈیگر کے "چیلے" مشہور تھے جنھوں نے نازی اشتراکیت کو پرجوش انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔ ملر کا کہنا تھا کہ ڈی مین نے ۴۲-۱۹۴۱ء کے دوران نازیوں کے بارے میں طلبا کے ایک فرانسیسی جریدے میں جو کچھ بھی لکھا اس سے یہ معنی اخذ نہیں کر لینے چاہئیں کہ ڈی مین مکمل طور پر فاشسٹ، یہود دشمن اور نازیوں سے مفاہمت کرنے والے انسان تھے لیکن انھوں نے جنگ کے بعد فرانسیسی اقتدار سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ملر کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد ڈی مین کو ہدف بنانا نہیں تھا بلکہ اس کی آڑ میں ردِ تشکیل کی بیخ کنی کرنا مقصود تھا۔ ملر کے تنقیدی شعور میں جنیوا دبستان کا گہرا عکس ہے۔ ان کی آٹھ کتابیں تنقیدی

حوالے سے خاصی معروف ہیں:

(1) Charles Dickens: The World of his Novels (1958) (2) The Disappearance of God: five Nineteeth Century Writers (1965) (3) Poets of Reality: Six Twenteith Century Writers (1965) (4) From The Victorian Fiction (1968) (5) Thomas Hardy: Distance and Desire (1970) (6) Fiction and Repetation: Seven English Novels (1982) (7) The Linguistic Moment (1985) (8) The Ethics of Reading (1986)

ژاں پی ژے (Jean Piaget) 1896-1980

سوئس نژاد فرانسیسی ماہر حیاتیات، ماہر نفسیات طفل، ماہر ساختیات، ریاضی دان، ماہر علمیات جنھوں نے جینیاتی ساختیات (Gentic Structuralism) کے طریقہ کار کو دریافت کیا۔ وہ اوراکی ساختیے پر زور دیتے ہیں اور حیاتیاتی ماڈل کے توسط سے اس کے نفسیاتی اور وظائی عناصر کو اجاگر کرتے ہیں جس کو وہ "نامیاتی روابط" (Organic Coordinations) کا نام دیتے ہیں جو اصل میں انسانی سرگرمیوں اور اوراک میں آئے ہوئے معروض کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ جب سامرنے نشانیات کے میدان میں نفسیات کو داخل کرنے کا عندیہ دیا تو ژاں پی ژے نے ریاضیاتی شناخت کے حوالے سے ساختیے کے تقریباً ہر نمونے کو دریافت کرتے ہوئے حیاتیاتی ساختیے کو ریاضیاتی ساختیے کے اوراک میں تبدیل کر دیا۔ حیاتیات اور ریاضیات کا یہی سنگم "ساختیات" کی اصطلاح پر مرکوز ہوا۔ پی ژے کی ریاضیاتی رسائی کو فرانس میں ایک عرصے تک قبولیت حاصل نہ ہو سکی اس کی وجہ نوجوان آون گارد ادیبوں اور نقادوں کے خیال میں ۱۹۶۸ء کی طلبا کی بغاوت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا لیکن پھر بھی فوکو، ژیل ویلز، سرس (Serres)، لوٹمین نے پی ژے کے ساختیات کے ریاضیاتی ماڈل سے اثر قبول کرتے ہوئے اپنے ساختیاتی نظریے کی تزئین کی جو بہر حال انسانی زندگی کے حقائق کے مطالعے میں طریقہ کار کو واضح کرتے ہیں۔ ژاں پی ژے نے موضوع اور ماحول کے درمیان تفاعل کے طریقہ کار کو بھی واضح کیا جسے لاکان نے "پی ژے کی غلطی" (Piagetic Error) کہا۔ کیونکہ بچوں کا اوراکی مخاطبہ (ڈسکورس) ماحولیاتی اور اوراکی ساختیے کے مابین مبادلہ ہوتا ہے۔

انھوں نے ساختیاتی شناخت اور تنقیدی انتخاب میں سے کسی بھی ایک کو سکونی ہیئت یا مبادلیات کا نظام کہا اور سکونی اور قابل تغیر ساختیے کو ایک دوسرے سے ممیز کرتے ہوئے اضاف کی ترتیب کو ساختیے کی آگہی کہا۔ (جو اصل میں جینیاتی علمیات ہے)

امریکی ماہر لسانیات نوعم چامسکی نے اپنے Generative Grammar کے مطالعے میں پی ژے کے ریاضیاتی اسلوب سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی کتاب "Structuralism" کا انگریزی ترجمہ ۱۹۷۰ء میں ہو چکا ہے۔

ژور ژپولے (Georges Poulet) 1902

ادبی نقاد، نظریہ دان، جینوا مکتب سے متعلق رہے۔ مظہریاتی تنقید کے سبب ان کی تحریروں پر گہرا فکری رنگ ملتا ہے۔ بلجیم کے شہر "چینی" (Chenee) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ وہ جان ہاپکنز یونیورسٹی (امریکہ) اور یونیورسٹی آف ایڈن برگ میں رومانی لسانیات پڑھاتے رہے۔ یونیورسٹی آف زیورچ اور یونیورسٹی آف نیس (Nice) میں فرانسیسی شعبے کے صدر نشین رہے۔ وہ اسکاٹ لینڈ میں بھی پڑھا چکے ہیں۔ انھوں نے قاری اساس تنقید پر خاصی عرق ریزی کی ہے۔ انھوں نے سوال کیا ہے کہ متن اور قاری میں سے معنویت کا سرچشمہ کیسے قرار دیا جائے اور حقیقت اور تشریح کو ایک دوسرے سے کیسے علیحدہ کر کے مطالعہ کیا جائے؟ پولے نے اسی حوالے سے قاری کے مظہریاتی رشتوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ بتایا کہ قرات کے دوران قاری کے یہاں سے موضوع اور معروض کا فرق مٹ جاتا ہے اور نیا باطنی وجود کا ظہور ہوتا ہے جس کو وہ ذہنی معروض کہتے ہیں۔

ان کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:

(1) Studies in Human Time (1949-1959) (2) The Interior Distance (1952- Tr. 1959) (3) The Metamorphoses of the Circle (1061-Tr. 1967) (4) Proustian Space (1977)

جیرالڈ جوزف پرنس (Gerald Joseph Prince) 1942

مصری نژاد امریکی نقاد، مصر کے شہر اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں امریکی

شہرت اختیار کی۔ ۱۹۶۳ء میں بروکلین کالج سے بی اے کرنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی آف فلوریڈا سے ایم اے اور ۱۹۴۸ء میں براؤن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل یونیورسٹی آف پینسلوانیہ میں پڑھاتے ہیں۔ ان کے مطالعات کی کائنات متن سے متعلق رہی ہے اس حوالے سے ان کا مقالہ "Narratair" کو اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے فرانسیسی ادب پر ایک کتاب اور کئی مقالے لکھے ہیں۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے حصوں میں ناول "ڈائری" اور "Metanrrative" لکھی جو بیانیہ کی رسائی کی نئی تکنیک تھی۔ ۱۹۶۸ء میں انھوں نے "Metaphysics and Techniques in Sartre's Fiction" لکھی۔

پرنس نے ۱۹۷۳ء میں "A Grammar of Stories" لکھی۔ کچھ دن پہلے انھوں نے "Narratology: The Form and Functioning of Narrative" مکمل کی ہے۔ آج کل وہ "Dictionary of Narratology" ترتیب دے رہے ہیں۔

پال رکئیوع (Paul Ricoeur) 1913

فرانسیسی فلسفی اور ماہر تفہیمات، فرانس کے جنوب مغربی شہر "ویلنس (Valencec) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انگریزی کے پروفیسر تھے جو پہلی جنگ عظیم میں پال رکئیوع کی پیدائش کے چند ماہ قبل ہلاک ہوئے۔ ان کی پیدائش کے کچھ مہینے بعد ان کی والدہ اور پھر دو سال بعد ان کی بہن کا انتقال ہو گیا۔ پال رکئیوع دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں کی قید میں بھی رہے۔ انھوں نے جرمنی فلسفی ایڈمنڈ ہوسرل کی کتاب "Ideen" کا مسودہ حاصل کر کے اسے فرانسیسی میں بھی ترجمہ کیا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد وہ ایک چھوٹے سے پروٹسنٹ اسکول میں معلم مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں وہ سون برگ میں تاریخ فلسفہ کے پروفیسر ہوئے۔ انھوں نے ہوسرل کے علاوہ کارل جاسپر، مارسل کو بھی فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۵۰ء میں "فطرت اور آزادی" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اس مقالے میں پال سارتر کے "نظریہ آزادی" کو رد کرتے ہوئے فرائڈ کی علامتوں کا بھی مطالعہ کیا گیا۔

رکئیوع کی صحت ہمیشہ خراب رہی لہٰذا انھوں نے فرانسیسی یونیورسٹی سے تین سال کی رخصت لی اور بلجیم کی لووین (louvian)، کیتھولک یونیورسٹی میں پڑھایا اور یونیورسٹی آف شکاگو

سے ۱۹۶۷ء میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۰ء میں ریٹائر ہونے کے بعد وہ پیرس اور شکاگو میں مختلف موقعوں پر خطبات دے چکے ہیں۔ ان کی چند تصانیف یہ ہیں:

(1) Freud and Philosophy (1070) (2) The Conflict of Interpretation (1970) (3) The Rule of Metaphor (1977) (4) Critical Hermeneutics (1981) (5) The Philosophy of Paul Ricoeur (1978) (6) Inter Retation Theory: Discourse and the Surplus of Meaning (1976)

مائیکل ریفاٹیر (Michael Rifaterre) 1924

امریکی لسانی نقاد، ریفاٹیر فرانس میں پیدا ہوئے۔ سوون بون سے ۱۹۴۷ء میں ادب کا "لائسنس" (Licence) حاصل کیا اور پھر ۱۹۵۲ء میں اسی سلسلے کے تحت "سرٹیفکیٹ" بھی حاصل کیا۔ ۱۹۵۵ء میں کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے فرانسیسی میں پی ایچ ڈی کیا اور وہیں تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۴ء میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۳ء تک فرنچ، رومانس اور لسانیات کے پروفیسر رہے۔ اب وہ امریکی شہری ہیں۔ لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ لوگ انھیں Michel کہیں۔ آج کل وہ ہاورڈ یونیورسٹی پریس میں کنٹریکٹ کی بنیاد پر منسلک ہیں۔

ان کی تنقیدی شہرت کا آغاز ان کے دو مقالوں "Criteria for Style Analysis" (1959) اور "Stylistic Context" (1960) سے ہوا۔ ان کی تنقیدی تحریروں میں متن کا بہت قریب سے تجزیہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب "Semiotics of Poetry" (۱۹۷۸ء) میں نظریاتی تناسبات کو اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ذی شعور قاری متن سے پھوٹنے والی معنویت سے نئے معنی پیدا کرتا ہے اگر قاری نشانیات پر توجہ دے گا تو وہ متن کی گہرائیوں کو پالے گا۔ ان کے خیال میں اسٹراس اور جیکب سن کو سمجھنا عام قاری کے بس کی بات نہیں۔ ان کی نظر میں ساختیات تحلیلی نظریہ فکر ہے جس کی بنیاد معروضی طریقہ کار پر رکھی گئی ہے۔ اس سے تب ہی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب ادبی نقاد کو اپنے کام میں اختصاصی مہارت حاصل ہو اور انھوں نے دبے لفظوں میں "ہنرمند نقاد" اور "زیرک قاری" کا جو تصور پیش کیا ہے، اس تصور پر وہ خود ہی پورے اترتے نظر آتے ہیں کیونکہ زیرک قاری عینی حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ زبان بعض دفعہ واہیے بھی کھڑے کر دیتی

ہے اور فیلیسی کی دنیا قائم کردیتی ہے لہٰذا اس سے دامن بچانا ضروری ہے جو ساختیاتی نقد اور تحلیل کے بعد تشکیل پانے والے تناظر کو ٹھوس اور معروضی ہی نہیں کہتے بلکہ یہ ان کی نظر میں سائنسی طریقہ کار کی رسائی بھی بن جاتی ہے جس میں شعری ساختیے پر پڑے ہوئے کئی دبیز پردوں کو اٹھاتے ہوئے شعری وظائف کی ماہیت کو دریافت کیا جاسکتا ہے۔

ریفاٹیر "Romontic Review" کے مدیر کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں اور امریکہ سے باہر کے ممالک میں ادبی نظریے اور تنقید پر خطبات دے چکے ہیں۔

ایڈورڈ ولیم سعید (Edward William Said) 1935

فلسطینی نژاد امریکی ادبی اور معاشرتی نقاد، پس نو آبادیاتی تنقید کے بنیاد گذاروں میں اہم نام، برطانوی زیر تسلط یروشلم کے ایک تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اوائل جوانی میں اسرائیل کو معروض وجود میں آتے دیکھا پھر قاہرہ چلے گئے۔ انھیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے جرم میں اسکول سے خارج بھی کیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں پرنسٹن یونیورسٹی (نیو جرسی، امریکہ) سے بی اے (B.A) کی اور ۱۹۶۴ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

انھوں نے شروع سے ہی فلسطینی کاز کے لئے کام کیا۔ مقامی فرنگیوں پر زبردست تنقید کرتے ہوئے اسرائیل کے وجود کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ اسرائیل دشمن ہونے کے سبب وہ اسرائیل کی ہر حکومت کی نظروں میں کھٹکتے رہے۔ جب اسرائیل اور فلسطین کے درمیان معاہدہ ہوا، پی ایل او سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ یاسر عرفات نے ان کی فلسطین میں داخلے پر پابندی لگادی بلکہ اپنے پرانے رفیق کی کتابوں کو بھی فلسطین میں ممنوع قرار دیا جس پر گنٹر گراس، دریدا، ایلین گنز برگ، سون ٹیگ، نجیب محفوظ، محمود درویش اور سعید ادونیس نے شدید احتجاج کرتے ہوئے اپنے خط میں ایڈورڈ سعید کی کتابوں پر فلسطین میں پابندی کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔

انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ہاورڈ یونیورسٹی میں تاریخ اور انگریزی کے اتالیق سے کیا اور ۱۹۷۰ء میں انگریزی کے تقابلی ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان کی پہلی اہم کتاب

"Joseph Conrad and A Fiction of Autobiography" ہے جو ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ بھی ہے جس میں کانیرڈ کی ذاتی تاریخ اور مختصر فکشن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ساختیاتی حوالے سے ان کی کتاب (1985) "The World, The Text, And the Critics" شائع ہوئی جو ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں جاتھن سوئفٹ، ارنسٹ دنیان، کانریڈ، فوکو، دریدا اور رے منڈ ولیم پر مضامین شامل ہیں جن میں ان مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے جو ثقافت، آئیڈیالوجی اور ادبی نظریے پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کو ایڈورڈ سعید ''تنقیدی باریک بینی'' کہتے ہیں۔ ان مضامین میں مباحث کو نئے تنقیدی رنگ میں پیش کیا گیا جو عہد حاضر کے بہت کم لکھنے والوں کے یہاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے ادبی نظریے اور تنقید کو کئی خطرناک رجحان سے قبل از وقت آگاہ کیا۔ ان کی تحریروں کے پس منظر میں آگہی کے علاوہ طریقہ کار کی نئی جہتوں کو بھی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے سوئفٹ، کانریڈ اور دنیان کے تنقیدی عمل کو نظریاتی اور عملی تنقید کا نمونہ قرار دیا۔ ''کلچرل اور امپریل ازم'' میں انھوں نے ادب، سیاست اور ثقافت کے حوالے سے سامراجیت، نو آبادیات اور مغربیت کے رویوں کا تجزیہ کیا ہے۔

ایڈورڈ سعید، پرنسٹن، جان ہاپکنز اور اسٹینفرڈ یونیورسٹی میں بحیثیت مہمان پروفیسر کے بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں یہ اہم ہیں:

(1) Begnnings: Intention Method (1975) (2)Orientalism (1878)
(3) Covering Islam (1981) (4) The World, the Text, and the Critic (183)
(5) After the Last Sky (1986) (6) Culture and Imperialism (1993)
(7) Representation of the Intellectual (1994)

کلودیل لیوی اسٹروس (Claude Leve Strauss)-1908

کلودیل لیوی اسٹروس برسلز (بلجیم) میں پیدا ہوئے۔ جب وہ چار سال کے تھے تو اپنے والدین کے ساتھ پیرس آگئے۔ ان کے والد مصور تھے جنھیں مٹی کے برتن بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اسٹروس کے دادا ربائی تھے۔ ابتدائی تعلیم فرانس میں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۲۷ء تک یونیورسٹی آف پیرس میں قانون اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ دو سال جوائسز (Jycees) میں فلسفہ بھی پڑھاتے رہے۔ اسی علمی مشغلے اور پیشے نے ان کی فکر کو وسعت دی۔ ان کی بشریات میں دلچسپی اس وقت سامنے

آئی جبکہ درکھائم مکتب کے عمرانیات دان کلیسٹن بوگل (Celestine Bougle) نے ان کی فکری اور تحقیقی فطانت کو دیکھ کر برازیل میں ماہر عمرانیات کی ایک اسامی کے لیے اسٹراوس کو نامزد کیا اور انھوں نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۹ء تک برازیل کی یونیورسٹی آف سینٹ پالو میں بشریاتی نوعیت کی میدانی تحقیق میں حصہ لیا۔ ۱۹۴۰ء میں پیرس کے نازی تسلط میں آجانے کے بعد وہ امریکہ آگئے اور نیو اسکول فار سوشل ریسرچ (برنارڈ کالج) میں درس و تدریس کے شعبے سے متعلق رہے۔ یہاں ان کی ملاقات رومن جیکب سن سے ہوئی اور انھیں لسانی ساختیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا مقالہ "لسانیات اور بشریات کا ساختیاتی تجزیہ" لکھا۔ یہ مقالہ ۱۹۵۴ء میں نیویارک کے جرنل آف سرکل میں شائع ہوا جس میں نہ صرف لسانیات و ساختیات کی فکر پر ہی نہیں بلکہ معاشرتی علوم پر بھی اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ ۱۹۴۷ء میں فرانس واپس آئے اور بعد میں مزید دو سال امریکہ میں فرانسیسی سفارت خانے میں بطور ثقافتی اتاشی کام کیا۔ ۱۹۵۰ء تک وہ Muceedel Homme (پیرس) کے اسسٹنٹ رہے پھر ڈائریکٹر آف اسٹڈیز اور ثقافتی مذہبیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ یونیسکو (UNESCO) کے ایک مختصر مطالعاتی پروجیکٹ پر کام کرنے کے لئے چاٹگام (مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش) بھی آئے۔ اسٹراوس ۱۹۵۰ء تک یونیسکو سے منسلک رہے۔ ۱۹۵۹ء میں وہ کالج ڈی فرانس میں معاشرتی بشریات کے شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔

وہ بحیثیت ماہر ثقافتی بشریات اور ماہر نسلیات معروف ہیں۔ انھوں نے ساختیاتی بشریات پر کئی کتابیں اور کئی مقالات لکھے۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

(1) Savage Mind (1966) (2) Structrual Anthropology (دو جلدیں) (1968) (3) The Row and Cook (1970) (4) Tristes Tro Piques (5) The Elementary Structures of Kinship (6) Totemism (7) From Honey to Ashe (8) The Origin of Table Manners (9) The Naked Mand (10) The Jealous Potter (11) The View from After.

فرنیڈنیڈڈی سوسیئر (Ferdinand De Saussure) 1857-1913

سوئس ماہر نشانیات، ماہر لسانیات، ان کے آباؤ اجداد ساتویں صدی میں فرانس سے نقل مکانی کر کے سوئزر لینڈ آئے۔ ان کی والدہ کا تعلق پوٹرلس خاندان سے تھا جو انقلاب

فرانس کے بعد سوئزر لینڈ آ گیا تھا۔ سوسیئر کو شروع سے ہی لسانیات میں دلچسپی تھی جبکہ انھوں نے یونیورسٹی آف جنیوا میں اپنی تعلیم کا آغاز سائنسی مضامین سے کیا۔ اکیس سال کی عمر میں "لیپسنڈنگ" اور برلن یونیورسٹی میں لسانیات کا مطالعہ کیا۔ وہ اپنے ایک ہم جماعت کے لسانی مونوگراف سے متاثر ہوئے اور ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۱ء تک پیرس کی درسگاہ Ecole Pratique Des Hantes Etudes میں درس و تدریس سے متعلق رہے۔ کچھ دنوں بعد وہ یونیورسٹی آف جنیوا آئے اور ۱۹۰۱ء میں انڈو یورپین لینگوئجز اور سنسکرت کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں لسانیات کے پروفیسر بھی رہے۔ وہ تاحیات معلّمی کے پیشے سے منسلک رہے۔ اپنی زندگی میں کوئی خاص تحریر نہیں چھپی۔ سوسیئر نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۱ء کے دوران جنیوا یونیورسٹی میں جدید لسانیات Course in General Linguistics کے عنوان سے خطبات دیے جس میں انھوں نے کلام اور زبان کے فرق کو واضح کیا۔ "معنی نما" (Signifier) "تصور نما" (Signified) "حاضر زمانیت" (Synchrony) اور تاریخی (Diachrome) کے تصورات پیش کیے۔ انھی خطبات میں سوسیئر نے نشانیات پر بھی بحث کی اور یہی تصورات مستقبل کے محققین، نقادوں، نظریہ دانوں اور معاشرتی مفکروں سے یہاں نئی روشنی کا مبدا ثابت ہوئے۔ ساختیات کے نئے علم و نظریے کی بنیادیں ان کے بنیادی تصورات سے تشکیل پائیں۔ انھی خطبات کے دوران سوسیئر بیمار ہو گئے (کچھ کتابوں میں لکھا ہے کہ انھیں نمونیہ ہو گیا تھا) لہٰذا یونیورسٹی کو متبادل پروفیسر کا انتظام کرنا پڑا۔ کچھ ہی دنوں بعد سوسیئر کا انتقال ہو گیا لیکن ان کے دو رفیقوں چارلس بیلی (Charles Bally, 1865-1947) اور البرٹ سانچے (Albert Secheave, 1970-1946) اور ایک طالب علم البرٹ ریڈلینگر (Albert Riedlinger) نے ان کے خطبات کو کتابی صورت میں مرتب کیا جبکہ البرٹ ریڈلینگر کا کہنا ہے کہ "بیلی اور سانچے سوسیئر کے ان خطبات میں موجود نہ تھے۔ سوسیئر کے لسانی اور نشانیاتی تصورات و نظریات کا اثر لوئی کلوریل اسٹراوس، بارتھ ہیلم سیلو، رومن جیکب سن، لیونارڈ بلوم فیلڈ کی تحریروں پر خاصا گہرا ہے۔ سوسیئر کی کتاب "کورس آف جنرل لینگویج" کو ۱۹۵۹ء میں ویڈ باسکن (Wade Baskin) نے فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

تزوتن تودوروف (Tzvetan Todorov) 1939

بلغارین نژاد، فرانسیسی ادبی نقاد اور نظریے دان چوبیس سال کی عمر میں بلغاریہ کو خیر باد کہا۔ ان کے والد بلغاریہ کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ تودوروف نے ۱۹۶۱ء میں یونیورسٹی آف صوفیہ سے سلاویک لسانیات میں ایم اے کیا جس کے پس منظر میں روسی ہیئت پسندی اور اصل فوکس "ہیئت" پر تھا جو ادب کی سیاق شکنی کرتا تھا۔ تودوروف نے شروع ہی سے جیکب سن اور کئی ساختیاتی لکھنے والوں کے درمیان پل بنانے کی بھی کوشش کی۔ انھوں نے اپنے دوستوں ہیلن سی کوس، جیرالڈ ژینے کی معاونت میں ادبی نظریے پر ایک جریدہ "Poetique" نکالا۔ اس پرچے میں ابلاغ اور فوک لوور پر بحث کی گئی۔ ان کے خیال میں ذرائع ابلاغ نے ادب کو شہرت دی۔ جس کا اثر اینگلو امریکن اور جرمن ادبی نظریے پر گہرا ہوا۔ انھوں نے اس ارتباط میں اہم کردار ادا کرتے ہوئے ادب کے نئے نظریے پر کئی مباحث کے دروازے کھولے جس میں مختلف قسم کے ادبی نظریات اور روایت کو یکجا کردینے کے بعد عام لوگوں کو اس کی آگہی مہیا کی گئی۔

تودوروف کے ادبی نظریے میں ادب کی شعریات، اس کی تشریح اور ساختیاتی قرائن کے ادبی تخاطبے کی بحث شامل ہے جس کو ادب کی سائنس بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی شعریات کے مطالعے کی جڑیں ساختیے اور لسانی فکر سے پیوست ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب کی سائنس فرد کی تشریح اور دیگر سائنسوں سے اختلاف کرتی ہے۔ خاص طور پر اسے نفسیات اور عمرانیات سے خدا واسطے کا بیر ہے کیونکہ ان دونوں سائنسوں میں ادب کو آگہی کا معروض قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ ادب، نفس اور معاشرے کا انکشاف کرتا ہے۔ انھوں نے فکشن کی تین جہات بتائی ہیں۔ (۱) معنیاتی جہت (۲) نحویاتی جہت (۳) لفظیاتی جہت —— انھوں نے فرانسیسی ادب کے علاوہ جرمن اور انگریزی ادب، ہنری جیمس، ایڈگر ایلن پو اور اگاتھا کرسٹی پر بھی تنقیدیں لکھیں۔ ان کی کتابوں کی فہرست کچھ یوں بنتی ہے:

(1) The Fantastid: A Structural Approachs A Literary Genre (1973) (2) The Poetics of Prose (1977) (3) The Introduction to Poetics (1981) (4) Theories of the Symbol (1982) (5) Symbolism and Interpretation (1983) (6)Mikhali Bakhtin (1984)

یوری تینیانوف (Jurii Tynianov) 1894-1943

روسی ماہر لسانیات، روسی ہیئت پسندی کے ادبی اور لسانی حلقے کے سب سے سرگرم رکن، وہ پیٹرگراڈ اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ ہسٹری کے ادبی شعبے سے متعلق رہے لیکن ان کی زیادہ تر فکری دلچسپیاں ادبی تجزیات اور مطالعوں سے متعلق رہیں۔ تینیانوف کی قدامت پسند مارکسیت اور ٹرانسکی کے نظریات سے کبھی نہ بنی۔ ان کی تحریریں روسی ہیئت پسندی کے شروع کے دنوں میں روس سے باہر ترجمہ ہوئیں۔ جس نے لسانی ساختیات کے میدان میں نئے سوالات اٹھائے اور اسے توسیع دی۔ جب ٹرانسکی نے اپنی کتاب "لٹریچر اینڈ ریولوشن" میں روسی ہیئت پسندی پر شدید اعتراضات کیے تو تینیانوف نے جیکب سن کے ساتھ مل کر ہیئت پسندی کا دفاع کیا۔ ان کے مقالات ۱۹۲۸ء میں چھپے۔ وہ سوسیئر کے لسانی تصورات سے خاصے متاثر تھے لہٰذا انھوں نے اپنے مقالات میں "معنی نما"، "تصور نما"، "زبان" اور "کلام" کی اصطلاحات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس بات کا احاطہ کیا کہ ادب و زبان کے ساختیاتی قوانین کا تجزیہ اس لئے ضروری ہے کہ اس سے محدود قسم کے ساختیاتی درجات ترتیب پاتے ہیں اور ادب کی تاریخ کے پوشیدہ ذاتی قوانین، ادبی اور لسانی تبدیلیوں کی تنقید کے نظام کو بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک مضمون بعنوان "Problems in the Study of Language and Literature" (۱۹۲۸ء) لکھا جس کو آر۔ ٹی۔ ڈی جارج (R.T. De George) نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔

جین پی ٹامپکن (Jean P. Tompkins)

امریکی ادبی نقاد۔ ٹیمپل یونیورسٹی میں امریکی ادب اور ادبی نظریے کی استاد ہیں۔ انھوں نے جیمس جوائس کے مختصر فکشن پر تنقیدی مضامین کا انتخاب "Twentieth Century Interpretation" (1970) کے نام سے مرتب کیا۔ ٹامپکن نے ادبی نظریے، سوانح عمریوں، امریکن فکشن، پس ساختیات، تانیثی تنقید پر مقالات لکھے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں Reader Respose Criticism کے عنوان سے مقالات کو بھی مرتب کر چکی ہیں۔

حال ہی میں انھوں نے American Melodrama: The Novel as a Social Theory in Brockden Brown Cooper and Harriet Becher Stowe لکھی۔

ایلین ٹورین (Alain Touraine) 1925

فرانسیسی ماہر عمرانیات، نقاد، مارکسی نظریہ دان، فرانس کے شہر "ہرمن ویل" (Herman Ville) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں مشہور تعلیمی ادارے ایکول نارملے سے تاریخ میں سند حاصل کی اور ۱۹۶۵ء میں ادبیات میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۷ء تک Ecole Pratique میں بحیثیت محقق، معاشرتی سائنس کے شعبے میں کام کرتے رہے۔ اس ادارے کے قائم مقام ناظم بھی رہے۔ ۶۰-۱۹۵۸ء تک ایل ایس آئی تجربہ گاہ برائے صنعتی عمرانیات کے ناظم مقرر ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں پیرس یونیورسٹی کے تحت سینٹر فار دی اسٹڈی آف سوشل مومنٹ کے ناظم ہیں۔

وہ جدیدیت کو پسند کرتے ہیں مگر جدیدیت پسند عناصر سے انھیں اختلاف ہے۔ ٹورین کو ساختیاتی نظریے اور طریقہ کار سے بھی اختلاف ہے وہ ساختیات کو بغیر ساختیے کا عمل کہتے ہیں۔

انھوں نے تاریخ، طبقاتی کشمکش، فرانس کی طلبا تحریکوں، محنت کشوں کے مسائل، معاشرتی تحریکوں، ثقافت، پس صنعتی معاشرے کے مسائل اور تکنیکی تغیرات پر کئی کتابیں فرانسیسی میں لکھی ہیں جن میں سے کچھ کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ ان کی دو کتابیں خاصی معروف ہیں:

(1) Crisis or Transformation (1977) (2) The Academic System in American Society (1977)

ولیم کرٹز ومسٹ جونیئر
1907-1975 (William Kurtz Wismatt Jr.)

واشنگٹن، ڈسٹرکٹ کولمبیا (امریکہ) میں پیدا ہوئے۔ والد لکڑی کے کاروبار سے منسلک تھے۔ جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے بی اے (۱۹۲۸ء)، ایم اے (۱۹۲۹ء) کی اسناد حاصل

کیں۔ ۱۹۳۰ء میں Port Smouth Priory School میں شعبۂ انگریزی کے صدر مقرر ہوئے۔ ۳۶-۱۹۳۵ء کے دوران ومسٹ امریکن کیتھولک یونیورسٹی میں درس و تدریس کے شعبے سے متعلق رہے۔ ۱۹۳۶ء میں ییل یونیورسٹی (Yale) میں شریک ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں ان کی نظم Shapes from Dusk to Winter کو ییل یونیورسٹی کی جانب سے انعام ملا۔ پھر انھوں نے اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اپنی موت تک اسی جامعہ میں درس و تدریس کے شعبے سے متعلق رہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

(1) Shapes from Dusk to Winter (1938) (2) The Prose Style of Samuel Johnson (1941) (3) Philosophic Words (1948) (4) The Verbal Icon (1970) (5) Literary Criticism: A Short History (1957) (6) What to Say about a Poem (1965) (7) Hateful Cont Rarıes (1965) (8) The Portrait of Alexander Pope (1965) (9) How to Compose Chess Problems and Why (1966) (10) Day of the Leopards: Essays in Defence of the Poem (1976)

ومسٹ نے کوئی دو درجن کے قریب مقالات بھی لکھے ہیں جن میں ٹریلنگ (Trilling) بلاغت اور نظم، نظریہ طرب، جاتھن کلر، واٹومیر نوباکوف (Nabokov) سیموئل جانسن کی شاعری اور نثر نگاری، موازنہ شیکسپیئر اور سیموئل جانسن، پر ان کے مقالات پڑھنے کے لائق ہیں۔

ہنری لوفے (Henri Lefebvre) 1910-

فرانسیسی نظریہ دان، ماہر عمرانیات، مارکسی اور ساختیات شکن نقاد۔ فرانس کے شہر ہاگاٹامو (Hegetmau) میں پیدا ہوئے۔ باس پائرنین (Bas Pyrrhenees) کے ایک گاؤں ناورنکس (Navarrenx) میں زندگی کا ابتدائی حصہ بسر ہوا۔ ان کی تحریروں میں اس شہر کے متعلق مختلف جگہوں پر خاصا ذکر ملتا ہے۔ اس گاؤں میں رہ کر انھوں نے بدوی معاشرے کو حضری معاشرے میں تبدیل ہونے کا مشاہدہ کرتے ہوئے خاص طور پر موسم بہار میں ان تبدیلیوں کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا۔ لوفے کی زندگی بیسویں صدی کے اس حصے میں پروان چڑھی جس کو

تاریخ مارکسی یا یسماریت کا عشرہ قرار دیتی ہے۔ لوفے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان مارکسزم سے متاثر ہوئے۔ ان کے خیال میں یہ ان کی زندگی کا رومانی دور تھا۔ انھوں نے جلد ہی یہ محسوس کرلیا کہ کمیونزم کی صورت حال خاصی گومگو ہے۔ دیگر فرانسیسی مارکسی دانشوروں کی طرح انھیں بھی اس بات کا احساس تھا کہ روسی انقلاب کی کامیابی کے بعد لینن ازم (Leninism) ناکام ہوچکا ہے اور چین میں ماؤازم ایک بہتر صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ اسٹالن کے انسدادی (Repressive) اصولوں سے بھی ناخوش تھے لہٰذا انھوں نے اپنے طور پر مارکس کے نظریات کی تفہیم و تشریح کی۔

لوفے ساختیات کے چند اہم نقادوں میں سے ہیں، جنھوں نے ساختیات پر شدید قسم کے نظریاتی اور عملی اعتراضات کیے، خاص کر لیوی اسٹروس اور التھیو کے ساختیاتی نظریات سے انھیں حد درجے کا اختلاف رہا حالانکہ یہ دونوں مارکس کے تاریخی تناظر سے لے کر ان کے وجودیاتی نظریے کی موضوعیت کو اپنائے ہوئے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک وہ فرانسیسی فلسفیوں کے مارکسی-لیننی گروپ کے رُکن رہے۔ لوفے دس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں اور کئی علمی اور نظریاتی جرائد میں ان کے مقالات شائع ہوچکے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر فرانسیسی میں ہی لکھا۔ ان کی تحریروں کے انگریزی میں بہت کم تراجم ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب Introduction to Modernity (1962) میں لیوی اسٹروس، بارتھ، ساسر اور التھیو پر شدید تنقید اور اعتراضات ملتے ہیں۔ الفریڈ شمٹ (Alfred Schmidt) نے اپنے ایک مضمون میں لوفے کی مارکسی تشریح پر سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ ایڈت کرذس ویل (Edith Kurzwiel) نے اپنی کتاب The Age of Structuralism (1880) میں لوفے پر "A Marxist Against Structuralism" کے عنوان سے باب قائم کیا ہے۔

○○

اصطلاحات

فوری .... Abrupt
لایعنی .... Absurd
مجرد، تجرید .... Abstract
تجریدی فن .... Abstract Art
موضوعِ مطلق .... Absolute Subject
مطلق .... Absolute
روحِ مطلق .... Absolute Spirit
تجریدی نظام .... Abstract System
تجریدیت، انتزاع .... Abstraction
تاؤ کلام .... Accentual Verse
تعریف گیر، گردان .... Accidence
عرضیت .... Accidentalism
عرفہ .... Acquaintalism
سمعی .... Acoustic
عامل .... Actant
فعالیت پسند، مفاعل .... Activist
بالفعل .... Actual
لسان تلخ .... Acrimony
مخاطب .... Addressee

لااصبیت .... Adeism
تصادق تام .... Adequation
جمالیات .... Aestetic
جمالیاتی دوربینی، جمالیاتی بُعد، جمالیاتی فاصلے .... Aestetic Distance
عمل .... Action
فعل .... Act
لہجہ .... Accent
اکلیز .... Achilles
صنعت توشیح .... Acrostic
جذباتی مغالطہ، جذباتی تخلیط .... Affective Fallacy
تاثر .... Affect
امیال .... Affections
قضیہ موجبہ، ایجابی قضیہ .... Affirmative Proposition
مثبت عمل .... Affirmative Action
میل مطابقت، بازتشکیل، اخذ، قلب کاری .... Adaptation

مہماتی کہانی، مخاطراتی قصہ ..... Adventure Story

گوشوارہ عمل ..... Agenda

دانش محال، مبالغہ فطرت شکن ..... Adynation

جہلیات ..... Agnoilogy

شیخی باز ..... Alazon

مشعر، تلمیح، اجناس ..... Allusion

اتفاقی تحریر ..... Aleatory Writing

تجنیس صوتی، تکرار صوت، آغاز بندی ..... Alliteration

خوارزمیت، پیمانہ ..... Allgorithm

مغائرت ..... Alienation

اثر متغائر ..... Alienation Effect

پیانہ (شعر یا نثر میں) ..... Allegory

فرضی نام ..... Allonym

بشر دوستی، دگریت، اخوانیت، خوف پرداری

Altruism

حسن تعبیر ..... Amblysia

ہیئت غیر مطلق ..... Amorphous

منتشر، بے ترتیب مواد ..... Amorphous Mass

دو معنوی، معنوی دو لختی ..... Amphiboly

بے یقینی، ابہام ..... Ambiguity

مبادلہ ..... Amoebean

عمل مخالف (تضادی احساس کے ساتھ) ..... Ambivalent

اطناب ..... Amplefication

مشابہت، تشابہ، مماثلت، قیاس ..... Analogy

سہو زمانی ..... Anachronism

تحلیل، تجزیہ ..... Analysis

قواعدی بے ربطی ..... Anacoluthon

تحلیلیت (کانٹ) ..... Analyticity

شہوانیت ..... Anality

باز آوری ..... Anamnesis

دریافت ..... Anagnorsis

صنعت قلب، صنعت مقلوب ..... Anagram

ملفوظات، ارشادات، مجموعہ اقوال ..... Analects

خطاب ..... Appelation

مسلمات ..... Aphorism

ترجیع کاری ..... Anaphora

بعد تجربی ..... Aposteriori

ظاہر ..... Apparent

ادراک ..... Aperecption

فوق العصر ..... Apeiron

قدر شناسی، تحسین ..... Apreciation

معنیاتی عدم قطعیت ..... Aporia

اسفار محرفہ ..... Apocrypha

نجات تامہ ..... Apocatastasis

اعتذاریت ..... Apologetics

اعتذاریہ ..... Apology

ترتیب آہنگ نو ..... Anagram

محاضرہ، روایت، نقل ..... Anedote

دہشت ..... Angst

تحشیہ، حاشیہ نگاری ..... Annotation

اعدامیت ..... Annihilationism

بے اصولا پن، بے قاعدہ ..... Anomaly

بشریات ..... Anthropology

بشر پرستی ..... Anthroplatory

بشر دردی ..... Anthropopatheism

بشر مرکزی ..... Anthropocentric

ضد اصول ..... Antinomy

صنعت تضاد، ضد دعویٰ ..... Antithesis

گلدستہ، بیاض، مخزن ..... Anthology

ردِ منتہا ..... Anticlimax

تاریخیت مخالف ..... Anti Historicist

تشریح، تفکیک ..... Anatomy

مدافعہ، اعتذار ..... Apology

خود مختارانہ، من مانا، انضباطی ..... Arbitrary

قدامت پسندی، کہنگی ..... Archaism

پیام ..... Arche

اولیات، بدائیات ..... Archelogy

آثاریات ..... Archaeology

زبان (کسی خاص طبقے کی) ..... Argot

توسیہ، تخیل، امہات الصور ..... Archetypes

اختبار ارسطو ..... Aristotle'sExperiment

ارسطوئیت ..... Aristotelianism

اریکیت ..... Arianism

آثاریائی ..... Archaich

صناعت ..... Artifacts

توجیہ ..... Argument

خلاف قاعدہ نحوی ..... Asyntactic

ایشیائی اسلوب ..... Asianism

ہم نوا ..... Assonance

یک سو ..... Aside

ائتلافیت، تلازمیت ..... Associationism

تجنیس صوتی ..... Assonance

خلاف قاعدہ نحوی ..... Asyntactic

ایشیائی اسلوب ..... Asianism

ائتلافیت، تلازمیت ..... Association

تلازمہ خیال ..... Association of Ideas

منقطع (تا آہنگ کا) ..... Asynartetion

طمانیت ..... Ataraxia

Asymmetric .... بے تناسبی

Atavistic .... پرکھاروگی

Atmosphere .... مزاج، ماحول (ادبی عمل کا)

Audience .... سامع

Auditory Imagination .... سامعی تخیل

Author-Function .... مصنف وظائف (تفاعل)

Author .... مصنف

Authenticicty .... استناد

Automatism .... خودکاریت

Autonomy .... خود مختاری، خود اختیاری، خود نامی

Authority .... مقتدرہ، اختیار روی

Automation Theory .... خودکاری نظریہ

Autotelia .... خود نمائی

Authentic Existence .... وجود مستند

Autotelic .... خودیافتہ

Authoritarianism .... مقتدریت، سندریت

Autobiography (Biography) .... سوانح عمری

Axiology .... قدریات

Axiomatic Method .... متعارفی طریقہ

Aiom .... اصول موضوعہ

Axiom .... بدیہہ

Axis .... اصول ساختیہ

Axiom .... بیاں بنا صداقت

Avantgarde .... نقیب

Ballad .... لوک، روایتی

Backward Looking .... رجعت بین

Background .... پس منظر

Base-Super Structure .... بنیادی ساخت، بالائی ساخت

Bestiary .... حیوانہ

Beast Epic .... رزمیہ حیوان

نامعلوم یا گمنام مصنف (روایتی زبانی روایت کا)

Ballad .... لوک، روایتی

Beast Epic .... رزمیہ حیوان

Becoming .... تکوین

Behaviour .... بیوہار، برتاؤ، کردار

Behaviourism .... کرداریت

Bestiary .... حیوانیہ

Bibliolatory .... انجیل پرستی

Bibliography .... کتابیات

Bigotry .... تعصب

Bibliolater .... حروف پرست

Being .... ہستی، ہست

Binary .... ثنوی

Binarism .... ثنویت

دو، پر تضاد، جڑواں تضاد، ثنوی تضاد

Binary Opposition

Binomic Forces .... غیر نامی قوتیں

Blanks .... کورے

Blank Verse .... نظم معریٰ

Bourgeoise .... بورژوا (مارکسی معنوں میں تاجر)

Burlesque (Satire) .... طنز

Climax .... عروج، بلندی

Comedy .... طربیہ

Competence .... اہلیت

Conflict .... تصادم، تعارض

Connotation .... نتیجہ، دلالت

Consonant .... مصمتہ

Content .... مافیہ

Credo .... عقیدہ

Consonance .... تجنیس صوتی

Creation .... تخلیق

Crncifixion .... دار کشی

Couplet .... بیت

Conistency .... ہم بودیت، استقامت، صلابت

Cupid .... کام دیو (عشق کا دیوتا)

Concrete .... مجرد

Crisis .... بحران

Cybemetics .... مطالعہ انسانی وظائف و مکانیت

Constructivism .... عمار، تعمیر پسندی، تعمیریت

Continuum .... تسلسل

Contextual .... سیاق

Contextual Criticism .... سیاقی تنقید

Contextulism .... سیاقیت

Criticism .... تنقید، انتقاد

Criteria .... معیار

Cross-Order .... تقلیب

Culture .... تمدن، ثقافت

Civilization .... تہذیب

Cynic .... مردم بیزار، خشک مزاج، ترش رو، بدخو کلبی

Cynicism .... کلبیت، سگ خوئی

Dactyl .... شعر کا ایک وزن

Dead Metaphor .... مردہ استعارہ

Daseine .... وجود (کی دی ہوئی حالت)

Data .... مواد، معطیات

Decode .... رد رموز، رموز کھولنا

Debate .... مناظرہ

Deconstruction .... رد تشکیل

English	اردو
Decorum	تہذیب
Defamiliarization	عمل اجنبیانے
Denouement	گرہ کشائی، حل، انجام
Deduction	استنباط
Day Dreaming	خواب بیداری
Decadence	زوال پسندی، انحطاط پسندی
Deconstruction	ردِ تشکیل
Determinative	تعین کار
Deferment	التوا، توقف، تعطل
Delusion	واہمہ
Definens	تعرفہ
De Interpretatione	التوجیہ
Denial of the Antecedent	انکار مقدم
Decision Problem	مسئلہ، تجزم
Decolonization	ردِ نو آبادیات
Decorum	سلیقہ تحریر
Demedicalism	ردِ طبعیت
Denotation	تعبیری معنی
Deontology	واجبیات
Demiurge	صانع
Decuratato Syllogism	قیاس محذوف المقدمہ، قیاس مقفہ
Demystification	سریت مخالف، روابطہ قربیت
Decentre	بے دخل کرنا، بے مرکز کرنا
Desig	خاکہ تصویری
Devoidness	شونیہ، نفی محض
Determinism	جبریت
Depragmatization	رد عملیات
Defamiliaris	اجنبیانے کا عمل
Denotation	مخصوص تلازمہ (لفظ یا تجربے کا)
Denouement	پلاٹ کا تصور آخر
Diachronic	تاریخی
Dialectic	جدلیات
Diallelus	مداورت
Dialogic	کثیر المعانی، کثیر الاصواتی
Dialogue	مکالمہ
Dichotomy	دوجائی
Diegessis (Mimesis)	بیانہ، نقالی
Defferentation	عمل افتراقیانہ
Difference	فرق، افتراق
Dilemma	ذوالجنین
Dilogy	ذومعنویت
Diletantism	شوقین پنہ
Didactic	ہنر تدریس

English	اردو
Diction	لفظیات، کلمہ بندی، تخفیظ، لفظ بندی
Dictionary	لغت، فرہنگ
Dionysian	السیاتی، دیونیسی
Diminishing Metaphor	مخفف استعارہ
Direct Knowledge	راست علم
Dirge	نوحہ
Discription	جزئیات نگاری
Disequilibrium	عدم توازن، عدم میزان
Disciplinary	علومی
Discipline	علومیہ
Discourse	کلام، تذاکرہ، مدلل بیان، مبرہن بیان
Discursive	کلامیہ
Disinterestedness	غیر جانبداری، بے لوثی، بے غرضی
Disputation	جدال
Dissociation	انشقاق
Dissemination	تخم ریزی (قائم کردہ معنی کو پھیلانا)
Dissociation of Sensibility	نفاق ادراک، وحدت شکنی ادراک
Diversive	کلامی
Distinctive Features	امتیازی خد و خال
Dithryamb	دسبری، حمدیہ نغمہ
Dis-Value	لاقدر
Divine Afflatus	الوہی فیضان
Dramatic Molologue	ڈرامائی ہم کلامی
Dramatic Convention	ڈرامائی روایت
Dramatization	ڈرامائی کاری
Dramatic Irony	ڈرامائی طنز
Dithyramb	نغماتی شاعری
Doctrine	عقیدہ
Dogma	اذعان، عقیدہ
Doubt	شک
Dream Vision	خواب بینش
Drama	ڈراما، ناٹک
Dominant	حاوی، محرک
Double Reading	دوہری قرات
Doxa	دقیا، مانوس تصور (اشیا اور احوال کا)
Duty	فرض
Dualism	ثنویت
Dualistic	دوئی آسا
Duplicity	دوہریت
Dyadic Relation	دوحدی اضافیت
Dyad	دو اشا
Dynamism	حرکیت

Dynamics ..... حرکہ

Dystopia ..... غلط مقام

(یہ اصطلاح فکشن میں ناخوشگوار تمثال کو برتنے پر استعمال کی جاتی ہے)

Eccentricity ..... بے مرکزیت

Echoverse ..... کلام بازگشت

Ecstasy ..... غایت انبساط، وجد، آنند

Eclectic ..... ہمہ آمیز

Eclecticism ..... اصطفائیت

Ecologue ..... انتخاب

Ecrivain ..... مصنف (جو لکھنے کے لیے لکھتا ہو)

Ecpycrosis ..... حریقہ

End-Stopped Line . شعری ایک سطر میں مکمل خیال

Eidola ..... طیوف

Eduction ..... استاخذہ

Elegy ... دکھ بھری نظم (بالخصوص کسی کی موت پر)

Effect ..... معلول (علت کی ضد) اثر

Elan Vital ..... ایلاں وطال

Elimination ..... اخراج

Elements ..... عناصر

Electicism ..... انتخابیت

Ellipsis ..... غفلت الفاظ

Elenchus ..... استطلاق

Egotism ..... خود پرستی

Ego ..... انا

Elucidation ..... توضیح

Egological ..... انائیاتی (فلسفہ)

Eject ..... بیرون انداخت

Egology ..... انائیات

Empower (To) ..... قوت رسائی (کرنا)

Empowerment ..... قوت رسائی

Emancipatory Theory . نجات کوش نظریہ

Emblem معروض علامت دیگر، نقش متن وتمثال

Emptiness ..... تہی دامنی، فقدان

Emotive ..... جذباتی

Emotion ..... ہیجان

Emotivism ..... تاثریت

Empiricism ..... تجربیت

Empirical Ego ..... تجربی انا

Empiricist Idealist ..... تجربی

Empathy ..... ہم گدازی

Emanation ..... اشراق

Emergent Evolution ..... ارتقاء بارز

Empataic ..... ہم گداز

Embodiment, Personification ..... تجسیم

Emigration ..... مہاجرت

Endless ..... لاانتہائی

Energism ..... فعلیت

Enlightenment Project روشن خیال خاکہ، منصوبہ

Enttheymeme ..... حذف

Ensoi ..... فی نفسی

Enlightenment ..... تنویریت

Entity ..... شے، ذات

Entropy ..... ناکارگی

Entity ..... موجودگی، ہستی، اصلیت

Epistemology ..... علمیات

Epistemological ..... علمیاتی

Epistemological Category علمیاتی درجہ بندی

Epiphenomenon ..... تابع مظہر

Epiplexis ..... دلیل بذریعہ علامت

Epiphany ..... انکشاف، ظہور

Epigram ..... منظوم لطیفہ

Equivocal ..... ذو معنی

Equivalence ..... مرادفیت

Epithalmium ..... گیت عروسی

Epigram ..... مختصر مزاحیہ بیت (شعر)

Eriebnis ..... حال تاملی

Error ..... خطا

Erotic ..... شہوانی

Essentialism ..... جوہریت

Essense ..... جوہر

Esthetic ..... جمالیاتی

Esthesis ..... حسیہ

Esoteric ..... محرمانہ

Essentialism ..... لازمیت

Established ..... منعقدہ

Ethics ..... اخلاقیات

Ethical Descriptivism ..... اخلاقی بیانیت

Ethinic ..... مخصوص نسل

Ethnocentrism ..... مخصوص نسلیت، عصبیہ

Etymology ..... اشتقاق

Ethos ..... سبھاؤ، خلیقہ، امتیاز

Epithalamion ..... نظم عروسی

Event ..... واردات، واقعہ

Eschatology ..... یوم حساب (بعد از مرگ)

Euphuism ..... انشائے مرصع

Euphony ..... خوش آوازی

Euphoria ..... مبالغہ عدم حقیقت

Exegetical ..... تشریحی

Excitement, Stimulus ..... تہییج

Existential ..... وجودی

Existentialism ..... وجودیت

Existential Import ..... وجودی اظہار

Existential Phenomenology ..... وجودیاتی مظہر

Experession ..... اظہاریہ، تاثریہ

Expressive Criticism ..... اظہاری تنقید

Exprssive Realism ..... اظہاری حقیقت پسندی

Explanation ..... توجیہ

Excitement ..... ہیجان

Exact ..... قطعی

Evolution ..... ارتقاء

Exemplification ..... تماثلت

Exercite ..... تمشق

Exoteric ..... ظاہری

External ..... خارجی

Externalization ..... خارجیانہ

External World ..... عالم خارجی

Extraversion ..... ظاہر بینی، برون اندروی

Exposition ..... افشاء، تشریح

Extended Metaphor ..... توسیعی استعارہ

Exoticism ..... ظاہر پرستی

Faith ..... ایمان، اعتقاد

Fabula ..... کہانی

Fable ..... قصہ کہانی، اخلاقی کہانی

Fancy ..... واہمہ

Fact ..... واقعہ، امر

Fact-Value Dichotomy ..... واقعہ، قدر دوئی

Faculty ..... ملکہ

Fantasy ..... واہمہ

Factual Truth ..... واقعاتی صداقت

Fallacy ..... مغالطہ

Fancy and Imagination ..... مغالطہ اور پیکریت

Fate ..... تقدیر، نصیبہ

Fatalism ..... تقدیریت

Farce ..... مزاح (مزاحیہ مکالمہ)

Feed Back ..... اطلاعی ردعمل یا جواب

Feeling ..... محسوسات، حساس

Felicific ..... مسرت زا

Feminist ..... تانیثیت، تحریک نسواں

تانیثی تنقید نسوانی تنقید، نقد نسواں

Feminist Criticism

Fetish ..... پکا

Fictive ..... کھوٹا، من گھڑت، نقلی، جعلی

Fictionlism ..... افسانویت

Figure ..... شکل (قیاسی)

Figurative Language ..... غیر ادبی زبان

Fideism ..... عقیدیت

Fine Arts ..... فنون لطیفہ

First Order System ..... اصل الاصول

Fixation ..... وابستگی

Flux ..... سیل

عندیہ پیشگی (جو قاری کو دیا جائے)

Foreshadow Wing

Foot ..... جز

Focalization ..... مرکوز کرنا

Folk Art ..... لوک فن، لوک کلا

Folk Ways ..... لوک ریت

Foil ..... باطل کرنا

Foundational ..... بنیادی، آغاز

Free Verse ..... نظم آزاد

Force ..... قوت

Fore Knowledge ..... پیش دانی

Foregrounding ..... پیش منظر میں

Foreunderstanding ..... پیش تفہیم

Formal Language ..... صوری لسان

Formal ..... صوری، ہیئتی

Formalist ..... ہیئت پسندی، صوریت پسند

Formalogy ..... ہیئیات، صوریات

Free Agent ..... فاعل مختار

Free Associations ..... آزاد تلازمہ

Formati m ..... تشکیل

Frame-work ..... خاکہ کاری، تجویز کاری

Franchise ..... حق دار، حق داری

Freewill ..... آزاد خواہش

Form of Reference ..... ذہنی حوالہ

Function ..... تفاعل، وظیفہ

Functionalism ..... تفاعل، وظائفی

Fundamental Divisiom ..... اساسی تقسیم

Fundamental ..... بنیاد پرستی، کٹر پنتھی

Future ..... مستقبل

Futilitarianism ..... نامفادیت

Fusion ..... اتحاد

Gagenstand Theory ..... نظریہ معروض

Galenaian Figure ..... قیاسی شکل جالینوسی

Generality ..... عمومیت

Generate ..... تشکیل دینا

English	اردو
Generalization	تعمیم
Generative Theory of Data	معطیات کا آفرینشی نظریہ
Genesis	تکوین، وجود میں لانا یا ہونا، نشاۃ
Genre	اصناف
Genre Criticism	اصنافی تنقید
Genetic	جینی، جنیاتی
Genetic Fallacy	جینی مغالطہ
Genetice Method	جینی طریقہ
Genius	نابغہ
Gesture	حرکات، اشارات
Generes	اصناف (ادبیات)
Genus	جنس
Glossary	مجموعہ تشریحات، فرہنگ
Gestalteinheit	واحدی نظام
Gnosiology	عرفانیت
Gnosis	عرفان
Global	کائناتی، محیط الارض
Geno-Gext	متن نسواں، نسوانی متن
God	خدا
Glossography	شرح نویسی
Grammatology	تحریرات، قواعدیات
Grands Recits	مہابیانہ
Gyno Criticism	تنقید نسواں
Hallacination	وہم
Hatred	نفرت، بغض، کینہ
Harmony	حسن ترتیب
Happiness	مسرت، خوشی
Hellenism	کلاسیت (یونانی)
Hebrew	عبرانی
Gebraism	لسانی انجیل
Hexis	عادۃ
Hegemonic	مسلم السار
Hermentics	تفہیم، تفہیمیت، علم تفہیم
Heterodox	غیر مقلدانہ، خلاف شرع
Hermeneutic	تفہیمی
Hermeneutical	تفہیماتی
Hermeneutic Code	تفہیماتی رموز
Heuristic	تفتیشی
Heterogeneous	غیر متجانس، مختلف الاوضاع
Heroic	اولوالعزمانہ
Hierarchy	درجہ وار، تدریجی، مراتبیات (کلیا)
Heterodoxy	الحاد
Histore	کہانی

English	اردو
History	تاریخ
Historiograph	تاریخ نگاری
Historical Materialism	تاریخی مادیت
Historicism	تاریخیت
Historicizing	تاریخیانہ
Historical Discourse	تاریخی کلام یا مخاطبہ
Hozx	شطرگرز
Homogeneity	یکجیتی، ہم جینی
Homogeneous	موافق، ہم قسم
Horizontal	افقی پہلو (زبان کا)
Holism	نظریہ کلیت
Hsio	حب جد
Humours	اخلاط رابطہ
Humanism	انسان پسندی، بشر دوستی، انسیت
Human Nature	فطرت انسانی
Huristic	تسخیر ذات
Hyperbole	انتہائی مبالغہ کلام
Hypogram	قالب
Hypothesis	فرضیہ، مفروضہ، قیاس
Hypothetica	امر افتراضی
Hypothetical Syllogism	قیاس افتراضی
Hypnotism	تنویم
Hypnosis	تنوم
Hypostatization	مشروتیایا
Hymen	شادی کا دیوتا
Hylomorpihism	ہیولی صورتیت
Hyperole	مبالغہ
Hyper Text	متن قبل
Hyper Media	ابلاغ قبل
Hypostasis	اقنوم
Hylosis	ہیولہ
Hylotheism	ہیولائیت
Hylozoism	ہیو حیوحیت
Hypallage	تبدیلی نحو
Hypermtric	پس پیمانہ
Ich	من، میں، انا
Icon	صنمیہ، شبیہ
Iconology	شبیہاتیات
Idyll	مختصر نظم
Ideal	مثالیہ، آدرش
Idea	خیال، تصور، عین
Idealistic	عینی
Idealism	مثالیت، عینیت، تصوریت
Ideality	قابل تصور

English	اردو
Ideality	تصوریت
Ideal Utilerianism	مثالی افادیت
Idealization	مثالیانہ، تصورانہ
Identity	ہم ذاتی، شناخت، عینیت (فلسفہ)
Ideo-Genetic Theory	صور فشائی نظریہ
Ideology	فکریات، آئیڈیولوجی، حکمیات
Ideological Construct	حکمیاتی تشکیل
Ideologue	خیال فروش
Idol	بت، صنم
Illusory Ending	التباسی اختتام
Illumination	تنویر
Illusion	التباس
Illusionism	التباسیت
Imago	مثالیاتی تمثال
Image	تمثال، پیکر
Imagism	تمثالیت، پیکریت
Imageless Thought	فکر بے تمثال
Imagery	تخیلیت
Imanence	سریانیت
Imagination	تخیل
Imitation	نقل، تقلید
Immanetism	داخلیات (وجود زماں)
Immaterialsim	لامادّیت
Immaterial	لامادّی
Immanet Interpretion	داخلی توضیح
Immediacy	فوریت
Immedediate	راست انتاج
Immoralism	بے اخلاقیت
Immortality	خلود
Immutability	تغیر ناپذیری
Immperitivism	اطلاقیت
Immpossiblity	عدم امکانیت
Implid Reader	مرادی قاری
Implication	اضماریت
Impression	ارتسام
Impersenal Unconscious	غیر ذاتی لاشعور
Inborn	خلقی
Impulse	تحریک، اضطرابی
Incantation	لفظی فسوں گری
Intuto	کثیف
Incest	مباشرت مادر
Inconsistency	عدم توافق
Incompatible	ناموافق
Inconcievabbility	تعقل ناپذیری

English	اردو
Incorporeal	غیر مادی
Ideterminism	لاتعینیت
Individual	انفرادی، فرد، منفرد
Individualism	فردیت، انفرادیت
Indubitable	صریح
Induction	استقراء
Individuation	تفرد
Indeterminism	لاتعینیت
Inertia	جمود، سکوت، استقرا
Ineffable	ناممکن
Inesse Inellectum	موجود فی العقل
Inferiority Complex	احساس کمتری
Inference	استنباط، انتاج
Inform Reader	جانکار قاری، آگاہ قاری
Infromal Fallacy	غیر ہیئتی مغالطہ
Inre	مادّی
Integerity	سالمیت
Introspection	دروں بینی، باطن بینی
Intentional Fallacy	شعوری مغالطہ
Infieri	حالت کاینہ
Infinity	لاتناہی
Infima Species (ارسطو کے یہاں انسان)	نوع سفل
Informal Fallacy	غیر ہیئتی مغالطہ
Instinct	جبلت
Imperfective	حال مستقبل
Innuendo	طعن آمیز اشارہ
Innate Ideas	وہبی تصورات
Innatism	وہبیت
Innersense	باطنی حس
Inference	استنباط، انتاج
Instrumentalism	پیمائیات، آلاتیات
Internal Rhyme	داخلی آہنگ
Integration	ارتباط، تکمیل
Intellect	دانش، خرد
Intellectnal Virtues	فضائل عقلی
Intellegible	قابل فہم
Intentionality	منشائیت، اسنادگی
Intentionalism	اسنادیت
Intention	مقصد، مدعا
Intentional Theory of Mind	ذہن کا اسنادی نظریہ
Interaction	تعامل، بین العمل
Interactionism	بین العملیت، تعاملیت
Interaction Theory	نظریہ بین العمل نظریہ تعاملیت

Interplay .... تعامل

Inter .... جامد

Interest .... دلچسپی

Internal .... داخلی

Internalism .... باطنی (ادراکی حوالے سے)

Internal Sense .... حسن باطن

Inter Subjective .... بین موضوعی

Interpretation .... تشریح

Inter Textual .... بین المتنی

Introception .... حصول وصول

Intrinisically .... فی نفسہٖ

Introjection .... درون اندوزی

Intrinic .... ذاتی یعنی

Intuition .... وجدان

Intuitive Cognition .... وجدانی وقوف

Intuitionism .... وجدانیت

تقلیب، عکس ترتیب (لفظوں کا)

Inversion (Anastrophe)

Irony .... طعن، رمز، طنز، ہجو

Irrational .... غیر عقل

Irregularity Theory .... نظریہ بے ضابطگی

Irrelevent .... بے محل

Isomorphism .... ہم شکلیت

Isotope .... مرکب (ایک سے زائد اجزا کا)

Jouissance .... لذت، مہا آنند

Judgment .... نکتہ دانی، تصدیق

Kalology .... علم الحسن

Katharsis .... تزکیہ، تطہیر، تنقیہ، انخلاص

Key Note .... مقامی نغمہ

Kind .... نوع

Kinesis .... حرکہ

Knowledge .... علم، آگہی

Kratocracy .... بل راج

Lai .... بیانیہ نغماتی نظم

Legend .... حکایت

Language .... لسان، زبان

Language Poem .... لسان شاعری

Latency .... مخفیت

Latent .... مخفی

Law .... قانون

Linguistic Arbitration .... لسانی بے قاعدگی

Linearity .... استعمال سطور

Learning .... تعلم علم، فضیلت، علمیت

Leftism .... یساریت

Lesbianism .... علت سفوی

Lemma .... تمہیدیہ

Lexicography .... فرہنگ نویسی، تالیف لغت

Lexias .... اجزاء قراتی

مؤلف لغت، صاحب اجزاء قراتی، فرہنگ نویس

Lexicographers

Lexis .... الفاظ (جو مصنف استعمال کرتا ہے)

Libertarianism .... اختیاریت

Lieberum Arbitrium .... اختیار فیصلہ

Limerick .... مزاحیہ شعر لطیف

Liberty .... اختیار، آزادی، حریت

Linguistic Description .... لسانیاتی توضیح

Limit .... حد، حصر

Limiting Notion .... تہائی رسم، تحدیدی تصور

Literariness .... ادبیت

Litterateur .... عالم، ادیب، مصنف

Literary Device .... ادبی پیرایہ، ادبی وضع

Literary Function .... ادبی وظیفہ، ادبی تفاعل

Lisbian .... ہم جنس نسواں

Lisbianism .... ہم جنس نسواں پسندی

Logomachy .... نزاع لفظی، لفظی بحث

Logic .... منطق

Logocentric .... لفظ مرکز

Logos .... کلام، نطق

Logosorthos .... کلمات صحیح

Logocentricity .... لفظ مرکزیت

Lucidity .... وضاحت بیان

Love .... عشق

Lyric .... غنائیہ

Lyrical .... غنائی

Matrilinean System .... مادری نظام

Macro .... کبیر

Macrocosm .... کائنات کبیر

Maibtic .... قابلائی

Main Idea (Theme) .... مرکزی خیال

Maxim .... حکیمانہ مقولہ، ضابطہ عمل

Major Term .... حد اکبر

Malapropism (Solecism) لسانی غیر ضابطگی

Mania .... خبط

Manifold of Sense .... تیرگی حواس

Manichism .... مانیت

Marginalise .... تحشی کرنا

Marxism .... مارکسیت

Marginalised .... محشی

Masochism ..... مسوکیت

Matter ..... مادّہ

Material Mode of Speech ..... مادّی انداز گفتگو

Material Apriori ..... مادّی قبل تجربی

Materialism ..... مادّیت

Materialization ..... تجسیمیت

Mathesis Universalis ..... لغت کلی

Matter Prime ..... مادّۂ اولی

Matrix Method ..... قالبی طریق

Matrix ..... مغذیاتی سانچا

Mean ..... اوسط

Melancholy ..... افسردگی

Meta ..... مابعد

Menemic Causation ..... تحفظی تعلیل

Meta-Commentary ..... مابعد تفسیر

Mechanism ..... میکانیت

Meliorism ..... اصلاحیت

Meneme ..... تحفظ

Menemics ..... تحفظ کاریت

Meta Criticism ..... مابعد تنقید

Meta Communication ..... مابعد ابلاغ

Mental Chemistry ..... ذہنی کیمیا

Meta Language ..... مابعد لسان

Meta Linguistic ..... مافوق لسانی

Meta Mathematics ..... مابعد ریاضی

Metem Pschchosis ..... تناسخ الارواح

Meta Physics ..... مابعد الطبعیات

Meta Morphosis ..... تجسم کاری، قلب ماہیت

Meaning ..... معنی

Memory ..... حافظہ

Metaphor ..... استعارہ، مجاز

Mediation ..... وساطت

Methodic Doubt ..... ارتیابی طریق

Methodology ..... طریقیات، نظریہ طریقہ کار

Method ..... طریقہ، منہاج

Mentalism ..... اذہانیت

Mental Process ..... ذہنی عمل

Minor Premise ..... مقدمہ صغریٰ

Miscersenation ..... نسلی خلط

Meter ..... وزن، بحر

Metonymy ..... مجاز مرسل، اسم تبادل

Metanarrative ..... مہابیانیہ

Metamorphosis ..... قلب ماہیت

Microcosm ..... عالم اصغر

Micro ..... اصغر

Micrological ..... خوردیاتی

Middle Term ..... حد اوسط

Milieu ..... ماحول

Micro Poetics ..... خرد شعریات، مائیکرو شعریات

Mimesis ..... نظریہ نقل، نقل، چربہ

Mimpathy ..... مثل دردی

Mind ..... ذہن

Minaturisation ..... تصغیریت

Misanthrophy ..... مردم بیزاری

Misoneism ..... نو بیزاری

Mock Reader ..... نقلی قاری

Modal Categories ..... اطوری زمرے

Modalism ..... طوریت

Mode ..... مزاج، طور، شان

Monadology ..... مونادیات

Monologue ..... خود کلام

Monism ..... وحدیت

Monotheism ..... توحید

Monologic ..... یک فکری

Mood of Syllogism ..... ضرب قیاس

Morbid ..... مریضانہ

Mores ..... رسوم، طور

Morals ..... اخلاق

Moral Sense ..... اخلاقی حاسہ

Monosexuality ..... یک جنسیت

Morphosyntax ..... حرف نحو

Motif ..... مقولہ، مؤلف (بار بار دہرائی جانے والی بات)

Mutation ..... انقلاب نوعی

Multi-Lingual ..... کثیر اللسان

Morphology ..... مطالعہ نموئے لفظ

Myth ..... کہانی، اسطور، قصہ

Mythology ..... اساطیر، علم الاصنام، قصص الرجال

Mythical Thinking ..... اسطوری فکر

Mysticism ..... سریت

Mystification ..... سریت، آبلہ فریبت

Mythopoesis ..... اساطیر آفرینی

Naive Realism ..... سادہ حقیقت پسندی

Narcissim ..... نرگسیت

Narration ..... بیاں کاری

Narrative ..... بیانیہ

Narrativity ..... بیانیہ پن

Narratology ..... بیانیات

Narrator ..... قصہ گو

Nascent .... ناشئی

Natural .... طبعی، فطری، خلقی

Nature .... ماہیت، اصلیت، فطرت

Naturalism .... فطریت

Naturalise .... اپنانا، متعلق کرنا

Nativity .... خلقیت

Nescience .... جہل

Neutral Monism .... تعدیلی وحدت

Nervousness .... اعصابیت

Nerves Tension .... اعصابی تناؤ

Neurotic .... نیوارتی

Negation .... نفی

Negative .... سلبی، منفی

Negativism .... منفیت

Negative Proposition .... قضیہ سلبیہ

Neo .... نو

Neo-Hegelianism .... نوہیگلیت

Neo-Realism .... نوحقیقت

Neo-Plationism .... نوفلاطونیت

Neo-Idealism .... نوتصوریت

Neo-Kantianism .... نوکانٹیت

Neo-Pythagorianism .... نوفیثاغوریت

Nihilism .... عدمیت مائل، نفی دانش، عدمیت، انکاریت

Niciht-Ich .... نیسرانا

Nihil Ex Nihlo .... لایصدر اشی عن لاشی

Noetic .... دانش، سمجھ

Noema .... معروضیہ (فلسفہ ہوسرل میں)

Noematic .... ذہنی

Nominal .... اسمی، تحدیدی

Nominalisation .... اسمیت

Nomenclature .... نظام تسمیہ، فرہنگ اصطلاح

Non-Being .... لاوقوفیت

Non-Vocalic .... سلب وجود، لاوجود

Norm .... معمول، معیار، منوال

Normative .... قاعدہ پرداز، معیاری، منوالی

Notation, Logical .... منطقی اشاریت

Notting .... لاشی

Notion .... خیال، تصور

Nucleus .... مرکزہ

حقیقت (خارج از شعور انسانی) معقول بالذات، کمایہ

Noumenon ....

Nous .... نسمہ

Object .... شے، معروض

Objectivism .... معروضیت

Objective .... معروضی

Objective Idealism .... معروضی تصوریت

Objective Language .... معروض لسان

Objectivise .... معروض بنانا

Objectify .... معروض کرنا

Observational Judgment .... مشاہداتی تصدیق

Observation .... مشاہدہ

Obscurantism .... ظلمت پسندی

Obscenity .... عریانی

Occurrence .... واقعہ

Occasionalism .... موقعیت

Ode .... طویل نغماتی نظم

Omnipotent .... لامحدود اختیاریات

Ommnicience .... کل آگاہی

Ontological .... وجودیاتی

Ontological Argument .... وجودیاتی دلیل

Ontology .... ماہیت علم، علم الوجود، وجودیات

Open Marxism .... کھلی مارکسیت، کشادہ مارکسیت

Operationalism .... کارآوریت

Opinion .... رائے

Optimism .... رجائیت

Opposition .... تخالف

Order .... نظم، ترتیب، ضابطہ

Orgality .... دہنیت

Organic .... عضویاتی، نامیاتی

Organicism .... عضویائیت، نامیائیت

Organism .... عضویہ، نامیہ

Organic Inferiority .... عضویاتی کمزوری

Organic Explanation .... عضویاتی/نامیاتی توضیح

Organon .... ذریعہ، آلہ، وسیلہ، منہاج

Orator .... سخنور، واعظ، فصاحت، خوش کلامی

Orismalogy .... تکنیکی اصطلاحات کی تشریح

Orthodoxy .... راسخ العقیدگی

Ostensive .... درشتی

Other .... غیر، دوسرا

Otherness .... دوسراپن، غیرپن

Over Individual .... فوق فرد

Oxymoron .... صنف اجتماع ضدین

Pacifism .... صلح جوئیت

Pain .... الم، اذیت

Palingenisis .... باز آئش

Panlogism .... ہمہ عقلیت

Pan-Objectivism .... ہمہ معروضیت

Pan-Psycychism .... ہمہ نفسیت

Pan-Stanism .... ہمہ ابلیت، ہمہ شیطانی

Pan-Theies .... ہمہ الہیت، وحدت الوجود

زمرہ (تصریفی) مثالہ، ماڈل (تحقیقی نظریے کا)
Paradigm

عمودی جہت (لسانی) استعاراتی جہت
Paradigmatic Aspect

Paradox .... استعاد، تناقض، قول محال

Paradoxical .... متناقضانہ، تناقض

Paralogism .... دلیل فاسد

Parrol .... تکلم

Paraphrase .... منطقی وضاحت

Passive Empiricism .... انفعالی تجربیت

Parable .... سبق آموز کہانی، حکایت

Past .... ماضی

Pastiche .... بازیافت اسالیب ماسبق

Pathos .... دل گداز، سوز گداز

Patriarchy .... نظام پدری

Pattern .... وضع، نمونہ، بناوٹ، قماش

Pathricide .... پدر کشی

Pathological .... مریضانہ

Performative .... عملی

Personification .... شخصی اضمار

Pentameter .... مخمس

Perception .... ادراک

Persona .... نقاب یا آواز (مصنف کا)

Percepts .... مدرکات

Percevier .... شاہد، مدروک

Performance .... کارکردگی

Person .... شخص

Personification .... استعارہ

Personalism .... شخصانیت

Personal Unconceious .... ذاتی لاشعور

Personal Identity .... شخصی عینیت

Perversion .... کج روی

Perspective .... تناظر

Pessimism .... یاسیت، قنوطیت

Predicate, Simple .... محمولیہ سادہ

Phantasm .... ظہور

Phallus .... العضو

Phantasy .... ظہوریہ

Phrase .... محاورہ، طرز کلام

Phenomena .... مظاہر

Phenomenon .... مظہر

Phenomenal Field .... مظہری میدان

Phenomenolism .... مظہریت

Phenomenology .... مظہریات

Philosophy .... فلسفہ

Phoneme .... صوت

Phonetic Transcription .... صوتیاتی تحریر

Phonetic .... صوتیہ

Phonological .... تجز صوتیاتی

Phonesis .... عمل تدبر

Philosophies of Retreat .... فلسفہ ہائے مراجعت

Phonocentrism .... صوت مرکزیت

Physicalism .... طبعیاتیت

Pity .... ترحم

Plot .... پلاٹ

Plastic .... قالبہ

Pleasusre (Plaisir) .... لطف و نشاط، لذت

Plurality .... کثیرالمعنویت

Pluralism .... کثرتیت

Plurality of Causes .... کثرت علل

Pneuma .... روح (بسا اوقات کلمہ کے مترادف

Poetic Diction .... شاعرانہ زبان

Poiesis .... صنعہ

Poem .... نظم

Poetics .... شعریت

Poeticality .... شعریات

Poetic .... شعری

Poeticalness .... شعری پن

Point of View .... نکتہ نظر

Polytheism .... کثرالہیت

Polysyllogism .... کثر قیاس

Polarisation .... قطبیت

Political Unconcious .... سیاسی لاشعور

Polyphonic .... تکثیری، کثیر صوتی

Propositions .... بند مسائل

Progression .... تحرک

Positivity .... اثباتیت

Posit .... اثبت

Post-Modernism .... مابعد جدیدیت

Post-Modern Conditions .... مابعد جدید صورتحال

Post-Structuralism .... پس ساختیات

Positive .... ثبوتی، مثبت

Positivism .... ایجابیت

Potency .... قوۃ

Potentially .... بالقوۃ، امکاناً

Pour Soi .... وجود بہ نفسی

Praedicablia .... محمولیہ

Practice .... طریقہ عمل
Prime Mover .... محرک اوّل
Protagonist .... مرکزی کردار (ادبی عمل میں)
Pragmatic .... عملی
Pramatices .... نتائجیہ، نتائجیت
Pramtic Fallacy .... نتائجی مغالطہ
Preconception .... سابقہ تصورات
Premise .... موضوعہ اصل، مقدمہ
Praxis .... عملیت
Priniciple of Differentation اصول تفریقیت
Presience .... پیش علمی
Problematic .... قضیہ، مسائل، مسائلی
Pre-Ordained Meaning .... طے شدہ معنی
Presence .... موجودگی
Producer .... پیداکار (معنی کا)
Pre-Determinism .... قضاء
Proem .... تمہید، آغاز
Proverb .... کہاوت
Process .... عمل
Privacy Epistimic .... علمیاتی محرومی
Privative, Term .... سلبی حد
Principle .... اصول

Probabilism .... مرجحیت
Probability .... احتمالیت
Prolegomena .... تعارفی مضمون
Project .... منصوبہ، خاکہ
Projection .... تظلیل
Proposition .... قضیہ، مسائل
Pro-To Decon Structive ابتدائی رد تشکیل
Pro-To Structuralist ابتدائی ماہر ساختیات
Protasis .... مقدم
Presupposition .... پیش فرض
Psychic .... نفسی
Psychology .... نفسیات
Psychosis .... دماغی خلل، جنون
Psychologism .... نفسانیت
Psycho-Analysis .... تحلیل نفسی
Psycho Linguistics .... نفسی لسانیات
Poletik .... بوطیقہ
Pure .... محض، خالص
Pure Ego .... انائے محض
Pure Experience .... تجربہ محض
Purism .... سادہ گری
Puritan .... ارتقائی

Puritan Ethics .... ارتقائی، متقشفی اخلاق
Purposiveness .... مقصدیت
Polystem Theory .... نظریہ تکثر المنظوم
Quality .... کیفیت، صفت
Quality .... کیفیہ، کیت
Quatrain .... شعری بند (چار سطروں کا)
Radica .... بنیادی تبدیلی
Radicalism .... بنیادی تغیر پسندی
Random .... بے ترتیب
Ramified Theory of Tyes .. انشعابی نظریہ انواع
Ratio .... عقل، نسبت
Ratiocination .... مداولت
Rationale .... عقلی جواز
Rationalism .... عقلیت
Rationalization .... تاویل
Reading .... قرأت
Readable .... خواندنی
Reader .... قاری
Reader-Oriented Criticism ... قاری اساس تنقید
Reader-Response Criticism . قاری جوابی تنقید
Readerly ... مقلدانہ، محررانہ (متنی حوالے سے)
Real .... حقیقی

Reality .... حقیقت
Realism .... حقیقت پسندی
Realisation .... قبولیت
Refin ایک ہی بند میں دو سطروں کا دوبارہ استعمال
Reason .... عقل
Recension .... تفہیم متن پر نظر ثانی
Recepivity .... تاثر پذیری
Recondite .... عسیر الفہم
Recit .... بیان
Reception .... قبولیت
Reception Theory .... نظریہ قبولیت
Recuperate .... سمجھانا (ادب، قاری کو)
Recursive .... تکراری، متوالی
Receiver .... حصول کنندہ
Reductionism .... تحویلیت
Reductive Fallacy .... تحویلی مغالطہ
Reference .... حوالہ، حالت
Absurd:un .... احالہ بہ محال
Referential .... تاریخی، حوالہ جاتی
Regimentatation .... جبر
Regionalism .... علاقہ پسندی، خطہ پسندی
Regession .... مراجعت

Regressive .... بازگردان

Relativism .... نسبت، علاقہ، رشتہ، اضافیت

Ralative .... اضافی

Repression .... جبر، دباؤ، جبری دباؤ

Response .... استجاب، تاثر، جواب

Rhetoric .... بدیع

Rhetorical .... بدیعیات، بلاغت، ریطوریقا

Rhyme .... قافیہ

Rhythm .... آہنگ

Rising Action .... دوکرداروں کا اختلافی ہیجان

Romanticism .... رومانیت

Run-On-Line .... ایک سطر جو دوسری سطر سے بغیر وقفے کے مل جاتی ہے

Saga .... قدیم کہانیاں

Sanction .... تکلف نافذہ

Sarcasm .... زبان دراز

Satire .... طنز

Scenic .... منظری

Sceintism .... سائنیات

Scansion .... تقطیع

Scatology .... فحش ادب

Schism .... افتراق

Scholasticism .... مدرسیت

Scholastic Philospher .... مکتبی فلسفی

Schizophrenia .... قبل لسانی (نشانیاتی حالت)

Scriptible .... ادبیانہ (متنی حوالے سے)

Secular .... عصری

Second Order System .... ثانوی نظام

Self .... ذات

Self Hood .... وجود ذات

Self Ratifying .... خود تصدیقی

Self Evoked .... خود انگیختہ

Self Centred .... خود مرکز

Self Consciousness .... شعور ذات

Semic .... معنیات

Sematic Anomaly .... معنیاتی بے قاعدگی

Sematics .... معنیاتی جہت (مواد کی جہت) معنیات

Sel-Deconstruction .... خود ردتشکیل

Seme .... معنوی اکائی، معینہ

Semiotic .... نشانیاتی

Semiology .... نشانیات

Semiotics .... نشان

Sense-Data .... معطیات حس

Sensibilty .... حسیت

Sequence .... ترجیع

Sentence .... جملہ

Sentence, Categorical .... جملہ حملیہ

Set .... مجموعہ

Set of Relations .... رشتوں کا مجموعہ

Super Structure .... بالائی ساخت

Shadow .... پرچھائیں

Sign .... نشان، علامت

Sign-Making .... نشان سازی

Sign-System .... نظام نشانات

Sign-Indexical .... اشاریاتی علامت

Signifi .... منفرد، معنی خیز

Signified .... مدلول، تصور نما

Signifier .... دال، معنی نما

Similie .... تشبیہ

Sjuzet .... پلاٹ

Simultaneity .... ہمہ وقتی

Social .... معاشرتی، سماجی

Social Contract .... معاہدہ عمرانی

Social Formation .... معاشرتی / سماجی تشکیل

Social Life .... معاشرتی زندگی

Socail Practices .... معاشرتی معمولات

Socialism .... اشتمالیت

Socratic .... ارسطوی

Socialogy .... معاشریات، سماجیات، عمرانیات، اجتماع شناسی

Social Text .... عمرانی متن

Solecism .... بے محاورہ (محاورے کی غلطی)

Spacial .... مکانی

Sophists .... سوفسطائیہ

Spacing .... فاصلہ سازی

Sphistry .... سوفسطائیت

Sound .... صوت

Sophocracy .... حکمائیت

Sound Symbolism .... صوتی رمزیت

Sorites .... قیاس مسلسل

Sorge .... تردد

Specacle Society .... تماش بینی معاشرہ

Spectrum .... طیف

Spirit .... روح

Spirism .... روحیت

Space .... مکان

Split Subject .... دولخت موضوع

Speech-act .... کلامی اعمال

Statement .... بیان

Struggle For Existence .... جہد للبقا

Structural .... ساختی

Structure .... ساخت

Structuralism .... ساختیات

Strucural Criticism .... ساختیاتی تنقید

Structuralist .... ماہر ساختیات، ساختیاتی

Structuration .... ساختیت

Structurization .... ساختیانہ

Structuring .... ساختگی

Speech .... تکلم، گفتگو

Stoic School .... رواقی، دبستان

Stimulus .... مہیج

Strategy .... حکمت عملی، طرز گذاری

Strata .... پرت، تہہ

Streotype .... قدیم (کردار اور پلاٹ وغیرہ)

Stream of Conciousness .... شعور رَو

Stylistic Shoice .... اسلوبیاتی انتخاب

Style .... انداز، اسٹائل، اسلوب

Subtantive .... قائم بالذات، جوہری

Subject .... فاعل، موضوع، ذات

Subject of Enuciating .... بیان کا موضوع

Subjectivism .... موضوعیت

Subjective .... موضوع، ردِ عمل

Sublime .... اجلال

Sublimation .... ارتفاع

Sub-Contrary .... تحت تضاد

Sub-Alternation .... تحت اشمار

Sub-sistent .... ثبوتی

Sui-Generis .... بجنسی

Succession .... توالی (ترتیب سے)

Supra-Intellectual .... ورائے خرد

Superssion .... اجبار، امتناع

Super Reader .... زیرک قاری

Supplement .... ضمیمہ (متن یا معنی کا)

Surrealism .... پاتال

Syllogism .... اشارہ

Symbolise .... علامتیانہ (زبان کے ذریعے اظہار کرنا)

Symbolist Poetry .... اشاراتی شاعری

Summative .... جمعی

Syllables .... مقطع لفظی

Symbolic Action .... علامتی، اشاراتی عمل

Syllogism .... قیاس

Symbolising .... علامت سازی

Syntagm .... نحویہ

Syntax .... نحو

Syntactes .... نحویات

Synthetic Proposition .... ترکیبی قضیہ

Syntagmatic .... نحوی افقی (رشتہ)

Synthesis .... ترکیب

Synchronic .... حاضر وقتی، یک زمانی

Synchrony .... حاضر وقیت، زمانیت

Syntagmatic Level .... افقی سطح

System .... نظام

Symptomatic .... تعلیلی

Systematization .... نظامیانہ

Talent .... ذکاوت

Tale .... قصہ، کہانی

Taboo .... قابلِ احترام، حرام، ممنوع، تحریم، امتناع

Tagmame .... قواعد کی سب سے چھوٹی اکائی

Tast .... ذوق

Taxis .... لفظوں کی ترتیب

Autology .... تکراریات

Telos .... غایت

Teleosis .... غائیہ

Teleology .... غائیت

Temporal .... زمانی

Term .... حد

Telepathy .... بعد فہمی

Text .... متن

Textualism .... متنیات

Textuality .... متنیت

Theism .... الٰہیت

Thoroug Hit Going .... مفرط

Thought .... تفکر، فکر

Theme .... بنیادی خیال، بنیادی تصور

Theorm .... نقطہ نظر، نظریہ، دعویٰ، مسئلہ

Thematics .... موضوع (کا خلاصہ یا مقولہ)

Thematics Critiems .... موضوعاتی تنقیدی

Theory .... فلسفہ، نظریہ

Theoryetical .... نظریہ

Theory of Relativity .... نظریہ اضافت

Thesis .... دعویٰ

Totality .... کلیت

Tone .... لہجہ

Tragedgy .... المیہ

Transitvity .... متعلقیت

Transcendental .... ماورائی

Trancedent Interpetation ماورائی توضیحات
Transferenece .... انتقال جذبہ
Topic .... عنوان
Transformation .... مبادلیات
Trans-Individual .... بین انفرادی
Trans Lingual .... بین لسان
Transpathy .... درو دروی
Trace .... جھلک، غائب معنی
Trace .... نقش خفی
Trite .... پیش پا افتادہ
Trichotomy .... سہ گانیت
Trimetore .... سہ رکنی سطر
Tropological .... استعاریاتی
Transcription .... معنیاتی نقل (مختصر نویسی)
Trope .... لفظ (جو حس کے معنی میں استعمال نہ ہو)
Truism .... سچائی، راستی
Tychism .... تُحسیت
Ugliness .... قباحت
Ugly .... قبیح
Paradox of Ugliness .... استبعاد قباحت
Ultimate Value .... علی قدر
Uncertanity Principle .... اصول لا تیقن

Unconscious .... لاشعور
Unconscious Mind .... لاشعوری ذہن
Undistrib Middle .... غیر متفرق اوسط
Understanding .... تفہیم
Under Line .... بین السطور
Under Erasur .... زیر تنسیخ
Undo .... بے دخل کرنا
Unifield Sel-fhood .... منظم ذات
Uniformity of Nature یکسائی، استقرار فطرت
Unique.. عدیم النظیر، یگانہ، یکتا، بے مثال، منفرد
Unitarianism .... توحیدیت
Unit .... واحدہ
Unity .... وحدت
Universal .... کلی
Universalism .... آفاقیت
Universe .... کائنات، کل
Universal Intelectual .... آفاقی دانشور
Discourse of Universal .... دائرہ بحث
Use-Mention Distinction... استعمال، حوالہ امتیاز
Utiliterianism .... افادیت
Utterance .... لہجہ، تلفظ، گفتار
Utopia .... یوطوفیا، طوبیہ

Utopianism .... یوطوفیائیت
Utopian Socialism .... یطوبی اشتمالیت
Variety .... متنوع، بوقلمونی
Value .... قدر
Variable .... متغیرہ
Veralization .... فعلیت
Verbal Irony .... زبانی مزاح
Veridicity .... صوابیت
Verification .... توثیق
امکان، احتمال (تخلیقی عمل میں تمثال اور حقیقت
Verisimilitude. جو مغالطے پیدا نہیں کرتے)
Verisimilitude .... تشابہ
Verbal .... لفظیاتی (جو زبان سے ادا ہو)
Vertical .... عمودی
Vertical Aspect .... عمودی جہت / پہلو
Verse .... شعر، بیت
Vicious Circle .... دور فاسد
Vignette .... مختصر بیانہ (تاثریہ)
Violent Hierachy .... متشدد فوقیتی ترتیب

Virtue .... فضلیت
Visual Art .... فنون بصری، فنون بینش
Vital Force .... قوت حیدی
Vitalis .... حیویت
Vocalic .... مصوتی
Vonel .... حرف علت، مصوت
Wasp .... واسپ
Wesen .... ماہیت، جوہر
Will .... ارادہ
World-Ground .... اساس عالم
World-Line .... خط عالم
World-Point .... نقطہ عالم
World-Soul .... روح عالم
World View .... تصور کائنات
مصنفانہ، ادیبانہ (متن کا مسودہ جس کو قاری خلق
Writerly (Scriptable) .... کرتا ہے)
Zeitgeist .... روح عصر
Zeuguma .... صفت حذف

BIBLIOGRAPHY

Abel, "Sartre VS Le'vi-Strauss" Commonweal, 1966, 84 (17): 364-54.

Abel, Elizabeth, (ed) Writings and Difference, Chicago, University of Chicago Press, 1980

Allen, E. I. From Plato to Nietzsche, Fawcett Publications Inc. Green Wich, Conn, 1977.

Ahsen, Akhter, The New Structuralism, New York, Brandon House, 1986.

Abrams, M.H. A Glossary of Literary Terms (Sixth Ed.) Harcourt Brace College Publisher, Fort Worth, Texas, 1993.

Angenot, Mare, "Structuralism as Syncretism: Institutional Distortion of Sausure" 150-153 in Fekete, John (ed.) The Structural Allegory: Reconstruction Encounters with the New French Thought. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1984 XXIV, 269 pp.

Anozie, Sunday O. "Nearitude and Structuralism" Black American Literature Forum 1981 Winter v15 (9) p 127-132.

Atkins G. Douglas and Morrow Laura (ed.) Contemporary Literary Theory. The University of Massachusetts Press Amcherst 1989.

Barry, Peter, "Life After Structuralism" Critical Quarterly 1981 Autumn V 23 (3) P 72-77.

Bakhtin, Mikhail, The Dialogic Imagination: Four Essays by M.M Bakhtin, Edited by Michael Holquest, Austin University of Texas Press, 1981.

Banerjee Nikhilish "Three Versions of the Literary Text. New Criticism, Structuralism and Russian Formalism. Dissertation Abstract International 1985 September V. 45 (3) P. 698 A.

Benveniste, Emile, Problem in General Linguistics, Coral Gubles, Florida University of Miami Press, 1971.

Bersani, Leo, A Future for Astyanax: Character and Desire in Literature. Boston Little Brown 1969.

Bal, Mieke, "Structuralism, History and the Semiotics of the Subject, Recent Development in French Literary Theory" Amsterdamer Deitrage Zur Neueren German Istik, 1982 V. 5 P. 55-78.

Barthes Roland, Element of Semiology, 1967, Translated by A. Lavers and C. Smith, Jonathan Cape, London, 1967.

Barthes, Roland, Writing Degree Zero, Translated by Laver and C. Smith, Jonathan Cape, London, 1967.

Barthes, Roland, Critical Essays, Translated by R. Howard, North Western University Press, Evanston Ill, 1972.

Barthes, Roland, Selected Writings, Introduction, Susan Sontage, Fontana, Lodon, 1983.

Barthes, Roland, S/Z, Sevil, Paris, 1970 and Hillz Wang, New York, London, 1975.

Blonsky, Marshall (ed.) On Signs: A Semiotic Reader, Bašil Blackwell Oxford, 1985.

Bennett, Tony, Formalism and Marxism, London, Methuen, 1979.

Boudreau, H.L. The Legacy of Structuralism: Chaos or Ferment Los Ensagistas: Georgia Series on Hispanic Thought, 1984, March V. 16-17, P. 81-84.

Boon, James, From Symbolism to Structuralism: Levi Strauss in a Literary Tradition, Harper and Row, New York, 1972.

Bruns, Gerald L. "Structuralism, Deconstruction and Hermeneutics Diacrotics: A Review of Contemporary Criticism, 1984 Spring V 4 (1) P. 12-23.

Bradbury John M. The Fugitives, A Critical Account Chapel Hill, University of North Carolina Press, 1958.

Barry, Peter "Is There Life After Structuralism" Critical Quarterly 1981

Autumn V 23 (3) P 72-77.

Broekman, J. Structuralism, Reidel, 1974.

Caruth, Cathy and E Seh, Debrorah, (ed) Critical Encounters: Reference and Responsibility in Deconstructive Writing, Ruters University Press.

Caws, Peter "What Is Structuralism:" Partisan Review 35, 1968, 75-91.

Chatman, Seymour, Story and Discourse Ithaca N. Y Cornel University Press, 1972.

Chomsky, Noam, Cartesian Linguistics, New York, Harper and Raw, 1966.

Chomsky, Noam, Language and Mind, New York, Harcourt, 1958.

Clarke, Simon, The Foundation of Structuralism, New Jersey, the Harvester Press, Sussex, Barness and Noble Books, 1981.

Cooper, Barry, Michel Foucault, In Introduction of the Study of his Thought, New York, Mellen, 1982.

Craig, David (ed) Marxism and Literature, Penguin Harmondsworth, 1975

Culler, Jonathan, Baum Alwin, Structuralism and Grammatology Boundary 2: A Journal of Post-Modern Literature and Culture, 1979, Fall V. 8 (1), P. 75-85.

Culler, Jonathan, Structuralist Poetics, Structuralism, Linguistics and the Study of Literature, London, Routledge and Kegan Paul, 1975.

Deely, John, Introducing Semiotic: Its History and Doctrine Bloomengton, Indiana University Press, 1982.

De George, Richard T. and Fernandem (ed) The Structuralism From Marx To Levi-Strauss, Gardencity, New York,Doublday (Anchor Books), 1972.

Detweiler, Robert, Story Sign And Self Phenomenology and Structuralism As Literary Critical Method Philadelphia, Fortress Press, 1978.

Domenico, Jervolino (Translated by Gordon Poole) The Cogito and Hermeneutics: The Question of the Subject in Ricoeve Kluwer Academic Publisher Dordrescent / Boston / London, 1990.

Donato, Eugene, "Of Structuralism and Literature" MLN 85, 1967 549-84.

Dowling, William, Jameson, Althusser, Marx, Ithaca, Cornell, UP 1984.

Davies, Douglas, J. "Evans-Pritchard, Structuralism and Anthropological Hermeneutics" Renaissance and Modern Studies, 1983 V. 27 P. 85-101.

Eagle, Herbert, J. "Verse as a Semiotic System: Tynjano, Jakobson, Mukarovsky, Lotman Extended Slavic And East Eurpean Jaurnal, Val. 25, No. 4, Winter 81- AA Tseel, University of Arizona, Tucson, AZ.

Easthope, Anthony, Birtish Post Structuralism Since 1968, London, Routledge, 1991.

Eco, Umberto, The Role of the Reader: Explorations in the Semiotics of Texts, Bloomington, Indiana University Press, 1979.

Eco, Umberto, A Theory of Semiotics, Blomington, Indiana University Press, 1976

Ehrmann, Jacques, 9ed) Structuralism, Gardencity, N.Y. Doublday, 1970.

Erlich, Victor, Russain Formalism, The Hague, Mague, Mouton, 1955.

Fekete, John, (ed) The Structural Allegory, Minneapolis, University of Minnesota Press, 1984.

Foucault, Michel, The Archaelogy of Knowledge, New York, Porth, Books, 1970.

Frye, Northrop, Antomy of Criticism: Four Essays, Princeton, N.J. Princeton University Prress, 1957.

Garvin, Paull "Structuralism, Estetics and Semiotics" 97-108.

In Steiner, Wendy (ed) Image and Code, Ann Arbor, University of Michigan, 1981, 186 pp.

Philosophy and Literature, New York, Basic Books, 1970.

Kurzweil, Edith, The Age of Structuralism, Le'vi-Strauss to Foucault, New York, Colambia University Press, 1980.

Lavers, Annette, Roland Barthes: Structuralism and After, Harvard University Press, 1982, 300 pp.

Lane, Michael (ed) Introduction of Structuralism, New York, Harper Torch books, 1972.

Lodge, David, Working with Structuralism, London, Routledge, 1986.

Leach, Edmond 9ed) The Structural Study of Myth and Totemin, London Tavi Stock, 1967.

Lotman, Yuri, Analysis of the Poetic Text, Ann Arbor, Mich, Ardis, 1976.

Lotman, Yuri, The Structure of the Artistic Text, Ann Arbor Mich, UP 1977.

Lerner, Laurence, (ed) Reconstructing Literature, Oxford, Blackwell, 1983.

Macdonell, Diane, Theory of Discourse, Oxford, Blackwell, 1986.

Macksey, Richard and Eugenio Donato, (eds) The Structuralist Controversy: The Language of Criticism And the Science of Man, Baltimore, John Hopkins University Press, 1970.

Makarius, R. "Structuralism: Science or Ideology" Socialist Register, 1974.

Martin, Robert R. The Homosexual Tradition in American Poetry University of Texas Press, 1979.

McMurtry, John, The Structure of Marx World View Princeton University Press, 1978.

Meese, Elizabeth (Sem). Erotics: Theorizing Lesbian: Writing-New york University Press, 1992.

Misra, Sadananda, "New Criticism vs. Structuralism" Indian Journal of American Studies 1980 July V. 10 (2) P. 40-49.

Genette, Gerard, Figures of Literary Disscours, New York, Clumbia University Press, 1982.

Goddar, Barkbara, Structuralism Post-Structuralism Language, Reality and Canadian Literature, 25-51, In Moss, John (Ed. and Auther) Future Indicative: Literary Theory and Canadian Literature, Othawa University of Ottawa Press, 1987, 247 pp.

Guiraud, Pirre, Semilogy, New York, Routledge, 1975.

Har and R. Super Structuralism: The Philosophy of Structuralism and Post-Structuralism, London, Routledge, 1978.

Hawkes, Terence, Structuralism and Semiotics, Berkeley, University of California Press, 1977.

Hasan Ruquya, "Direction From Structuralism" 102-122, In Fabb, Nigel (ed. and Introd.) The Linguistics of Writing, Argument Between Language and Literature, New York, Methuen, 1987 Vl. 7, 325 pp.

Healy, Jack J. "Structuralism Applied: American Literature and Its Subordination to Structure" A Real, A Review of International English Literature, 1983 April, Vl. 4 (2) P. 35-51.

Holub, Robert, Reception Theory, A Critical Introduction, London Methuen, 1984.

Huckle, John J. "Without Man, Some Aspects of the Structuralism of Claude Lev-Strauss" Thought" A Review of Culture and Idea, 1981 Dec. V. 56 (223).

Jakobson Roman, Selected Writing, The Hague, Mouton, 1971.

Jakobson Roman, and Morris Halle, Fundamentals of Language. The Hague, Janua Lingusum, Mouton, 1956.

Jefferson, Ann and Robey, David (ed) Modern Literary Theory, New Jersey, Binner and Noble Books, 1982.

Krieger, Murray and Dembo, L. S. Direction For Criticism, The University of Wisconsin Press.

Kuhans, Richard, Structure of Experience, Essay on the Affinity Between

University Language and Literature Association, A Literary Journal, 1993 Nov. V. 60, P. 278-294.

Timpanaro, Sebastiano, "Structuralism and its Successor" Contemporary Literature, 1981 Fall, V. 22 94) P. 600-622.

Todorov, Tzvetan, The Fantastic: A Structural Aprooach To A Literary Gener, Ithaca N.Y. Cornell University Press, 1975.

Wihl, Gary, The Contingency of Theory: Pragmatism, Expressinism and Deconstruction, Yale University Press, 1994.

Wachek, Josef, The Linguistic School of Prague, Bloomington, Indiana University Press, 1966.
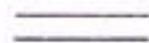
Mitchell, W.J.T (ed) Against Theory, Literary Studies and the New Pragmatism, Univesity of Chicago Press, Ill, 1985.

Pettit, Philip, The Concept of Structuralism: Acritical Analysis, Berkeley, University of California Press, 1975.

Piaget, Jean, Structuralism, Translated by Chaninah Maschler, London, Routledge and Kegan Paul, 1971.

Preminger, A Lex and Brogan T.V.F. The New Princeton Encyclopedia of Poetry and Poetics, University of Princeton, Princeton, New Jersey, 1993.

Powell, Mave Jo, "The Function of Response Proposals in Literary Structuralism" Poetics Today 1988, V. 9 (3) P. 607-633.

Ravindran, Sankaran, Structuralism and Decontruction, Delhi, Lucknow Atma Ram and Sons, 1982.

Robey, David (ed) Structuralism, An Introduction, New York, Oxford University Press, 1973.

Said, Edward, Culture and Imperialism, Alfred A. Khop F, New York, 1993.

Said, Edward, Beginings, New York, Basic Books, 1975.

Schultz, William R. Genetic Codes of Culture: The Deconstruction of Tradition by Kuhn, Bloom, Derrida, Garland Publishing, Incorporated, 1994.

Sont Tag, Susan, Against Interpretation, London, NLB, 1967.

Sturrock, John, Structuralism and Since, New York, Oxford University Press, 1979, (ed)

Strickland, Geoffrey, Structuralism or Criticism: Thought on How to Read, Combridge Uniersity Prress, 1981, Vl. 11, 209 pp.

Swiggers, P. "The Relationship Between Phenomenology and Structuralism" Some Critical Remarks, Art Semiotical: International Journal of American Semitic (98) V. 4 P. 263-263.

Sussex, Ronald, Saussure Agonistes: A Linguistic Perspective on Literature Structuralism, Aumla: Journal of the Australian

Examples of Urdu Literature.

9. **STRUCTURAL THEORY OF TRANSLATION**
Translation is linguistic textual metamorphis, linguiste relationship and new meaning, translation and universal factor, unity of mind and reality and structure unity, difference between mental and philosophical structure. Translation and meaning of text, creation of new translational structure comlex situation of linguistic structure in translation. Reader and translated text, some examples of Urdu translations. Deviation from linguistic structure, knowledge of cultural environment (or Translation).

10. **GUL BA SANOBAR CHEH KARD (A CLASSICAL URDU DRAMA) AND STRUCTURALISM**
Background, Story of Drama, Tragic, Comic and Abstract Structure of Drama, Structural explanation of the Drama. Classification of surface and deep structure of Drama. Basic Structural factor of the Drama, empirical analysis of Drama.

11. **THE CHROLOLOGICAL ORDER IN MAJOR FORM OF STRUCTURALISM (A GLOSSARY)**
Ebonic criticism, Rhitorical criticism, post-colonist criticism, superstructuralism, beyond superstructuralism, post structuralism, historiographical criticism, Hermeneutics, decolonialist criticism, deconstruction, phenomenology, text and writing (ECRITURE) criticism arhetypal criticism, structuralism, contextualism, archetypal criticism, reception theory, semiology / semiotics, neo-structuralism, formalism, dialogic criticism organic criticism, trop/tropology. The Fugitive, Berbal Icon, Discourse analysis, Feminist criticism, Reader response criticism, Lesbian and gay criticism, Nuclear Literary criticism. Post deconstruction
RELATED SCHOOL OF THOUGHT
* Bakhtin School * Chicago School * The Copenhagen School
* The Prague School * Russian Fromalism * The Yale School

12. **PERSONALITIES:**
M.E. Abrams, Althusser, Bakhtin, Bleach, Bloom, Barthes, Chromsky, Culler, Deman, Derrida, Foucalt, Eagleton, Eco, Frye, Fish, Goldmann, Gibson, Habermas, Hartman, Hirsch Jr., Holland, Iser, Korzybski, Kristeva, Jakobson, Jameson, Lacan, Lefebre, Michales, Miller, Piagent, Paulet, Prince, Ricoeur, Refaterre, Said, Saussure, Todorov, Tynianov, Tompkins, Toruaine, Wimsatt Jr.

13. **TERMINOLOGIES**
BIBLIOGRAPHY

STRUCTURALISM

History, Theory and Criticism

AHMED SOHAIL

1. **CHRONOLOGY OF STRUCTURALISM, FROM 1602 TO 1995**
2. **MYTH OF STRUCTURALISM I**
3. **MYTH OF STRUCTURALISM II**
4. **FUNCTIONAL STRUCTURALISM· FROM LITERATURE TO SOCIOLOGY**
A brief introduction, Creative Function of Literature, Jan Mukarovsky and Functional Aesthetics, Jean Amery and Franciois Furet-Mukarovsky's Concept of Structuralism Phenomenological method, Allusio of Phenomenology, empirical reality, are the function is inner directed as the tie of objectivity, Functional Semiotics - Conculsion.
5. **GERMAN STRUCTURLISM**
Objectives of study, Background of German Structuralism, Linguistics and Literary Analysis, Narratology, Rhetoric, Discourse analysis or Textual Linguistics, Pragmatics speech act theory, Reception Theory, Semiotics - Conclusion
6. **GENETIC STRUCTURALISM: GOLDMANN'S PERSPECTIVE**
Introduction of Genetic Structuralism, a Critical Theory, Genetic Structuralism, Sociology and Literary Criticism. New Hegelism, New German idealism, Compariosn of Zima's Aesthetic Social Strtucture, Principle of Homology, Human Facts and its methods, Goldmann's reaction of structural Formalism, significant structure, collective consciousness of structure.
7. **STRUCTURALISM AND MARXISM**
Historical background, Parmenides "School of Electic" Hiraclitus, Marx's concept of Social, Economic, Political and Theoritical Structure, Monism, Pluralism, System Theory, Hegel's Dialectic Theory of Structuralism and comparisn with Leve-Strauss's Theory of Structuralism, Goldmann, Althusser, Lebebre, Tourain, Jamerson, Eagleton, Machery - Conclusion.
8. **PHILOSOPHICAL BASE OF HERMENEUTICS**
Meaning of the term, General and Special Hermeneutics Origin and history of Interpretation. Ancient Jewish Exegesis New Testament use of the Old Testament, Medieval Exegesis. Reformation Exegesis, Modern Hermeneutics, Three types of Hermeneutics (1) Historical-Cultural and Contextural Analysis (2) Lexical Syntactical Analysis (3) Theological Analysis General and Philosophical Hermeneutics - Hermeneutics and special reference to origin, Augustine, Schlemacher, Apel, Betti, Delthey, Cadamen, Hebermas, Hirsch, Ricoeur, Heidegger, Dilthey Concep of Hermeneutic Circle and some

احمد سہیل کی پیدائش ۲؍ جولائی ۱۹۵۳ء کو کراچی (پاکستان) میں ہوئی۔ ان کا اصل نام سہیل احمد خان ہے۔ ابتدائی تعلیم کراچی اور اعلیٰ تعلیم امریکہ میں حاصل کی۔ بی اے (امتیازی)، ایم اے (عمرانیات) کے بعد ۱۹۹۶ء میں امریکہ کی San Antonio's Trinity یونیورسٹی سے تقابلی ادب میں پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ کچھ عرصہ کنساس (Kansas) اسٹیٹ یونیورسٹی کے جدید زبانوں کے شعبے میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور کیلی فورنیا کی سینٹاکلارا (Santaclara) کاؤنٹی میں مترجم بھی رہے۔ موصوف نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مقالہ نگاری، شاعری اور ترجمے سے کیا۔

امریکہ کے ماحولیاتی (Ecological) اور علامتی تعاملیت (Symbolic Interactionism) کے مدارس فکر سے متاثر رہے۔ ان کی فکری تربیت میں ان دونوں دبستانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ان مکاتب ہائے فکر کے نمائندہ فلسفیوں اور ماہر عمرانیات کی نگرانی میں نئی عمرانیاتی اور ادبی تھیوری کی تربیت حاصل کی۔ اسی وجہ سے ان کی ادبی تھیوری اور تنقیدی نظریات میں تجربیت، عملیات اور نئی عقل پسندی کے مخصوص فکری نظام ہائے کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ ان کی تنقید میں تجرباتی اور کلی تنقید کے نمونے ملتے ہیں جس میں عمرانیاتی آگہی کی جہت ابھر کے سامنے آتی ہے اور آئیڈیالوجی کی تشریح سائنسی نوعیت کی ہو جاتی ہے۔ احمد سہیل کے یہاں مناجیاتی رسائی تنقید کی نئی فکری استدلالیت کو دریافت کرتی ہے۔

۱۹۹۱ء میں کیلی فورنیا میں "ورلڈ آف پوئیٹری" کی جانب سے انھیں "گولڈن پوئٹ" (Golden Poet) کا اعزاز بخشا گیا۔ ان کی شاعری، تراجم، علمی ادبی اور تنقیدی مقالات برصغیر پاک و ہند کے جرائد کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں ان کی کتاب جدید تھیٹر ادارہ ثقافت پاکستان، اسلام آباد نے شائع کی۔ وہ امریکہ کی کئی ادبی اور علمی تنظیموں کے رکن ہیں۔

فارغ اوقات میں ان کے مشاغل میں نظارۂ طیور (Bird Watching)، ماہی گیری، والی بال، باسکٹ بال اور باؤلنگ (Bowling) شامل ہیں۔ اب تک ان کے دو سو سے زائد ڈرامے، کہانیاں وغیرہ چھپ چکے ہیں۔ وہ پچھلی دو دہائیوں سے زائد عرصے سے امریکہ کے دور دراز علاقے ٹیکساس (Taxas) میں بیٹھ کر اردو علم و ادب کی مخلصانہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان دنوں ٹیکساس کے ڈپارٹمنٹ آف کرمنل جسٹس میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔

تخلیق کار پبلشرز

104/B۔ یادر منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

∞